Feb. 85

Rs. 1/50

ایڈیٹر

نسیم انہونوی

مستقبل کی آواز ⊙ دھڑکتے دل کا ساز

بخشی جنتری ۱۹۵۵ء

نئی نویلی دلہن کی طرح سجی بنی

مفید مضامین اور دیدہ زیب طباعت سے آراستہ و پیراستہ

قدردانوں کے لئے حاضر ہے

اندراجات

جنتیں	احادیث پاک	پیش گوئیاں	فالنامہ

تاریخی ناموں اور ساتھ ہی ساتھ بخشی کی مشہور آفاق

ادویات اور حسن افزا مصنوعات کا تعارف

نمونہ کی کاپی ایک روپیہ کے ڈاک ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیں۔

ایس اے بی بخشی کمپنی۔ پوسٹ بکس نمبر [illegible] کلکتہ (۱۲)

اپنے ... میں ہمارے اسٹاکسٹ سے بھی حاصل فرما سکتے ہیں۔

جائے حیرت ہے کہ مسلمان جو ساری دنیا کو سچائی، نیکی، راست بازی، خوش معاملگی اور ایمانداری وغیرہ کا سبق دینے کے لئے چار دانگ عالم میں پھیل گئے تھے وہ آج خود انھیں برائیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ جہیز کی کمی کے سلسلہ میں مسلمانوں نے ظلم و ستم کا وہ طریقہ ابھی تک نہیں اپنایا ہے، جس کے تحت بے گناہ بیویوں کو زندہ جلا کر یا اور کسی طریقے سے مارا جا رہا ہے۔ مسلمان ابھی بھی گناہ کر رہا ہے کہ جہیز حسب دلخواہ نہ ملنے کے باعث شادیاں نہیں کرتے۔ اس طرح گھر سے کم کنواری لڑکیوں کی جائیں تو محفوظ رہتی ہیں۔

دعا

از فیض احمد فیض

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں
آئیے عرض گزاریں کہ نگار ہستی
زہر امروز میں شیرینی فردا بھر دے
وہ جنہیں تاب گراں باری ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے
جن کی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے
جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے
عشق کا سر نہاں جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

جہیز کی لعنت کی جڑیں بڑی گہرائی تک پہنچ گئی ہیں۔ آسانی سے انھیں اکھاڑ پھینکنا ایسا ہی دشوار ہوگا جیسا بے پردگی اور بے راہ روی پر قابو پانا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ حکومت نے انسداد جہیز کا قانون بنا دیا ہے لیکن یہ لعنت قانون سے دور نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ قانون سے بچ کر بھی ایسے کام کئے جا سکتے ہیں اور پھر رشوت کا بھلا ہو، ہمارے ملک میں اس کے ذریعہ ہر کام ہو جاتا ہے۔ اس لئے تاوقتیکہ اخلاقی طور پر لوگ اس لعنت کو محسوس کر کے خود اس کا مداوا نہ کرنا چاہیں، اس کا سدّباب نہیں ہو سکتا۔

ہماری بہنیں معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ جہیز لینے میں خواتین ہی پیش پیش ہیں اور جہیز نہ لانے یا کم لانے پر خواتین ہی سب سے زیادہ طعن طعنہ کرتی ہیں۔ مردوں کو اس مسئلہ میں کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد عورتیں ہی جہیز دیکھنے کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ انھیں کو یہ فکر رہتی ہے کہ دلہن کیا کیا لائی ہے۔ جیسی بھی شادی میں، میں نے مرد کو سب کچھ معلوم کرتے نہیں دیکھا۔ اس لئے جہیز کی لعنت دور کرنے میں خواتین کو سامنے آنا چاہئے۔ انھیں قسم کھا کر عہد و پیمان کرنا چاہئے کہ جہیز کے سلسلہ میں کوئی فرمائش نہ کی جائے گی۔ جو کچھ بھی لڑکی والے دے سکیں گے اسے قبول کیا جائے گا۔ ہر محلہ میں چند خواتین اس مہم کو شروع کریں۔ گھر گھر جا کر خواتین کو سمجھائیں کہ وہ خود اپنی ہی جنس کو اس عذاب میں مبتلا کر رہی ہیں یہ کتنا بہت بڑا گناہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں ان نوجوانوں سے بھی، جن کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔ یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے والدین سے

کہہ دیں کہ وہ جہیز لینا پسند کریں گے اور ایسی ہی لڑکیوں سے شادی کریں گے جو جہیز نہیں لا سکتیں۔ اگر ہمارے نوجوان قربانی اور ایثار کی ایسی مثالیں پیش کرنا شروع کر دیں تو معاشرے کی یہ برائی بڑی حد تک دور ہو جائے گی، یہ بھی ضروری ہے کہ اگر اس طرح کی شادیاں ہوں تو ان کی پبلسٹی کی جائے، خراج عقیدت پیش کیا جائے تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو سکے۔

نئی حریمی بہنوں سے

حریم میں جولائی سنہ [illegible]ء سے دو مسلسل ناول قسط وار شائع ہو رہے ہیں۔ ایک عفت موہانی صاحبہ کا ناول، دوسرا شہناز کنول صاحبہ کا سوختہ دل۔ سالنامہ میں انکی قسطیں شامل نہیں کی گئیں، لیکن فروری سے انکا سلسلہ پھر شروع ہوگا، اس لئے جو بہنیں چاہیں ان ناولوں کی سابقہ قسطیں دفتر سے طلب فرما سکتی ہیں۔ ان کی قیمت فی قسط پچاس پیسے لی جائے گی اور ۲/- وی، پی چارج کے لئے جائیں گے۔ (منیجر حریم)

ہندوستان کا شرمناک محکمۂ ڈاک

۲۹ جنوری کی ڈاک سے ہمیں تقریباً پچاس خطوط ایسے ملے ہیں جو ۸ جنوری سے ۱۶ جنوری تک ہمارے نام پوسٹ کئے گئے تھے اتنی تاخیر سے وصول ہونے کے باعث اکثر کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ اور موزوں ہو ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ ماہ [illegible] کے لئے عنوان ہے۔ محفل۔ اور اپریل کے لئے خیال۔

• نمبر خریداری [illegible] • [illegible] اشعار موزوں بھیجیں ہیں۔

جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

مرسلہ:۔ سیما [illegible] (الہ [illegible])

جب اس محفل میں سننے پہ نہیں ہے کوئی آمادہ
تو پھر ہم نطق کا جادو جگائیں بھی تو کیا ہوگا

مرسلہ:۔ نگار سلطانہ قریشی (لکھنؤ)

بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نینی تال)

خدا کرے نہ مٹے دل سے داغ الفت کا
یہی چراغ ہے محفل میں روشنی کے لئے

مرسلہ:۔ کاکا وحیدہ [illegible] (الہ آباد)

حسرت کو ہے تو آئیں تری بزم ناز میں
کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

مرسلہ:۔ عائشہ غلام محمد سرکٹ (شر[illegible])

بے حسی، بے گانگی، بے اعتنائی، بے رخی
کچھ نہ پوچھو اس کی محفل میں ہمیں کیا کیا ملا

مرسلہ:۔ صباح رحمٰن (لکھنؤ)

بیاں کر دے گی میری سرگزشتِ دل وہی تجھ سے
سحر کو شمع جو بجھ کر تری محفل سے نکلے گی

مرسلہ:۔ فہیدہ شاہین (ملی [illegible])

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

مرسلہ:۔ ب۔ن آشنا [illegible] (دہلی)

سوچتا ہوں چوٹ بن جاؤں میں طبل جنگ کی
حشر در آغوش ہو محفل رباب و چنگ کی

مرسلہ:۔ نجمہ النساء (بجنور)

تم جو ٹھکرا کے گئے ایک تمنا کا چراغ
محفلِ زیست کی سب شمعیں بجھا دیں میں نے

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ [illegible]

• ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خط لکھیں۔ دوسرا پرچہ بھیجا جائے گا۔ شکایت لکھتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ ورنہ شکایت کرنے پر پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

حضرت یونسؑ

سید فضل الرحمن جعفری

ہزاروں سال پرانی بات ہے، جب فلک کی بوڑھی آنکھوں نے نینوا کی بستی میں یہ عجیب منظر دیکھا تھا کہ چمکتی ہوئی صبح کو بستی کے تمام لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں ان کے چہروں پر ہیبت ہے دہشت ہے، اور اضطراب کی بڑی بھیانک لہریں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کوئی بہت بڑی ناگہانی آفت آئی ہے۔ اور وہ اس سے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی۔ گھر بالکل خالی ہو گئے ہیں، اور یہ ویرانے آباد ہو رہے ہیں یہ سب جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ اور پھر ایک چٹیل میدان میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے فریاد وفغاں کر رہے ہیں —— ان کی دردناک چیخوں سے جنگل لرز رہا ہے، اور پہاڑ ہل رہے ہیں اور دریا کی لہروں میں ہلچل مچ گئی ہے۔

یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ شہر نینوا کے لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک نبی بھیجا تھا۔ وہ انھیں نیک کاموں کی نصیحت کرتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا۔ وہ ان کی خیر خواہی کرتا تھا۔ اور وہ اس کی بدخواہی کرتے تھے۔ وہ انھیں بہت سمجھاتا رہا! کہ دیکھو تم اللہ کے بندے ہو وہی تمہارا رب ہے۔ تمہارا خالق ہے اور وہی بندگی کے لائق ہے۔ تم بت پرستی چھوڑ دو۔ تم ان سے مدد مت مانگو، تم ان کو نفع و ضرر کا مالک نہ سمجھو —— تم ایسا کرو گے تو نقصان میں رہو گے تم صرف اللہ کی پرستش کرو گے تو فائدے میں رہو گے، اللہ کے نبی کی یہ تمام نصیحتیں ان پر بے اثر ثابت ہوتی رہیں اور وہ بدستور بتوں کی پوجا میں مصروف رہے۔ جب اس قوم کی سرکشی اور تمرد حد سے تجاوز کر گیا تو اللہ کے سچے نبی نے ان کے حق میں بددعا کی۔ اور بارگاہ ایزدی میں یہ عرض کیا کہ۔

"اے رب کریم! میں نے تیرے حکم سے اس قوم کو بڑی نصیحت کی۔ اس کو تیرا پیغام پہنچایا اور اسے بار بار سمجھایا لیکن وہ مسلسل سرکشی کرتی رہی اور بتوں کی پرستش کرتی رہی اور میری کوئی بات نہیں مانی الٹا مجھے جھوٹا بناتی رہی اور مجھے ستاتی رہی۔ اس لئے اے خداوند قہار وجبار تو اس پر اپنا عذاب نازل فرما کہ تیرا وعدہ سچا ہے۔"

یہ دعا نبی نے قاضی الحاجات کی درگاہ میں مانگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اللہ کا عذاب اس قوم پر نازل ہو کے رہے گا۔ چنانچہ وہ عالم غضب میں چھوڑ کر نکل گیا جب قوم کو اس کا علم ہو گیا کہ نبی نے شہر چھوڑ دیا ہے تو انھیں یقین ہو گیا کہ نبی کی دعا خالی نہیں جا سکتی۔ انھوں نے عذاب کے کچھ آثار بھی دیکھے تو گھبرا کر گھروں سے نکل پڑے۔ اور میدان میں پہنچ کر آہ وبکا کرنے لگے ان کے کلیجے پھٹ رہے تھے اور انھیں اس بات کا یقین آ گیا تھا کہ نبی سچا ہے اور ہم جھوٹے۔ اس نے ہمیں خدا کی طرف بلایا۔ اور ہم جنوں کی طرف بھاگتے رہے اس نے جس عذاب کا ہمیں ڈر دلایا تھا، وہ غلط نہ تھا وہ عذاب واقعی سر پر آ گیا۔ اور واقعی خدا ایک ہے اور وہی پرستش کے لائق ہے پوری قوم نے دل سے توبہ کی۔ الٰہی ہم اعمالیوں پر پریشان ہوئی۔ تمام بت توڑ ڈالے۔ اور خدا کی کامل اطاعت کا عہد کیا۔ حق تعالیٰ نے اپنے گنہگار بندوں کی دعائیں قبول کیں۔ پھر قوم نے اللہ کے نبی کی تلاش شروع کی، اور یہ چاہا کہ وہ مل جائے تو اس کی پوری پیروی کرے تلاش وجستجو کے باوجود اس قوم کو اپنے نبی کا سراغ نہ مل سکا۔ وہ اب اس بستی میں نہ تھا۔ وہ بہت دور سمندر پار کہیں چلا گیا تھا، وہ قوم سے بہت ناراض تھا اور اب اس کے درمیان آنے کے لئے تیار نہ تھا۔

قدرت کا تکوینی نظام انسانی فہم سے بالاتر ہے اس نظام میں خیر ہے۔ رحمت ہے اور سعادت ہے ہوا یہ کہ اللہ کا وہ نبی جس نے قوم سے ناراض ہو کر جنگل کی راہ لی تھی، وہ ایک کشتی میں بیٹھ کر شہر سے نکل گیا تھا کشتی میں بہت سے لوگ تھے۔ وہ بیچ دریا میں ڈوبنے لگی۔ ملاح نے کہا کہ بوجھ زیادہ ہے اسلئے کشتی کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے ایک آدمی کشتی سے اتر جائے۔ بیچ دریا میں کون بھلا اترنا پسند کرتا جب کوئی بھی اس کام کیلئے آمادہ نہ ہوا تو قرعہ ڈالا گیا۔ قرعہ اس نبی کے نام پر نکلا۔ نبی کی صورت اتنی معصوم تھی کہ لوگوں نے اس پر رحم کھایا اور قرعہ دوبارہ ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا یہ عمل تین بار کیا گیا ہر بار نبی کا نام نکلتا رہا۔ یہ دیکھ کر نبی نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ابھی دریا کی تہہ میں پہنچنے نہیں پایا تھا کہ ایک مچھلی نے اسے نگل لیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا اس نے مچھلی کو یہ حکم دیا کہ وہ اسے اپنی غذا نہ سمجھے۔ بلکہ ہم نے تیرا شکم اس کے لئے قید خانہ بنایا ہے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس کی پوری حفاظت کر اسے کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ ادھر اللہ کے نبی نے اپنے اللہ کو پکارا اور اپنی خطا کا اعتراف کیا اور اس کی بارگاہ میں یہ عرض کیا کہ:-

اے بار الٰہا! میں اپنی قوم سے مایوس
ہو گیا تھا یہ میری غلطی تھی میں نے تیرے
حکم کا انتظار نہ کیا اور بستی چھوڑ کر چلا آیا۔
میرا یہ عمل درست نہ تھا مجھے تیرے حکم کا انتظار
کرنا چاہیئے تھا۔ پس اے ربِ حقیقی! "کوئی
حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے۔ میں
تھا گنہگاروں میں سے۔"

نبی کی یہ دعا مستجاب ہوئی۔ منشائے ایزدی یہ تھا کہ وحیِ الٰہی کا انتظار کئے بغیر نبی کا عمل درست نہ تھا یہ ایک نبی کی شان کے خلاف ہے۔ اسی بات پر اللہ کی طرف سے یہ آزمائش شروع ہوئی تھی، اور بالآخر توبہ کے بعد نجات حاصل ہوئی۔ اور مچھلی کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے دریا کے کنارے آکر اگل دے مچھلی نے حکم کی تعمیل کی۔

یہ تھے حضرت یونس علیہ السلام جنہیں اللہ نے موصل کے قریب شہر نینوا کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ اس واقعہ سے نبی کی تنقیص نہیں بلکہ اس سے اللہ کا مقصود یہ تھا کہ نبی کی جلالت شان ظاہر ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہو حضرت یونس کا دریا کی گہرائی میں گرنا اور مچھلی کے پیٹ کی اندھیری کوٹھری میں قیدی بن کر رہنا، اور پھر صحیح و سالم مچھلی کے پیٹ سے نکل کر دنیا میں آنا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مظاہر ہیں جن میں بندوں کے لئے عبرت و موعظت کا بڑا سامان ہے۔

یہ دعا جو حضرت یونسؑ کی زبان سے کہلوائی گئی ہے، یہ پوری اُمت کے لئے ایک نسخۂ شفا بن گئی ہے اس دعا کی بڑی فضیلت ہے۔ یہ مصائب و آلام میں انسان کو اللہ کے حکم سے نجات دلانے کا بہترین وسیلہ ہے۔ آج بھی جب مسلم گھرانوں میں کوئی ناگہانی آفت آتی ہے اور اس سے نجات کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تو اس آیۃ کریمہ کا ورد کرایا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم کے سورۂ انبیاء کی یہ آیت ورد کرنے کے لئے ہزاروں زبانیں بیک وقت جنبش میں آجاتی ہیں۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

(ترجمہ) کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے، تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں میں سے۔

بقیہ صفحہ ۲۴ پر

زکام کا بہترین علاج

لہسن ۔!

نزلہ زکام سے بچاؤ کے لیے ضروری نہیں کہ وٹامن سی کی گولیاں ہی کھائی جائیں، لہسن اس کام کے لیے انتہائی موثر ہے۔ دنیا بھر میں عرصہ سے لوگ لہسن کو خون کی صفائی اور زکام سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن یہ ضرور ہوگا کہ آپ خاصی تعداد میں لہسن کھائیں تو اس کی بو ایسے افراد سے آپ کو متاثر نہ کرے گی۔

جنھیں زکام ہو، اور جن کے جراثیم اڑ کر آپ کو لگ سکتے ہیں، لیکن حالیہ سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ لہسن میں سب سے زیادہ خصوصی طبی فوائد ہیں جن میں عارضۂ قلب، فالج، کینسر اور ذیابیطس سے بچاؤ شامل ہے جبکہ اس میں اینٹی بایوٹک خصوصیات بھی ہیں۔

ایک خط

برادر مکرم! اسلام مسنون

خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں — لمعات میں آپ کی پردے کی حمایت اور پھر بدلے میں لڑکیوں کی جھاڑ پونچھ پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں پردہ اچھی چیز ہے لیکن آپ یہ بھی تو سوچئے کہ اس آزادی اور بے راہ روی کا ذمہ دار کون ہے؟ میں تو ان نوجوانوں کو الزام دوں گی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہی چاہتے ہیں کہ بیوی تعلیم یافتہ ہونی چاہیئے خوبصورتی بھی ہو سیرت خواہ کیسی بھی ہو آج کی سوسائٹی میں بیوی کو ساتھ لے کر نکلنا فیشن میں داخل ہے اگر بدنصیبی سے بیوی کم پڑھی گھریلو قسم کی ہے تو سینما اور کلب کے لئے اور کسی لڑکی کو منتخب کر لیا جاتا ہے اس گرانی کے دور میں عموماً لڑکے یہ بھی چاہتے ہیں کہ بیوی برسر روزگار ہو اور یہ حقیقت ہے کہ وہ لڑکیاں جو خود کما رہی ہیں آرام سے ہیں ورنہ اکثر لڑکیاں بڑی پریشانی کی زندگی گذار رہی ہیں۔ پہلے وقتوں میں والدین شادیاں کر دیا کرتے تھے مجال نہیں کہ بیٹا نہیں کرے۔ لڑکی بھی اولاد جانے کھونٹا لے نکلے پر عمل کرتی تھی لیکن اب معاملہ برعکس ہے۔ ناچیز کی رائے تو یہ ہے کہ آپ ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی مشورہ دیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ فیشن ایبل لڑکیوں پر کم پڑھی گھریلو قسم کی لڑکیوں کو ترجیح دیں، اس طرح آجکل جو معاشرہ گندگیوں میں ملوث ہے کسی حد تک پاک ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کے والدین بھی اچھی تعلیم کی وجہ سے اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرح ان پر زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے تعلیمی اخراجات۔ پھر جہیز۔!! آزادی اور بے پردگی نے خوبصورتی کی قیمت بڑھادی ہے۔ سیرت پر کوئی توجہ نہیں کرتا لہٰذا لڑکیاں اور ان کے والدین کسی حد تک مجبور ہیں کہ لڑکیوں کو نہ صرف تعلیم دلائیں بلکہ وہ دیکھنے میں بھی خوبصورت لگیں تاکہ اچھی جگہ شادی ہو سکے اس کے لئے میک اپ کا بھی رواج ہو گیا ہے اور وہ بن ٹھن کر بے پردہ پھرنے لگی ہیں۔ میں تو ان نوجوانوں کو ہی ذمہ دار ٹھہراؤں گی جو مغربی ممالک سے ڈگریوں کے ساتھ ہی میمیں بھی لائے اور پھر ہندوستانی لڑکیوں کو میم بنانے کی کوششیں کرنے لگے۔ آزاد رہنا کون نہ چاہے گا؟ ایک سبب یہ بھی ہے کہ مشرقی تعلیم کا فقدان ہونے کی وجہ سے دلوں میں خوف خدا نہیں رہا۔ اس لئے مشرقی تہذیب کی لٹیا ہی ڈوب گئی اخلاقی معیار اتنا گر چکا ہے کہ ہم آپ کتنا ہی چیخیں چلائیں نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگی۔

ناچیز آپکی بہن زرین بارہ بنکوی

جب مفت ملتے تھے

آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ انگریزی دور حکومت میں منی آرڈر اور وی۔ پی فارم بلا قیمت ہر ڈاکخانہ سے حسب ضرورت ملا کرتے تھے لیکن ہماری قومی حکومت نے ان فارموں کی قیمت مقرر کردی ہے اور اب یہ فارم دس پیسے کا ملتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ قیمتاً بھی یہ فارم بروقت اور بآسانی نہیں ملتے۔ انھیں حاصل کرنے کے لئے ہمارے آدمی کو مختلف ڈاکخانوں کے چکر لگانا پڑتے ہیں، پھر بھی کبھی کبھی ضرورت بھر کے وی پی فارم نہیں ملتے اور وی پی صرف اس لئے بروقت نہیں روانہ ہو پاتے کہ وی پی فارم نہیں ملتے — سالنامہ حریم کی روانگی کے لئے بہت زیادہ وی۔ پی فارم درکار تھے۔ انھیں فراہم کرنے کے لئے ہمارے آدمی کو ایک ماہ تک ہر روز ڈاکخانوں میں جانا پڑا۔ یہ ہے ہماری حکومت کا حسن انتظام اور یہی وجہ ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی اکثر لوگ غلامی کے دور کو یاد کیا کرتے ہیں۔

○ پانچ نئے ناول

نور سحر	ہاجرہ نازلی	۲۲/۵۰
شہابی	شہناز کنول	۲۵/-
رازداں	فردوس حیدر	۲۵/-
ہار جیت	عفت موہانی	۱۸/-
افشاں	اے آر خاتون	۳۶/-
روپ	رضیہ بٹ	۳۳/-

افسانہ

آخری وار

نجم اعزاز

تبریز نے گھر میں قدم رکھا تو عجیب سی ویرانی کا احساس ہوا۔ گھر کے مکین تو الگ رہے چوکیدار اور مالی تک ڈرے سہمے ایک طرف کھڑے تھے۔ لان کے کنارے کنارے بنی کیاریوں میں پھول تو لگے تھے لیکن بچوں کی کلکاریاں اور چہچہے نہ تھے۔ تبریز کا دل دھڑک اٹھا۔

"خدا خیر کرے" وہ دھیرے سے بولا "لگتا ہے آج بی اماں نے پھر کوئی زیور گم کر دیا ہے"

لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اندر پہنچا تو عقبی کمرہ کے سامنے ناہید مل گئی روئی روئی سی آنکھیں، اڑی اڑی رنگت دیکھتے ہی تبریز کے لبوں سے آہ نکل گئی۔ اس کا اندیشہ ٹھیک ہی نکلا پچھلے ایک ماہ سے ہر دوسرے تیسرے دن بی اماں کا کوئی نہ کوئی زیور گم ہو رہا تھا اور ہر مرتبہ آ گئی بلا ناہید کے سر جارہی تھی کہ وہ بد سلیقہ غیر منتظم اور پھوہڑ ہے اس کی لاپروائی سے گھر میں چوریاں ہونے لگی ہیں۔

حالانکہ تبریز اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ناہید کا قصور نہیں خود بی اماں کی لاپروائی ہے اگر وہی ذرا سی احتیاط کرکے منہ دھوتے ہوئے واش اسٹینڈ کے پاس یا نہانے کے بعد غسل خانہ میں انگوٹھی کنگن جھمکے وغیرہ نہ چھوڑیں تو اتنا نقصان نہ ہو۔ لیکن انھیں کون سمجھائے کہ آج کل زمانہ ایماندار ملازم کا ملنا کس قدر دشوار ہے اور بغیر ملازم کے اتنی بڑی گھر گرہستی چلانا بھی کتنا مشکل ہے۔ پھر روز روز نئے ملازم ملتے بھی کہاں ہیں۔

اس کے باوجود ناہید اور وہ ملازموں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ہر مرتبہ سختی سے ملازموں سے باز پرس بھی کی تھی مگر نتیجہ ہمیشہ وہی ڈھاک کے تین پات" نکلتا رہا۔ ملازموں کے خلاف پولس میں رپورٹ کرنے پر بی اماں کی ناراضگی الگ سہنا پڑتی کہ "بیٹے دیکھا چور باپ برابر" پھر وہ کئے دن کی ان چوریوں کا کیا سدباب کرتا۔

چنانچہ عشرت کو اس نے تاکید کر رکھی تھی کہ بی اماں کے غسل کرنے یا منہ دھونے کے بعد ان جگہوں سے ان کے چھوڑے ہوئے زیورات اٹھا کر بی اماں کو دے دیا کریں۔ جب تک دونوں لڑکیاں گھر میں رہتیں بی اماں کے زیورات کی چوکسی کرتیں ان کے کالج چلے جانے پر بیچاری ناہید بی اماں کا سایہ بنی ان کے ساتھ لگی پھرتی مگر اتنی احتیاط کے باوجود ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ گم ہو جاتا اور آئی گئی ناہید کے سر ہوتی۔

بی اماں کی اس زیادتی پر ناہید کسی سے شکوہ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے پرائے جس کسی سے وہ اس رویہ کے متعلق کچھ کہتی تو الٹی خود ہی نکو بنتی۔ سارا شہر جانتا تھا کہ بی اماں نے دو دو سوتیلے بیٹوں کا کس چاؤ سے بیاہ رچا کر بہوؤں کو راج سنگھاسن پر بٹھایا تھا کہ جب تک وہ بی اماں کے ساتھ رہیں سوتیلی ساس کے گن گاتی رہیں اور جب شوہروں کی ملازمت کی وجہ سے پردیس سدھاریں تو یوں پھوٹ پھوٹ کر روتی رخصت ہوئیں جیسے لڑکیاں میکہ سے وداع ہوتی ہیں۔

بھلا سوتیلی بہوؤں کے ساتھ شفقت کا ایسا برتاؤ کرنے والی بی اماں اپنی اکلوتی سگی بہو سے کوئی بدسلوکی کر سکتی تھیں؟۔ جو کوئی بھی سنتا ناہید کو منہ پر ہی جھٹلا دیتا۔ پھر ناہید زیادہ زور دے کر اپنی کہی منوا بھی تو نہ سکتی تھی کیونکہ انھیں بی اماں نے سترہ سال تک اس کو یوں لاڈ پیار سے رکھا تھا کہ خود اس کی اپنی امی نے کبھی کبھی اسے اتنا نہ چاہا تھا۔ انھیں بی اماں کے مشفقانہ برتاؤ کی وجہ سے ہی تو وہ اپنی امی کی موت کا صدمہ برداشت کر سکی تھی۔ بی اماں کے رہتے اسے اپنی امی کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

"بی اماں۔ بی اماں" کہتے کہتے خود اس کی زبان بھی خشک ہوتی تھی اب اسی زبان سے وہ ان کی برائی کس طرح کر سکتی تھی اور اگر کرتی بھی تو کون یقین کرتا۔ پھر برائی بھی کیا کرتی۔ بس یہی ذرا سی لاپروائی کی۔ یوں اپنی سوچوں میں گم عقبی کمرہ کے دروازہ کی چوکھٹ سے لگے اس کی نظر سامنے سے آتے تبریز پر پڑی تو گھنی پلکوں پر تھرتھراتے آنسو رخساروں پر اتر آئے ستاروں کے چمکنے اور ٹوٹنے کا منظر دیکھ کر تبریز کے دل کو دھچکا سا لگا۔ خجالت آمیز انداز میں اس نے ناہید کو تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ سسک کر بولی "بی اماں پہلے تو ایسی نہ تھیں تبریز"

عقبی کمرہ میں دیوان پر دراز بی اماں نے ناہید کی سسکی پر بیقرار ہو کر دل تھام لیا اور لمبی سانس لے کر بڑبڑائیں "میں سچ مچ پہلے ایسی نہ تھی ناہید جان"

بچے بچے کی بی اماں پہلے ایسی نہ تھیں۔ درامنل وہ پہلے بی اماں بھی نہ تھیں۔ پہلے پہل وہی سادی عطو تھیں۔ عجیب الطرفین غیور پٹھان باپ کی اکلوتی بیٹی عطیہ خانم۔ پہلی بیوی کی اولاد میں لڑکے ہی لڑکے تھے دوسری بیوی سے عطیہ ملی تو خان صاحب نے پٹھان ہوتے ہوئے بھی چھاتی پھلاکر ملازموں کو انعامات سے نوازا تھا۔ سارے جرگہ میں ان کی بیجا خوشی پر حیرت کا اظہار کیا گیا تھا لیکن خان صاحب نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ بیویوں کی طرف سے وہ جتنے لاپرواہ تھے بیٹی کو اسی قدر چاہتے تھے۔ عطیہ سے "عطو" انہیں کی وجہ سے تو وہ بنی تھیں۔ پیاری پیاری گول مٹول سعادت مند بیٹی کو عطو کہہ کر جب وہ گود میں بھرتے تو ان کا چوڑا چکلا سینہ اور پھول جاتا۔ طباق سا چہرہ گلگوں ہو جاتا۔ وہ بھی تو باپ پر جان دیتی تھیں۔ مگر باپ بیٹی کی یہ محبت خاندان کی خواتین کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس جرگہ میں تو عورت کو پیر کی جوتی کہا جاتا تھا۔ پھر بیٹی سے محبت کیسی۔؟ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ بیویوں کو پیر کی جوتی کہنے والے خان صاحب بیٹی کے طفیل بیٹی کی ماں کو بھی چاہنے لگے۔

ایک خاص بیوی سے محبت نے ہی تو خاندان والوں کو چراغپا کر دیا تھا اسی لیے خان صاحب کی گھر میں غیر موجودگی پر خواتین میں وہ ہاہاکار کا واویلا پڑتا کہ ننھی سی عطو کا دل رہ رہ دہل جاتا۔ ساس بہو کے جھگڑے نند بھاوج کی لڑائی۔ سگے سوتیلے کی جلن اور رسہ تیا ڈاہ میں گزارے بچپن نے انہیں بے حد حساس بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باشعور ہونے پر وہ خاندان تو کیا جرگہ بھر میں مثالی کردار بن گئیں۔

بے بس و بے کس ماں سے لڑتی دادی پھوپھیوں پر ایسی جان نچھاور کی کہ ننھی عطو کے بے لوث پیار کے آگے ان رشتوں کا ازلی بیزار اور بغض و کینہ کا زنگ سب کے دلوں سے چھٹ گیا۔ سگی ماں سے بڑھ کر سوتیلی ماں سے ان کی محبت اور فرمانبرداری کا شہرہ ہر ایک کی زبان پر تو روز اول سے ہی تھا لیکن سوتیلی بھاوجیں آئیں تو انہیں بھی اتنا ٹوٹ کر چاہا کہ سگے سوتیلے کا فرق ہی مٹ گیا۔ وہ گھر جو ہمیشہ میدان کارزار بنا رہتا تھا ان کی پرخلوص بے لوث محبتوں اور ان تھک کوششوں کی وجہ سے گہوارہ امن بن گیا تھا۔ اور جرگہ بھر میں بطور مثال پیش کیا جانے لگا تھا۔ کہیں بڑی بوڑھیاں نئی دلہنوں کو دعائیں دیتیں "خدا انہیں عطو جیسی نندیں عطا کرے" تو کہیں لڑکیوں کے والدین پیام لانے والی مشاطاؤں سے کہتے۔ "سوتیلی اولاد اگر عطو ایسی ہو تو ایک کیا ہم پانچ پہلی بیوی کی اپنی لڑکی بیاہ دیں گے۔" غرض ہر ایک زبان پر بس "عطو ہی عطو" تھا۔ اور یہی عطو جب میکہ سے دلہن بن کر رخصت ہوئی تو گھونگھٹ میں جھانکتے دو ننھے فرشتے منہ دکھائی میں دیتے ہوئے گلریز خاں نے بھرائی آواز میں کہا تھا۔ "بن ماں کے یہ بچے اب تمہارے حوالے ہیں عطیہ خانم۔" عطو کے نام سے آشنا کانوں نے عطیہ خانم کے نام پر پرجذبات اپیل سنی تو ارمانوں بھرے مچلتے دل اور سلگتے جذبات پر کنواری ممتا کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برس پڑی لپک کر انہوں نے یوں نو دمیدہ غنچوں کو سمیٹ لیا جیسے وہ انہیں کے چمن نو کی بہار رہی ہوں۔

پھر بھی شہیر اور شہیر ان کی دونوں آنکھیں بن گئے۔ ان دونوں کی آنکھیں رات دن انہیں تاکتی رہتیں اور وہ رات دن اپنی انہیں دونوں آنکھوں کو نہار کر ہمیں نئے سرے سے نئی مثالیں دی جانے لگیں۔ "خدا ہر دوہاجو کو عطیہ خانم جیسی بیوی عطا کرے" "سوتیلی ماں ہو تو عطیہ خانم جیسی"۔ پھر تو عطو نے عطیہ خانم کا جامہ ایسا پہنا کہ برسوں گزر گئے گلریز خاں کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھ پائیں۔ کبھی دو گھڑی تنہا پاس بیٹھنے کا موقع بھی نہ نکال سکیں۔ مگر گلریز خاں ان کی ایک ایک حرکت کو بہ نظر غائر دیکھتے پرکھتے اور سراہتے رہے۔ دل ہی دل میں عطیہ خانم کے بے مثال کردار کو سراہتے سراہتے وہ یوں ان پر مفتون ہوئے کہ وہ عطیہ خانم سے "عطی" بن گئیں۔ عطی کہتے کہتے ان کا منہ خشک ہوتا تھا وہ تو جیسے زن مرید ہو کر رہ گئے تھے پھر ننھے نبر بنو کی پیدائش نے ان کے وجود کو مکمل کر دیا۔ شہیر و شہیر انہیں "بی" کہتے تھے، ننھے نبر یز نے زبان کھولی تو "بی" میں "اماں" کی سریلی جھنکار بھی شامل کر لی۔ یوں وہ ایک بار پھر نیا نام پا کر سب کے لیے "بی اماں" بن گئیں۔

عطو سے عطیہ خانم، عطی اور پھر بی اماں بن کر وہ بچے بچے سب کے لیے قابل احترام ہو گئی تھیں۔ مگر عطو سے بی اماں تک کا سفر کرتے کرتے وقت اور زمانے نے کتنی کروٹیں بدلی تھیں۔ حالات نے کیسی تلخیاں دی تھیں لیکن وہ رہیں وہیں کی رہیں۔ سہاگ کا رنگین آنچل تقدیر کے ہاتھوں نے بیدردی سے کھینچا تو بیوگی کی سفید چادر سر پر لے کر وہ اور بارعب و باوقار بن گئیں اپنی گداز کلائیوں کے سونے پن کو لمبی سفید آستینوں سے ڈھانک کر انہوں نے شہیر اور شہیر کی دلہنوں کی کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں پہنائیں اپنی بڑی بڑی قاتل سرمگیں آنکھوں سے قدرتی کاجل کو مٹانے پر قادر ہو سکیں تو ان میں ممتا کی قندیلیں روشن کر کے بہوؤں کے لیے رہبر و رہنما بن گئیں۔ یوں مجسم خلوص و محبت میں ڈھل کر انہوں نے زندگی کے اتنے

ایک سال اپنے پرایوں کے بیچ میں گذار دیے تھے کہ اپنے تو اپنے غیر بھی بے پرکھے ان کی محبت پر ایمان لے آئے تھے۔ پھر یہ اچانک کیا ہو گیا تھا کہ ایک ماہ سے "بی اماں" اپنی ہی ناز ولی کی پالی پوتیوں، چہیتی اکلوتی بہو اور فخر خاندان جیسے بیٹے تبریز کی خوشیوں بھری زندگی پر غموں الجھنوں اور پریشانیوں کے ابر سیاہ کی طرح برس پڑی تھیں۔

تبریز اپنی جگہ حیران تھا کہ کیا یہ وہی بی اماں ہیں جنھوں نے اس کی پسند پر غیر خاندان سے بیاہ کر خاندانی روایات کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا جز گر بھر کی مخالفت مول لے کر عزت و عشرت کو مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تک دے دی تھی۔ پھر اتنے عرصہ بعد یہ ایک ماہ کے اندر کیا ہو گیا تھا جو وہ یوں اپنی اولاد کے لیے تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھیں یہ نہ تو تبریز سمجھ پا رہا تھا نہ ناہید۔

گھر کا ماحول بے حد تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ تبریز آفس میں اور عزت و عشرت کالج کی مصروفیات میں گم ہو کر چند گھنٹے سکون سے گذار لیا کرتے تھے لیکن جان عذاب میں تھی ناہید کی۔ وہ سارا دن گھر پر رہتی تھی۔ بی اماں کے عجیب سے رویہ کی وجہ سے ذہنی تناؤ نے اسے اس قدر ہراساں کر رکھا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی تھی ادھر تبریز کی جان تو سولی پر تھی نہ ماں کو غلط گردان سکتا تھا نہ بے قصور بیوی کو مطعون کر سکتا تھا۔ دل ہی دل میں کڑھتے رہنے کے سوا چارہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ شاید ندامت بھرے انداز میں بیوی کو تسلی دینا اور گمشدہ زیور کی جگہ نیا زیور انتہائی سعادت مندی سے ماں کے حضور پیش کرنا ہی اس کے مقدر میں لکھ گیا تھا۔

معمول کے مطابق ناہید کو تسلی دے کر وہ الٹے پاؤں صرافہ کی طرف ہو لیا تھا۔ بڑی دیر بعد واپس لوٹا تو سیدھا "بی اماں" کی تلاش میں لگ گیا۔ عزت و عشرت ابھی کالج سے لوٹی نہ تھیں۔ ناہید اکھڑے دل سے باورچی خانہ کے کاموں میں لگی تھی۔ تبریز بی اماں کی تلاش میں گھر کے آنگن سے ہوتا ہوا اوپری منزل کی بالکونی میں پہونچا تو ہمیشہ کی طرح بی اماں جھلملی سے لگی کھڑی تھیں۔ گذشتہ ایک ماہ سے بی اماں روزانہ صبح و شام اس بالکونی میں ضرور نظر آتی رہتی تھیں۔ تبریز نے ان کے اس معمول پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اس وقت بھی بی اماں کو جھلملی سے آنکھیں لگائے بڑے انہماک سے باہر جھانکتے پایا تو خود بھی جھلملی سے باہر دیکھنے لگا۔ سڑک کے موڑ پر عزت و عشرت کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کر رہی تھیں۔ سڑک پر روزانہ کی طرح آمد و رفت تھی دو کانوں پر روزانہ کی چہل پہل تھی۔ کوئی خاص بات ایسی نہ تھی کہ تبریز باہر ہی دیکھتا رہتا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے انگوٹھی کی ڈبیہ ٹٹولی اور دل ہی دل میں مخاطبت کے لیے الفاظ موزوں کرتا ہوا وہ بی اماں کی طرف گھوما تو ان کا سرخ چہرہ دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ لبوں پر آئے الفاظ ٹوٹے ٹوٹ کر بکھرنے لگے "آ۔ آ آپ کی انگوٹھی"

"انگوٹھی۔؟" بی اماں نے رخ موڑ کر اسے دیکھا "میری انگوٹھی"

ان کی تیوری کے بل دیکھ کر تبریز کا خون خشک ہونے لگا "جی جی ہاں۔ آپ کی انگوٹھی آج کھو گئی تھی نا۔ اس لیے دوسری لے آیا ہوں۔"

"ہوں" بی اماں کا لہجہ یکلخت بدل گیا "آج انگوٹھی کل جھمکے پرسوں کنگن ہر دن ہر زیور دوسرا لا سکتے ہو تبریز۔ کیا کھوئی ہوئی عزت بھی لا پاؤگے کبھی"

"ع۔ جی۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں" تبریز بی اماں کے سرد لہجے سے زیادہ ان کی بات سن کر گھبرا گیا تھا۔ بی اماں پھر جھلملی کی طرف پلٹ کر باہر دیکھنے لگیں۔

"میں نے کوئی انوکھی پہیلی تو نہیں بجھوائی تبریز۔ ذرا باہر دیکھو اپنی لڑکیوں کو"

تبریز پہلے بھی عزت و عشرت کو دیکھ چکا تھا۔ دوبارہ باہر جھانکے رخ موڑ کر حیرت سے بولا "کوئی خاص بات تو نہیں وہ مرزا صاحب کی لڑکی سے باتیں کر رہی ہیں بی اماں"

"ہاں بیٹے کوئی خاص بات نہیں۔ کہ آس پاس کی دوکانوں پر کتنے چہرے کتنی آنکھیں ان پر گڑی ہیں۔ وہ تو دوکانوں میں رکھی چیزیں اور سڑک پر بکتا مال ہیں کہ ہر آیا گیا پرکھتا رہے"

"بی اماں" تبریز نے باہر جانے کیا کچھ دیکھا کہ تلملا گیا "یہ آج کل کا دستور ہے۔ لڑکیاں دیکھ کر غنڈے لوفر آوارہ گرد تو ویسے اکٹھا ہو ہی جاتے ہیں۔ مگر اپنی لڑکیاں تو ایسی نہیں ہیں نا"

"بیشک لڑکیاں ایسی نہیں لیکن ہو گئیں تو کیا ہوگا" بی اماں نے زہریلے لہجے میں کہا "میں گذشتہ ایک ماہ سے انھیں دیکھ رہی ہوں جب سے میری مخالفت کی پرواہ نہ کر کے تم نے لڑکیوں کو برقع اتار پھینکنے کی اجازت دی ہے تب سے روزانہ صبح و شام پھولوں پر ایسے ہی بھونرے منڈلانے لگے ہیں"۔

"مگر بی اماں" تبریز نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تھا لیکن بی اماں ان سنی کر کے درشت لہجہ میں بولیں: "بیشک بر تعیش پہننا اوڑھنا ندامت پرستی اور جہالت ہو سکتی ہے لیکن قیمتی شے یوں کھلے عام لاپرواہی سے چھوڑنا بھی تو کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ اب تم میری لاپرواہی سے گم کیے زیورات بڑی آسانی سے دوبارہ خرید کر مہیا کر دیتے ہو لیکن لڑکیوں کی عصمت و عفت پر الزام آیا تو دوبارہ کوئی انتظام ہو سکے گا۔ یا اب جس طرح نوکروں کو الزام دے کر چپ ہو جاتے ہو تب ان چھوکروں کو برا بھلا کہہ کر مطمئن ہو جاؤ گے۔"

بی اماں کا لہجہ دو دھاری تلوار کی طرح کلیجہ کے پار ہو گیا تھا۔ تبریز تلملا گیا "نہیں بی اماں ایسی بدشگونی کی باتیں مت کہیے میری لڑکیوں کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"شید صاحب تم سے زیادہ شریف و معزز ہستی سمجھے جاتے تھے تبریز۔" بی اماں نے سرد لہجہ میں جواب دیا: "لیکن جب سے ان کی پوتی کو راہ چلتے اغوا کر لیا گیا ہے تو تم سب انھیں کس نظر سے دیکھتے ہو۔ اس بدنصیب لڑکی کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ کسی دوکان پر عزت و آبرو جیسی شے فروخت ہوتی ہے تو اس کم نصیب لڑکی کے لیے پھر مہیا کیوں نہیں کر دیتے کہ وہ بدبخت مراد دل جلی بھی سر اٹھا کر چل سکے؟"

"بی اماں" ناہید نہ جانے کب سے تبریز کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور ماں بیٹے کو محو گفتگو پا کر کمرہ میں ہی رک گئی تھی کہ بی اماں کی کھری کھری سن کر روتی ہوئی ان سے آلپٹی: "ایسا نہ کہیے۔"

بی اماں کا دل بھر آیا۔ ناہید کو سینے سے بھینچتے ہوئے انھوں نے گلوگیر لہجہ میں کہا: "میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تاہید کسی کو دکھ نہیں دیا۔ سگے سوتیلے رشتوں کی مرضی کہاں تک ان کے خلاف چلتی رہی۔ مگر تم لوگوں کی اندھی فیشن پرستی نے مجھے مجبور کر دیا کہ اپنی فطرت کے خلاف سخت ہو جاؤں۔"

تبریز سر جھکائے کھڑا ندامت سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ بی اماں نے ناہید کی متورم پلکیں خشک کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "کتنے عادی بنے تم دونوں میرے بچو کر اصلی زیور کی طرف سے یوں لاپرواہ ہو کر زر و جواہر کی گمشدگی پر خون کے آنسو بہاتے رہے۔ افسوس ہے کہ مجھے اتنا سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔"

"افسوس آپ کو نہیں، ہمیں ہونا چاہیے بی اماں" ناہید رندھے گلے سے بولی: "کہ ہمیں سبق دینے کے لیے آپ اپنے زیورات سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

"نہیں بچی۔" بی اماں زیر لب مسکرا دیں: "ایک تار بھی کہیں نہیں کھویا۔ وہ تو میں جس دن ان لڑکیوں کے آس پاس بچوں شہد ڈن کو دیکھتی تھی تو جان بوجھ کر کچھ نہ کچھ زیور چھپا دیتی تھی تاکہ تم لوگ اس طرح زچ ہو جاؤ تو لوہا گرم دیکھ کر میں آخری وار کر سکوں ورنہ ایسے تو تم لوگ میرے اعتراضات کو ایک کان سن کر دوسرے سے اڑا دیا کرتے تھے۔"

"ہاں بی اماں" ناہید و تبریز شرم سے گڑ گئے: "انجانے میں ہم نے نوکروں سے کیا کچھ نہیں کہا۔"

"اس کے لیے تم شرمندہ نہ ہو بچو۔" بی اماں شہد گھلے لہجہ میں بولیں "جب جب تم لوگوں نے کسی ملازم کو پھٹکارا تب تب میں نے ان سے معافی مانگ کر ان کی مالی مدد کی ہے۔"

"یعنی آپ خون بہا ادا کرتی رہیں۔" بی اماں کے دلار پا کر تبریز نے لاڈ میں آکر فقرہ کسا۔

"خون بہا تو نہیں" بی اماں نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "ہاں یہ دیکھا چور رہا پر برا ہو" والی مثل تم لوگوں کی وجہ سے عملی طور پر صادق آتے دیکھی۔ کیوں ناہید جان۔ پھر کبھی رفیقن کو چور کہو گی؟"

"ادل ہوں بی اماں"۔ ناہید شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی کھسیا کر بھاگنے لگی تو بی اماں نے ایک دم سنجیدہ ہو کر تبریز کو مخاطب کیا: "کیا زندگی میں پھر مجھے ایسا کوئی ڈرامہ کرنا پڑے گا تبریز؟"

"نہیں اماں" تبریز نے بی اماں کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے خجالت سے کہا "ایسی غلطی پھر کبھی نہیں ہوگی آپکے اس طریقے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اتنے خطرناک مسئلہ کو معمولی کبھی نہیں سمجھوں گا۔"

"خدا کرے تم ثابت قدم رہو۔" بی اماں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے دھیرے سے کہا: "اور خداوند کریم تم جیسے تمام ناعاقبت اندیش والدین کو نیک توفیق دے ورنہ میں خلاف فطرت اپنی بدسلوکی پر تاحیات نادم ہونگی۔"

افسانہ

دلدل

(آس محمد ٹیٹاگڑھ)

"ارے اماں ۔ ! آج اتنی جلدی کیسے آگئیں ؟"

اچانک اپنی ماں کو آنگن میں دیکھ کر اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ذہنی طور پر وہ سٹپٹا گیا تھا۔

"کیا کہوں بیٹے ۔ ! دکاندار کے یہاں مال جام پڑا ہے اس لئے کل اس نے بیڑیاں نہیں لیں"

مقصود اپنے والدین کی منتوں اور مرادوں کا تنہا نورِ نظر تھا۔ وہ اپنے والد کے ارمانوں کا سہارا اور اپنی ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس سے قبل کی کئی اولادیں بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے چکی تھیں، اس لئے مقصود کی ناز برداری، لاڈ و پیار اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل کے لئے ماں اور باپ دونوں ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ والدین کے بے جا لاڈ پیار سے اس کے علم و ہنر کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ بچپن نکمے لڑکوں کی صحبت میں گذرا تھا۔ کھانا، کھیلنا اور بے مقصد گھوم پھر کر پیسے خرچ کرنا ہی اسکی زندگی تھی۔ اور اسی دائرے میں گھومتی ہوئی جوانی اس کا پیچھا کرتی رہی۔ اس کا جیب خرچ بھی فضول خرچی اور بڑھتی ضرورتوں کے ساتھ بڑھتا رہا اور جب یہ بوجھ اس کے والد سلطان میاں کی بساط کے باہر ہونے لگا تو انھیں احساس ہوا، لیکن وہ اب کر بھی کیا سکتے تھے۔

ارشد بیڑی کا کاروباری تھا۔ اس کے کارخانے میں تیس چالیس کاریگر بیڑیاں بنانے پر ملازم تھے۔ ان کے علاوہ اکثر عورتیں اپنے گھروں میں بیڑیاں بنا کر اس کے یہاں فروخت کر دیا کرتی تھیں۔ سلطان میاں بھی اسی کارخانے سے منسلک تھے یہاں سے جو کچھ ملتا، اسی سے گھریلو اخراجات اور مقصود کی خواہشات پوری ہوتی تھیں۔

محدود آمدنی اور لامحدود اخراجات انسان کو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں، یا پھر گھروں کی خواتین نوکری کرنے یا گھروں ہی میں کام کر کے آمدنی میں اضافہ کرنے کی خاطر باہر نکلنے پر مجبور ہو کر بے پردگی اور معاشرے کی بدنامی میں اضافہ کرتی ہیں۔ سلطان میاں کی نیک اور پارسا بیوی بھی شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لئے گھر میں بیڑیاں بنانے لگی تھی۔ جس کے لئے اسے گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ سلطان میاں یہ ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے کہ ان کی بیوی بھی بیڑیاں بنانے لگی ہے، اس لئے یہ کام مقصود کی ماں چھپا کر کرتی اور راشد میاں کی دوکان پہنچا کر کچھ کما لیتی تھی۔

مقصود کی جوانی مردانہ حسن کا ایک نمونہ تھی۔ کسی بھی حسینہ کو راغب کرنے کے لئے اس کے خد وخال، سڈول جسمانی ساخت اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں کافی تھیں۔ اس کے منچلے اور عیاش دوستوں کو اس کی موجودگی سے نت نئی گرل فرینڈس سے دوستی کی پینگ بڑھانے کے سنہرے مواقع فراہم ہوتے تھے۔ نتیجہ میں وہ بھی عیاش اور آوارہ مزاج ہوتا چلا گیا اور اس کے والدین تماشائی بنے رہے، لیکن پانی سر سے اونچا ہوتے دیکھ کر انھوں نے اسی میں مفر سمجھی کہ اس کی شادی کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ بیوی کا جوا کندھے پر رکھا جائے گا تو خود بخود راہ راست اختیار کر لے گا۔ اور واقعی انوری سے شادی کے بعد مقصود کی زندگی میں تبدیلی پیدا ہو چلی تھی۔ اس کی آوارگی اور اوباشی میں ایک کمی پیدا ہو گئی تھی۔ والدین خوش تھے کہ ان کا ارمان بھی پورا ہو گیا تھا اور اپنے فرض سے بھی عہدہ برآ ہو گئے تھے۔ مقصود کے کردار کی تبدیلی گویا ان کی کامیابی تھی۔ اب وہ کمتر ہی باہر نکلتا تھا۔

انوری بھی خوش تھی کہ ایسا جوان رعنا شوہر اسے آسانی سے مل گیا تھا جو بظاہر اس پر پروانہ وار فدا ہوتا رہتا تھا۔ اس کی کنواری رشتے دار لڑکیاں اور پڑوسنیں اس پر رشک کرنے لگی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انوری کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کے ساس سسر اپنی گاڑھی کمائی سے گھر کا خرچ چلاتے تھے اور مقصود گھر ہی میں رہ کر اس کی جوانی پر گویا منڈلایا کرتا تھا۔

عورت اپنے شوہر کے پیار کی پرستار ہوتی ہے مگر اسکی

کمائی کی انتہا بھی اس کے پیار کا ایک جز ہے جس پر اس کا حق ہوتا ہے۔ وہ سوچتی رہتی کہ اگر اس کی بوڑھی ساس اور ضعیف العمر دمہ کے مریض سسر کی آنکھیں بند ہوگئیں تو مستقبل ایک المناک تاریکی میں بدل جائے گا۔ وہ اپنے شوہر کے لاابالی پن کو کیا کرے؟ اپنے مجازی خدا پر حکمرانی کیسے کرے؟ اس کی سسرال ہی تو اس کا اپنا گھر تھا جس کے لئے اس نے نہ جانے کتنے سہانے سپنے دیکھ رکھے تھے، اپنے سنہرے خوابوں کی تعبیر کے لئے وہ فاقے کر سکتی تھی مگر گھر یلو تلخی اسے گوارہ نہ تھی۔ لیکن مقصود کی بے کاری اور بے فکری کو محسوس کر کے کبھی کبھی وہ ہنسی ہنسی میں اشارتاً اسے کمانے کی ترغیب دیتی رہتی جسے وہ ٹال دیا کرتا ——— اس کا ٹالنا اس کے ذہن میں کانٹے کی چبھن سے کم نہ ہوتا، مجبوراً فرصت کے اوقات میں وہ بھی اپنی ساس کے ساتھ بیڑی بنانے کا کام سیکھتی رہی کہ نہ جانے کل کیا ہو جائے۔

روز افزوں گرانی کے پیش نظر دوسرے صنعتی اداروں کی طرح بیڑی مزدوروں نے بھی اپنی مانگوں کا نعرہ بلند کیا۔ یونینوں نے ہڑتال کرا دی۔ مالکان آسانی سے تو مطالبات مانتے نہیں۔ ارشد کی فیکٹری بھی بند ہوگئی۔ ایسی صورت میں جو لوگ کام کرنا بھی چاہتے ہیں یونین اور اس کے ہمنواؤں کے ڈر دباؤ کے باعث کام نہیں کر پاتے۔ اسٹرائک مہینوں چلتی رہی۔ مقصود کے باپ بیکار ہو گئے۔ ان جو کچھ کما لیتی تھی وہ سلسلہ بھی بند ہو گیا، اس طرح گھر پر بے روزگاری، فاقہ مستی اور پریشانی کے بادل چھا گئے، جو دن بدن گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

لگاتار ہڑتال کی طوالت نے سلطان میاں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ لڑکے کی شادی پر لئے گئے قرضوں کے ناقابل برداشت تقاضے ہوتے رہے، مکان کا کرایہ، مہمانوں کی آمد اور چھوٹی موٹی بیماریوں کی ہلکی پھلکی ادویات اور گھریلو اخراجات بار گراں ہو گئے۔ بیٹے کی شادی میں ملے جہیز اور بہو کے گہنے گذرتے لمحات کی طرح ایک ایک کر کے سرکتے رہے شبنم سے قطرے نمی تو ہو سکتی ہے مگر آبیاری ممکن نہیں۔ اتنی ساری پریشانیوں کے باوجود۔ بے حس مقصود کی بے فکری اور بے کاری حسب معمول قائم و دائم رہی مستزاد یہ کہ انوری کے قرائن نے واضح کر دیا کہ وہ امید سے ہے۔ اس علم کے بعد گھروں میں خوشیاں منائی جانے لگتی ہیں۔ آنے والے مہمان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن مقصود کے گھر میں اس سے افکار و آلام کا اضافہ ہو گیا۔ بڑھیا بڈھے یہ سوچنے لگے کہ اس فاقہ مستی میں وہ اپنے حوصلے کیسے نکالیں گے۔ بیکاری نے نان شبینہ کے لئے محتاج بنا دیا تھا۔ کوئی اور کام کرنا اس ضعیفی میں سلطان میاں کے لئے ممکن نہ تھا۔ مقصود ہاتھ پیر ہلانے کا عادی ہی نہ تھا۔ بیوی کے پیر بھاری ہونے کے علم نے اس کی عیاشانہ ذہنیت کے تحت اسے بیوی سے بیگانہ بنانا شروع کر دیا۔ اب وہ گھر سے راہ فرار اختیار کرنے لگا۔ کبھی دن دن بھر باہر رہتا۔ کبھی کبھی راتوں کو بھی غائب رہتا۔ اس کے ان اطوار سے انوری کا دل ڈوبنے لگا تھا لیکن نیک و پارسا بیوی کی طرح وہ ضبط و صبر سے کام لیتی رہی۔

انوری اپنی سسرال کے تینوں افراد کے حالات، خیالات اور جذبات سے واقف تھی، اس پر جان چھڑکنے والے ساس سسر سے گہری ہمدردی تھی اس لئے کہ انھوں نے کبھی اسے ترچھی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ البتہ مقصود سے اب اسے نفرت سی ہونے لگی تھی، اس لئے کہ اس مشورے نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی تھی کہ وہ اسقاط حمل کرا دے اسے اولاد کی خواہش نہیں ہے۔ انوری نے اس کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا تھا اور جواباً مقصود نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔

تنہائی میں وہ طرح طرح کی باتیں سوچتی رہتی اور جب ذہن زیادہ تھک جاتا تو لاجو سے باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ لاجو مالک مکان کی بیٹی تھی۔ وہ سبھی کرایہ دار عورتوں سے بڑی خوش خلقی سے ملتی تھی۔ عمر کی مناسبت سے اپنا رشتہ قائم کر چکی تھی۔ اپنی بڑی والی خالہ کے ناطے سے مقصود کو بھیا اور انوری کو بھابی کہتی تھی ——— اس کی ہم عمر ہونے کی وجہ سے اس سے سکھیوں کا سا دوستانہ سلوک کرتی تھی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ اس سے حسد بھی کرتی تھی۔ مقصود کی جوانی اس کی نگاہوں میں عرصے سے بسی رہتی تھی، لیکن اچانک ہی انوری سے رشتہ طے ہو گیا اور اس طرح کہ جٹ منگنی پٹ بیاہ۔ انوری دلہن بن کر آ گئی اور لاجو دل ہی دل میں پیچ و تاب

کھا کر رہ گئی، لیکن انوری کیا کسی کو بھی اس کے احساسات کا علم نہ ہو سکا۔
انوری سے وہ اس طرح گھل مل کر باتیں کرتی تھی کہ وہ اسے اپنی سچی ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی اپنے درد دکھ بھی اس سے بیان کر جاتی تھی۔
اسی لئے لاجو کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ مقصود کی دلچسپی انوری سے اب کم ہو گئی ہے۔
اسی درمیان انوری کی ماں نے آکر خواہش ظاہر کی کہ ان کی بیٹی کی پہلی اولاد انھیں کے گھر ہونی چاہیئے۔ اس درخواست نے مقصود کے والدین کو ایک کربناک کوفت سے بچا لیا تھا اور مقصود کو مکمل آزادی بخش دی تھی۔

انوری اپنے ماں باپ کے پاس جا کر ایک گول مٹول بچے کی ماں بن چکی تھی۔ اور اب اسے لے کر سسرال آنے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ کسی نے اسے یہ خبر دی کہ لاجو مقصود کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس کے بعد کس منہ سے مقصود کے والدین اسے گھر لاتے اور کیسے اس کے ماں باپ اسے رخصت کرتے۔ بچے کی ولادت سے جو خوشی انھیں ہوئی تھی وہ غم و الم میں بدل گئی۔ مقصود کے والدین تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئے تھے، اس لئے راتوں رات دونوں بڑھیا بڈھے مکان چھوڑ کر چلے گئے۔
اور انوری اپنے سہاگ کا پھل لئے اپنے میکے میں زندگی بسر کرنے لگی۔
کئی ماہ بعد پولیس نے مقصود اور لاجو کو گرفتار کر لیا۔ بالغ ہونے کے باوجود لاجو نے جو بیان دیا وہ مقصود کے خلاف تھا، اس لئے کہ مقصود نے نہ صرف لاجو کے تمام زیور فروخت کر دیئے تھے، لاجو کو ستانے بھی لگا تھا۔ عدالت نے اسے چھ ماہ کی سزا اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کر کے جیل بھیج دیا۔ جرمانے کی رقم ادا کرنے والا بھی کوئی نہ تھا، اس لئے سزا میں چھ ماہ کا اضافہ ہو گیا۔ انوری کا سہاگ چھیننے والی لاجواب خود بھی دلدل میں پھنس گئی تھی۔

لطیفے

• نوجوان لڑکی نجومی کے پاس قسمت کا حال معلوم کرنے گئی۔ نجومی نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اندازے سے بتانا شروع کیا "تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہوگی۔ وہ جوان خوبصورت اور پرکشش شخصیت کا مالک ہوگا۔
"اور دولت مند بھی؟" لڑکی نے سوال کیا۔
نجومی بولا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی عمر صرف پچیس سال ہوگی۔
لڑکی خوشی سے بے قابو ہو کر بولی۔ اب مجھے یہ بھی بتاؤ کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس طرح پیچھا چھڑا سکتی ہوں۔

• ایک شوہر صاحب جب دفتر جانے لگے تو ان کی بیوی نے ایک مشہور ہیئر آئیل کی شیشی ان کے ہاتھ تھما دی۔ شوہر نے حیرانی سے شیشی کو دیکھا اور بیوی سے بولے "یہ کس لیے؟"
بیوی سنجیدگی سے بولی "یہ آپ کے لیے نہیں بلکہ اس کے لیے ہے جس کے بال آج کل آپ کے کوٹ پر بہت جھڑنے لگے ہیں۔"

• ایک دن ملا نصیرالدین کے ہمسایہ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ملا اس کے جنازے میں شریک تھا اور رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ کسی ناواقف نے پوچھا: "جناب کیا یہ آپ کی بیوی کا جنازہ ہے؟"
ملا نے کہا: "رونا تو اسی بات کا ہے کہ اس کا جنازہ نہیں ہے۔!"

• ایک عورت ہتھیاروں کی دوکان پر گئی۔ دوکاندار پستول دکھا کر کہنے لگا: "چھ شاٹ والا پستول ہے، یہ لے لیں۔"
عورت: (دلچسپی سے) "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے چھ شوہر ہیں؟"

• ننھے رضی کے والدین نے اپنی خالہ اور خالو کو کھانے پر بلایا۔ کچھ دیر بعد رضی اپنی خالہ سے بولا۔ کیا آج کھانے کے بعد بھی آپ خالو کو نچائیں گی!
خالو جان اس بات پر بہت جھلائے۔ رضی کی امی جان نے کہا "چپ" تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ یہ ناچتے ہیں۔؟
رضی نے جھٹ جواب دیا "آپ نے ہی تو کہا تھا کہ نسرین خالہ خالو کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔"

• ضرورت رشتہ

نہایت سلیقہ مند، قبول صورت اور اعلیٰ خاندان ایک شیعہ اثنا عشری انٹرمیڈیٹ پاس اٹھارہ سالہ لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے۔ لڑکا سید یا مغل ہو سرکاری ملازم ہو یا تجارت کرتا ہو یا کسی غیر ملک میں برسرکار ہو۔ تعلیم یافتہ اور ۳۰ سال سے کم عمر کا ہو۔ لڑکی سہارنپور میں رہتی ہے، لیکن رشتہ دوسرے شہر کا بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی۔ پتہ: معرفت نسیم [illegible] حریم لکھنؤ

افسانہ

نیا روپ

نجمہ بیگم کاکوروی

موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ عاشی کا دل چاہ رہا تھا۔ اسی وقت روبی سے ملنے جائے مگر مجبوری تھی کوئی ساتھ چلنے والا نہ تھا۔ بوا شکورن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اکیلے جاتے ڈر لگتا تھا ویسے روبی کا گھر دور نہ تھا روبی اس کے سگے ماموں کی لڑکی تھی ہم سن تھی اور ہم مزاج بھی۔ کل ہی احسان کا خط آیا تھا اس کے ابو کے نام جس میں اس کے ایک مہینے بعد آنے کی خبر تھی۔ پورے دو سال بعد آرہے تھے۔ منگنی کی وہ رات عاشی کو اب بھی یاد تھی جب احسان نے انگوٹھی پہناتے وقت آہستہ سے کہا تھا میرے آنے کا انتظار کرنا عاشی ورنہ تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ عاشی نے شاید آنکھوں سے وعدہ کیا تھا۔ ابھی وہ خیالوں کی دنیا میں گم ہی تھی کہ اچانک کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہاں کیا کر رہی ہیں محترمہ عاشی۔

"ارے روبی تم عاشی ہنستی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ اچھا اب کوئی نئی خبر سناؤ روبی صوفے پر لیٹتے چلی تھی کی عاشی نے اسے پھر کھڑا کر دیا۔ واقعی نئی خبر ہے سنوگی تو خوش ہوجاؤ گی۔

تو پھر جلدی سے بتاؤ کونسی نئی خبر ہے۔

احسان کا خط آیا ہے۔ ایک مہینے بعد آنے والے ہیں ہائے اللہ تب تو تم جلد ہی پرائی ہوجاؤ گی۔

چل ہٹ عاشی کا چہرہ گلابی ہوگیا۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد روبی نے کہا اچھا اب میں چلی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شام کا کھانا پکانا ہے۔ اور ہاں سنو میرا سوٹ جلدی سی دینا۔ خدا حافظ۔

رفتہ رفتہ دن گزر گئے۔ احسان کے آنے میں دو دن باقی تھے۔ عاشی کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل تھا پورے گھر کی صفائی کر چکی تھی ؟ احسان کیلئے کمرہ ٹھیک کر دیا تھا، اپنے کاڑھے ہوئے بیڈ کور بچھا دئے۔ ضروریات کا سامان قاعدے سے سجایا۔ اس کے اسی سگھڑاپے پر ہی تو احسان اسے پسند کر کے اس پر ہزار جان سے فدا ہوگئے تھے۔ اور چچا جان سے ان کی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا۔ شوخ اور آزاد طبیعت کی لڑکیاں تو انھیں پسند ہی نہ تھیں۔

بیٹی عاشی کیا کر رہی ہو ذرا کچن میں جا کر دیکھ تو بوا نے سب کچھ تیار کرلیا ہے کہ نہیں تمہارے ابو اور خاں صاحب اور ڈاکٹر شکیل گئے ہیں احسان کو لینے آتے ہی ہوں گے۔ اسی وقت ہارن کی آواز آئی۔ اسے سنتے ہی صفیہ بیگم دروازے کی طرف لپکیں۔ بوا بھی کچن سے نکل آئیں مگر عاشی اپنے کمرے میں گھس گئی ہاتھ پیر قابو میں نہیں تھے۔ دل دھک دھک کر کے سینے سے باہر نکلنے کو بیقرار تھا۔

صفیہ بیگم نے لپک کر احسان کو گلے لگا لیا۔ احسان نے بجائے احترام سے سلام کرنے کے بجائے بس ہکی سی اڑادی اور بولے ارے چچی جان آپ دبلی کتنی ہوگئی ہیں۔

بیٹا میرا اب بڑھاپا ہے۔ دبلی نہیں تو کیا موٹی ہوں گی۔ خیر آؤ چلو اندر چل کر ہوا میں بیٹھو۔ نگوڑی گرمی ہے کہ قلب اُلٹائے دے رہی ہے۔ احسان نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ چچی موسم تو لندن کا شاندار ہوتا ہے۔ ہندوستان بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔

عاشی کی امی نے کہا چل ہٹ، لندن کی تعریف کرتا ہے۔ ارے بیٹے کیا تو نے پڑھا نہیں کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

"ارے چچی جان، یہ تو شاعری ہے، آپ نے لندن دیکھا نہیں ورنہ یہ شعر نہ پڑھتیں" کہکر احسان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

عاشی کی امی نے کہا خدا نہ دکھائے لندن سجھے" جو اپنے وطن کو نظروں سے گرا دیتا ہے۔

اچھا چچی جان اب کچھ کھلائیے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ اور ہاں وہ عاشی کہاں ہے چچی۔

گھر ہی میں ہے۔ شرم کی وجہ سے نہیں آرہی ہے تم کیا یہ بھول گئے کہ منگنی ہو جانے کے بعد ہمارے یہاں کی لڑکیاں شرمانے لگتی ہیں۔ منگیتر کے سامنے نہیں آتیں۔

"مگر چچی جان" احسان نے کہا "لندن میں تو منگنی کے بعد لڑکیاں اور لڑکے کورٹ شپ منانے لگتے ہیں۔

"یہ کورٹ شپ کیا چیز ہوتی ہے" عاشی کی امی نے حیرت سے پوچھا

ارے چچی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں آزادی کے ساتھ گھوم پھر کر ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں کہ ان میں نبھ سکے گی۔ یا نہیں۔

عاشی کی امی نے حیران ہو کر کہا "بیٹا! خدا نہ کرے کہ ہمارے یہاں کی لڑکیاں بھی ایسا ہی کرنے لگیں، یہ تو بڑی بے شرمی کی بات ہے"

"نہیں چچی" احسان نے کہا "یہ تو بہت اچھا قاعدہ ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند نہ کیا تو منگنی فسخ ہو جاتی ہے۔ ناپسندیدہ شادی کرنا تو ایک طرح کا گناہ ہے۔

عاشی کی امی نے دل برداشتہ ہو کر کہا تب تو بیٹا ہم سب ہی گنہگار ہیں نہ تمہارے امی ابو نے ایسا کیا تھا نہ میں نے اور تمہارے چچا نے"

"وہ اور وقت تھا چچی جان" احسان نے کہا "اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب وہ پرانی باتیں نہیں چل سکتیں۔ دیکھئے تو انسان کتنی ترقی کر گیا ہے"

عاشی کی امی نے کہا "تو کیا ترقی کا مطلب یہ ہے کہ انسان شرم حیا سب کچھ چھوڑ دے، تم تو ایسے نہیں تھے بیٹا۔ تمہیں تو بے پردہ اور آزاد لڑکیوں سے نفرت رہا کرتی تھی"

احسان نے کہا "بیشک رہتی تھی، لیکن جب میں نے لندن میں رہ کر وہاں کی آزادی کو قریب سے دیکھا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب میرے خیالات بدل گئے ہیں ——"

اسی وقت عاشی کے ابو اور ڈاکٹر شکیل بھی آگئے جو احسان کا سامان وغیرہ موٹر سے نکال کے رکھ رہے تھے۔

"ارے تم نے ابھی تک غسل بھی نہیں کیا بیٹے" عاشی کے ابو نے کہا

"وہ" میں چچی کی باتوں میں الجھ گیا تھا، کہتا ہوا احسان غسل خانہ میں چلا گیا۔

رومی آتے ہی عاشی کے کمرے میں چلی گئی۔ عاشی کسی چور کی طرح چھپی بیٹھی تھی۔ رومی نے کہا "ارے تم یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ احسان نے گھومنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تم کو بھی تو ساتھ ہی چلنا ہے۔

"میں کیسے جا سکتی ہوں" عاشی نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

پھوپھا ابا نے اجازت دے دی ہے۔ رومی بولی۔

عاشی نے کہا "تعجب ہے ابو نے کیسے اجازت دے دی۔ مجھ سے تو ان کے ساتھ نہ جایا جائے گا۔ بس تم ہی چلی جاؤ ان کے ساتھ۔ مجھ سے ایسی بے غیرتی نہ لادی جائے گی۔

"تم تو ایسی خوفزدہ ہو جیسے کہ احسان بھائی تمہیں کھا جائیں گے۔ یہ سب ان کی منشا کے مطابق کیا جا رہا ہے، لندن میں رہ کر وہ آزاد خیال بن گئے ہیں۔ کیا تم نے ان کی باتوں سے محسوس نہیں کیا۔

اچھا بھئی، ہمت کروں گی عاشی بولی۔

دوسرے دن احسان نے جلدی سے ٹیکسی منگوائی ڈاکٹر شکیل بھی آگئے۔ رومی بھی دھانی جوڑا پہنے تیار تھی عاشی نے گلابی جوڑا اور کالا برقع پہنا لیکن جیسے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے نکلی احسان نے کہا "ارے۔ تم تفریح کرنے جا رہی ہو پھر یہ برقع کیسا۔ عاشی خاموش رہی، لیکن شکیل صاحب نے کہا برقع شریف عورتوں کی پہچان ہوتی ہے"

ٹیکسی ایک ہوٹل کے پورٹیکو میں رکی تو احسان نے کہا "خدا کے لئے یہاں تو برقع اتار ہی دو۔ کیا کہیں گے ہوٹل والے کہ کیسے غیر مہذب ہیں یہ لوگ۔ آخر رومی بھی تو لڑکی ہی ہے۔ اسے دیکھو۔ کتنی کلچرڈ لگتی ہے۔

شکیل حیران حیران سے احسان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں احسان کا انداز گفتگو پسند نہ آیا، لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ آخر عاشی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس ہوٹل میں مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھائے گی۔

احسان نے کہا "شادی کے بعد کیا کرو گی —— میں تمہیں پردے کی بوبو بنا کر تو رکھ نہیں سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ کلب گھروں، ہوٹلوں، پارٹیوں اور جلسوں میں بے پردہ جانا ہوگا۔ پھر کیا کرو گی۔

عاشی ان باتوں کا بھلا کیا جواب دیتی۔ خاموش ہی رہی، لیکن ڈاکٹر شکیل نے کہا "احسان! ہم لوگ تفریح کرنے نکلے تھے نہ کہ لڑنے جھگڑنے۔ یہ جگہ ایسی باتوں کے لئے موزوں نہیں۔ یک بیک کوئی بھی مشرقی لڑکی اتنی آزاد خیال نہیں بن سکتی۔

احسان بولا "یہی حال رہا تو ہندوستان کبھی ترقی نہ کر سکے گا۔ میں تو ایسی عورتوں سے نباہ کر ہی نہیں سکتا۔ خیر تم ایسا کرو شکیل کہ انھیں گھر واپس لے جاؤ۔ میں شام تک آؤں گا، میں نے مس رینا سے پکچر چلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے ساتھ فلم دیکھ کر لوٹوں گا۔

شکیل نے لاکھ سمجھایا، لیکن احسان نے اسکی بات نہیں مانی، مجبوراً شکیل عاشی اور روبی کو لے کر واپس آگیا

احسان کی آزادیاں بڑھتی رہیں۔ وہ عاشی سے بے تعلق سا ہوگیا تھا۔ عاشی بھی اب اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ احسان کو لندن کی آب و ہوا نے گمراہ کر دیا ہے۔ جس انداز میں اس کی پرورش ہوئی تھی اس کے بعد وہ اپنے کو احسان کی پسند کے مطابق تبدیل نہ کر سکتی تھی اس نے ایک روز روبی سے کہا کہ وہ کسی طرح امی اور ابو سے کہدے کہ وہ شکیل کے ساتھ شادی نہ کر سکے گی ـــــ لیکن روبی کو عاشی کے ان خیالات کے اظہار کی ضرورت نہ پڑی۔ خود احسان نے ہی چچا کے نام ایک خط لکھکر ان پر واضح کر دیا کہ ان کے احسانات کے باوجود وہ ان کی دقیانوسی بیٹی سے شادی نہ کر سکے گا جس کا اسے افسوس ہے۔

احسان کا خط بجلی کی طرح عاشی کے ابو پر گرا۔ ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہوگیا۔ انھوں نے بیوی سے تذکرہ کیا تو وہ یہ سن کر بیہوش ہوگئیں۔ سارا خاندان جانتا تھا کہ احسان اور عاشی کی منگنی ہو چکی ہے۔ رسم و رواج کے تحت یہ بڑی بدنامی کی بات تھی۔ کئی روز تک گھر میں صف ماتم بچھی رہی۔ عاشی کو بھی اس کا علم ہوگیا تھا، لیکن اسے کوئی غم نہ ہوا، وہ احسان کی باتوں سے سہمی ہوئی تھی۔ اسے خیال تھا کہ اس کے والدین اسے احسان کے پلے باندھنے سے گریز نہ کریں گے۔ انھیں خاندانی روایات کو توڑنا پسند نہ آئے گا، لیکن خود احسان ہی نے انکار کر کے اس کی فکر و پریشانی کو دور کر دیا تھا۔

ڈاکٹر شکیل بچپن ہی سے ان کے گھر آتا تھا۔ وہ عاشی کو پسند بھی کرتا تھا، لیکن اسے معلوم تھا کہ عاشی کی منگنی احسان سے ہو چکی ہے اس لئے اس نے ایسی بات کبھی نہ سوچی کہ وہ اس سے شادی کر لے گا، لیکن اس علم کے بعد کہ احسان نے چچا کے احسانات کو پس پشت ڈالکر شادی سے انکار کر دیا ہے تو اسے بہت دکھ پہنچا۔ ساتھ ہی اس نے سوچا کہ شاید وہ عاشی کو اپنا سکے جو اسکی آئیڈیل تھی

غم و الم کی سنگینی دیکھ کر اس نے ایک روز مرزا صاحب کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا "چچا جان اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کی موجودہ فکریں دور ہو سکتی ہیں۔

احسان کے ابو نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ کیا مطلب ہے تمہارا" شکیل نے سر جھکا کر نگاہیں نیچی کئے کئے کہا۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیں۔ یہ میری خوش بختی ہوگی اگر آپ اسے منظور فرمالیں گے۔

خود مرزا صاحب اور عاشی کی امی بھی ڈاکٹر شکیل کو بیحد پسند کرتی تھیں، لیکن ایسی بات انھوں نے کبھی نہ سوچی تھی۔ خود شکیل کی زبانی اس خواہش کے اظہار نے ان کے تفکرات دور کر دئے۔ شکیل ہر اعتبار سے عاشی کے لئے موزوں تھا، اس لئے انھوں نے کہا "بیٹا! عاشی سے بھی اس سلسلہ میں بات کرنا ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اسے یہ بات معلوم ہے کہ وہ احسان کی منگیتر ہے۔

"ضرور ضرور" شکیل نے کہا "یہ تو بہت ضروری ہے۔ بہرحال میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا ہے، عاشی سے آپ دریافت فرمالیں۔

عاشی کی ماں نے روبی کے ذریعہ عاشی کی رائے معلوم کی۔ عاشی کو بھی شکیل ہر اعتبار سے پسند تھا، لیکن ایک مشرقی لڑکی ہوتے ہوئے اسے جو روحی تعلق تھا احسان سے وہ اس کی ترقی پسندانہ باتوں اور شادی سے انکار کرنے کے باعث دل شکستہ ہوگئی تھی اور پھر قلبی تعلق کے باوجود اپنی زندگی اسے سونپنے پر تیار نہ تھی، اس لئے شکیل کی پیش کش کو اس نے قبول کر لیا اور اس کی بن گئی۔

بزم تسنیم

اس عنوان کے تحت حرمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہوسکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف مختصر الفاظ میں لکھی جائے خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کریں کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائیں ۲۰ کے بعد آنے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• میرے کرم فرما اسرار مسعود صاحب (بھوپال) کی نواسی بیٹی مسز رضا بلقیس صدیقی سلمہا اللہ تعالیٰ (بھوپال) کو اللہ پاک نے ۱۵ر دسمبر ۸۷ء کو دن میں ۱ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ سردست پیار کا نام بکی رکھا گیا میری دعا ہے کہ اللہ پاک اسے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔ (تسیم انہونوی)

• صفیہ ناھید (بنگلور) میری بہن خالدہ ذکریا اور بھائی جان کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲ر نومبر ۸۷ء بروز منگل بوقت ۸ بجے شب ایک دختر عطا فرمائی۔ نام ظل ہما قرار پایا۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور دین و دنیا میں سرخرو ہو۔

• کوثر ترنم صاحبہ۔ آپ کی خبر بلا نمبر خریداری و بلا ٹکٹ وصول ہوئی ہے

• درخشندہ تغزل (کانپور) میرے تایا زاد بھائی وحید احمد اور بھابی تبسم وحید (علی آباد) کو اللہ پاک نے ۲۹ر نومبر ۸۷ء کو دو بچیوں کے بعد ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر خضر عطا فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• افشاں تبسم (آنولہ) میری آپی نزاکت النساء اور بہنوئی مختار الدین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۳ر نومبر ۸۷ء بروز ہفتہ بوقت ۵ بجے عصر۔ بمقام کلکتہ ایک دختر عطا فرمائی نام شمع عرف حینی قرار پایا۔ پروردگار عالم اسے عمر دراز عطا فرمائے۔

• نگار سلطانہ جلیل قمر لطیف (آبعد) میری آپا منور سلطانہ اور بہنوئی صدیق اکبر بادشاہ (رشی وندیم) کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بار ۱۳ر نومبر ۸۷ء بروز منگل ایک دختر عطا فرمائی۔ نام منور فاطمہ عرف حافظہ آفرین رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ننھی حافظہ عکس حضرت بی بی فاطمہؓ بنے۔

• رضیہ خاتون (بنگلور) میری نواسی نیرہ اختر عرف انوری اور میرے ماموں زاد بھائی انور پاشاہ کو اللہ پاک نے پہلی بار ۴ر دسمبر ۸۷ء بروز جمعہ بوقت ۱ بجے صبح ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد معین الدین قرار پایا۔ اللہ پاک اسے والدین اور اس کے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور دین و دنیا میں سرخرو ہو۔

• کلثوم پروین زیدی (بھاگلپور) میرے چھوٹے بھائی ظفر نیازی لاری اور بھاوج راشدہ ظفر کو اللہ پاک نے ۶ر جنوری ۸۸ء کو ۸ بجے شب میں ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغامات نشاط

• مسز خادم حسین خاں (گورکھپور) میرے فرزند ارجمند امداد حسین خاں سلمہ کی شادی نکہت جہاں سلمہا دختر جناب اختر عالم مرحوم (الہ آباد) کے ہمراہ بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں ۹ر جنوری ۸۸ء کو صدیقی کنزہ پانڈے حاطہ گورکھپور میں دعوت ولیمہ دی گئی۔ میری دعا ہے کہ امداد و نکہت سلمہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• میرے دیرینہ دوست جناب عبدالحق خان (لکھنؤ) کے فرزند اکبر عزیزی انعام الحق خان سلمہ ایڈوکیٹ اناؤ کے نور نظر العبد الحق سلمہ کی شادی خانہ آبادی ترنم سلمہا دختر نیک اختر نیاز احمد صاحب لکھنؤ کے ہمراہ ۲۴ر جنوری ۸۸ء کو منور کیجن کیہند ریلوے۔ جملہ امور حسن و خوبی انجام پائی اس سلسلے میں انعام الحق سلمہ نے ۲۸ر جنوری ۸۸ء کو اپنی رہائش گاہ زیر جس اناؤ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی جس میں معززین، حاضرین اور حکام ضلع نے بھی شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (تسیم انہونوی)

• جناب شفاعت علی صدیقی سنڈیکیٹ (آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ) کے فرزند دلبند اختر اقبال سلمہ کی شادی کے سلسلے میں ہماسمین جہاں سلمہا دختر جناب امداد حسین صدیقی

محل میں آئی۔ اس سلسلے میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی جس میں خصوصیت سے شعراء اور ادبا نے شرکت کی۔ میں شفاعت صاحب اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• مجھے، این صباح (آسیور) میری سہیلی یاسمین بانو (دختر این۔ محمد سعید صاحب) کا عقد نکاح قیس احمد (فرزند این محمد زکریا صاحب) کے ہمراہ ۲۳ر دسمبر ۸۵ء بروز اتوار بمقام چوک آسیور عمل میں آیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ دونوں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• جناب اختر عالم کی دختر نیک اختر زیبا سلمہا کی شادی خالد پرویز سلمہ (فرزند عبدالغفار صاحب) کے ہمراہ ۳۱ر دسمبر ۸۵ء اختر عالم کی رہائش گاہ نیو حیدر آباد لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• عبدالباسط خاں صاحب (بھوپال بک ہاؤس بھوپال) کی دختر نیک اختر نگہت یاسمین سلمہا کی شادی راشد حسین سلمہ (پسر جناب منصور حسن) ۱۲ر جنوری ۸۶ء کی سہ پہر کو مسجد کلثوم جہاں بیگم میں نہایت سادگی کے ساتھ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• نسرین سلطانہ (بنگلور) میری بہن رحیمہ سلطانہ (دختر اے۔ آر۔ عزت شریف صاحب) کی شادی ایف۔ فیاض اللہ خاں (فرزند لطف اللہ خاں صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۳۰ر دسمبر ۸۵ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے دن بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ان کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرے۔

• ڈاکٹر اخلاق حسین عارف صاحب (لکھنؤ) کے فرزند دلبند سید خورشید اللہ رضوی سلمہ کی شادی خانہ آبادی کے سلسلے میں جو یاسمین فاطمہ سلمہا (دختر نیک اختر سید محمد ہادی رضوی ایڈوکیٹ) کے ہمراہ عمل میں آئی۔ ۱۲ر جنوری ۸۶ء کو ڈاکٹر اخلاق عارف صاحب نے اپنی رہائش گاہ احتشام نگر یادو خانہ لکھنؤ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی جس میں علمائے شہر کے ساتھ ہی شعراء اور ادبا نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• ایس۔ اے۔ رضوی صاحب۔ سکریٹری بیسک ایجوکیشن یو پی گورنمنٹ کی صاحبزادی ایس قرۃ فاطمہ سلمہا کی شادی۔ ایس علمدار حسین ایڈوکیٹ، سمداوال، اناؤ (فرزند۔ ایس زائر حسین رضوی صاحب) کے ہمراہ ۱۱ر جنوری ۸۶ء کی شب میں بمقام مفتی گنج لکھنؤ بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پر ملال کی خبریں

• آمنہ خاتون زیدی (دہلی) ۱۳ر نومبر ۸۵ء بروز سہ شنبہ بوقت ۱۱ بجے شب بمقام نویڈا (یو۔ پی) میرے بہنوئی سید منصور حسن صاحب رئیس مونی ضلع جون پور نے ایک مختصر علالت میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے پیچھے ایک بھرا پرا روتا بلکتا خاندان چھوڑ گئے

حریمی دسترخوان

باجرہ خاصیت میں گرم ہوتا ہے۔ جاڑے میں اس کا استعمال صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اسے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔

باجرے کی روٹی: باجرے کا آٹا قدرے سخت گوندھ کر اس کی ٹکیاں پکائیں توے پر اچھی طرح سینک کر، گرم گرم ترکاریوں یا اچار کے ساتھ نوش فرمائیں۔

باجرے کا ملیدہ: باجرے کی روٹیاں پکا کر اچھی طرح سینکیں اور پھر انھیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر کے پسی ہوئی شکر اور گھی ڈال کر مسل کر استعمال کریں۔ ۲۵۰ گرام آٹا ہو تو اتنی ہی شکر اور گھی کم سے کم ۵۰ گرام ورنہ ۲ سو گرام شامل کریں۔ گرم گرم کر کے ہی نوش فرمائیں۔

باجرے کی ٹکیاں: باجرے کا آٹا ۲۵۰ گرام، میدہ ۵۰ گرام، شکر پسی ہوئی ۲۵۰ گرام۔ تینوں کو دودھ میں سخت سخت گوندھ کر چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر ممکن ہو تو اصلی گھی میں ورنہ ڈالڈا یا کڑوے تیل (سرسوں کے تیل) میں تل لیں۔ ٹکیاں کافی دنوں تک خراب نہیں ہوتیں۔ اکثر لوگ شکر کے بجائے گڑ استعمال کرتے ہیں۔ میدہ صرف اس لئے ملانا چاہیئے کہ باجرے میں لس نہیں ہوتا۔ تلنے میں ٹکیوں کے بکھر جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ تلنے سے پہلے ٹکیوں میں تل لگا لیں تو لذت بڑھ جائیگی۔

حریمی دسترخوان افسوس کہ ابھی تک تیار نہ ہوسکی، جو آرڈر اس کے لئے آتے ہیں، محفوظ ہیں۔ کتاب تیار ہوتے ہی روانہ ہوگی۔

مرحوم بڑے نیک پارسا اور سادہ لوح انسان تھے۔ پروردگار عالم بہ صدقہ اہلبیت اطہار انہیں غریق رحمت کرے اور جملہ اعزا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• بہن فاطمہ ملک صاحبہ نے ڈیلی ڈس۔ انگلینڈ سے لکھا ہے کہ ان کے بھائی مرزا شبیر احمد صاحب ۶ر جنوری کو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ، کوٹلی لوہاراں میں انتقال فرما گئے۔ بہن فاطمہ ملک صاحبہ ۱۵ سال سے اپنے بھائی سے نہ مل سکی تھیں جو واقعی ان کے لئے سخت افسوسناک بات ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد بھائی رہ گئے تھے انہیں بھی اللہ پاک نے اٹھا لیا۔ میں بہن فاطمہ ملک کے غم میں شریک ہوں۔ (نسیم امہونوی)

• محمد معروف صاحب دلہہ فیکٹری یو پی اسٹیٹ کیمیکل اور پارٹنر حافظ کرلا اینڈ برادرس پرفیومرس بمبئی کے بھائی اور سسر الحاج سید محمد یونس صاحب بمقام مکہ معظمہ ۷ر جنوری ۸۵ء بروز دوشنبہ رحلت فرما گئے۔ مرحوم عشاء کی اذان سن کر اسے دہرا رہے تھے کہ دم آخر آ گیا۔ کیسی مبارک موت تھی۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم امہونوی)

• تنصیرہ تبسم وعطیہ سلطانہ (آمبور) افسوس کہ ہمارے پھوپھا جان محمد موسیٰ میاں صاحب ۲۵ر دسمبر ۸۴ء کو ۲ بجے دن میں رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے نیک، خلیق اور ہر دل عزیز تھے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

زبیرا اختر، سائرہ بانو (آمبور) نے بھی موسیٰ میاں کے انتقال کے سلسلے میں خبر بھیجی ہے۔ مرحوم ان کے نانا تھے۔

- حاجی شفیق الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ (لکھنؤ) تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں ایک طویل علالت کے بعد گذشتہ ماہ جنوری میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ہائی کورٹ میں دیوانی کے قابل ترین وکیل تھے لکھنؤ کے متعدد دینی تعلیمی اصلاحی اور ملی اداروں سے ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے اس لیے ان کا شمار لکھنؤ کے معزز ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ (نسیم امہونوی)

• اردو دنیا کی مشہور ترین شخصیت پروفیسر مجیب صاحب کا بھی جنوری ۸۵ء میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم بیک وقت عالم، استاد، ادیب اور مورخ تھے۔ اردو دنیا کو مجیب صاحب کے انتقال سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

• مشہور طنز و مزاح نگار جناب وجاہت علی سندیلوی ایڈوکیٹ سندیلہ ہردوئی کی بڑی بہن صاحبہ کا ایک طویل علالت کے بعد ۲۳ر جنوری ۸۵ء کو انتقال ہو گیا۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نسیم امہونوی۔

اقوالِ زرّیں

• بڑائی غصہ دکھانے میں نہیں، ضبط کرنے میں ہے • خاموشی غصہ کا بہترین علاج ہے • جہاں غصہ ہے وہاں تباہی ہے • غصہ انسانی عقل کو کھا جاتا ہے • غصے میں اپنے دل کی بات کہنے کے بجائے انسان دوسروں کی دل آزاری کرتا ہے۔ (مرسلہ حمیرہ تسنیم گوہر تاج۔ آمبور)

• زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

• زبان وہ درندہ ہے، جسے اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو دوسروں کو کاٹ لیتا ہے • زبان کی تیزی اس پر نہ آزماؤ جس نے تمہیں بولنا سکھایا ہے • انسان زبان کے پردے میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت پہچانا جاتا ہے جب وہ بولتا ہے۔ (مرسلہ جاوید احمد۔ لکھنؤ)

• نہ اتنا میٹھا بن کہ دوسرے تم کو نگل جائیں، نہ اتنے کڑوے بنو کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔

• نہ اتنا نرم بنو کہ تمہیں نچوڑ لیا جائے، نہ اتنے سخت ہو کہ توڑ دیے جاؤ۔

• حالات مساعد ہوں یا نا مساعد، فرض بہرحال فرض ہوتا ہے
• جہاں ذمہ داری کا مسئلہ ہو وہاں کسی مصلحت کی پروا نہ کرنا چاہیے
• جو صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائے، اس کا خیر مقدم خلوص اور گرمجوشی سے کرو • عذر اور پیمان شکنی بدترین جرم ہیں۔ (مرسلہ گمنام)

• اگر آپ جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع پہلی تاریخ تک دفتر میں آ جانا چاہیے ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً ملے گا۔

• بزم حریم کے سلسلہ میں خبر اور پسندیدہ اشعار علیحدہ علیحدہ کاغذوں پر لکھیں اور ان پر کوئی دوسری بات نہ لکھیں۔

☆ اقلیتوں کے لئے زبانی جمع خرچ نہیں

ٹھوس اقدامات

حکومت اتر پردیش اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و ترقی کے لئے نہ صرف پرعزم ہے

بلکہ پوری طرح سرگرم عمل بھی ہے اس کا ثبوت ہیں مندرجہ ذیل حقائق۔

☆ اقلیتوں کی فلاح سے متعلق آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۱۵ نکاتی پروگرام پر تیز رفتار عمل درآمد میں اتر پردیش سب سے آگے۔

☆ ممبران مجلس قانون ساز کی ایک کمیٹی بھی سرگرم کار جو اقلیتوں کے مسائل پر غور و خوض کر کے ان کے حل کے لئے حکومت کو مشورہ دیتی ہے۔

☆ اقلیتی فرقوں کی امداد کے لئے اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام۔

☆ ریاستی اقلیتی کمیشن کے زیر اہتمام ایک اقلیتی بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ

☆ مختلف ملازمتوں میں اقلیتوں کی تقرری کو یقینی بنانے کے لئے اردو اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے خالی اسامیوں کی مشتہری کا بندوبست۔

☆ اردو تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے اتر پردیش میں مزید پانچ ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ اس سلسلے میں کارروائی بھی شروع۔

☆ اردو زبان کے تحفظ و فروغ کے لئے اتر پردیش اردو اکاڈمی سرگرم کار جس کی سالانہ گرانٹ

اب ۲۳۰ لاکھ روپئے کردینے کی منظوری۔

☆ فخرالدین علی احمد میموریل سوسائٹی کے لئے سالانہ گرانٹ کے طور پر پانچ لاکھ بہتّر ہزار روپئے کی منظوری۔

☆ ایک وقف ترقیاتی اتھارٹی قائم کرنے کا فیصلہ جس کے لئے ایک کروڑ روپئے کی گرانٹ منظور اس کے علاوہ مسلم اوقات کے لئے ۲۵، ۲۷ لاکھ روپئے کی مزید امداد بھی منظور۔

☆ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے حساس ضلعوں میں حتی الامکان اقلیتی فرقے کے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کی تعیناتی۔ ایسے ضلعوں میں دیگر پولیس افسران کی تقرری میں بھی اقلیتوں کی نمائندگی کو یقینی بنانے کا فیصلہ۔

☆ پولیس میں سپاہیوں کی بھرتی کے سلسلے میں تشکیل دی جانے والی سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے کسی افسر کو شامل کرنے کا فیصلہ۔

☆ فساد زدہ علاقوں میں پی۔ اے۔ سی کی تعیناتی کا اندولہ پولیس کی روانگی کی طرح کرنے کا فیصلہ تاکہ کسی علاقے میں اگر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو اس کی نشان دہی کی جاسکے۔

☆ محکمہ اطلاعات کی جانب سے جاری کئے جانے والے اشتہارات کے مجموعی بجٹ کی ۵ فی صد رقم اردو اخبارات کے لئے مختص۔

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش لکھنؤ

وہ پریم اور پیار بھریں انگ انگ میں

ستر کروڑ لوگ ہوں سب ایک رنگ میں

نذیر بنارسی

ستّر کروڑ لوگوں کے اس ملک میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی روزمرہ کی زندگی میں نہ صرف ایک دوسرے کے مددگار ہیں بلکہ ایک دوسرے پر منحصر بھی ہیں۔ بازاروں میں، تجارت میں، کارخانوں اور صنعتوں میں، تفریح گاہوں میں میلوں ٹھیلوں میں سب شانے سے شانہ ملائے نظر آتے ہیں۔ یہ ہندو مسلم سکھ عیسائی ایکتا ہماری ثقافتی خصوصیت ہے۔ یہ ایکتا اور ہم آہنگی ہی ہماری بقا اور ترقی کی ضامن ہے اور اسی سے ہماری آزادی سالمیت اور جمہوریت بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ جو لوگ ہم میں دوری، علیحدگی اور غیریت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ہمارے ملک کے بھی دشمن ہیں اور ہماری آزادی، سالمیت اور جمہوریت کے بھی۔ ہمیں ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا ہے۔

جاری کردہ۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش لکھنؤ

دہ پارہ پارہ ہوا ناصر الدین شاہ زیادہ دیر میدان میں کھڑا نہ ہو سکے گا اور
اس آخری معرکے کے بعد وہ ایک مضبوط اور پائیدار حکومت بنائے گا۔
ابوبکر شاہ ابھی فیصلے ہی کر رہا تھا کہ ناصر الدین شاہ نے جالیسر میں اپنے اہل
و عیال اور رشتہ داروں کو چھوڑا اور چار ہزار سواروں کے ساتھ اچانک دہلی پر
حملہ آور ہو گیا ابوبکر شاہ کی فوج نے اسے روکنا چاہا مگر غضبناک ناصر الدین نے حکم
دیا کہ بداؤں دروازے کو آگ لگا دو اور شہر میں داخل ہو جاؤ۔ اور دار السلطنت
کا محاصرہ کر لو۔ ناصر الدین کی فوج نے تمام دروازوں کو آگ لگا دی اور اطراف
میں پھیل کر شہر پناہ کو گھیر لیا۔ ابوبکر شاہ کی محصور فوج اب صرف مدافعانہ
پوزیشن میں تھی۔

ابوبکر شاہ اپنے دیوان خانے میں فکر میں غلطاں بیٹھا ہوا تھا کہ شبینہ
اندر داخل ہوئی۔ ابوبکر شاہ نے نظر اٹھائی اور حیران رہ گیا۔ شبینہ مکمل طور
پر ایک سپاہی کے روپ میں کھڑی تھی۔ وہ مسکرائی اور بولی۔ "ابوبکر شاہ یہ
وقت غور و فکر کا نہیں ہے طویل محاصرہ ہماری فوج کو پست ہمت کر دے گا
اس سے پہلے ہمیں انتہائی ہوشیاری سے اس محاصرے کو توڑنا ہوگا۔ میں
نے فیروزی غلاموں میں اعلان کر دیا ہے کہ فیروز شاہی غلاموں کی جانباز دوشیزائیں
اپنی تربیت کا حق ادا کرنے کے لئے نکل آئیں۔ اسلام کے دور عروج میں ایسے
نازک موقعوں پر مسلم خواتین نے تیر و تلوار ہاتھ میں لے لیا ہے اور میدان جنگ
کی فتوحات میں ان کا بھی حصہ رہا ہے۔ دلوں کو تسخیر کرنے والی یہ خواتین ہر
میدان میں فتحیاب ہوئی ہیں۔ آج ہم شاہ ابوبکر بن تغلق کے ہمنوا،
ہم قدم اور ہم رکاب بن کر اپنے رشتہ کے دشمن پر بجلی بن کر گریں گے۔ ابوبکر
شاہ۔ باہر آؤ اور دیکھو فیروزی غلاموں کی سپاہ کا دستہ باہر تمہارا منتظر

جس میں وہ اپنے دشمن کو جلاتا ہے۔"
"نہیں اسلام خاں نہیں۔ شبینہ بے اختیار رو کر بولی اتکا بہن کی یہ
حالت اس جوش انتقام کا نتیجہ نہیں ہے۔۔۔ یہ تو۔۔۔ انھیں تو پامال کیا
گیا ہے ان پر ظلم و استبداد کا وہ حربہ استعمال کیا گیا ہے جو عورت کو
ذلالت کی اندھی کھائی میں پھینک دیتا ہے۔۔۔ بتاؤ میری اتکا بہن کون
ہے وہ۔۔۔ کون ہے جس نے تمہیں تباہ کر دیا برباد کر دیا مجھے بتاؤ۔۔۔ خدا
کے لئے۔۔۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
نوشینہ نے آنکھیں کھولیں اور مضمحل آواز میں بولی۔ "میری بہن تو بات تو
سمجھ، ہمارا مقصد انتقام تھا۔۔۔ میں حسین تھی جوان تھی۔ میرے پاس یہی تو
سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ میں میدان جنگ میں تلوار لے کر دشمن کو نہیں للکار
سکتی تھی۔"
"اف خدایا۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔ شبینہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال
مٹھیوں میں جکڑ لئے۔ اتکا بہن انتقام تمہیں دوسروں سے لینا تھا مگر تم
نے تو خود اپنی ذات کو نشانہ بنا لیا۔ مقصد براری کے لیے آبرو نہیں لٹائی
جاتی۔"
"شبینہ میں تنہا تھی، کمزور تھی، مقابلہ سخت تھا یہ سب تو ہونا ہی تھا۔
اسی لئے میں نے تجھے متنبہ کر دیا تھا کہ تجھے کبھی کسی بھی حال میں دیکھ کر چونکنا
مت۔۔۔ ہم کسی معمولی انسان سے مقابلہ کرنے نہیں نکلے تھے۔"
"تم نے اپنے والدین کی تربیت کو داغدار کر دیا۔ انھیں اللہ کے حضور
شرمندہ کر دیا۔ عیاش حکمرانوں کو زیر کرنے کا یہ بہت پرانا اور ذلیل حربہ
ہے اتکا بہن۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں جنگ اور مقابلے کی وہ تعلیم اور تربیت

دی بھی جو بے مثال تھی وہ ہمیں دو دھاری تلوار کہا کرتے تھے ....مگر... مگر
اکا بہن تم کند چھری بن کر دشمن پر گریں اور خود ہی چوٹ کھا گئیں جو کام ہمیں سکھایا
نہیں گیا تم نے اس پر غور ہی کیوں کیا۔ اس راہ پر کیوں چلیں جس کا تمہیں کوئی
علم نہیں دیا گیا تھا۔ اگر تم ہر فن سے محروم ہوتیں اگر تمہارے پاس بزرگوں کی
شجاعت کا ورثہ نہ ہوتا اگر تمہارے پاس اللہ اور رسول کے فرمان و ارشادات
نہ ہوتے اگر تمہارے پاس علم نہ ہوتا اگر تم اس حد تک تہی دست ہوتیں کہ
سوائے حسن و جمال کے اور کچھ بھی تمہارے پاس نہ ہوتا تب بھی اپنے جسم کو
کسی بدکار کا بستر بنانے سے بہتر ہوتا کہ تم خود کو ہلاک کر دیتیں۔ لیکن تم نے
تو سب کچھ ہوتے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی، اپنا گوہر شادیابھیڑیئے
کے سامنے بھیڑ بن گئیں۔ اف خدا۔ میں تمہارے جرم کو کیونکر تمہاری مجبوری
یا انتقام کہوں.... نہیں.... نہیں.... نہیں...
تو شبینہ بس روئے جا رہی تھی۔ بہن کے انداز گفتگو نے اس کا دل اور بھی
شکستہ کر دیا وہ رو کر بولی۔ "شبینہ میں زندگی کی ہر مسرت سے اب محروم ہوں
تو میرا جرم نہ دیکھ مقصد دیکھ....."

"اکا بہن یہی تمہاری بھول ہے کہ مقصد کے لیے تم نے گناہ کی راہ پسند
کی تمہیں ابھی جان کے آخری الفاظ یاد نہیں کہ تم دو دھاری تلوار ہو جس پر
گر و گی اسے نیست و نابود کر دو گی مگر یہ تلوار کہاں گرے کب گرے اور کیسے
گرے اس کا فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ اکا بہن میں بھی اسی مقصد کو لے کر
نکلی تھی میں نے اپنوں کو ساتھ لیا اور دشمن پر شب خون مارنے میں بھی جانتی
تھی کہ میرے خنجر اور تلوار اس وقت کام نہیں آ سکتی لہٰذا ذہنی جنگ کی اور
ناصر الدین شاہ کی حکومت کی بنیادوں کو کمزور کیا بار بار کی جنگوں اور شکستوں

بے باق کرنے کے لئے ہی تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں ہم
جا نہیں ہارنے کا فن جانتے ہیں اور فی الحال ہمارے مقصد سے شاہ ابوبکر واقف
ہیں۔" شبینہ کے تیکھے تیور دیکھ کر ابوبکر شاہ خفت سے ہنس پڑا۔ "ہم نے فیروز شاہی
لوگوں کو کبھی بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا وہ تو ہمارے دست راست ہیں۔
لیکن پھر بھی ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے۔ ہم سے خوف زدہ
ناصر الدین کی ہمت کس نے بڑھائی ہے۔"
"ابوبکر شاہ ___ زندگی عروج و زوال ہی سے عبارت ہے تاریخ عالم
ہمیں یہی بتاتی ہے کہ فتح کو لازوال مت سمجھو اور شکست سے بد دل نہ ہو حکومت
کرنے والے دل اور دماغ کسی امیر وزیر یا جاسوس کی دی ہوئی ہمتوں کے سہارے
آگے نہیں بڑھتے وہ خود اولوالعزم ہوتے ہیں۔ ہر حکمراں ہزاروں سپاہیوں
اور کمانڈروں کی ہمت و شجاعت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی لئے وقتی شکست اسے
بزدل نہیں بناتی بلکہ وہ خود فرار شدہ سپاہ کو بار بار حوصلہ بخشتا ہے۔ یہ
معرکہ بھی جلد یا بدیر ہونا ہی تھا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے
حوصلے ہماری ہمتیں، ہماری شجاعتیں، ہمارا اتحاد دشمن کے مقابلے پر کئی گنا
بڑھا ہوا ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ہمت و شجاعت کا پیکر بن جاؤ۔"
ابوبکر شاہ ایک بار پھر شبینہ کی باتوں کے سحر میں کھو گیا۔ وہ میدان جنگ
کا ایک عاقل کھلاڑی تھا مگر محبت کے میدان میں وہ شبینہ سے ابھی تک
مات ہی کھا رہا تھا۔
ابوبکر شاہ نے امراء سلطنت اور وزیروں سے مشورہ کر کے پھر ناصر الدین شاہ
سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ہمایوں خاں کی بزدلی اور فرار سے وہ کافی مطمئن تھا
اور شکست خوردہ ناصر الدین سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ

سے وہ ٹوٹ چکا ہے اب یا ئمار حکومت اس کا مقدر نہیں رہی وہ چند روزہ
ہے اس کا عیاش بیٹا ہماری ہیبت سے نیم جان ہے۔ ہمارے ماں باپ نے وفاداری
کی سزا پائی تھی۔ میں نے بقدرِ ضرورت وفاداری برتی اور ذہن کو جگائے رکھا۔
آنکھ بند کر کے کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا اور چوٹ وہاں لگائی کہ ایک مضبوط
حکومت کے قابل نہ رہے۔"

نوشینہ کرب سے مسکرائی اور شبینہ کا ہاتھ تھام کر چوما پھر بولی "میری چاند سی بہنا
میں یہ تو نہیں چاہتی کہ تمہاری اتنی ساری کامیابیوں میں حصہ بٹاؤں۔ مگر اب جبکہ
میں بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں اور زیادہ دن کی مہمان نہیں ہوں۔ اس دنیا
سے میرا دل بھر چکا ہے۔ مگر میں ماں باپ کے سامنے شرمندہ منہ لے کر نہیں جانا
چاہتی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی بھی حال میں دیکھ کر چونکنا مت۔ تو بہت
خوش بخت ہے لیکن خدا کے واسطے تو میری اس بات کو میری کامیابی کہہ دے
کہ.... کہ.... ہمایوں خاں کو انتہائی رنگ رلیوں میں، میں نے الجھایا، اسے
میدان جنگ سے دور میں نے رکھا، اس کی مردانگی کو میں نے ختم کیا۔ اسے تم
لوگوں سے خوفزدہ میں نے کیا۔ اسے موت کے قریب میں نے پہنچایا ہے.....
نوشینہ کا سانس پھول رہا تھا مگر وہ بولے جا رہی تھی۔ شبینہ نے اس کی باتوں کو
سن کر انکار میں گردن ہلائی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ
نکلے وہ سسکیوں کے درمیان بولی "کہہ دے شبینہ.... ایک دفعہ کہہ دے کہ
میں نے خود کو مٹا کر ظالموں سے انتقام لے لیا ہے.... میں نے خود کو تباہ کر کے
انھیں بھی برباد کیا ہے.... شبینہ بھی بہن کے ساتھ رو رہی تھی اس کے دل پر
آرے چل رہے تھے وہ دم بخود نوشینہ کا اعتراف گناہ سن رہی تھی۔ مگر
اس کی گردن مستقل انکار میں ہل رہی تھی۔ اسے نوشینہ کے طریقۂ انتقام سے اتفاق

ہماری محبت کل ہماری نگاہ جھکا دینے کا سبب بن جائے۔ وہ کھڑا ہو گیا
اور بولا ایک بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے لئے عادل، منصف بنے
ان کے غموں کا مداوا کرنے والا ہو۔ اور ان کی شکایات کا ازالہ کرے۔
تیری خواہش اگر یہی ہے تو اپنی تلوار کو آب دے لے اور اپنے اعضاء کو
پھر تیلا بنا لے شاید زندگی خود تجھ سے امتحان لینے والی ہے۔ شبینہ کے چہرے
پر اطمینان تھا۔

———•———

اسلام خاں کے اشارے پر ناصر الدین شاہ نے کمر ہمت پھر باندھی اور
فوج اکٹھی کرنے میں لگ گیا۔ ماضی میں ہارنے والے کسی بھی بادشاہ نے یہ کبھی
نہیں سمجھا کہ یہ اس کا آخری معرکہ ہے اور اس کی شکست اب فتح میں نہیں
بدل سکتی۔ یہی سیاست و حکومت کا اصول ہے کہ ہارنے والا اگلے لمحے سے
فتح کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ تاج و تخت حکمرانی اور شہنشاہی کو اسی لئے نشہ
کہا گیا ہے کہ اس کا عادی انسان اس کو جیتے جی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔
ابوبکر شاہ نے اگرچہ شبینہ سے وعدہ کر لیا تھا لیکن وہ ناصر الدین کی طرف
سے مطمئن تھا لیکن جب اسے خبر ملی کہ ناصر الدین شاہ پھر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا
ہے تو اس نے حیرت سے شبینہ کی طرف دیکھا اور بولا "شکست خوردہ انسان
اتنی جلد باہمت نہیں بن سکتا۔ وہ ابھی ہم پر حملہ کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا
تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی نے اسے اپنی بلند ہمتی اور رفاقت کا یقین دلایا
ہے۔ تیرا کیا خیال ہے کون ہو سکتے ہیں وہ۔ جو اس کو مدد دیں گے؟"
شبینہ نے مسند پر بیٹھ کر اطمینان سے کہا "کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر
نودار شاہی غلام نہیں ہو سکتے۔ فیروز شاہی گروہ ناصر الدین سے ظلموں کا حساب

بالکل نہیں تھا اُسے خاموش دیکھ کر نوشینہ نے التجا بھری نظروں سے اسلام خاں کی طرف دیکھا اور بولی "اسلام خاں ۔ تم لوگ قبول کیوں نہیں کرتے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی میں نے .... میں نے انتقام لے لیا... ایک دفعہ کہہ دو .... کوئی ایک دفعہ .... کہہ دو .... نوشینہ کا سانس اکھڑنے لگا۔ فیضی بیگم نے فوراً پانی منگوایا مگر اس سے پہلے ہی نوشینہ کو دو ہچکیاں آئیں چہرہ زرد ہو گیا اور وہ اسلام خاں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اٹک اٹک کر اتنی قدر کہہ سکی .... تم .... تم .... مجھے معاف کرنا۔ آخری ہچکی کے ساتھ ہی اس کی گردن ڈھلک گئی اور سب دیکھتے رہ گئے۔ اسلام خاں تیزی سے باہر نکل گیا اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا وہ پچھلے ہفتہ بھر سے صبر کی صلیب پر لٹکا ہوا تھا۔ جب سے فیضی بیگم کا فرستادہ اُسے نوشینہ سے ملوانے کی خبر لایا تھا وہ مستقل بے چین اور بے سکون تھا۔ نوشینہ سے مل کر تو اس کے دل سے آہ بھی نہیں نکل سکی تھی وہ کئی گھنٹہ تک سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ یہ وہی نوشینہ تھی جسے اس نے "تلوار، خنجر، تیر چلانا سکھایا تھا۔ لڑائی کے داؤ پیچ سے آگاہ کیا تھا گھوڑ سواری میں مشاق بنایا تھا دشمن کو زیر کرنے کے گر بتائے تھے اور اسی کے ساتھ اسے اپنے دل میں بسا کر اپنی خلوتوں کو آباد کیا تھا۔ اس کے ہر روپ کو چاہا تھا اور پھر نوشینہ کو پانے کی خواہش کا اظہار بھی اس کے باپ سے کر بیٹھا تھا۔ اس کی وفا میں اثر تھا اس لئے اس کی خواہش کو پذیرائی مل گئی تھی اور اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ دنیا کی خوبصورتی میں سے سب سے زیادہ حصہ اسے مل گیا ہے۔

لیکن ابھی دل کی آرزو نے ہمکنا ہی سیکھا تھا۔ ابھی ارمانوں کو قوت گویائی بھی نہیں ملی تھی۔ پیار کے جذبوں نے پہلی انگڑائی بھی نہیں لی تھی کہ ایک

سوچ کر جواب دیں گے ۔ تیرے پیار نے ہمیں چہار جانب سے اپنے نرغہ میں لے رکھا ہے۔"

شبینہ نے کسمسا کر خود کو سمیٹنا چاہا مگر اس کا عندیہ اقرار میں مل جانے کے بعد سے ابوبکر شاہ اکثر شوخ ہو جاتا تھا۔ تیری خواہش پر ہم نے غور کرنے کا وعدہ کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فیصلہ تیرے ہی حق میں ہوگا لیکن ان سب باتوں سے پہلے ہم تجھے اپنی خوابگاہ میں عروسی لباس میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور یہ خواہش اب تاخیر گوارہ نہیں کر سکتی۔"

"میں نے خود کو تمہیں سونپ دینے کا وعدہ کیا ہے ابوبکر شاہ ۔ اور میں نے تمہارے دل میں داخل ہو کر ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ میں تمہارے دل سے کبھی نہیں نکلوں گی۔ یہی میرا اصول ہے۔ اور اب بھی میں تمہاری خوابگاہ میں داخل ہو کر پھر باہر نہیں آؤں گی۔ تمہاری بن کر میں خود کو دنیا سے چھپا لوں گی۔"

"تیرے ہر جذبے پر ہم قربان تو پھر اب ......

"بس اس سے پہلے میں ایک بار میدان کارزار میں اپنا امتحان خود لینا چاہتی ہوں ۔ میں تمہیں خدائے وحدہٗ لاشریک کا واسطہ دیتی ہوں مجھے روکنا مت، میں تمہاری ہمقدم بن کر ناصرالدین کو صرف یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ فیروز شاہی غلام افرت اندہ خاک کے آگے جھکنا نہیں جانتے انہیں صرف محبت سے جیتا جا سکتا ہے۔"

ابوبکر شاہ کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور ایک قطعی فیصلے کے آثار ابھرے ہم نہیں چاہتے کہ تیری زبان سے کبھی بھی یہ سنیں کہ ابوبکر شاہ نے اپنے نفع کو خاطر پناہ دی تھی یا اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے دلدہی کی تھی۔

قیامت آئی اور اپنے ساتھ سب کچھ لے گئی۔ اسلام خاں کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے
ایک ہرے بھرے گلزار میں سویا اور آنکھ کھلی تو لق و دق صحرا میں خود کو پایا۔ خواب
اور حقیقت کے درمیان کی بھی ایک منزل ہے جہاں صرف حیرت رہ جاتی ہے۔
انسان حقیقت سے گریز کرنا چاہتا ہے اور اس کا دل سامنے ہونے والے سانحہ
کو خواب سمجھنے پر مصر ہوتا ہے اور عقل و خرد اس واقعہ کی تلخی کو ثابت کئے جاتے
ہیں۔ اسی لیے اس کے برعکس بھی بات ہوتی ہے کہ ایک حسین خواب کو حقیقت سمجھنے
کو دل چاہا کرتا ہے۔ اسلام خاں کا دل بھی حیرت و حسرت کا مارا ہوا حقیقت کی
تلخی کو ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ ایسی کشمکش میں اکثر کمزور اعصاب کا انسان
یادداشت کھو بیٹھتا ہے اور مضبوط دل والے پر جنون اور غصہ طاری ہوتا ہے۔
کبھی وہ دنیا سے شکوہ کرتا ہے اور کبھی اللہ سے۔ اسلام خاں نے جب نوشینہ
کو لحد میں اترتے دیکھ لیا تو اس پر بھی جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ
گھر پہونچا اور زندگی میں پہلی بار آنسوؤں سے رویا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا
گریبان چاک کیا۔ سر کو دیواروں سے ٹکرایا اور دل کے ارمانوں کا ماتم کرتے
کرتے اس نے رات گزار دی نوشینہ کی یادوں نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔
آج اسے سب کچھ بے معنی سا لگ رہا تھا۔ وفاداری، جاں نثاری، منصب،
عہدے، جاہ و حشمت ــــ وہ افسردگی سے سوچنے لگا کہ ان تمام باتوں کے
باوجود وہ اپنی محبت گنوا بیٹھا۔ اپنی حاصل زندگی نوشینہ کی پاکیزگی اور
معصومیت کو نہ بچا سکا جن کی سلطنتوں کو بچانے کے لئے اس نے
میدان جنگ میں سیکڑوں زخم کھائے انھوں نے ہی ایسا گہرا زخم دیا اور
محافظوں ہی کے ہاتھوں نوشینہ کی عزت کی دولت لٹ گئی آبرو نیلام ہو گئی
اس کے دل میں نفرت اور بغاوت کا الاؤ دہکتا رہا اور اس کی اپنی ذات جلتی رہی۔

شبنم نے اس کے بند ہاتھوں پر اپنا سر ٹکا دیا۔ "ماں باپ کو کھویا تھا
تو اپنی آکا جان کی موجودگی اور ان کی محبت کا احساس تھا اور انھیں کی ذات
سے اسلام خاں وابستہ تھا لیکن آج تو میں بالکل تنہا رہ گئی۔ مجھے اپنے اطراف
تاریکی اور سناٹے کا احساس ہو رہا ہے۔"
"نہیں... نہیں ایسا مت سوچ" ابوبکر شاہ نے اس کا سر اپنے سینے سے
لگا لیا۔ "ہم تیرے ہیں۔ بہت پہلے تجھے اپنی رفاقت کا یقین دلا چکے ہیں۔ ہماری
بات ایک بادشاہ کا وعدہ ہے ایک سپاہی کا قول ہے۔ ہم تجھے ایک جگمگاتے
اور روشن مستقبل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم تجھے شایان
شان کچھ نہیں دے سکے۔ لیکن اب ــــ اب کار خیر میں دیر نہیں ہوگی۔ تیری
تنہائیوں کو ہماری محبت آباد کرے گی، تیری خلوتوں میں بہار اور رنگینیاں
بھر دے گا۔ تو ایک نیا گلشن سجا سکے گی ایک نئی بہار تیرا استقبال کرے گی
تیرا مقدر پھولوں کی طرح شگفتہ ہوگا۔ ماضی کی کلفتوں کو بھول جا اور ابوبکر شاہ
کی الفت میں خود کو گم کر دے۔"
"تمہاری الفت ہی نے مجھے سہارا دے رکھا ہے۔ تمہاری ہم نشینی ہم جلیسی
ہی نے مجھے زندگی کا احساس دے رکھا ہے۔ تم نے میری ہر خواہش کو قبولیت
بخشی ہے۔ بس یہ آخری آرزو ہے التماس ہے التجا ہے۔ صرف ایک بار
مجھے اپنی ہمت دیدو اپنا حوصلہ دیدو پھر میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں
وعدہ کرتی ہوں۔ خدا کے لئے میری بات رکھ لو ابوبکر شاہ ...." وہ اس کا
دامن پکڑ کر گڑگڑائی۔
ابوبکر شاہ نے بہت محبت سے اپنی باہوں میں لے لیا اور بولا "تیری
خواہش طفلانہ ہے اور انداز خواہش مجنونانہ، پھر بھی دو چار روز ٹھہر جا ہم

صبح سویرے وہ اٹھا اور فیضی بیگم کی حویلی میں پہنچا۔ جہاں شبینہ صدمے سے بے حال تھی۔ اپنے پیاروں کو اس کم عمری میں ایک کے بعد ایک اس نے موت کی آغوش میں جاتے دیکھا تھا۔ ماں کی گود میں ماں نے دم توڑا۔ باپ نے دنیا کو خیرباد کہا اور اب بہن بھی چھوڑ گئی۔ اسلام خاں کو دیکھا تو وہ پھوٹ پڑی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر دل کا خون بہاتی رہی۔ اسلام خاں شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور خود بھی روتا رہا۔ چوٹ کی تکلیف فوراً نہیں محسوس ہوا کرتی ایک رات گزر جائے تو پھر درد، ٹیس، جلن اور اس کی شدّت کا احساس ہوتا ہے اور اس وقت نہ مرہم کام دیتا ہے نہ ٹانکے نہ پھاہے۔ بس آہیں اور آنسو ہی سے سکون ملتا ہے اور علاج ہوتا ہے۔ شبینہ اور اسلام خاں دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے غموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔

فیضی بیگم نے آکر شبینہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور محبت سے بولی "بیٹا غم بہت بُرا ہے مگر حقائق سے آنکھ کبھی نہ چرانا چاہیئے۔ نوشینہ اجنبی بن کر گئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ نقصان کا سودا کرنے نکلی ہے۔ میں ایک طوائف ہوں۔ اس زندگی میں بہت سے سودے کئے بہت کچھ خریدا بیچا لیکن نہ کبھی بیچتے دل پسیجا نہ خریدتے کوئی افسوس ہوا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔ لیکن طوائف بھی زندگی میں ایک بار صرف ایک بار ماں بن کر ضرور سوچتی ہے حالات کی کوئی کروٹ اس کے دل میں ممتا کے سوئے جذبات کو جگا دیتی ہے۔ میں نے بھی نوشینہ کو دیکھا اس کی معصومیت اور بے بسی نے ایک کہانی سنا دی وہ خود اپنا سودا کرنے نکلی تھی۔ میں جاگ پڑی لرز اٹھی کانپ گئی میں نے سب کچھ بھول کر اس کی ماں بننا چاہا اسے ممتا کی چھاؤں میں لے کر اس کا دکھ جاننا چاہا تھا۔ مگر وہ اجنبیت کے پردے سے باہر ہی نہ آئی

کرنا چاہتی ہوں۔ خواہ میں رہوں یا نہ رہوں۔"

"شبینہ — کیا تو ہوش میں ہے۔ شکست خوردہ ناصر الدین اب ایسی بھول نہیں کرے گا اور اگر وہ میدان میں آ بھی گیا تو تیرا تنِ ناتواں اس کی تلوار کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ ہم سپاہی بھی ہیں اور بادشاہ بھی تجھے اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ شہنشاہ کی تلوار کے دبدبہ اور رعب کا مقابلہ کرنا معمولی بات نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں، لیکن میری تلوار اسی رعب اور دبدبے کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ جس نے ظالم بن کر ہمارا خون چاٹا ہے۔"

"ایسی ضد مت کر جو ہلاکت میں ڈال دے۔ تو خود کو مطمئن کیوں نہیں کر پاتی کہ تو نے ناصر الدین تغلق اور ہمایوں خاں بن ناصر الدین سے بیک وقت بدلہ لے لیا ہے دو دو بار شکست خوردہ سے لڑنا خلافِ عقل ہے۔"

"میں اپنا سب کچھ تمہیں سونپ چکی ہوں۔ میرا جسم میری جان میرا دل میرے ارمان تمہارے ہیں۔ میں سوائے تمہارے کس سے فریاد کروں کہاں جاؤں کس کو اپنا دلِ داغ داغ دکھاؤں — کیا تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" وہ فریاد کناں تھی۔

"تیری خاطر ہم اپنی جان دے سکتے ہیں۔ تو ہماری زندگی ہے لیکن تیری اس وقت کی خواہش جذبات کا ابال ہے۔ جوشِ انتقام کی دیوانگی ہے، تو ہوش میں آ اور پھر غور کر۔ ہم ہر قدم پر تیرے ساتھ ہیں۔ ہر منزل پر تیرے ہمنوا ہیں۔ ابوبکر شاہ نے شبینہ کے نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لئے۔ غم کرا نے اور پرچھاویں مت ہونے دے۔ ماں باپ جیسی دولت کھو کر تو تو عقل و ہوش سے بیگانہ نہیں ہوئی تھی آج اس قدر ہراساں کیوں ہے؟"

فیضی بیگم ایک لمحہ کو رکی پھر آنسو پونچھ کر بولی:" اور اب ـــ شبینہ تو یہ بھی سُن لے کہ میں نوشینہ کے بعد پھر ایک پتھر دل عورت ہوں جو لوٹنے والے سے انتقام لینے پر یقین رکھتی ہے اسے تباہ کرنا چاہتی ہے۔ تیرا یہ رونا دھونا حالات سے فرار ہے اٹھ اور نوشینہ کی روح کو سکون دے۔ ان لوگوں کو برباد کر دے، جلا دے بھون دے خاک کر دے فنا کر دے صفحۂ ہستی سے مٹا دے ان کے نام ونشان تیرے پاس وہ سب کچھ ہے علم بھی ہنر بھی عقل بھی عمل بھی اور اگر دولت کی ضرورت ہو تو میرا سب کچھ لے لے۔ اشرفیاں ہیرے جواہرات سونا چاندی ساز و سامان حتیٰ کہ یہ حویلی بھی۔ تجھے اس راہ میں جو کچھ چاہیئے مجھ سے لے میں ایک ماں بن کر تجھ سے فریاد کر رہی ہوں جو لوگ معصوم لڑکی کو طوائف بناتے ہیں۔ عورت کی کمزوری ذلت پر عیاش مرد اپنی خباثتوں کے محلے کرتے ہیں لیکن ہر عورت نہ فیضی ہوتی ہے نہ نوشینہ جو مرد سے انتقام لے کر خود پر ظلم کرتی رہتی ہیں اور بدنام ہو جاتی ہیں۔ شبینہ ہم تو خس وخاشاک کی طرح ایک دن بے نام طریقہ سے ختم ہو جائیں گے اور آنے والا کل ہمیں بالکل فراموش کر دے گا جیسے کہ ہم کبھی تھے ہی نہیں۔ لیکن یاد رکھ بہادر جری غیور عورت دائمی زندگی کی مالک ہو جاتی ہے تو اپنے علم وفن کو بروئے کار لا۔ اور لافانی بن جا ـــ"

اسلام خاں مبہوت فیضی بیگم کو دیکھ رہا تھا اور شبینہ جو دو روز سے صرف غم منا رہی تھی جیسے نیند سے جاگ اٹھی اس نے فیضی کے سینے سے الگ ہو کر اسلام خاں کی طرف دیکھا اور بولی:" اسلام خاں اگر نوشینہ تمہاری عزت و حرمت تھی تو اب کھل کر ناصر الدین کے خلاف میدان میں آجاؤ اور دیکھ کر اس بھیڑیئے سے کہہ دو کہ فیروز شاہی غلاموں میں سے صرف شبینہ سے دو بدو ہونے کو تیار

اور تیری وجہ سے ہماری ہمدردیاں فیروزی غلاموں کے ساتھ رہیں اور ہم نے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہونچایا۔"

" مجھے تمہارے اچھے عمل سے انکار نہیں ہے میرے محسن" وہ بولی۔

" تب پھر تجھے اس بات پر بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ تیرا انتقام پورا ہو چکا ہے اور یہ انتقام پورے فیروز شاہی گروہ نے ہمارے ساتھ مل کر لیا ہے۔"

" ابوبکر شاہ تمہاری دل دہی اور تمہارے احسانوں نے ہم سب کو بہت ڈھارس دی ہے ہماری شکستہ ہمتوں کو جوڑا ہے۔ ہمارے زخموں پر مرہم رکھا ہے۔ تم نہ ہوتے تو شاید ہم بھی آج نہ ہوتے۔ لیکن میرا انتقام ابھی ادھورا ہے میری بہن کو لٹے ملے کی موت مار آگیا ہے اسے کسی زہریلے افعی کی طرح سے ڈسا ہے

ابوبکر شاہ نے حیرت آمیز لہجے میں معلوم کیا۔" ذرا اپنی بات کی وضاحت کر۔"

شبینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس کی مٹھیاں بند تھیں آنکھیں سرخ اور چہرے پر جلال تھا۔ وہ تلخ لہجہ میں بولی:" ایک بار ناصر الدین شاہ میدان جنگ میں اور آئے گا۔ ایک معرکہ اور ہوگا اور اس مقابلے میں تمہاری سپاہ میں ایک سپاہی کی حیثیت سے میں بھی موجود ہوں گی۔"

" تجھے آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ ہم تیرے لئے شاہی طبیب سے کوئی مسکن دعا تیار کروائیں گے۔ تاکہ تجھے راحتِ قلب ملے۔ تو بہت مضطرب و بیجور ہے۔"

" نہیں ابوبکر شاہ ـــ" وہ سسک پڑی" نہ مجھے آرام کی ضرورت ہے نہ مسکن دواؤں سے سکون مل سکتا ہے۔ مجھے میدان جنگ میں اپنے ساتھ لے چلو میں اس شخص کو للکاروں جس نے میرے گلشن کا ہر پھول نوچ کر پھینک دیا اسے برباد کر دیا اس کو بہاروں کو روند ڈالا۔ میں اس شخص کا فیصلہ خود

ہوجائے اور دیکھ لے کہ فیروزی غلام جب دالواری پر آتے ہیں تو اپنے آقا پر اپنی جانیں نچھاور کر دیتے ہیں اور اگر کوئی ان کا صبر آزمانے پر آجائے تو فنا ہو جاتے ہیں مگر ان کو بے گناہی کی سزا کوئی نہیں دے سکتا"۔

"شبینہ" وہ بولا۔ "میں زندگی کی ہر خوشی کھو چکا ہوں۔ تمام راحتوں سے مجھے محروم کیا گیا ہے۔ میرا دل ایک بھٹی کی طرح دہک رہا ہے۔ رات بھر میں نوشینہ کی یادوں کو گلے لگا کر روتا رہا ہوں۔ اگرچہ فیضی بیگم کی تقریر نے ایک نئی زندگی دی ہے لیکن پھر بھی ہمیں ہر وقت ہوش سے کام لینا چاہیئے۔ نوشینہ بھی جوش انتقام کی نذر ہوئی ہے اگر ہوش سے کام لیتی تو یہ انجام نہ ہوتا"۔

"اسلام خاں" شبینہ درد سے بولی"۔ اب ہوش کا وقت گزر چکا ہے میں ناصرالدین شاہ کو معاف نہیں کر سکتی میں اب للکار کر اس سے بدلہ لوں گی چھپ کر نہیں۔ بس ایک بار اسے میدان جنگ میں لانا تمہارا کام ہوگا۔ مجھے اپنی آکا بہن کی محبت کا قرض اتارنا ہے۔ تم اس کی زندگی کے شریک بننے کے دعویدار تھے اگر یہ کام کر دو تو فیروزی غلاموں کے خون اور آبرو کی عزت بن جاؤ گے"۔

"میں نے تجھے نہ کبھی مایوس کیا ہے نہ کروں گا۔" اتنا کہہ وہ واپسی کیلئے مڑ گیا۔

شبینہ کی پُرنم داستان ابوبکر شاہ نے بغور سُنی جس کا ہر لفظ آنسو تھا ہر فقرہ ایک آہ تھی اور ہر خاموشی درد کا سمندر، جس میں وہ درمیان داستان میں غرق ہوتی اُبھرتی رہی اور بہن کی موت تک پہونچ کر تو وہ پانی کی بن گئی۔ موت تو سب کے لئے ہے لیکن نوشینہ کی تو زندگی موت سے بدتر تھی اور موت نے تو اس کیلئے معافی اور مکافات کے راستے بھی بند کر دیئے تھے۔ شبینہ کا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ نوشینہ نے اپنی مرضی سے اپنی آبرو لٹوائی تھی۔ اللہ کے ہاں بھی گناہ کی شدت

اس وقت بڑھ جاتی ہے جب انسان جان بوجھ کر اسے اختیار کرے۔

شبینہ کی سسکیوں نے ابوبکر شاہ کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ شبینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اس کی تکلیف اور درد کو محسوس کر رہا تھا۔ تسلی اور دلاسے تو کسی ایک غم پر دیئے جاتے ہیں یہاں تو تباہی بربادی اور غم واندوہ کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو شبینہ کی ذات کا مسلسل امتحان لے رہا تھا اور وہ ثابت قدم رہی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لڑکھڑا پڑی تھی۔ ابوبکر شاہ اس کی اس کیفیت سے واقف تھا۔ اس نازک بدن لڑکی نے جس پامردی سے مقابلہ کیا تھا اس کی بنا پر ابوبکر شاہ کی آنکھوں میں تحسین بھی تھی، تعریف بھی، دلاسہ بھی اور شدید اپنائیت بھی وہ ہمدردی و محبت سے اس کا ہاتھ تھپک رہا تھا۔ شبینہ خاموش ہوئی تو بولا

"فیروزی غلاموں کی لڑکیاں جہاں صبر و حلم میں یکتا ہیں وہیں وہ غیظ و غضب میں بھی اپنی مثال آپ سمجھی گئی ہیں۔ شاید اسی لئے ان کے ایک ہاتھ میں قرآن و حدیث ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ۔۔۔ وہ ہر میدان میں نمایاں نظر آتی ہیں اور اپنی شخصیت کی پہچان کروا دیتی ہیں۔ یہ شناخت ہمیشہ مثبت رہی ہے لیکن تیری بہن نے منفی انداز اختیار کیا اس نے نہ تو قرآن و حدیث سے کام لیا اور نہ اپنی تلوار سے تو پھر اس کا انجام کیوں کر بخیر ہوتا!"

"میں جانتی ہوں آکا بہن سے زبردست بھول ہوئی مگر میں اپنے دل میں لگی ہوئی آگ کے لئے کیا کروں ۔۔۔؟ میرا جگر پھنک رہا ہے۔ دماغ میں بگولے سے اٹھ رہے ہیں۔ میرا سارا وجود جل رہا ہے"۔

"ہم جانتے ہیں جانِ شاہ ۔۔۔ کہ تم سب پہ ایک عرصے سے ظلم و ستم ہو رہا ہے اور صبر و ضبط کا مظاہرہ ایک حد تک ہی کیا جا سکتا ہے۔" اس نے شبینہ کی پشت پر اپنی بانہہ پھیلا دی "تجھ سے قربت کی کوئی وجہ تو ہم نے محسوس نہیں کی تھی

[illegible] بولے۔

"تمہاری باتوں کا جواب میں صرف اتنا ہی دے سکتا ہوں کہ انسان اپنی
پوری زندگی میں طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ اگر اس کی قسمت
اسے گہرائیوں میں لے جاتی ہے تو بلندیوں پر بھی پہونچاتی ہے۔ انسانی زندگی
میں خوشی اور غم کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ غم کا دور دیوانگی
ہے۔ میرا تجربہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ افراطِ انبساط بھی شادی مرگ پر ختم ہوتی
ہے۔ خدا نے انسان کو صبر و ضبط، طاقت برداشت بھی عطا کی ہے۔ غم
انسانوں ہی پر پڑتے ہیں انھیں برداشت کرنا چاہئیے۔ غم کے آگے سپر انداز ہونے
سے غم خود پر حاوی ہو جاتا ہے! یہ بہت بُری بات ہے۔ تم نے اپنے غموں
کو خود پر مسلط کر لیا ہے۔ یہی بات ہے۔ تم ذہنی بیمار نہیں ہو!!

شباہت صاحب! بے حسی ایک نعمت ہے میرے لئے" ماریہ نے
کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے ادراک ہے کہ میں بھولی بھٹکی ہو کر رہ گئی ہوں اور
میں اسی کیفیت کا دوام بھی چاہتی ہوں۔ تاکہ غموں کی شدت مجھے بالکل
پاگل نہ کر دے سنا تھا میں نے کہ میں پاگل ہو گئی تھی۔ امی اور بھابی کی
موت پر میں ہنسنے لگی تھی مجھے یقین نہیں آتا۔ کیا یہ سچ ہے۔ پھر میں
ٹھیک کیونکر ہوں گی؟"

"خدا نے مہربانی کی تم پر!"

"پتہ نہیں!"

"ماریہ؟"

وہ مغموم انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

[illegible] طالب علم رہ چکی ہو!

اور خلا میں گھورنے لگی۔!

"وجاہت!۔" اچانک شباہت کی آواز سنائی دی۔ ماریہ نے انھیں دیکھا
اور سہم کر بولی۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے کچھ اُڑھا دو!

شباہت بھاری قدم رکھتے ہوئے دالان کے سرے تک آئے۔۔۔ ماریہ
کانپنے لگی!

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" انھوں نے گرج کر پوچھا۔

"گگ۔ کچھ نہیں۔ سردی لگ رہی ہے۔ رضائی اوڑھا کر۔" ماریہ کی
بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ شباہت نے بڑے بے رحم لہجے میں کہا۔

"تمہیں سردی نہیں لگ رہی۔ تم کام سے بچنا چاہتی ہو۔ لیکن میں کہتا
ہوں کہ آج ہم سب کے لئے چائے تم بناؤ گی! سمجھیں!!۔"

"جج۔ جی۔!" وہ خوفزدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگی پھر چپکے سے
بولی۔ "آپ سب کے لئے۔ چائے بنا کے۔ لاتی ہوں۔!"

اور مڑ کر اس طرف چلی گئی۔ جدھر باورچی خانہ تھا!

"اللہ کا شکر ہے کہ اتنے ہی حواس واپس آئے۔" اماں بولیں۔ "پہلے کیا
حال تھا کہ دیکھے سے خوف آتا تھا۔!

"بچوں کو ناشتہ کرائیے اماں۔!" شباہت نے کہا۔ پھر انھوں نے نوشابہ
کی طرف دیکھا اور بولے۔

"ذرا تم دیکھ لیتیں بہن۔ کہیں وہ ہاتھ واتھ نہ جلا لے۔"

نوشابہ کچن کی طرف چلی گئی!

"وجاہت۔ میں نے تمہیں اس لئے آواز دی تھی کہ دیکھو [illegible]
[illegible] جاگ گئے ہوں تو انہیں دالان میں بلا لاؤ۔ میں [illegible]

بھائی بہن اور بچوں کو ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"ابھی دیکھتا ہوں بھائی جان۔" وجاہت باہر کمرے کی طرف چلا گیا!۔

ملازمہ نے ایک کشتی میں دودھ کے دو گلاس اور طشتری میں بسکٹ رکھ کر اماں کو پیش کئے وہ تخت پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئیں اور منا کر چمکار کر ناشتہ کرانے لگیں!۔

رفتہ رفتہ گھر کے سب افراد دالان میں اکٹھا ہو گئے!۔ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا جیسے جیسے دھوپ کی تمازت بڑھتی گئی۔ موسم خوشگوار ہوتا گیا الیاس بھی اٹھ کے آگئے تھے۔ اب بھی ان کے چہرے پر حزن وملال کی کیفیات منجمد تھیں۔ رہ رہ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے! اور خلا میں گھورنے لگتے!

شباہت اپنے دوست کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ وہ اپنی سسرال میں رہ پڑے تھے۔ مگر سسرال والوں ہی کا حال تباہ تھا وہ اپنے غمگساروں کی تلاش میں تھے کسی کی غم خواری کیا کرتے۔ وہاں تو سب کا کام رونا اور رُلانا ہی رہ گیا تھا! یہ صورت حال شباہت سے دیکھی نہ گئی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر تک اس گریہ خیز ماحول میں رہے تو خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں گے۔ کیونکہ ماحول یہ تھا کہ ایک طرف الیاس احمد بیٹھے سسکیاں بھر رہے تھے۔ دوسری طرف سفینہ کی والدہ زار وقطار رو رہی تھیں تیسری طرف سب سے زیادہ انہاک بلکہ خوفناک منظر تھا۔ ماریہ بیچ صحن میں کھڑی بے تحاشہ ہنسے جا رہی تھی!۔ اس کی حرکتیں اتنی خطرناک تھیں کہ کوئی بھی عورت اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرتی تھی!

اس کے ایک مرتبہ قہقہہ لگانے پر الیاس احمد نے بلبلا کر کہا تھا۔

"ارے خدا کے لئے کوئی اسے مار ڈالے۔ اسے خدا نے موت کیوں نہیں

"نہیں!" کانپ کر اس نے دونوں گال تھام لئے۔

"یاد تو آتا ہوگا اپنا گھر۔۔!"

یاد آتا ہے اور اپنے ساتھ بہت ڈراؤنی، ہولناک اور غمناک یادیں بھی سمیٹ لاتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں نے سوتے جاگتے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ اور شاید۔ میں اب بھی سو رہی ہوں کابوس کی بیمار ہو گئی ہوں میں۔ میری آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ میں اپنے گرد و پیش کے نظارے دیکھ سکتی ہوں مگر پھر سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ میں سب کو باتیں کرتے سنتی ہوں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھئے کہ میں نے کیا سنا تھا تو میں آپ کے سامنے ایک لفظ بھی دوہرا نہیں سکتی۔ مجھے پچھلی زندگی کچھ یاد آتی ہے۔ کچھ بھول گئی ہوں میں! وہ گھر۔ میری امی۔ بھائی بھابی، بچے۔ یہ سب کون سے خواب کی دھند میں ملفوف ہیں دکھائی سب دیتے ہیں۔ جن کا ادراک مجھے نہیں ہوتا۔ شباہت صاحب۔ سچ بتائیے۔ کیا یہ کوئی دماغی بیماری ہے؟"

شباہت اس کا چہرہ تک رہے تھے۔ قبول صورتی بدحواسی میں گھل ملی کچھ خوبصورتی میں تبدیل ہو رہی تھی! خوشنما آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں سے آراستہ غلافی بوجھل پپوٹے۔ کتنے دل اس انداز میں جھپک رہے تھے۔ خشک لب جن پر نام کو بھی گلابی نہ تھی مگر وہ پُرکشش لگ رہے تھے! شباہت کو یاد آیا یہی ماریہ تھی۔ بڑے شوخ و شریر انداز میں انھیں گھورا کرتی تھی۔ کیا وہ زمانہ بھی اس کے دھندلائے ہوئے ذہن سے محو ہو چکا؟

شباہت نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس کا کش لیتے ہوئے پُرخیال

دی۔ یہ کیوں میرے صبر وضبط کا امتحان لینے کے لئے زندہ بچ گئی ہے ماریہ
ماریہ بدنصیب۔ کاش تجھے خدا اٹھا لے۔ ! "
شباہت نے الیاس احمد کی بڑی سالی زیبا باجا سے کہا۔ "کیا یہ اس
سانحے کے بعد ایک مرتبہ بھی نہیں روئیں۔ ؟ "
"بھیا۔ رو لیتی تو اس نوبت کو کیوں پہونچتی۔" زیبا باجا نے آہ بھر کر
کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ بے چاری کو پاگل خانے میں شریک کرنا پڑے گا۔
کون سنبھالے گا اسے۔ پاس تک جانے کی ہمت تو کسی میں ہے نہیں ! "
"میں ان سب کو اپنے گھر لے جاؤں۔ بہن ! " انہوں نے بڑے عاجزانہ
انداز سے کہا۔ "یہاں یہ سب اور آپ سب یوں روتے روتے ختم نہ ہو
جائیں گے۔ الیاس خود بھی دیوانے بن گئے ہیں۔ شاید ماحول بدلنے سے
دل و دماغ کو قدرے سکون حاصل ہو۔
"جو جی چاہے کرو میاں۔" وہ بولیں۔ "یہاں اپنے آپ میں کون ہے؟
الیاس تم اور بچے چلو میرے ساتھ میرے گھر ! " شباہت نے آگے بڑھ کر الیاس
کو تھاما اور کھڑا کر دیا۔ پھر وہ ماریہ کی طرف مڑے۔
"آپ بھی چلیئے ! "
ماریہ نے پھر ایک قہقہہ لگا دیا۔ اور جیسے ایک بجلی سی چمک گئی شباہت
کے فولادی ہاتھ کا تھپڑ اس طرح ماریہ کے گال پر پڑا کہ وہ ایک طرف جھک
گئی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل۔
"میری امی۔ ! "
فوراً ہی دوسرا تھپڑ دوسرے گال پر تڑاخ تڑاخ۔ اور وہ بے تحاشہ چیخ
کر بلک بلک کر روتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ !

"جی ہاں۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں اس گھر کی کوئی نہیں۔"
"چائے بناؤ۔ ماریہ ! "
"وہ ایک مجرم کی طرح بیٹھ گئی۔"
"اپنے لئے بھی بناؤ ! "
"جی۔ میں سب کے ساتھ پی چکی ہوں ! "
"میرے ساتھ ایک پیالی اور سہی ! "
"جی اچھا ! "
"ماریہ ؟ "
"جی۔ ! "
"اب تو تمہارا دل نہیں گھبراتا ! "
"بہت گھبراتا ہے۔ رونا آنے لگتا ہے ! "
"جتنا زیادہ تم رو سکتی ہو۔ رو لیا کرو۔ صحت مند ہو جاؤ گی ! "
"کیا کروں گی صحت مند ہو کے۔ ! "
"ابھی زندگی گزارنی ہے ! "
"زندگی۔ ؟" وہ ہنسنے لگی۔
"ہنسا مت کرو۔" ان کا لہجہ درشت تھا۔
"جی۔ بہت اچھا۔" یکبارگی سہم کر وہ خاموش ہو گئی۔
"تم نے آج تک نہیں پوچھا کہ میں تم سب کو اپنے گھر کیوں لے آیا ہوں۔"
"اماں سے میں نے پوچھا تھا۔ اماں نے جواب دیا کہ — ہمارے گھر
والوں کے دماغ الٹ گئے ہیں لہٰذا آپ ہمیں یہاں لے کے آ گئے ہیں ! "
"تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو ؟ "

نے کھڑکی کے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر ایک گہری سانس لی اور پھر ... سے ٹک کر سگریٹ سلگایا اور روشن و منور خلا میں نظریں گاڑ دیں ... انکی آنکھیں تفکرانہ انداز میں نیم باز تھیں اور پیشانی پر بھی سوچوں کا غبار تھا!

دفعتاً دہلیز پر آہٹ ہوئی! وہ مڑے۔ ماریہ چائے کی کشتی لئے کھڑی تھی! اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا! اور یوں لگتا تھا جیسے وہ خوفزدہ بھی ہو ۔۔۔!

"آپ کی چائے ۔۔۔!" اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔

"اندر آجاؤ!"

اس نے چائے کی کشتی تپائی پر رکھدی۔ شباہت کرسی پر آ بیٹھے!۔ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ، متعجب اور کسی قدر اداس بھی لگ رہے تھے۔

"چائے تم نے بنائی ہے؟" انھوں نے ماریہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا ۔۔۔

"جی ہاں!"

"تمہیں میری بات ناگوار لگی ہوگی۔ میں تم سے کام لیتا ہوں۔

جی نہیں۔

کیوں ۔۔۔؟ ناگوار کیوں نہیں لگتا؟ تم اس گھر کی ایک فرد ہو ۔۔۔ ملازم تو نہیں ہو۔

گھر کا کام کرنے والے ملازم تھوڑی ہوتے ہیں۔ فرحانہ بھی تو دن رات معروف رہتی ہیں۔

وہ اس گھر کی بہو ہے۔ تم ... ہو؟ یہ سوال پوچھنے کا تم ... کی ... ہو۔

"... شباہت۔" چیخ کر الیاس جھپٹے اور شباہت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ تم نے کیا کیا۔ اس مظلوم کو تم نے کیوں مارا۔ کیوں مارا!" وہ خود بھی روتے ہوئے ماریہ کے پاس بیٹھ گئے!

سب لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ پاگل ماریہ جسے سب رلانے کی کوشش کر کے تھک چکے تھے۔ بلک بلک کے ہچکیاں لے لے کے رو رہی تھی! تبھی چچی اماں نے الیاس کو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور دبی دبی خوشی سے بولیں۔ اسے منا کو چپ کراؤ نہیں۔ دیکھتے نہیں۔ وہ رو رہی ہے۔ اچھا ہے۔ دل بھر کے رولے دماغ ہلکا ہو جائے گا تو ہوش میں آجائے گی! خدا کا شکر ادا کرو کہ اسے پاگل خانے میں شریک کرنا نہیں پڑا۔ وہاں کے محافظ اس سے زیادہ مارتے!!"

"یہی اس کا علاج ہے بھائی۔ میری نیت بری نہیں تھی۔" شباہت نے کہا۔ "ایسا ظلم شاید میں ہی کر سکتا! اور تم میں کون ہے جو اس ستم رسیدہ پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کرتا۔ اب دیکھو کہ وہ گہرا غبار جو ان کے دماغ پر جما ہوا تھا کس طرح آنسو بن کر بہہ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دل بھر کے رو لینے کے بعد وہ ہوش میں آجائیں گی!"

"چوٹ کتنی لگی ہو گی غریب کے۔" الیاس احمد بے حد دکھ سے بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"الیاس عقل کے ناخن لو۔ اس کی زندگی زیادہ اہم ہے کہ تھپڑ۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" چچی اماں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ میں ایک بڑے خسارے سے بچ گیا۔" وہ بولے۔

دیر تک ماریہ روتی رہی۔ ... کسی نے بھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی۔

لائی ہوئی تشریف لائی ہوں!"

"نوشابہ اچھل پڑی۔ "ایسی تیسی تمہاری۔ ایسا بھی جھوٹ؟"

"ایمان سے" رضوانہ جھوم کر بولی۔ "کل جلسے میں ان سے ملی تھی انہوں نے فرمایا کہ اپنی کتابیں آ کے لے جانا۔ میں نے سوچا کہ آج اتوار ہے موصوف گھر پر ہوں گے۔ بس۔ سویرے سویرے بھاگی آئی ہوں۔ ان سے ملنے کے اشتیاق میں، ایمان سے قسم لے لو جو ساری رات میں ایک لمحے کے لئے سوئی بھی ہوں۔"

"تو میں کہلوادوں کہ تم آئی ہو؟"

"ہاں مانوں گی تمہارا ــــ!

چائے وائے بھیجوں؟

رضوانہ لونڈوں کی طرح ہنسی۔ "چائے وائے نہیں۔ اب شربت دیدار ہی چوس ہوں گی۔

اچھا۔ پروں کے بغیر بہت اونچی اڑ رہی ہو۔ ذرا بیلنس رکھو۔ ایسا نہ ہو کہیں زمین دیکھنی پڑ جائے۔

نوشابہ چلی گئی اور رضوانہ مضطربانہ انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی!!

کھڑکی کے دونوں پٹ دور تک کھلے ہوئے تھے۔ ایک خوشنما سبزہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ [illegible] پیڑ درخت اور پھولوں کے تختے، نرم سبز ہوئی زمین [illegible]

[illegible] شباہت

قریب ایک گھنٹے بعد وہ سسکیاں لے کر چپ ہوئی اور اٹھ کر چپکے چپکے چلتی ہوئی دالان میں پڑے تخت پر لیٹ گئی۔ اس کے دونوں گال سرخ ہو رہے تھے ان پر شباہت کی انگلیوں کے نشان دور ہی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ اوپر کا ہونٹ ورم کر آیا تھا آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ اس پر ترس آ سکتا تھا!

اس کی دماغی حالت کا امتحان لینے کے لئے الیاس نے اسے آواز دی۔

ایک سسکی لے کر اس نے سر اٹھایا۔

ان سے پوچھو۔ تمہارے ساتھ میرے ہاں چلیں گی؟" جلدی سے شباہت نے کہا الیاس نے یہی بات اس سے پوچھی۔

"آپ کی جو مرضی بھیا!" اس کے لب ہلے۔ غمزدہ سی آواز آئی۔ پھر اس نے ایک نظر سامنے کھڑے ہوئے شباہت پر ڈالی اور چپکے سے آنچل سر پہ اوڑھ لیا۔ یہ حرکت یقیناً ہوشمندی کی تھی!

الیاس احمد نے شباہت کے تھپڑ بھلا دیے! اور گرمجوشی سے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لئے۔

"یہ علاج ہم سے یقیناً نہ ہو سکتا جو تم نے کیا۔ میں تمہارا ممنون ہوں۔"

"اس ظالمانہ طریق علاج کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔" ماریہ پر وقفہ وقفہ اس طرح گریہ و زاری کے دورے پڑتے رہے کہ وہ لوگ جو اسے بہر حال رلانا چاہتے تھے اس کے آنسوؤں سے پریشان ہو گئے! لیکن بات مزید ہوئی کہ ماریہ بالکل ہوش میں آ گئی۔ اب اس کی خاموشی [illegible] کا نتیجہ تھی۔ دیوانگی کی علامت نہیں!

اسی شام شباہت، الیاس احمد، ماریہ اور بچوں کو اپنے گھر لے گئے [illegible]

لوگوں کو ساری المناک کیفیت سب کو معلوم تھی۔ اماں، نوشابہ اور دوسرے لوگوں نے ان کی خاطر تواضع، دلداری، اشک شوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی!

نوشابہ، ماریہ کو اپنے ساتھ رکھتی! اسے بہلاتی رہتی تھی۔

الیاس احمد کے لئے بڑے غمگسار، چارہ ساز شباہت کیا کم تھے۔

بچوں کو وجاہت اور شمعون نے اس طرح بہلایا اور خود سے مانوس کر لیا تھا کہ وہ ہفتہ بھر ہی میں اپنی ماں، دادی اور گھر وغیرہ کو بھول کر انہیں لوگوں کے ہو گئے! اماں جی کا دل بہت بڑا تھا۔ اس دل میں نیکی، محبت پیار اور خدا ترسی کے سوا کچھ نہ تھا! انہوں نے سچ مچ دادی بن کر ننھے بچوں کو اپنی پیار بھری گود میں سمیٹ لیا۔

غم کا قاعدہ ہے کہ بٹانے سے ہلکا ہوتا ہے۔

یہاں تو سبھی غم خوار تھے۔ الیاس احمد کا دلدوز، جانگسل غم بھی آہستہ آہستہ اپنی شدت کھوتا گیا! آہستہ آہستہ انھوں نے خود پر قابو پانا سیکھ لیا۔

آہستہ آہستہ پھر ہنستی کھیلتی دنیا کی طرف لوٹ آئے!

بزنس میں دلچسپی لینی شروع کی۔

بچوں سے کھیلنے لگے۔

ماریہ سے گھنٹوں باتیں کرتے۔

اماں کے پاس بیٹھ کر ان کی محبت بھری باتیں سن کر اپنا دکھ مٹاتے۔

نوشابہ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ وہ جو ساری گرہستی کی ذمہ دار تھی اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ان کے ناشتے کھانے کا خیال رکھتی تھی!

ڈاکٹر عظمت ماریہ کا علاج کر رہے تھے خیال تھا کہ اس کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں! ان کے علاج سے ماریہ کی صحت بھی روز افزوں ترقی پا رہی

اشتیاق سے پوچھا۔

"بے مزے کی۔" نوشابہ بولی۔ "تم لوگ نگوڑی عاشق نامراد! انہیں دیکھنے، ان سے باتیں کرنے کو ترس ترس کے مرتی ہو۔ مگر میں دنیا کی خوش ترین ہستی ہوں۔ بی بی تنّو۔ ان کی تمام خدمات میرے ہی سپرد ہیں۔ ان کا کمرہ صاف کرتی ہوں۔ ان کی سگریٹوں کی دیکھ بھال میرے ذمے ہے۔ میں جو لباس نکال کر رکھ دیتی ہوں وہ اسی کو پہن لیتے ہیں۔ ان کا ناشتہ کھانا میں ہی پہونچاتی ہوں۔ پرسوں ان کے سر میں درد تھا۔ جناب اس مقدس اور پیارے سر کو گھنٹہ بھر میں نے دبایا ہے سمجھیں۔ یوں آنکھیں پھاڑ کے اور منہ کھول کے مجھے مت گھورو۔ ہونس کے نہ رکھ دینا کہیں —!"

"سچ مچ خوش نصیب ہو!" رضوانہ نے آہ بھری۔

"صبح صبح کیسے آگئیں۔ قسم کھائی تھی کہ یہاں قدم بھی نہ رکھو گی۔!"

بس۔ خوش نصیبی ہی لے آئی!۔

کیا مطلب؟

شباہت صاحب گھر پر ہیں کہ نہیں۔

ہیں۔ ابھی ابھی ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں گئے ہیں۔ ان سے کچھ کام ہے؟ ارے۔ رضوانہ۔ پلیز۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری کتابیں بھائی جان سے لے کے واپس نہ کر سکی! دراصل میری ہمت ہی نہ پڑی!۔

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" رضوانہ مسکرائی! "میں خود لے لوں گی۔ اور کہوں راز کی ایک بات؟"

شادی ہو رہی ہے تمہاری۔!

"کیا! شادی۔! میں سمجھ رہی تھی کہ میں خود آں جناب کی محرم

کہ حیران رہ گئی! اور پردے کے پاس کھڑی ہو گئی! ۔
رضوانہ صوفہ پر بڑی شان سے متمکن تھی۔ نوشابہ کو دیکھ کر بھی سیدھی
نہیں ہوئی بلکہ اس کے لبوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ شریر ہو گئی!
نوشابہ ہکا بکا تھی۔ اسے اس کی داستان محبت کا علم تھا اور رضوانہ
نے شاید قسم بھی کھائی تھی کہ اس گھر میں قدم نہ رکھے گی!
"اتنی مرعوب ہو گئی ہو مجھ سے کہ سلام دعا کا بھی ہوش نہیں رہ گیا۔"
وہ بڑی خوش دلی سے ہنسی! "خیر میرا سلام تو کم از کم لے ہی لو۔"
نوشابہ اس کے پاس آبیٹھی "حیران ہوں تم وہی مصیبتوں کی ماری
محبت کی ستائی کسی ظالم کے ظلم کی شاکی وہی بے چاری رضوانہ ہو کہ
تمہارا اپنا جنم ہوا ہے۔"
"اوہو۔ یہ عمدہ لباس، نئے وضع کے بنے بال، لبوں پر ایسی ہنسی۔
اور آنکھوں میں زندگی کی چمک۔ سچ کہو کوئی خزانہ وزانہ مل گیا ہے کیا؟"
"عظمت بھائی تو ڈاکٹر ہیں۔ مگر انھوں نے تمہیں شاعری خوب سکھا
دی ہے۔" رضوانہ نے کہا۔ "کیسا میل بھر لمبا ڈائیلاگ تم نے بکا ہے کہ میں
بے چاری ادبی آدمی ہو کر بھی نہیں بک سکتی!"
"مذاق چھوڑو! یہ بتاؤ کہ میرے خوبصورت اور ستم گر جیٹھ کے گھر
تم آ کیسے گئیں!" نوشابہ نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔
"خوبصورت تو وہ اللہ رکھے ہیں ہی مگر کون انہیں ستم گر کہہ سکتا
ہے۔" رضوانہ نے ایسے انداز میں کہا کہ نوشابہ اسے تکنے لگی!
"تو گویا تم نے ساری شکایتیں واپس لے لیں۔"
"ہاں! تمہارا اللہ سے کبھی جھگڑا ہوا ہے؟" رضوانہ نے بے حد

تھی۔ غرض کہ الیاس احمد اور ماریہ شباہت اور ان کے بھائی بھاوج اور والد
کے بے حد ممنون اور شکر گزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شباہت ان میں دلچسپی
نہ لیتے ان کے غم کو یوں بٹا نہ لیتے تو آج ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہوتا۔ الیاس
احمد غموں کے حوالے ہو جاتے۔ بچے یتیم خانے میں پہونچا دیئے جاتے اور ماریہ پاگل
خانے چلی جاتی!!۔
الیاس احمد مرد تھے۔ بہر حال اپنے پچھلے مشاغل پر لوٹ گئے اور ڈھکے چھپے
زندگی سے بھی دلچسپی لینے لگے! اب بہانوں بہانوں سے گھر سے دور رہتے!
اور رات دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ شباہت کے پوچھنے پر ان کا جواب نہایت
معقول ہوتا کہ وہ اپنی مل کے حساب دیکھتے رہتے تھے! اور شباہت خود
بھی چاہتے تھے کہ وہ اپنی دلچسپیوں میں دل و دماغ پر منڈھا ماتم کا بوجھ ہلکا
کر سکیں۔ انہیں اپنے بچوں آعصار اور عمار کی بھی چندان فکر نہ رہ گئی تھی۔
کیونکہ بچے خود بھی باپ کے پاس پھٹکتے نہ تھے! ان کی دیکھ بھال اماں اور
نوشابہ کے سپرد تھی۔ وہ بہت مزے میں تھے! نوشابہ کی محبت دیکھتے ہوئے
عظمت نے ان سے مذاق کیا تھا۔
"تمہاری مرضی ہو تو الیاس بھائی سے کہہ کر انہیں ہم گود لے لیں۔"
نوشابہ نے عبرت انگیز انداز میں آنکھیں نکالیں: "اے میں تو یہ کہتی
ہوں کہ وہ انہیں خود ہی ہمیں بخشش دیں گے۔ آپ دیکھتے نہیں۔ پلٹ کے بچوں
کی خیریت تک نہیں پوچھتے۔ سچ بچ باپ کا دل بہت کٹھور ہوتا ہے!"
"خواہ مخواہ انہیں الزام دیتی ہو۔ آخر کہاں تک ان پے در پے صدمات
کو برداشت کرتے رہیں گے۔ ہاں تو۔ بچوں کے سلسلے میں بات کروں۔"
"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پلے پلائے بچے ہاتھ آئیں گے۔ تم کچھ اپنی اولاد سے الرجک ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ـــــ!"

"آپ کے منہ میں تو کوئی روک ہی نہیں رہا۔" نوشابہ جھینپ گئی ـــــ "کیسے مزے میں کہہ رہے ہیں۔ اپنی اولاد ـــــ!"

"تم نے کوئی امید ہی نہیں بندھائی!" عظمت نے منہ لٹکا لیا۔ "شادی ہوئے کم از کم چھ مہینے ہو چکے!"

"ہاں ہاں۔ چھ صدیاں گزر چکیں۔"

"تو پھر ہے کوئی ہوپ!"

"مجھے نہیں معلوم!"

"نوشابہ!" دروازے پر ماریہ کی آواز آئی۔

عظمت نے بڑے دلار سے کہا۔ "چلی آؤ بہن!"

ماریہ کافی کی ٹرے ہاتھوں پر لئے اندر آئی!

"یہ تم اتنی تکلیف کیوں کرتی ہو۔ بہن۔" عظمت نے اٹھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "تم تو مہمان ہو ہماری۔ ہم سے خدمت لیا کرو اور آرام کیا کرو! سمجھیں!"

ماریہ کے اداس چہرے پر ہمہ گیر سنجیدگی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اسے اتنے دن گزر گئے تھے یہاں رہتے ہوئے۔ مگر کبھی کسی نے اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم بھی نہیں دیکھا تھا۔ جیسے نہایت مایوس اور اندوہناک خیالوں نے اسے سہار رکھا تھا! وہ اپنے مستقبل سے خائف تھی اور سکتا بھول چکی تھی۔

ٹرے میں دو پیالیاں دیکھ کر عظمت نے کہا۔ "اور خود تمہاری پیالی کہاں ہے؟ سنو۔ تم یہاں بیٹھ کے نوشابہ کے ساتھ پیو۔ میں باہر جا رہا ہوں۔

سب کے ساتھ پی لوں گا!"

"جی نہیں!" ماریہ نے بے حد اداس لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے نہیں پینا ابھی تو میں کافی اماں اور شباہت صاحب کو پہنچانے بھی جاؤں گی۔"

"سنو تو" نوشابہ بولی۔ "صبح کو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے!"

"کوئی سی گولی اماں نے دی تھی۔ کھائی۔ اب نہیں ہے درد ـــــ!" ماریہ نے کہا اور اتفاقاً نا سر ہلایا۔ مسکرائی!

"بہرحال تم کو اس طرح ایکٹیو دیکھ کر خوشی بہت ہوتی ہے۔" عظمت نے کہا۔ "گھر کا کام کاج کرتی ہو۔ بہت اچھی لگتی ہو۔ ہمیں بڑی خواہش تھی کہ ہماری کوئی بہن بھی ہوتی۔ اللہ نے غیب سے دلا دی!"

ایک گہری آہ بھر کر ماریہ بولی۔ "ہاں بھیا۔ مگر بڑی قربانی دے کے دی!"

ماریہ کے جانے کے بعد نوشابہ نے کہا۔ "اب تو بالکل حواس میں ہے۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں یہی کیفیت مستقل نہ ہو جائے۔ بے چاری کی ساری زندگی ہی برباد ہو جاتی!"

ملازمہ لڑکی نے دروازے میں جھانکا! "دلہن بی۔ آپ کے پاس کوئی صاحبزادی آئی ہیں۔ دیوان خانے میں بیٹھی ہیں!"

"تمہاری بہن ہیں شاید۔" عظمت اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ ناشتے پر نہیں آ سکوں گا تم جاؤ دیکھو کون صاحبزادی تشریف لائی ہیں!"

نوشابہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ [illegible] گالوں پر ہلکا سا پف کر کے [illegible]
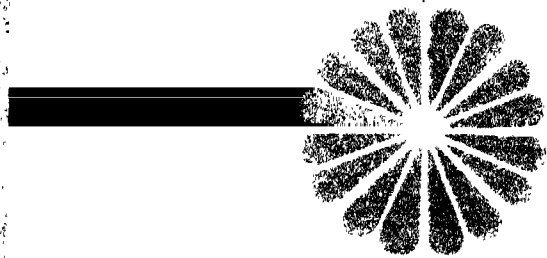
حریم
THE HAREEM
Mar. 85
Rs. 1.60

نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۲۲۵۵۹   اس جگہ سُرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپکی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہو گئی۔   ٹیلیفون نمبر رہائش ۔ ۲۳۳۳۲

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے۔

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۵)   فہرست مضامین مارچ ۸۲ء   نمبر (۳)

ایڈیٹر و نگراں نسیم انہونوی

معاونین شوکت جہاں بیگم غزالہ ــــ جانی بیگم رُدَولوی

قیمت سالانہ

امدادی خریداری	منی آرڈر سے	۳۶ روپیہ
مخصوص خریداری	"	۳۴ روپیہ
عام خریداری	"	۳۴ روپیہ

وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد

ــــ غیر ممالک سے ــــ

ساٹھ روپیہ یا اس کے مساوی غیر ملکی سکّہ۔ اپریل سے [illegible] کے مختلف شرحیں۔

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔ حریم ہر انگریزی ۵ تاریخ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے [illegible] میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

اس مادی اور سائنسی دور میں جہاں یہ تلقین کام نہیں کر رہی ہے کہ مسلم خواتین پردے کی افادیت پر غور فرمائیں اور اسے ترک کرنے کی جو وبا مغربیت کی نقالی میں پھیل گئی ہے اس سے بچیں تاکہ شرم و حیا جیسے جوہر سے محروم نہ ہو جائیں جو عورت کے بہترین زیور ہیں، بالکل اسی طرح آج خواتین اس کیلئے بھی مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہیں کہ وہ در در کی ٹھوکریں کھانے اور مردوں ہی کی طرح نوکریاں کرنے سے باز رہیں جس میں سواریوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں جس کے لئے انہیں نامحرموں کے ساتھ ان کی بدنگاہیوں کو برداشت کرتے ہوئے کام کرنا پڑتا ہے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ بداخلاق مرد انہیں بھوکی اور للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ خاموش رہنا پڑتا ہے اس لئے کہ بہرحال وہ صنف کمزور ہیں اور کچھ ایسی کمزوریاں فطرت نے ان میں شامل رکھی ہیں جو انہیں ہمیشہ سے مردوں کے مقابل کمزور بنائے رہیں۔ بنائے ہیں اور بنائے رہیں گی۔ عورت کتنی ہی اعلیٰ تعلیم کیوں نہ حاصل کر لے، کتنی ہی آزاد کیوں نہ ہو جائے لیکن مردوں سے اسے ہمیشہ دکھ پہنچتے رہے ہیں اور ہمیشہ پہنچتے رہیں گے عافیت اور سکون کی جو زندگی اسے خاتون خانہ بن کر مل سکتی ہے وہ ملازمت کر کے کبھی نہیں مل سکتی، لیکن پھر بھی عورتیں تیزی کے ساتھ ملازمت کی طرف متوجہ ہوتی جا رہی ہیں جس کے کئی اسباب ہیں۔

خواہشات رفتہ رفتہ ضروریات بن جاتی ہیں

فضول خواہشات سے چھٹکارا ملنا بہت بڑی دولت ہے

حضرت علی مرتضیٰ رض

ایک تو یہ کہ بیشتر والدین اپنی ساری آمدنی لڑکیوں کی تعلیم پر صرف کر دیا کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی والدین اس کے لئے جہیز اکٹھا کرنا شروع کر دیتے تھے اس لئے شادی کے وقت انہیں زیادہ فکر نہ کرنا پڑتی تھی لیکن آج والدین کی پوری توجہ لڑکیوں کی تعلیم پر مبذول رہتی ہے۔ اس لئے کہ شادی کے وقت صورت شکل اور جہیز کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی کتنی تعلیم یافتہ ہے آج گریجویٹ سے کم لڑکیوں کو گردانا ہی نہیں جاتا اس لئے والدین بیٹیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرانے کی کوشش میں اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ صرف کر دیتے ہیں۔ تعلیمی مصارف میں صرف اسکولی فیس اور کتابوں کا خرچ ہی نہیں ہوتا بلکہ بہترین ملبوسات وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اسکول میں متمول گھرانوں کی لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ ان کے لباس دیکھ کر متوسط اور معمولی گھرانوں کی لڑکیاں بھی والدین سے اچھے لباس وغیرہ بنواتی ہیں۔ اس طرح والدین جہیز کے لئے کچھ پس انداز نہیں کر پاتے۔ جس کے بغیر آج کل شادی ہو ہی نہیں پاتی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لڑکیاں اس بات کو خود محسوس کرنے لگتی ہیں اور وہ سوچتی ہیں کہ ملازمت کر کے خود اپنی کمائی سے جہیز کا انتظام کر لیں۔

کچھ لڑکیاں جب تعلیم سے فارغ ہوتی ہیں تو ان کے باپ ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ سوچتی ہیں کہ گھر کے اخراجات کو حسب حال قائم رکھنے کے لئے انہیں خود ملازمت کرنا چاہیئے۔

کچھ لڑکیاں اس لئے بھی ملازمت کرتی ہیں کہ ان پر والد کے انتقال سے چھوٹے بہن بھائیوں اور متعلقین کی ذمہ داری آ پڑتی ہے۔ اس لئے ملازمت کر کے گھر کے اخراجات چلاتی ہیں۔

کچھ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیکھتی ہیں کہ صورت کی کمی یا جہیز کا انتظام نہ ہونے کے باعث ان کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں۔ اس لئے وہ بیکار بیٹھ کر وقت برباد کرنے سے بہتر سمجھتی ہیں کہ ملازمت کر لیں تاکہ والدین پر بار نہ بنیں۔

اسی طرح کی اور بھی دیگر صورتیں ہوتی ہیں جن کے باعث شادی سے پہلے ہی لڑکیاں ملازمت کرنے لگتی ہیں۔ لیکن بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی۔ شادی کے بعد بھی خواتین ملازمت کرنے لگی ہیں جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ صرف شوہر ہی کی آمدنی گھر کے اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ معیار زندگی بلند ہوتا جاتا ہے جیسے

جیسی سادہ زندگی اب کوئی بھی گزارنا نہیں چاہتا۔ اعلیٰ تعلیم، آزادی اور بے پردگی کے باعث خواتین کو ہر وقت ہی گھروں سے باہر جانا ہوتا ہے اس لئے اچھے اچھے ملبوسات وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے پہلے جیسی صورت اب نہیں رہ گئی کہ خواتین گھروں سے کبھی کبھی نکلتی تھیں۔ اس لئے نہ زیادہ ملبوسات کی ضرورت ہوتی تھی نہ حسن افزا اشیاء کی۔ تھوڑی آمدنی پر بھی اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ سائنسی ایجادات نے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی کولر، ہیٹر، گیزر، واشنگ مشین، گیس اور ان کے چولھے اور ککنگ رینج وغیرہ ایسی ایسی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں کہ ان کا رکھنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے حسن افزا اشیاء میں پچاس ساٹھ سال پہلے ابٹن، مہندی اور کاجل جیسی چیزیں ہی استعمال ہوتی تھیں جو مفید ہونے کے ساتھ ہی بہت کم خرچ بھی ہوتی تھیں لیکن آج افزائش حسن کے لئے صدہا مصنوعات بننے لگی ہیں جو بے حد قیمتی ہیں اور ان کے اشتہارات اخبارات ریڈیو اور ٹی وی پر اس طرح دیئے جاتے ہیں کہ دل للچا اٹھتے ہیں اور ہر خاتون کا دل مچل اٹھتا ہے کہ یہ ساری چیزیں خرید لی جائیں۔ مزید تفصیل میں گئے بغیر میں اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کروں گا کہ اخراجات پورے کرنے کے لئے خواتین کو بھی کمائی کی راہیں نکالنا پڑتی ہیں حالانکہ عورتیں اس لئے پیدا نہیں کی گئی ہیں کہ وہ کسب زر کے لئے مردوں کی طرح کمر کس کر باہر نکلیں۔ قدرت نے ان پر دوسرے فرائض عائد کئے ہیں اور ان کی تکمیل ہی ان کے لئے ضروری ہے ان سے روگردانی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی بہر حال اگر کام ہی کرنا مقصود ہو تو کم از کم مسلم خواتین کو ایسے کام کرنے چاہئیں جو عزت کے ساتھ گھر بیٹھے ہو سکیں۔

مثال کے طور پر پڑھی لکھی خواتین اپنے گھروں میں مکتب کھول کر چھوٹے بچوں کو معمولی فیس لے کر پڑھانے کا کام کر سکتی ہیں اور ترقی کر کے مکاتب کو اسکولوں کی شکل دے سکتی ہیں۔

ایک بڑا ہی دلچسپ اور وقیع پیشہ (کتابت) کا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ لکھنؤ کے مسلم گرلس کالج نے اپنے یہاں ایک ایسا شعبہ بھی قائم کیا ہے جس میں کتابت کا فن سکھایا جائے گا اس وقت اردو کتابت کی بڑی قدر ہے میرا خیال ہے کہ اس فن کو سیکھ کر ہر خاتون ۲۰-۲۵ روپئے روز کا کام گھر بیٹھے کر سکتی ہے۔ آفس میں ملازمت کرنے کے بعد اگر مشاہرہ زیادہ ملتا ہے تو ملبوسات اور میک اپ وغیرہ کے لوازمات اور سواری کے مصارف پر تنخواہ کا بیشتر حصہ صرف ہو جاتا ہے مگر گھر بیٹھ کر کام کرنے کی صورت میں یہ تمام اخراجات بھی نہیں بچیں گے بلکہ گھر کی دیکھ بھال کے لئے بھی وقت نکلتا رہے گا۔ البتہ اس فن کو حاصل کرنے کے لئے اردو لکھنا پڑھنا ضروری ہے۔

ریڈی میڈ کپڑوں کا چلن دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں اس میں غیر معمولی نفع ہوتا ہے خواتین بھی کٹائی سلائی کی تعلیم حاصل کر کے یہ کام گھروں میں کر سکتی ہیں۔ ملبوسات تیار ہونے پر کسی بھی دکان پر دیئے جا سکتے ہیں ترقی کر کے اس کے لئے فرم بھی بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری خواتین کی مدد سے اس کام کو بھی ترقی دی جا سکتی ہے۔

اس طرح اگر خواتین چاہیں تو اور بھی کام ہو سکتے ہیں جنہیں عزت و آبرو کے ساتھ گھروں میں رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

اب آپ طلب فرما سکتی ہیں

حریم میں کتابیں حاصل کرنے کے لئے جو رعایتی اعلان شائع کیا گیا تھا اس میں شامل کتب میں۔ عروج۔ از سلمیٰ کنول اور ببول۔ از بشریٰ رحمن بھی شامل تھیں، لیکن یہ کتب تاجر سے آئیں اس لئے جن بہنوں کو اس اعلان کے تحت ۱۶ر فروری سے پہلے وی پی بھیجے گئے ان میں یہ کتب شامل نہ ہو سکیں۔ بہنیں چاہیں تو اب انھیں طلب فرما سکتی ہیں ان پر جو رعایت حسب اعلان ہوگی، دی جائے گی۔

• افسر (ماتحت سے) بیٹا ہر مصیبت کو خوشی کے ساتھ اور مسکرا کر جھیلنا چاہیئے۔
مگر جناب آپ نے تو کبھی اس کا عملی مظاہرہ نہیں کیا۔
بیٹا: تم نے شاید غور نہیں کیا میں جب بھی دفتر سے گھر جاتا ہوں تو میرے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔

• عورت۔ اگر میں مر گئی تو تم کیا کروگے؟
شوہر۔ غم سے پاگل ہو جاؤں گا
عورت۔ شاید تم دوسری شادی کر لوگے۔
شوہر۔ جی نہیں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں گا۔

اسلام کی نظر میں حقوق زوجین

محمد سرفراز

زوجین کا مفہوم یا مطلب ہے زوج اور زوج کے معنی جوڑ۔ مذکر و مؤنث اس لحاظ سے زوجین کے معنی ہیں دو زوج یعنی میاں بیوی۔ والدین اور اولاد کے بعد دنیا کا مضبوط ترین اور انتہائی اہمیت کا حامل رشتہ میاں بیوی ہے لیکن ایک نظر سے دیکھا جائے۔ تو میاں بیوی کا رشتہ اس لحاظ سے ان رشتوں سے مضبوط دکھائی دیتا ہے کہ یہ رشتے بھی میاں بیوی کے رشتے کا حاصل ہیں۔

کائنات کا سارا نظام جوڑوں کی بنیاد پر جاری و ساری ہے اور رہے گا۔ زوجین کا رشتہ ہی دراصل دنیا کی روح ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے" (الذاریات)

زوجین کی بنیاد انسانی بنا پر نکاح ہے۔ اسی سے نوع انسانی کا سلسلہ رواں دواں ہے۔ یہ وہ عنوان ہے کہ جو نہ ہوتا تو اولاد آدم کی روحانی و بدنی تسکین پریشان ہو جاتی اور وہ حیوانوں وحشیوں سے بھی آگے جا نکلتا سورۃ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے "تمہاری بیویاں تمہارے لئے پوشاک ہیں اور تم ان کے لئے تفسیر عثمانی میں ہے کہ جس طرح بدن اور پوشاک کا بہت گہرا اور ضروری تعلق ہے اس طرح میاں بیوی کا بھی قریبی تعلق ہے اسطرح اسلام میں میاں بیوی کے تعلق کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

جس طرح انسان کا پوشاک کے بغیر گزارہ نہیں۔ اسی طرح میاں بیوی کا بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں۔

جس طرح پوشاک موسم کی سختی کو روکتی ہے اسی طرح میاں بیوی بھی مصائب کے مقابلے میں ایک دوسرے کی ڈھال ہیں۔

پوشاک عزت اور آبرو کی محافظ ہے۔ عریانی اور بے حیائی سے بچاتی ہے میاں بیوی بھی ایک دوسرے کی عزت اور آبرو کے محافظ ہیں ایک دوسرے کو عریانی اور بے حیائی سے بچاتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل نہیں ہونے دیتے۔

صاف اور بدن زیب پوشاک سے انسان کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح نیک اور مذہبی میاں بیوی ہوں تو ان کو ایک دوسرے سے فرحت اور تسکین ملتی ہے۔

سورۃ الروم میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زوجین کو اس لئے بنایا کہ وہ ایک دوسرے سے سکون پائیں۔ اور (لہذا) ان میں محبت و رحمت پیدا کر دی۔

میاں بیوی کا رشتہ ایک مقدس رشتہ ہے یہ عمر بھر کا رشتہ ہے لہذا ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ جب نکاح ہوتا ہے تو مرد و زن خود ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں مطلب خطا کا پتلا ہے۔ اگر ایک دوسرے کی چھوٹی موٹی غلطیوں پر ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے ازدواجی زندگی نہ صرف تباہ و برباد ہو جاتی ہے بلکہ وہ زوجین کوئی اچھی اور مفید نسل بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ بسا اوقات زوجین آپس کے تعلقات میں گڑبڑ کی وجہ سے بڑے اور ممنوع کاموں کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جو کہ انتہائی گناہ ہے اور سخت سزائیں مقرر ہیں۔ خصوصاً مردوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ارشاد ربانی ہے کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو اگر تم نے انہیں پسند نہیں کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس چیز میں خیر کثیر رکھ دے۔

اسی طرح نبی کریم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کی سخت کلامی پر صبر کرے اس کو حضرت ایوب علیہ السلام کا سا ثواب ملے گا۔ اور جو اپنے شوہر کی بدخلقی پر تحمل کرے اسے حضرت آسیہ (زوجہ فرعون) کا سا اجر ملے گا۔

اللہ تعالیٰ نے احترام کے لحاظ سے میاں بیوی کا درجہ مساوی رکھا ہے۔ اسلام کا جو نظریہ زوجین انسانی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ نہ ہی اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ خاوند بیٹھے بٹھائے بیوی پر ہاتھ اٹھائے اور نہ ہی بیوی کو چھوٹی موٹی بات کو لڑائی کا پیش خیمہ بنا لے۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت کے جذبات بدرجہ اتم موجود ہونا چاہئیں۔ عورت اور مرد کی مساوات انسانیت کے نقطہ نظر کے لحاظ سے مساوات ہے لیکن انتظامی لحاظ سے الگ الگ ہے۔ گھر کا سربراہ فقط ایک ہی ہو سکتا ہے۔ مرد کو دین اسلام نے گھر کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ یعنی بیرونی انتظامات کے لئے مرد کو اور عورت کو گھر کے انتظامی کاموں کے لئے۔ حدیث مبارکہ ہے "خاوند بیوی کا محافظ اور پشتیبان ہے۔ اس سے پر مشتمل ہوگی بیوی اپنے خاوند کے گھر کی نگران ہے

اس امر میں وہ جواب دہ ہوگی ۔

مرد اپنے اہل وعیال کی کفالت کا ذمہ دار ہے گھر کے سربراہ کی حیثیت سے یہ مرد کا اولین فرض ہے اور اس کام سے عہدہ برآ ہونا بڑی فضیلت ہے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ انسان کے اعمال کے پلڑے میں جو چیز سب سے پہلے رکھی جائے گی وہ اس کا کنبہ پر کیا ہوا خرچ ہوگا۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بدترین شخص وہ ہوگا جو بیوی کا شریک راز ہوا۔ اور اس نے بیوی کا بھید کھول دیا۔ اسلام کے نزدیک میاں بیوی کا رشتہ کتنا پسندیدہ ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ اگر دونوں میں صلح و صلاح کے لئے طرفین کسی قدر جھوٹ بھی بول دیں تو اسلام اسے روا رکھتا ہے۔ آئیے اب ہم زوجین کے حقوق علیحدہ علیحدہ دیکھتے ہیں۔

خاوند کے حقوق

خاوند کا درجہ اس حدیث مبارکہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر غیر اللہ کے آگے سجدہ جائز ہوتا تو میں حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بیوی اس حالت میں وفات پائے کہ اس کا خاوند اس سے خوش ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔ یہ بات متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

بیوی کے حقوق

دین اسلام کے ظہور سے قبل عورت کے حقوق جس بے دردی سے پامال ہو رہے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ معاشرے میں اس کی کوئی حیثیت و اہمیت نہ مانی جاتی تھی۔ جوئے کے داؤں پر لگا دیا جاتا تھا اور یا اور یہ کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹے اپنی سوتیلی ماؤں کو موروثی مال سمجھ کر اپنے عقد میں لے لیتے تھے۔ لیکن جب ظہور اسلام ہوا تو اس نے عورت کو وہ حقوق عطا کئے کہ آج بھی کسی دوسرے مذہب میں اسے حاصل نہیں ہیں۔

آپؐ نے فرمایا "تم میں سے بہترین وہ ہے جو بیویوں کے حق میں اچھا ہے۔"

ایک اور جگہ فرمایا کہ مومن (خاوند) کو مومنہ (بیوی) سے بغض نہیں رکھنا چاہیئے اگر اس کی ایک خو خاوند کو ناپسند ہوگی تو دوسری پسند بھی ہوگی۔

ایک صحابیؓ نے نبی اکرمؐ سے عرض کیا کہ ایک عورت کا حق شوہر پر کیا ہے۔ فرمایا جو خود کھاؤ، اسے بھی کھلاؤ خود پہنو تو اسے بھی لباس دو، اس کے چہرے پر نہ مارو۔ اس کی برائی نہ مانگو۔

گھر کے سارے اخراجات کا ذمہ دار مرد ہے۔ بیوی کو حق ہے کہ وہ خاوند کا مال جائز اخراجات میں اٹھائے۔ خاوند (جائز معاملوں میں) بہت تنگی کرے تو بیوی (جائز معاملوں میں) بقدر ضرورت لے سکتی ہے۔

بچہ دودھ پیتا ہو اور اس دوران میاں بیوی میں طلاق ہو جائے اور پھر ماں بچے کو دودھ پلائے تو وہ اس کا معاوضہ بچے کے باپ سے وصول کر لے گی ورنہ ماں پر رضاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

خاوند کی وفات پر بیوی کو اس کی وراثت کا متعین حصہ ملتا ہے یعنی اولاد ہو تو آٹھواں ورنہ چوتھا۔

خاوند خرچ کے سارے راستے بند کر دے تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے جہاں سے اسے نان ونفقہ یعنی رہنے سہنے اور کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات کی ڈگری دی جائے گی۔ اگر بیوی طلاق لے تو خاوند کو بیوی کا حق مہر ادا کرنا ہوگا۔ بیوی معاف کر دے تو اور بات ہے۔ بیوی کی زندگی میں اس کے مال پر خاوند کا کوئی حق نہیں۔ مرنے کے بعد البتہ وارث ہو سکتا ہے ہاں اگر بیوی اپنی خوشی سے اس پر خرچ کرے تو باعث ثواب ہے۔

اقوال زریں

- تمہارے رخسار پر شرم کی ایک لکیر اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ تمہارے دل میں دھبہ ہو۔ (سروانٹس)
- شرمیلی عورت کو کسی زیور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (اربیڈس)
- ایک خوبصورت عورت کی حیا بار پلکوں اور جھکی ہوئی نظروں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا۔ (مارٹر)
- خوش نصیبی اور سعادت کے فرشتے اس گھر میں نہیں آتے جس میں عورت نہ ہو۔ (سکندر اعظم)
- عورت گھر کی چار دیواری کا روشن چراغ ہے۔ (پشتو ادب)
- آج ہم اچھائی، رحم اور مہربانی کے سادہ الفاظ سے خوف زدہ ہیں۔ ہم ان پرانے الفاظ پر عمل پیرا ہونا نہیں چاہتے کیونکہ ہمیں پرانے اقدار پسند نہیں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہماری طبقہ دنیا بیمار ہے۔
- اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے خط کا جواب دیا جائے تو ضروری ہے کہ آپ جوابی کارڈ یا جواب کے لئے ٹکٹ روانہ فرمائیں۔
- پرچہ نہ ملنے کی شکایت کے متعلق لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریداروں کو

صورت یا دولت

عفت موہانی

اماں بی نے بعد نماز بڑی لگن سے دعا مانگی اور بے حد عقیدت سے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے۔ جانماز لپیٹ کر طاق پر رکھتے ہوئے انھوں نے اتنی گہری آہ بھری جیسے پھیپھڑوں کی ساری سانس اسی ایک آہ کے ذریعے باہر نکال پھینکی ہو۔ پھر کمر پر ہاتھ رکھے کچھ کراہتی کچھ بڑبڑاتی وہ باورچی خانے کی طرف ہولیں۔ ابا میاں بعد مغرب کارخانے سے آئے تھے۔ ان کے لئے گرم دوہری روٹیاں ڈالنا اماں بی ہی کا فرض تھا کیونکہ وہ دھندلکا ہونے کے بعد سوزن کاری قطعی نہ کرسکتی تھیں۔ یہ کام جہاں آرا کا تھا۔ ماں بیٹی نے اپنے اپنے فرائض بانٹ لئے تھے۔

اماں نے جو گہری سانس لی تھی وہ سچ مچ جہاں آرا کے دل میں جا چبھی تھی اب یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہ اماں بی سے فرمائش کرتیں کہ خدا کے لئے آپ یہ سانسیں نہ لیا کیجئے۔ یہ زہریلے تیر ہیں جو میرے دل و جگر میں گڑتے ہیں اور زندگی کو بھی زہر آلود کردیتے ہیں جب کہ جہاں آرا کو خوب معلوم تھا کہ اماں بی کی یہ آہ بازی صرف انہی کی ذات کی وجہ سے ہے۔ اگر آج وہ اپنے گھر در سے ٹھکانے لگی ہوتیں تو بھلا کاہے کو یہ گیت ستم سہنے پڑتے۔

جہاں آرا نے چندھی روشنی میں پلکیں جھپکائیں جالا سا چھایا جا رہا تھا آنکھوں میں۔ پھر ٹھنڈا اور سرکا کے آنکھیں لیں اور پھر خود بھی ایک سانس لے کر تارکشی کرنے لگی۔

اتنے میں بوسیدہ دروازہ چرچرا کے کھلا اور بادامی چارخانے کا رومال کندھے پر ڈالے۔ انگلی پر تسبیح لپیٹے ابا صحن میں نظر آئے۔ جہاں آرا نے دوپٹے کا آنچل سر پر ڈال لیا۔ ابا پہلے حیدرآباد کے کسی نواب کے باغ پر نگراں کار مقرر تھے۔ نواب صاحب بھی ابا سے وفاداری نباہ گئے اپنی زندگی تک برابر چار سو روپے ماہوار عید تہوار پر وہ کپڑے لتے اور اضافہ تنخواہ سے بھی سلوک کرتے اور پھل پھلاری تو روز کی چیز ٹھہرے۔ مزے میں گزر ہو رہی تھی ابا شاید یہ سمجھتے تھے کہ یہی لیل و نہار سدا رہیں گے تھوڑا بہت اکائی

بچی کے لئے جمع جوڑ لی اور باقی سب پیٹ کے دوزخوں میں اترتا رہا۔ جو کچھ تولہ ماشہ سونا چاندی لوٹا کٹورہ اور پانچ سات کپڑے ولے کے جوڑے تھے وہ بھی اماں بی کی دوراندیشی کی وجہ سے تھے ورنہ ابا تو چار دن خانے مست الست آدمی تھے۔ جو سامنے آیا اللہ کا شکر ادا کرکے لے لیا۔ نہ کسی چیز کی ہوس نہ لالچ نہ تیرے میرے ہاتھ سے چھیننا انہیں آیا۔ وہ اپنے مولا پر نظر کئے بیٹھے رہے۔ لیکن ننھی منی جہاں آرا جو ابھی کل تک چاندی کی پازیب پہنے آنگن بھر میں چھن چھن کرتی پھرتی تھی۔ بڑی ہوکر قاعدے قرینے سے سر ڈھانکے نظریں نیچی کئے ابا کے سامنے آتی تو اچانک ابا کا دل دھڑک اٹھتا خدا خیر کرے۔ میری جانی تو ماشاء اللہ ..... اور پھر ان کے ادھیڑ دل نے وحشت بھری زقند ایک اور لگائی۔ اب اس کا بیاہ ہوگا۔ مگر گھر کے آگے بڑی لمبی اور گہری خندق تھی جسے سامان جہیز جوڑے گھوڑے کی رقم اور سسرال والوں کے مطالبات سے منہ تک بھرنا پڑے گا۔

ابھی تک وہ بیٹی کے اس فرض اور اس کے سسرالی، فرضی رشتہ داروں کے اللہ واسطے کے قرض سے لاپرواہ تھے۔ اب یکبارگی آنکھیں کھلیں تو لگا کہ سامنے ایک چٹیل میدان ہے جس میں کڑی دھوپ لہریں لے رہی ہے اور جہاں سبزی کا نام تک نہیں۔

ان کا اللہ اللہ کا وظیفہ دونا ہوگیا۔ تہجد کے وقت اللہ الصمد کی ضربوں میں شدت پیدا ہوگئی۔ تسبیح کے دانے سو کی جگہ پانچ سو ہوگئے انھیں پورا یقین تھا کہ بعض مرض صرف دعا ہی سے دور ہوجاتے ہیں لیکن وہ بے چارے پرانے وقتوں کے آدمی تھے۔ جن کے زمانے میں سوا سو مہر، جہیز کے نام پر لوٹا کٹورہ اور تن کے کپڑوں ہی سے لڑکی سسرال چلی جاتی تھی۔ انھیں پتہ نہ تھا کہ جہیز کے کینسر کے لئے دوا کے نام پر روپیہ بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ دوا بے چارے شیخ صاحب کے پاس نہ تھی صرف دعا ہی تھی جس نے انہیں مزید سخت ترین آزمائش میں مبتلا کردیا۔

ہوا یوں کہ نواب صاحب جو کچھ شوق ذوق کے آدمی تھے ایک رات انھوں نے اتنا شوق کرلیا کہ فرط مسرت سے سوتے کے سوتے رہ گئے! وہ اگر سو گئے تو ان کی رہی لیکن وہ تو شیخ صاحب کی تقدیر کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا گئے۔ نواب صاحب کے [illegible]

کوٹھی کا جلدی جلدی گلا کے فرشتہ اپنے مزدوری کام پر چلا گیا تھا تو یہ اگر رنگت ہی گلاب جامن ہوتی تو مدلبعد کر صبر کر لیا جاتا کہ ناک نقشہ تو ٹھیک ہے۔ وہاں تو کوئی چیز قاعدے کی نہ تھی رنگت دھنویں کی سی۔ دو انگل کی دویں دار پیشانی۔ ننھی ننھی سی آنکھیں بانسے پر ناک بیٹھی ہوئی۔ نچلے پپیلے پپیلے۔ سرمئی ہونٹ وہ بھی موٹے موٹے۔ گردن اندر دھنسی ہوئی۔ گدبدا بدن اوپر سے موٹی آواز۔ لیکن وہ خود کو حور پری سے کم نہ دیکھتی۔ اس صورت پر گلابی پاوڈر کی پچکاری کر کے اور دھندلے ہونٹوں پر لپ اسٹک تھوپ کے وہ جب منہ بنا کر بات کرتی اور ادا کاری کر کر کے چلتی پھرتی تو جی چاہتا کہ بھاگئے اس کے پاس سے۔ باپ کی دولت، اپنے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا اسے خوب اندازہ تھا جسے چاہے منٹوں میں خرید لے۔ جو چاہے کرے سب اسی کا تھا۔

تو ان بیوی کے لئے بیگم حسن نے شرائطیں دو دو ڈار رکھی تھیں کھلی چھوٹ تھی لڑکوں کے لئے۔ جوڑے گھوڑے کے نام سے جو بھی بھیک مانگیں گے ملے گی۔ موٹر اسکوٹر، رنگین ٹی وی، بکو ڈریسنگ کی الماریاں۔ ہزاروں سے سلام کرائی چاہیئے۔ بے شک لے دیکھیا! آخر کار اکلوتے داماد ہوں گے۔ کہو تو ہوٹل بلڈر پر کوٹھی بھی مع ساز و سامان کے دلوا دیں۔ یا۔ باہر جانا چاہو تو اس کا انتظام بھی منٹوں میں کر دیا جائے۔

کئی ایک لڑکے لاکھ میں آئے بھی تھے ان کے گھر سے عورتیں لڑکی دیکھنے تشریف لاتی تھیں خوشامد کے مارے ان کی خوب خاطریں ہوتیں۔ لڑکی کو بھی بارہ مسالوں سے لیپ پوت کے سامنے بٹھایا گیا مگر وہ نمک حرام عورتیں لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کے ایسی رفو چکر ہوئیں کہ پھر چڑیلوں نے دوبارہ جھانکا بھی نہیں۔ بیگم حسن فکر مند تو تھیں مگر پریشان نہیں۔ کوئی عقل کا منہ مد تو ملے گا ہی۔ اتنی بے پناہ دولت آخر کوئی چیز تو ہے۔ لڑکی سالہا سال جوان ہے تو کیا۔ اسے ہتھی پر پہنچانا یا حسن کے مقابلے میں ابھارنا تو نہیں ہے۔

شیخ صاحب کی بیوی نے ان سے اپنا دکھڑا سنا دیا تھا، جواب میں بیگم حسن نے کہا تھا۔ "ارے آپ کا بھی کیا بھلا کیا پریشانی ماشاء اللہ وہ تو کمتن کی حیثیت ہے آنکھ بند کر کے کوئی قبول کرے تو خوبصورت

لڑکی اگر جہیز نہ بھی لے جائے تب بھی سسرال والے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ مصیبت تو ہماری ہے۔ ماں ہوں تو کیا۔ بے انصافی تو کر نہ سکوں گی۔ میری فرو بی بی۔ واہ واہ۔ ان کا کیا ہوگا۔ شیخ صاحب سے کہئے کہ ان کے لئے ذرا دعا فرمائیں۔

"یہ وہ تو ہے بہن۔ مگر آدمی بھی تو اپنی سی کوشش کرے۔"

"ہاں ہاں۔ اور کیا۔ اچھا۔ آپ اطمینان رکھیے اب کی بار آئیں گی تو میں آپ کی طرف بھی بھیج دوں گی۔"

جہاں آرا اور فرخندہ اختر بی بی میں خاصہ بہناپا تھا —— وہ اپنے حال میں، اپنی کھال میں مست تھی مگر ان کی دوستی میں امارت و غربت کے اعتبارات شامل نہ تھے فرخندہ اختر مزے لے لے کے اپنی کالج کی سہیلیوں کی محبت کے قصے سناتی تھی۔ اور جہاں آرا فلمی معلومات کے دریا بہاتی تھی معلومات سے مستفیض دونوں ہوتیں بہر حال نبھ رہی تھی۔

فرخندہ کا محبت پر بڑا پکا اعتقاد تھا۔ محبت نہ ہو تو دنیا ویرانہ نظر آتی مگر انہیں شکوہ بھی تھا کہ ان سے کسی نے محبت نہ کی تھی اس مرحلہ پر جہاں آرا نے ٹوکا تھا۔

"ناشکری نہ کرو! حسن چچا اور چچی ماں تم پر جان چھڑکتے ہیں تمہاری صورت دیکھ دیکھ کے جیتے ہیں اور کیسی محبت چاہتی ہو تم۔"

"تم بھی نری ملانی ہو جہاں آرا۔" فرخندہ حقارت سے ہنس دی "ارے ماں باپ کی محبت سے کیا ہوتا ہے یہ تو روزمرہ کی سیدھی سادی پھیکی میٹھی چیز ہے۔ جیسے کہ بس مونگ کی دال روٹی کہ عمر بھر کھائے جاؤ۔ ہمنہ ——"

"ہائے اللہ تو پھر کیا چاہیئے ——" سوئی تاگا ہاتھ سے رکھ کر جہاں آرا حیرت و تعجب کی دلکش تصویر بن کر رہ گئی۔

"تم کبھی فلم نہیں دیکھتیں شاید؟"

"ایک دیکھا تھا۔ کیا نام —— "خانۂ خدا" جہاں آرا نے فخر سے بتایا۔ حج کے بعد قربانی کا منظر —— ایمان تازہ ہو گیا۔ سچ۔"

"ارے تم بل کی چوتیا ہو۔ بی بی۔ خانہ خدا کو ادھر رہنے دو" فرخندہ نے کہا۔ "تم اگر وہ والا کھیل دیکھتیں۔ جوانی کی دوا تیں پھر بھول جاتیں یہ اپنی نمائیت —— شیخ چچا نے اپنا سا تم کو بھی تیار کیا ہے بھلا تمہاری یہ عمر۔ یہ جوانی اور باتیں سنو تو ایسی کہ جیسے اماں

بڑے سے اکٹھا کو چلی آرہی ہو۔

"ارے توبہ گناہ ــــــ ۔" جہاں آرا نے خلوص دل سے توبہ توبہ کی

"گناہ ؟" فرخندہ نے قہقہہ لگایا۔ "سنو شاعر کیا کہتا ہے۔

رحمت بے پناہ کی سوگند ؟ زندگی کا مزہ گناہ میں ہے

جس نے گناہ نہ کیا اس نے خدا کی رحمت پر بھروسہ نہ کیا اور پھر گناہ ثواب کیا۔ کون سے ایسے فرشتے ہم تم ہیں کون سا بار بار دنیا میں آنا ہے۔ جب تک جیئے عیش کیا۔ مرنے کے بعد کس پر کیا گزرتی ہے کوئی بتانے نہیں آتا۔ سچ مچ تمہاری سی شکل میری ہوتی تو میں ایسی کس کی محبت کرتی کہ تمہیں نچوڑ لیتی اس کم بخت زندگی سے جو اب رد کھی پھیکی کسی مصرف کی نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو کوئی سن لے تو ـ !"

"سن لے ـ مجھے ڈر ہے کسی کا ــ ایسی تیسی ـ"

"زندگی وہی اچھی فرخندہ بی بی کہ کسی ایک کے ہو کے جیئے ـ اطمینان سے بسر کی اور پھر ــــــ "

"عمر بھر گھاس کھایا کئے گدھوں کی طرح ـ پھر مر گئے یہی ہے زندگی ؟ چھی ـ لاحول ــ !"

ان باتوں میں جہاں آرا کو ایسا لطف آنے لگا کہ اب وہ فرخندہ سے ملنے کی خاطر ان کے گھر بھی جانے لگی تھی ـ محبت کا تذکرہ، کسی فرضی محبوب کا ہیولائی وجود ـ مفارقت اور ملاقات کے تذکرے اور بھی تذکرے جیسے زندگی میں اب رنگ بھرنے لگا تھا۔

بالآخر رسول بی مشاطہ کی ان تھک کوشش رنگ لائی انہوں نے شیخ صاحب سے ایک پیام کی نشاندہی کی۔ گھرانہ اچھا تھا لڑکے کی پہلی بیوی سال بھر کا بچہ چھوڑ کر ختم ہو گئی تھی اب حامد میاں کو بچے کی خاطر دوسری بیوی کی تلاش تھی ـ ان کی عمر خود بھی ابھی کیا تھی ـ بمشکل تمام تیس کے تھے ـ ماں دائم المریض تھیں ـ پوتے کی دیکھ بھال انہیں ناممکن تھی ـ حامد میاں کے ہاں پہلی مرحوم بیوی کا لایا ہوا سارا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ غریب دو سال ہی دلھن رہی ابھی تو جوڑوں کے ٹانکے بھی نہیں ٹوٹے تھے لہٰذا حامد میاں کا مطالبہ ایک چھنجھی کوڑی کا بھی نہ تھا۔ وہ شریف سلیقہ مند لڑکی چاہتے تھے جو گرہستی چلا سکے اور ان کے بچے کی سوتیلی ماں نہ بنے۔

شیخ صاحب اور ان کی بیوی کو یہ رشتہ پسند تو تھا مگر وہ مذبذب تھے ـ سوتیلا ناطہ ہمیشہ برا ہوتا ہے ماں اپنے بچے کو تربیت کی خاطر پیٹے تو کوئی نہیں کہتا ـ سوتیلے بچے کو ایک تھپڑی بھی چھوا دو تو بدنامی ـ اگر دو اور دو کچھ نہ کہو تو بھی بدنامی کہ سوتیلے بچے سے مطلب ہی کیا ہے شیخ صاحب ڈرتے تھے کہ کہیں پرائے بچے کے سلسلے میں ان کی عابد و زاہد لڑکی اللہ کی گنہگار نہ ہو جائے کوئی کوتاہی اس کا بڑا گناہ نہ بن جائے۔

ان کی بیوی کو رشتہ دل سے پسند تھا۔ ارے ایک سال کا بچہ کیا جانے اپنی ماں کیا دوسری ماں کیا۔ جہاں آرا جس طرح چاہے گی بچے کو رکھے گی کیا اسے اللہ کا خوف نہیں ہے ـ انھوں نے مشاطہ سے کہہ دیا کہ حامد میاں کو اطمینان دلا دے یہ رشتہ ہو جائے گا۔ لڑکی مفت میں اٹھا رہی تھی نہ کچھ لینا نہ دینا۔ اب وہ کنوارے کی تلاش میں اپنی لڑکی کو دراکاٹ تو کرنا نہیں تھا۔

مگر جہاں آرا دل ہی دل میں اینٹھ بل رہی تھی ـ اماں ابا کی عقلوں پر پتھر پڑے ہیں۔ بھلا انھیں سسرال میں جا کے دیں دیں کرتے بچے کی گیلے پوتڑیاں دھونا ہے ؟ منہ دکھائی میں میاں سال بھر کا روتا بسورتا بچہ گود میں ڈال دیں گے ان کے نصیب میں یہی خواری لکھی ہے ایسا ہی کیا نگوڑا نصیب ــ ان کا سکون چین حرام تھا مگر وہ بھلا منہ سے کیا بول سکتیں۔ خاموش احتجاج کیا کیں ـ جان بوجھ کر کسی گاہک کی ساڑی الٹی کاڑھ دی اس طرح بیل بوٹے بنائے کہ پھول نیچے ڈنڈیاں اوپر ! ایک دن کھانا نہ کھایا بخار کا بہانہ کر کے کوٹھری سے نہ نکلی ـ مگر کچھ نہ ہوا شیخ صاحب نے الٹے سارے کام سیدھے کرئے اماں نے رکھے اٹھائے کپڑوں کو دھوپ دکھائی اپنا گلے کا ہار میاں کو دیا کہ نئے سرے سے گندھوا لائیں۔ برتنوں پر قلعی کروائی اور ان کے چھوٹے سے گھر میں سچ مچ شادی کا سامان ہونے لگا اور جہاں آرا کا دم گھٹنے لگا۔

ایک روز مرہ کی سی صبح تھی مگر جہاں آرا کو یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات خونیں دھند میں لپٹی ہو ایک پیارے دن کو نگلنا نے کے لئے۔ وہ باغ کے راستے فرخندہ کی کوٹھی کی طرف ہو لی اب کسی کو کیا خبر کہ دست قدرت کس طرح کتاب زندگی کا ورق پلٹ دیتا ہے ـ باغ کے گیٹ پر وہ بری طرح جھجکی ایک طالب علم نما صاحب باغ کے گیٹ پکڑے پھولوں کی سیر کر کے سگریٹ کا دھواں اگل رہے تھے جہاں آرا

کو دیکھ کر انہوں نے سگریٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جہاں آرا کا یہ حال کہ جیسے سارا جسم ماؤف ہو گیا تھا۔ مطلب یہ کہ ہر بن مو سے پسینے کے چشمے جاری تھے آنکھوں کے آگے اندھیرا ناچ رہا تھا اور پاؤں کا دم نکل گیا تھا کہ وہ بے چاری الٹے پاؤں بھاگ بھی نہ سکی۔ ان صاحب کا چہرہ بھی سرخ ہوتا نظر آیا۔

بھابی ادھر سے فرخندہ نے آواز دے لی۔ وہ جیسے نیند سے جاگی اور بڑی بدحواسی سے آگے قدم بڑھا دیئے ان کی ابتر حالت دیکھ کر فرخندہ ہنسی کے مارے بے حال ہو گئی۔

"میرا سامنا ہو گیا۔ تھے کون؟" انھوں نے دل کو سنبھال کر پوچھا۔

"امی جان کے بھتیجے" فرخندہ نے خاصی مہارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"اچھا اچھا۔ میں سمجھ گئی۔"

"پسند آئے؟"

"کمال کرتی ہو فرخندہ بی بی۔ بھلا وہ غیر مرد ——" وہ پھر گلابی ہو گئیں۔

"یہ دکھوے کے لئے آئے ہیں؟" زہر بھرے انداز میں ہنس کر فرخندہ نے اطلاع دی۔

"دیکھئے —— ہمارے ہیں وہ تو آدھی بارات کو ساتھ لانا چاہیئے تھے کوئی معمولی بر دکھوا ہے۔" وہ بناوٹی ہنسی ہنس کر بولی۔

"معاف کرو۔" فرخندہ نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا۔ روز اول سے یتیم یسیر ہیں۔ ابھی تک یونیورسٹی ہوسٹل میں جھک مارا کئے تھے۔ اب ایم کام کر لیا ہے اس وقت کی نگرانی کے لئے ابا جان نے بلا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ——!"

"بہت اچھا ہے ایسا ہو جائے تو۔ مطلب یہ کہ گھر داماد۔"

"میاں نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اس نکما گدا ——" فرخندہ بولی۔

جہاں آرا جو ہمیشہ راتوں کی تنہائی میں فرضی محبوب سے وصل و ہجر کا شکوہ کرتی تھی۔ ان کے تصور سے دل بہلایا کرتی تھی سچ مچ ایک محبوب کا سراپا دل میں بسائے گھر لوٹی اور بڑی نفرت سے دیکھا کہ بوا لطیفن اور نانی رحمت اماں بی کے ساتھ لگی تو شک میں ٹانکے ڈال رہی ہیں۔ دل سے ایک بھنکار سی نکلی اور وہ بڑھیوں کی صاؤں کو پیچھے پھینکتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

جہاں آرا کو یقین تھا کہ ان کی سی کلوٹی، بدشکل زبان دراز لڑکی کو شاہنواز علی خاں ہرگز ہرگز پسند نہیں کر سکتے اور ان کے جیسے اکیلے، بے روزگار اور تنگدست لڑکے کو حسن چچا اپنا داماد نہیں بنا سکتے مگر بات آ پڑی تقدیر کے لکھے کی —— ارے بھائی جوڑا تو اللہ میاں آسمان پر بنا دیتے ہیں نا۔ چنانچہ یہ جوڑا بھی بن ہی گیا۔

فرخندہ کے ہاں آتے جاتے جانی بوجھی لاپرواہی سے شاہنواز سے جہاں آرا کا کئی بار سامنا ہوا مگر وہ لئے دیے رہی۔ تقدیر کی تحریر سے بیخبر وہ انتظار کرتی رہی کہ کب شاہنواز ان کا ہاتھ تھام آنکھوں سے لگائیں گے اور کہیں گے اس کالی پہاڑی سے مجھے بچاؤ۔ اہا ہا ہا۔ تم کتنی خوبصورت ہو۔ اور پھر وہ شاید مارے خوشی کے مر جائے گی۔ شاہنواز کے بے انسان کے لئے وہ بنی تھی بس فرخندہ کو تو اپنے باپ کے گھر داماد سے نفرت تھی۔

لیکن جانے کیا ہو گیا۔ اچانک حسن صاحب کے بنگلے میں ایک نئی زندگی جاگ اٹھی۔ ایک دن بیگم حسن خوشی خوشی شیخ صاحب کے گھر آئیں اور جہاں آرا سے بولیں۔ "اللہ نے فرہ بی بی کا جوڑا بھی اپنے گھر سے اتار ہی دیا۔ اے ہاں اور کیا بھائی میاں کا جانا بوجھا لڑکا ہے پڑھا لکھا، اپنی ہڈی اپنا خون اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی کو دور دراز ہو کے کہیں جانا نہیں ہے۔" "وہ" تو گھر داماد بنا رہے ہیں۔ چلو اچھا ہے ہمارا سب کچھ لڑکی ہی کا تو ہے۔ بی بی جہاں آرا بی بی تم ذرا چلی آنا۔ میں اکیلی ہوں۔ بہن کے بیاہ میں ہاتھ بٹانا۔ اللہ تمہارا بھی نصیبہ نیک کرے۔

جہاں آرا کے سینے میں سانس رک گئی بمشکل ہکلائیں۔ "فرخندہ تو شاہنواز میاں کو ناپسند کرتی۔"

بیگم حسن نے برجستہ قہقہہ لگایا۔ "ارے اس نک چڑھی بیٹی کی انصاف کی بات اسے ملے گا کون —— تو بیٹی تم چلی آنا۔ بھر شاہنواز"

اور جب وہ سر جھکائے جیسی قیمت جوڑوں میں ٹانکے لگا رہی تھی تو یوں لگ رہا تھا کہ ہر ٹانکے میں اس کا ایک ایک خاموش مرمراہٹ بھی ٹنکا جا رہا ہو۔ عجب سا تعجب تھا آخر فرخندہ راضی کیسے ہو گئی۔ شاہنواز علی خاں کا تو یہ حال تھا کہ بے پایاں دولت نے ان کی آنکھوں پہ ایسی پٹی باندھی تھی کہ حسن و بدصورتی انھیں نظر ہی نہیں آ رہی تھی وہ دالان میں کھڑے تھے۔ اور مذاق کر رہے تھے۔

بھی معلوم نہ تھا کہ سالی صاحبہ ہر فن مولا ہیں ہماری پھوپھی کا لاڑھا ہے کہ گت ہے کہ کلیجہ نکال کے رکھ دیا ہے! اب ہم انہی سے کام بنوایا کریں گے!"

دسوں انگلیاں دسوں چراغ، بیگم حسن اس گھٹیا مذاق پر ہنس دیں تب ہی جہاں آرا نے سامنے پھیلے ملبوسات ایک طرف سرکا دیئے اور کچھ کہے بغیر اپنے گھر آگئی۔ شیخ صاحب اللہ کا تھے کر شاطر کو تعلی اور آخری مثبت جواب دے رہے تھے! ایک معلق سانس جہاں آرا کے سینے سے نکلی۔ اس نے وضو کرتے ہوئے سوچا۔ اب یہ ماشاء اللہ ایک پھول سا بچہ کھلائیں گے۔ اور آسودہ انداز میں جانماز پر آکھڑی ہوئی۔ (عنبر سلطانہ)

پسندیدہ اشعار

اس کالم کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ موزوں اور پاکیزہ ہو۔ ساتھ ہی ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جس ماہ میں شعر چھپنا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ر تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانا چاہئے۔ اپریل کیلئے عنوان ہے "خیال" اور مئی کے لئے "اثر" غلطی سے مارچ کے لئے دو عنوان شائع ہو گئے ہیں۔ عذاب اور محفل اس لئے دونوں کے تحت اشعار شائع کئے جا رہے ہیں۔

سفر تنہا بہر صورت عذاب جان ہوتا ہے
نہ ہے قسمت سفر میں ہمسفر دو چار ہو جائیں۔

مرسلہ: کاکا وحیدہ ناز (عمر آباد)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مرسلہ: کے سمیعہ صبا (آمبور)

میری طرح نہیں جو حریفِ نشاطِ کرب
اس کو فغانِ نیم شبی کا عذاب دے

مرسلہ: مجمہ الصار (بھٹکل)

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مرسلہ: سہیلہ (مدارس)

مرسلہ: مس کوثر ترنم (آمبور)

مرسلہ: نصیرہ تبسم، عطیہ سلطانہ

مرسلہ: قرۃ العین (نندلی)

مرسلہ: کشور سلطانہ۔ لال باغ لکھنؤ

مرسلہ: ب۔ن آمنہ ابراہیم (بنگلور)

جدا ماں باپ سے ہونا حقیقت میں مصیبت ہے
مگر مجبور ہے انساں کہ یہ قانون قدرت ہے

مرسلہ: راحیلہ اسد (آمبور)

آنکھوں میں تو آنسو ہیں اور ہونٹوں پہ ہنسی ہے
یارب یہ کس عذاب میں جاں میری پھنسی ہے

مرسلہ: مسرور تمنا

نہ شاعری نہ محبت نہ جام اے واعظ
یہ زندگی بھی تری ایک عذاب کی سی ہے

مرسلہ: شہناز یوسف احمد (کراچی)

عام بالا میں وہ ہیں، نور ان کا دل میں ہے
چاند ہے چرخ بریں پر، چاندنی محفل میں ہے

مرسلہ: مہ پارہ صبا (بھاگلپور)

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا

مرسلہ: عالم آرا (آرہ)

ہنسنے کی شرط نہیں

• ایک لڑکی نے اپنی شادی شدہ سہیلی سے کہا کہ مجھے اب اپنی جوانی سے نفرت ہو گئی ہے۔
سہیلی نے فکرمند ہو کر پوچھا کیوں؟ کیا اس لئے کہ کہ وہ ختم ہو گیا ہے۔
لڑکی نے مایوسی سے جواب دیا۔ نہیں اس لئے کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

شکستِ محبت

امروزجہاں (آرہ)

وہ بہار کا ایک خوبصورت دن تھا جب میں تم سے ملا تھا۔ وہ دن کتنے حسین تھے جب تم میرے ساتھ تھیں۔ فضائیں جوان تھیں۔ اور میرے دل میں صرف تم ہی بسی رہتی تھیں۔ وہ دن کتنے دلفریب تھے جب تم میری بانہوں میں سما جاتی تھیں۔ جدھر میری نگاہیں اٹھتیں تم ہی نظر آتی تھیں۔ میں منزل سے چند ہی قدم دور تھا۔ میرے دل میں تمہیں پانے کی چاہت جاگزیں تھی لیکن جب سے میرا دل ویران ہوا ہے اور تم چھین گئیں مجھ سے۔ یقین کرو کہ مجھے زندگی کی خوشیاں پھر نصیب نہ ہو سکیں۔ وہ دلکشی اور رعنائی نہیں ملی مجھے۔ یادوں کے نہاں خانوں میں تمہاری محبت کا چراغ اب بھی روشن ہے لیکن تم مجھ سے بہت دور چلی گئی ہو۔ بہاروں کے دن بھی خزاں کے سے لگتے ہیں۔ ایک ہی راہ پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چند ہی قدم جا کر تم مجھ سے جدا ہو گئیں۔ اب تو موسم بہار کی ہوائیں بھی مجھے شعلوں کی آنچ سے کم نہیں لگتیں۔ میں بکھر گیا ہوں لیکن تم نے میری خبر نہ لی۔ دل زخمی ہے اور اب تو یہ زخم رسنے بھی لگے ہیں۔ یادوں کے جھکڑ سے اب صرف دھول ہی دھول اڑتی ہے ان میں تمہارا چہرہ اب دھندلانے لگا ہے۔ اور میں تمہیں پہچاننے کے لئے تمہاری تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں میرے لب خاموش ہیں لیکن دل اب صرف تمہارے ہی لئے دھڑکتا ہے۔

مجھے آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم میرے قریب ہو۔ بالکل اسی طرح جسطرح تم کشمیر میں ملی تھیں، سچ مانو کشمیر کا حسن بھی مجھے اتنا متاثر نہ کر سکا جتنا مجھے تمہارے حسن جہاں تاب نے لبھایا تھا یاد ہے تمہیں کرشن نہاں کتنی حسین تھیں۔ کتنی شریر تھیں جھرنوں سے کھیلتے ہوئے تم نے کس طرح پانی کے چند قطرے مجھ پر اچھال دئے تھے اور تب ہی سے مجھے میرے خواب حقیقت نظر آنے لگے تھے۔ ہر لمحہ تم میرے دل میں اُترتی چلی گئی تھیں۔ اور میں تمہیں چپکے چپکے دل میں چھپاتا جا رہا تھا۔ افسوس کہ اتنی جلد ہی تمہیں کھو کر میں کس طرح برباد و ناشاد رہنے لگا اور تمہارے بغیر زندگی کو ایک بوجھ کی طرح گھسیٹ رہا ہوں۔

کچھ دن پہلے جب تم میرے ساتھ ریلوے لائن کراس کر رہی تھیں وہ نہ تو کشمیر کا کوئی پرفضا مقام تھا نہ حسین چاندنی رات بلکہ وہ گرمی کی تپتی ہوئی ایک دوپہر تھی ہم پیدل ہی چل رہے تھے گرمی سے تمہارا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور میں تمہارے دوآتشہ حسن میں کھو کر رہ گیا تھا۔ لیکن آج مجھے زندگی کا ہر پل اداس اور ویران لگتا ہے۔ میں پھر اسی جگہ جا رہا ہوں۔ نہ جانے تمہیں ڈھونڈھنے کے لئے کن کن راہوں سے گزرنا پڑے گا۔

یہاں اسٹیشن سے سیدھا وہیں چلا آیا ہوں۔ انھیں راستوں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے جن میں تمہاری یادیں پنہاں ہیں۔ سب ویسا ہے۔ پر فضا مناظر، شاداب وادیاں ابلتے اور بہتے ہوئے چشمے زندگی بخشنے والی خنک ہوائیں تاریکی کو اُجالا دینے والی چاندنی سب ہی ویسی ہی ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں کسی چیز میں بھی میرے لئے دلکشی نہیں ہے۔ شاید کیا یقیناً اس لئے کہ تم ساتھ نہیں ہو ـــ نمی! کاش وقت اور سماج نے ہمارے ساتھ وفا کی ہوتی۔ محبت تو ایک پاکیزہ شے ہے۔ میں نے تو تمہیں اپنی زندگی بنانا چاہا تھا۔ میں تو تمہاری پرستش کرتا۔ تمہیں اپنے گھر کی رانی بناتا! لیکن کسی نے ان باتوں کا احساس نہیں کیا۔ اور بجلی جسطرح خرمن پر گر کر اسے خاکستر کر دیتی ہے، اسی طرح مجھ سے تمہیں چھین کر مجھے سوختہ کر دیا گیا۔ لیکن تم بے قصور ہو اور میں مجبور۔ میں تمہاری یادوں کے پھول چنتا انھیں راہوں سے ہوتا ہوا آج پھر اسی پتھر پر آکر بیٹھ گیا ہوں جہاں تقدیر نے مجھے تم سے ملایا تھا جہاں میں گویا زندگی سے ملا تھا۔ میں سحر زدہ سا ہو کر تمہاری آنکھوں میں گم ہوتا چلا گیا تھا۔ تم نے ایک دفعہ نظریں اٹھائیں اور پھر مسکرا کر ان پر ریشمی پلکوں کی جھالر گرا دی تھی۔ میں ان نگاہوں کے طلسم میں آج بھی کھویا ہوا ہوں۔ شاید اب اس رات کی سحر کبھی نہ ہوگی جس کے اندھیرے میں میں بھٹک رہا ہوں۔ تم مجھے وہ دل سکون گی جس کی تلاش میں میں یہاں تک چلا آیا میں بہت اداس ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا بے شمار خزانہ

لئے وہاں سے موتی جھیل کی طرف چلا آیا ہوں۔ جہاں چاندنی رات میں ہم تم کبھی ساتھ تھے۔ اس وقت تمہارا چمکتا دمکتا حسن میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ نہ جانے میں احساس کی کن منزلوں سے گزر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے تمہیں اپنی باہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ تمہارے لمس کی خوشبو نے مجھے مدہوش کر دیا تھا۔

نمی! اگر تم مجھے نہ ملیں تو!

ایسا نہ کہو راز نمی تمہاری اور صرف تمہاری ہے!

اور میں خوابوں کو [illegible] کچھ میٹھا تھا!

کہاں کہاں تمہاری پرچھائیوں کو دیکھتا چلوں۔ یہاں تو ہر ہر پھول میں تمہارا عکس نظر آتا ہے۔ زخموں سے ٹیس اٹھنے لگتی ہے اور میں بے تاب ہو جاتا ہوں۔ کاش میں تم سے ملا ہی نہ ہوتا کہ زندگی کو یہ روگ تو نہ لگتا تمہارے بغیر کبھی زندگی اتنی بے رنگ تو نہ تھی۔ میں کوشش کے باوجود تمہیں بھلا نہ سکا اور میرے تخیل میں تمہارا سایہ ابھر ابھر کر ڈوبتا رہا۔

تمہیں دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا تھا دل چاہتا تھا کہ تمہیں روح کی گہرائی میں چھپا لوں کہ ہم دونوں کی روحیں ایک دوسرے میں جذب ہو کر ڈوب جائیں کبھی نہ ابھرنے کے لئے۔

میں یہاں ساری رات نہ سو سکا اور پھر سویرے اسی جگہ تمہاری یادوں کی کرچیاں سمیٹنے چلا آیا۔ میں نظاروں کی دلفریبی میں وہ کشش نہ پا سکا جو تمہارے ساتھ پاتا تھا۔

اچانک میں نے قدرت کے اس بے مثال شاہکار کو آتے دیکھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس نے مجھے پکارا۔ ہم لوگوں نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عہد و پیماں کے سارے رشتے توڑ ڈالے۔ میں نے چند پھول تحفۃً تمہیں دئیے تم نے ہاتھ بڑھایا لیکن پھول تمہارے ہاتھوں کے بجائے تمہارے قدموں میں گر پڑے اور میں تخیل کی دنیا سے حقیقت کی دھرتی پر آ گیا۔

وہ دور کتنا نشاط انگیز تھا نمی! میرے ماضی کی جھلکیوں میں تمہارا پر وقار چہرہ جب ابھرتا ہے تو میرا دل تڑپ اٹھتا ہے وقت کو مجھ پر ذرا سا بھی تو رحم نہ آیا۔

میں چاہتا ہوں کہ اسے اسی ماضی میں ہمیشہ کے لئے کھو جاؤں۔ پچھلے سال تم میرے ساتھ تنہا آئی تھیں۔ نمی! تمہیں یاد ہے ہم کتنے خوش تھے ہم دونوں نے دنیا جہاں کی باتیں کی تھیں۔ تم تھک کر پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھیں اور میں تمہارے قریب بیٹھ گیا تھا اور تمہیں خاموش تکتا رہا تھا۔ ہزاروں باتیں کہنے کو تھیں لیکن زبان گنگ تھی۔ تم آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں اور میں جذبات کے تیز دھارے میں بہہ رہا تھا۔ میں تمہارے قریب کھسک آیا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ میں نے کہا تھا

نمی!

تم نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا، چاندنی کچھ اور نکھر گئی تھی۔

تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گی؟

تمہیں وہم ہو گیا ہے راز میں تمہیں اپنی روح میں چھپا لوں گی کوئی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے گا

لیکن تقدیر کچھ اور سوچ کر ہنس رہی تھی۔

اور پھر سب کچھ جہاں کا جہاں رہ گیا۔ کشمیر سے واپس آکر میں نے سنا، تمہاری شادی منصور سے کر دی گئی۔

تم سے مل کر میں اپنی حقیقت ہی بھول گیا تھا۔ تم ایک رئیس خاندان کی فرد تھیں تمہارے بھائی اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ تمہارے ڈیڈی ایک بڑی فرم کے مالک تھے اور منصور بھی انھیں کی حیثیت کا نوجوان تھا۔ اور میں اڑتی ہوئی دھول کا ایک حقیر ذرہ۔ جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ جس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ جس نے چاند تک پرواز کی کوشش کی تھی۔ کتنے حسین خواب دکھائے تھے تم نے تمہیں بھی یاد ہوں گے۔ دن بھر کی تھکن سے اب بدن ٹوٹ رہا ہے۔ میرے انگ انگ میں تمہاری یادیں مچل رہی ہیں۔

یکایک فضاؤں میں مخصوص سی خوشبو پھیلی میں نے مڑ کر دیکھا تم میرے پیچھے اداس اور ویران چہرہ لئے کھڑی تھیں۔ میں نے بے ساختہ بڑھ کر تمہیں سینے سے لگا لیا اور سسک اٹھا۔

نمی مجھے یوں تنہا چھوڑ کر تم کہاں چلی گئی تھیں۔

پھر تمہارے لب کانپے۔ اور میں نے سنا۔ تم کہہ رہی تھیں۔

"کب تک میری یادوں کو سینے سے لگائے روتے رہو گے۔ مجھے

بھول جاؤ راز۔ مجھے منتظر یہاں ہنی مون منانے کے لئے لائے ہیں۔ جانے کیا ہو جائے۔ میں تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو سکتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بھول جاؤ سمجھ لو کہ تمہاری نمی مر گئی۔ اور میں سچ مچ مر چکی ہوں، اس لئے کہ میری روح تمہارے پاس ہے اور بے روح جسم مردہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

نہ جانے دل میں کیا کچھ ہو رہا تھا میں تمہیں خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میرا سر گھوم رہا تھا لیکن مجھے تمہاری خوشیاں زیادہ عزیز تھیں۔ بلا سے میں مٹ جاؤں۔ میں جانے کے لئے مڑا تو تم ایک بار پھر میرے سینے سے لگ کر بے تحاشہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں میں نے آہستہ سے تمہیں الگ کرتے ہوئے کہا۔

ان آنسوؤں میں پہلے ہی ڈوب چکا ہوں نمی۔ میری روح تک میں ویرانی بس گئی ہے اور میں اسی وقت کشمیر کو الوداع کہکر واپس ہو جاؤں گا۔

میں کشمیر تمہیں ڈھونڈھنے ہی آیا تھا تم ملیں لیکن تمہارا ملنا بھی نہ ملنے کے برابر تھا۔ میں تمہاری راہوں سے دور ہو گیا۔ میرے دل کی نگری ویران اور سنسان ہو گئی یعنی اب بھی میں اپنی راہ کا اکیلا مسافر نہیں ہوں۔ کیا ہوا جو تم میرے ساتھ نہیں ہو، تمہاری یادیں تو ہیں۔ ہم دونوں بے وفا نہیں زمانے کو ہمارا ملن گوارہ نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو روح کا نذرانہ پیش کیا ہے جینے کے لئے یہی سہارا بہت ہے نمی۔ خدا حافظ

اِعلان ملکیت ماہنامہ حریم لکھنؤ

فارم نمبر ۴ رول نمبر ۸

۱۔ پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر — سید محمد فہیم انہونوی

۲۔ قومیت — ہندستانی

۳۔ پتہ — کاشانۂ فہیم گیٹ ملک گیتی لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

۴۔ مقام اشاعت — ۵۲ ڈالی گنج روڈ۔ لکھنؤ

۵۔ تاریخ اشاعت — ماہوار، اردو، انگریزی

۶۔ ان اشخاص کے نام جو ایک فیصد سے زیادہ حصص کے مالک ہوں — ۱۔ سید محمد فہیم انہونوی ۵۰ فیصد ۲۔ مسز شوکت جہاں بیگم ۵۰ فیصد

قومیت .... ہندوستانی

پتہ — کاشانۂ فہیم گیٹ ملک گیتی۔ لکھنؤ

افسانہ

مجبور

از۔ نسرین زمان

چند دن ہوئے میں نے استانی کو کمرے میں بلایا یہ استانی میرے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ملازم رکھی گئی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی میرے کمرے میں آئی اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ فطری شرم کے جذبے ٹپک رہے تھے میں نے کہا۔

" بیٹھ جاؤ میں نے سوچا تمہارا حساب ہی کر لیں تمہیں کچھ نہ کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی تم تو تکلف میں اپنی تنخواہ مانگتی ہی نہیں ہو۔ اچھا تمہیں یاد ہے نا ہم نے تمہاری تنخواہ دو سو روپے ماہوار مقرر کی تھی؟

استانی نے بڑی مری ہوئی آواز میں کہا "جی تین سو روپیہ"

میں نے بڑے طمطراق سے کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو ہم جب کوئی بات کہتے ہیں تو اپنی ڈائری میں لکھ لیتے ہیں۔ میں ٹیوٹر کو اس سے زیادہ تنخواہ نہیں دیا کرتا۔ اچھا دو سو روپے ماہوار کے حساب سے دو ماہ کی تنخواہ چار سو روپے ہوئی۔

" جی دو ماہ اور ۱۵ دن" استانی نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا،

میں نے پھر بے اعتنائی سے کہا" یہ بھی تمہاری بھول ہے دو مہینے کی تنخواہ ہے تم جمعہ کو تو کوئی کام نہیں کرتیں آٹھ جمعے ہوئے یا نو۔ چلو نو جمعے ہی سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر دو ماہ میں تم نے تین دن چھٹی بھی کی تھی، استانی کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ رنگ سرخ ہو رہا تھا وہ دوپٹے کو مروڑ کر اپنی انگلیوں پر لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی

اچھا تو چار سو میں سے پچاس ہم نے کاٹ لئے۔ میری بیٹی پہلے چار دن بیمار رہی تب بھی تم نے کام نہ کیا تم ننھے نبیل کی دیکھ بھال کرتی رہیں اسے میں کام نہیں سمجھتا اور ہاں دو دن تمہاری داڑھ میں درد رہا میری بیوی نے تمہیں کام سے چھٹی دے دی اس کے پچیس روپے اور کٹ گئے باقی بچے تین سو پچیس۔

استانی عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے وہ اپنی تنخواہ سے جانے کیا کیا پروگرام

جا چکی تھی آنسو بہہ نکلے مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔
"اچھا تمہیں یاد ہے نبیل کی سالگرہ پر تم نے نئی پرچ پیالی توڑ دی تھی۔ اگرچہ وہی پرچ پیالی مل ہی نہیں سکتی مگر ہم صرف پچیس روپے جرمانہ کریں گے باقی رہے تین سو روپے ہاں ایک اور بات یاد آگئی میری بیٹی محض تمہاری غفلت کی وجہ سے درخت پہ چڑھ گئی اور اس کا قمیص کوٹ پھٹ گیا بیس روپے جرمانہ اور ہوا۔ ہم نے تم کو لازم رکھا وہ عدیلہ کا بارٹ نیلر بھاگ گیا تمہارا فرض تھا تم اس پر کڑی نگاہ رکھتیں بیس روپے جرمانہ اور ہوا اور ہاں دس جنوری کو تم نے مجھ سے ۱۰۰ روپے قرض لئے تھے۔

مجبور روپے کس استانی بول پڑی "مگر جناب میں نے تو آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا!"
میں نے کہا "تم پھر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں ہم تو جب بھی کوئی بات کہتے ہیں ڈائری میں درج کر لیتے ہیں"
استانی کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس نے تھوک نگل کر صرف اتنا کہا "آپ سچ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا لیکن میں نے اس دو مہینے اور پندرہ دن..."
میں نے بات کاٹ کر کہا "دو مہینے کہو!" استانی نے کہا معاف کیجئے گا اس دو مہینے میں صرف بیگم صاحب سے پانچ روپے لئے تھے"
میں نے اچھل کر کہا "اچھا تو تم نے بیگم سے بھی پانچ روپے لئے اچھا تو حساب ہوا.... دو سو پینتالیس روپے یہ لو۔ گن لو میں نے زیادہ تو نہیں دے دیئے"

استانی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں"
استانی کے الفاظ سنتے ہی میں بے اختیار ہو کر اچھلا اور غصے سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔
"کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہو"
استانی نے جواب دیا "تنخواہ کا جی"
میں نے چلا کر کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا تم سے جھوٹ بولا تنخواہ تمہاری تنخواہ کاٹ لی تم پھر بھی شکریہ ادا کر رہی ہو۔"
استانی نے بے چارگی سے کہا "جناب دوسرے لوگوں نے تو میری تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔"
"بالکل کچھ نہیں دیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا
"جی نہیں"
"مگر میرا کوئی حق نہیں تھا کہ میں تم سے جھوٹ بولوں میرا اس لفافے میں تمہاری ساری تنخواہ ہے وہ روپے مجھے واپس کر دو اور اپنا حق مانگنے کا حوصلہ پیدا کرو انسان میں ہمت ہونی چاہیئے کہ اپنا حق چھین کر لے لے۔"
استانی شکریہ کے الفاظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سوچ رہا تھا کہ آدمی طاقت کے بل بوتے پر کمزور سے ہر شرط منوا سکتا ہے۔

لطیفے

• "آج چرچ میں تمہاری بیوی پر اچانک کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ سب پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے میں سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا۔"
"تشویش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیوی نے آج نیا لباس پہنا تھا وہ اسے سب کو دکھانا چاہتی تھی۔"

• "تم ناصر سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"
"میں صرف اس شخص سے شادی کروں گی جو زندگی کو سمجھتا ہو اور جسے زندگی کی الجھنوں کا عملی تجربہ ہو۔"
• "اوہ! میں سمجھی۔ تم کس رنڈوے سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

آنکھوں کا عطیہ

بیلا شازی

منی غریب گھرانے کی لڑکی تھی گھرانہ بھی کیا غربت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ اگرچہ مالی لحاظ سے منی کمزور تھی مگر جوانی کی طوفانی لہریں اس کے اندر موجزن تھیں وہ ہروقت تخیلاتی دنیا میں گم رہتی اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے اس کے پر نکل آئے ہوں اور وہ تصور ہی تصور میں اڑ کر دوسری دنیا میں پہنچ جاتی ہے ایسی دنیا میں جہاں اسے الگ روپ کے مالک شہزادے اس کے دربار میں غلاموں کی حیثیت سے کھڑے دکھائی دیتے وہ یونہی دن رات خوابوں کے جزیرے کی سیر کر رہی ہوتی کہ آپا کی آواز سنائی دیتی جو ہمیشہ اس کے اصل نام آسیہ کے بجائے منی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔

منی کو آپا پر غصہ تو بہت آتا مگر منہ بسورتی اللہ میاں سے شکایت کرنے لگتی۔ اللہ میاں یہ آپ نے اتنا چھوٹا کیوں بنا دیا کہ میں پورے بیس سال کی ہونے والی ہوں پھر بھی آپا کو منی ہی نظر آتی ہوں وہ گھر دسمبر پر کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ رکھ کر سوچتی میں منی کیوں ہوں۔؟

آپا کیوں نہیں؟ اگر آپا نہیں تو پھر سونیا کی طرح اونچی لمبی کیوں نہیں؟ سونیا جو منی سے پورے دو سال چھوٹی تھی اب منی سے پورے چار سال بڑی لگنے لگی تھی اونچی لمبی خوبصورت سونیا۔

منی بیچاری چھوٹا سا قد کہ دیکھنے والے اسے بچہ ہی سمجھتے تھے لال کو کبھی جب کوئی سودا سلف لانے والا نظر نہ آتا تو منی کو بازار بھیج دیتی اور جب دکاندار اسے بے بی کہہ کر مخاطب کرتا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

اکثر لوگ اسے دیکھ کر ہنسنے لگتے گھر پر آئے ہوئے مہمانوں سے وہ چھپتی پھرتی اگر کبھی کسی کی اس پر نظر پڑ جاتی تو آپا مہمانوں سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے [illegible] ہیں۔ مہمان [illegible] ظاہر کر کے ہنس دیتے اور [illegible] کہ لگتا ہے جیسے بچوں کی طرح ہے

اسے معلوم تھا کہ اس کے اس سوال کا جواب کوئی نہ دے پائے گا۔ سب اپنے آپ میں اس قدر مصروف تھے سب جو اپنی اس لاپرواہی کے باوجود اسے پیارے لگتے لیکن اس کی تنہائی کا مداوا تو کسی کے پاس نہ تھا اپنی اس اکھڑی سی سوچ کے درد اور دکھ سے تنگ آ کر کبھی بار ہنستے اس پار برابر والے گھر میں جھانکتی، نصیر بھائی کو دیکھتی رہتی جو بالکل اس کے خوابوں کے شہزادے سے ملتے جلتے تھے وہ جب بھی اداس ہوتی برآمدے میں آ کر بیٹھ جاتی اور نصیر بھائی کو گھورتی رہتی۔

ایک دن برآمدے میں بیٹھی اکیلی لوڈو کھیل رہی تھی نصیر اسے یوں دیکھ کر بولے واہ منی بس اکیلی ہی کھیلتی ہو کبھی میرے پاس آؤ تو ہم دونوں مل کر لوڈو کھیلیں گے۔ اور کیا تم میری دوست بنو گی منی اپنی جوان دھڑکنیں سنبھالتی ہوئی۔ نصیر بھائی سے لوڈو کھیلنے لگی۔ اب منی اور نصیر کی پکی دوستی ہو چکی تھی۔ وہ اک ٹک نصیر کو گھورتی اس کے خوابوں کے شہزادے اور نصیر بھائی میں کتنی مشابہت تھی وہی وجیہہ سراپا خوبصورت پیشانی بالوں کا اسٹائل بڑی بڑی [illegible] ہوئی آنکھیں ناک چہرے کا کٹ دمکتی ہوئی رنگت اور [illegible] تاثر ویسے ہی شہزادوں والی شان۔ اب وہ نصیر بھائی کے متعلق بہت کچھ جان گئی تھی نصیر بھائی اپنی سروس کے سلسلے میں تنہا یہاں رہتے تھے ان کی ممی کسی دوسرے شہر میں رہائش پذیر تھیں ایک دن نصیر بھائی بولے منی میں چند دنوں کے لئے اپنی ممی کے پاس جا رہا ہوں پھر آ کر تمہیں ایک خوشخبری سناؤں گا۔

منی جس کا ذہن بھی اس قد کی طرح ننھا منا تھا [illegible] سمجھ بیٹھی اور دن رات سپنے سجائے نصیر کا انتظار کرتی تنہائی سے وہ اتنا اکتاتی کہ اکثر اوقات وہ کوئلے سے فرش پر [illegible] پر تصویریں بناتی اور مٹاتی رہتی کبھی کاغذ پنسل لے کر شعر لکھتی رہتی۔

ایک دن وہ اداسیوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ اسے [illegible] ملی کہ نصیر بھائی آ گئے ہیں وہ جذبات سے سرشار [illegible] زیادہ خوبصورت کپڑے پہن کر نصیر کے ہاں چل دی [illegible] کے پہنچ کر اس کے قدم رک گئے نہ جانے نصیر کیسی خوشخبری سنانے والا ہے وہ ابھی سے بھلا تو نہیں مانگ رہے یہ سوچ کر وہ [illegible] تھی کہ نصیر بھائی نے منی کو دیکھ لیا۔

ارے آئیے منی واپس کیوں جا رہی ہو کبھی ادھر تو آؤ! وہ منی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ روم میں لے آئے جہاں ایک نہایت خوبصورت لڑکی بناؤ سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ یہ کون ہے ہکلاتی ہوئی بولی،

یہ تمہاری بھابھی اور میری خالہ زاد بہن ہیں،

منی کو یوں لگا جیسے وہ پستیوں میں گرتی جا رہی ہو دماغ میں دھماکے ہونے لگے اپنے ڈولتے وجود کو بڑی مشکل سے اس نے سنبھالا نصیر اس کی پیلی رنگت دیکھ کر بھاگ کر پانی لے آئے پانی کا جو بڑا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔ یونہی اس کی نظر دلہن کی آنکھوں پر پڑی تو وہ یکدم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سوالیہ نظروں سے نصیر کی طرف دیکھنے لگی نصیر منی کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا منی نادیہ کے ساتھ یہ المیہ شادی سے صرف پانچ دن پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں ہوا اور نادیہ اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھی۔

منی کچھ نہ بولی بس نادیہ کو گھورتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔ گھر آ کر وہ اس دنیا کی اہمیت، اپنا مقام، کائنات، وجود وغیرہ جیسے مسئلوں پر غور کرنے لگی۔ اسے کائنات میں اپنا مقام کہیں نہ ملا اپنے وجود کی مقصدیت سمجھ میں نہ آئی۔

مقصدیت اور افادیت پر سوچ سوچ کر اس کا ذہن پھوڑے کی طرح پکنے لگا تھا۔ اسے نصیر بہت بلند نظر آنے لگا بالکل دیوتاؤں کی طرح جس نے نادیہ کی اندھیری دنیا میں سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

دوسری صبح محلے کے ہر فرد کے لبوں پر تھا کہ منی نے خودکشی کر لی اور وصیت میں اپنی آنکھیں نادیہ کے نام عطیہ کر دی ہیں۔

اقوال زریں

- فرمانبردار بیوی خاوند پر حکومت کرتی ہے (چینی ادب)
- عورت اپنی شکست کو مان لیتی ہے فتح حاصل کرنے کے لئے (گولڈ اسمتھ)
- عورت تمام جانداروں میں سب سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم ہستی ہے (ڈاسرائیلی)
- عورت جب شرماتی ہے تو کتنی خوبصورت، دل آویز اور دلکش معلوم ہوتی ہے (موپساں)
- جس عورت میں شرم نہ ہو، اس میں اور کوئی خوبی ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں وہ سب کچھ کھو چکی ہوتی [illegible]

افسانہ

سمجھوتہ

شیریں گل

گھڑی کی ٹک ٹک ٹک اور دل کی دھک دھک کے علاوہ کمرے میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی رابعہ دلہن بنی کمرے میں بیٹھی تھی۔ رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے راحیل باہر کسی کام میں مصروف تھے رابعہ جانتی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر بعد راحیل اس کے کمرے میں آ جائیں گے مگر اس کے باوجود اس خیال سے اس کے دل میں نہ تو ہلچل مچی اور نہ ہی وہ پی ملن کے سہانے احساس سے شرما لجا کر سرخ ہوئی بلکہ لاشعوری طور پر اس کی نظریں اپنے پاس سوئی ہوئی ننھی شاذیہ اور شرجیل پر جم کر رہ گئیں سوتے میں۔ دونوں کتنے معصوم، کتنے انجان اور کتنے بے غم لگ رہے تھے مگر وہ ماں سے محرومی کے صدمے کو تو نہ بھولے ہوں گے۔ عمر ہی کیا تھی ان ننھے فرشتوں کی شاذیہ دو سال کی تھی اور شرجیل چار سال کا تھا رابعہ کی آنکھوں میں یہ سوچ کر نمی سی تیرنے لگی۔۔۔۔ ٹک ٹک کی آواز نے رابعہ کو چونکا دیا ایک بار پھر نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔۔۔ اب گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے رابعہ پر اکتاہٹ طاری ہونے لگی اس نے توجہ ہٹانے کو کمرے میں ادھر ادھر دیکھا ڈریسنگ ٹیبل پر اپنی مرحوم بہن کی تصویر نظر آئی رابعہ تصویر دیکھتے ہی ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔

صالحہ اور رابعہ دو بہنیں تھیں دونوں جڑواں تھیں، چلبلی چنچل شوخ والی گلابی گلابی رنگت والی معصوم مگر ذہین لڑکیاں تھیں دونوں کا شمار اسکول کی ذہین طالبات میں ہوتا تھا ان دنوں جب کہ میٹرک کے امتحانات تھے امتحانات کی تیاری زوروں پر تھی دونوں میں شرط لگ گئی تھی کہ اول نمبر لینے والے کو دوسرا انعام کے طور پر پنڈی سے چترال تک کا ہوائی ایئر واپسی ٹکٹ خرید کر دے گا [illegible] دونوں ہی ایک جیسی تھیں اس شرط نے پڑھنے میں کچھ زیادہ ہی شوق، جوش اور شدت پیدا کر دی عموماً دونوں میں چند نمبروں کا ہی فرق رہتا تھا اس دفعہ تو [illegible] ہر کوئی مبارک سلامت کہنے ضرور آتا تھا اساتذہ کی [illegible]

کی بات معلوم ہو چکی تھا چنانچہ ہر کوئی نتیجہ آنے کا امتحان دینے سے قبل ہی منتظر رہنے لگا تھا۔

فروری کے مہینے میں ایک شام نہایت سرد برفیلی ہوا چل رہی تھی امی کے منع کرنے کے باوجود رابعہ تمام دن کی پڑھائی کے بعد تھکن اتارنے کے لئے نہانے چلی گئی۔ بس پھر کیا تھا نہانا تو بس بہانہ بن گیا ایسی شدت کی بیماری پڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ادھر صالحہ نے امتحان دے دیا مگر رابعہ ہسپتال میں پڑی موت و حیات سے دو دو ہاتھ کرتی رہی۔ امتحان ختم ہو گئے اور نتیجہ بھی نکل آیا۔

صالحہ نے اسکول میں نہ صرف اول پوزیشن حاصل کی تھی بلکہ ٹیلنٹ اسکالرشپ بھی حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا رابعہ بیچاری کئی مہینے تک ہسپتال میں داخل رہی اور جب روبصحت ہو کر گھر لوٹی تو ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ اسے دماغی محنت نہیں کرنی چاہیئے۔ رابعہ یہ سن کر سخت پریشان رہنے لگی وہ بھی صالحہ کی طرح خوب پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر ایف ایس سی جیسی ابتدائی پڑھائی اس کے بس کی بات نہ رہی تو ڈاکٹر بننے کا خواب خود بخود چکنا چور ہو گیا بس چپ چاپ سی رہتی آخر میں مصروف رہنے کے لئے گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اپنے آپ کو امور خانہ داری کا خوب ماہر بنا لیا۔

ادھر صالحہ تیزی سے ڈاکٹر بننے کے مراحل طے کر رہی تھی رابعہ کی ایک خالہ عرصے سے انگلینڈ میں رہ رہی تھیں انھوں نے اپنے بیٹے راحیل کے لئے رابعہ جیسی سگھڑ لڑکی کو مانگ لیا تھا راحیل چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن چکا تھا اسی لئے آنٹی شادی کرنے پاکستان چلی آئیں یہاں آکر عجیب ماجرا ہوا راحیل نے رابعہ کے بجائے صالحہ کو پسند کر لیا جو کہ عنقریب ڈاکٹر بننے والی تھی۔ رابعہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری ایک تو وہ تعلیمی میدان میں صالحہ سے پیچھے رہ گئی تھی، دوسرے راحیل کے انکار نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا رابعہ غریب بجھ کر رہ گئی بیچاری کی دل کی کلی مرجھا کر رہ گئی تھی ماں نے کچھ لیت و لعل کرنے کے بعد راحیل کے ساتھ مجبوراً رابعہ کے بجائے صالحہ کو دلہن بنا کر رخصت کر دیا ــــــ تقدیر کی بات کہ اس دوران رابعہ کے لئے کوئی رشتہ پسند نہ آسکا ویسے بھی رابعہ کا دل ٹوٹ چکا تھا وہ شادی کے معاملے میں ذرہ برابر دلچسپی کا اظہار

نہ کرتی تھی پانچ سال صالحہ اور راحیل نے ہنسی خوشی گزار دیئے لیکن پھر تیسرے بچے کی پیدائش پر صالحہ اور بچہ دونوں چل بسے راحیل اور اس کی ماں کو بچوں کو سنبھالنے میں بڑی مشکل پیش آنے لگی کوئی لڑکی دو بچوں کے ہوتے ہوئے راحیل سے شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی لڑکی والوں کا مطالبہ یہی تھا کہ بچے ددھیال میں رہیں مگر راحیل اس پر راضی نہ ہوتا تھا آخر رابعہ کی خالہ نے رابعہ کی امی سے رابعہ کے رشتے کے لئے بات کی۔ رابعہ اس رشتے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی تھی راحیل اور اس کی امی بچے لے کر پاکستان آگئے بچے رابعہ کو ماں کی شکل دیکھ کر بہت جلد اس سے مانوس ہو گئے بلکہ ننھی شازیہ رابعہ کو ماں کہہ کر اس کے ساتھ سونے بھی لگی تھی آخر سب کے مجبور کرنے پر رابعہ راحیل کی بیوی بننے پر تیار ہو گئی وہ راحیل جس نے اس کے وجود کی دھجیاں یہ کہہ کر بکھیر دیں تھی کہ میں ایک میٹرک پاس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا.... رابعہ کے لئے یہ الفاظ [illegible] ہوا سیسہ تھا اب وہی راحیل اسی میٹرک پاس لڑکی سے ضرورت کے تحت شادی پر مجبور تھا۔

اس خیال کے آتے ہی دلہن بنی ہوئی رابعہ کے دل میں نفرت کی ایک ہرسناتی ہوئی لہر گزر گئی رابعہ کے وجود میں ایک حشر برپا ہوا اس کا دل چاہا کہ ابھی اس کمرے سے اٹھ کر بھاگ جائے مگر ان معصوم فرشتوں پر نگاہیں پڑتے ہی وہ بپھری شیرنی سے [illegible] ہوئی عورت موم کی طرح پگھل گئی، بکھرتے، بکھرتے کے رنگ [illegible] واضح اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی کے [illegible] لگے اسی ایک طوفانی لمحے میں رابعہ نے ایک [illegible] اور وہ ان معصوم پھولوں کے لئے سمجھوتہ تھا جن کو [illegible] کا یہی راستہ تھا۔

رابعہ جانتی تھی کہ راحیل کے لئے اس کے [illegible] کبھی [illegible] ہو چکی تھی اس کے لئے محبت کا [illegible] اعتماد اور وفا کا نام بیگانہ تھا [illegible] راحیل تھا جس نے اس کی [illegible] اس کے [illegible] جو کبھی نہ بھر سکے گا بلکہ [illegible] نے یہ سب کچھ محبت کے تحت نہیں بلکہ ضرورت کے تحت کیا ہے

حریمی دسترخوان

چنے کی دال اور پالک کے کٹلس

سامان۔ چنے کی دال ۲۵۰ گرام، پالک ۵۰۰ گرام۔ ڈبل روٹی ایک جو دو روپیہ کے لگ بھگ ملتی ہے۔ پیاز دو بڑی آنڈی۔ ادرک ایک تقریباً پچاس گرام۔ نمک۔ سرخ مرچ گرم مسالہ اندازے سے۔ گھی یا ڈالڈا یا سرسوں کا تیل حسب ضرورت۔ ہرا دھنیا اندازے سے۔ ہری مرچ حسب خواہش۔ چنے کی دال کو دھو کر رات میں پانی میں بھگو دیں صبح اسے نکال کر تھوڑے سے پانی میں ابال لیں۔ پانی اتنا ہی ہو کہ دال میں جذب ہو جائے۔ پالک کے پتوں کو اچھی طرح دھو کر صاف کر کے تھوڑے سے نصف لیٹر پانی میں اچھی طرح ابال کر۔ اس کے پانی میں ڈبل روٹی کے سلائس بھگو دیں۔ پیاز کے لچھے کر کے تیل یا ڈالڈا میں سنہرا کر لیں۔ اس کے بعد ادرک، سرخ مرچ، گرم مسالہ، نمک اور ابلی دال اور پالک کے پتوں کو ملا کر سل پر پیس لیں۔ اس کے بعد بھیگے ہوئے سلائس ملا کر ایک جان کر لیں۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا تراش کر ملائیں۔ نمک مرچ چکھ کر دیکھ لیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر گھی یا روغن میں انھیں تل لیں۔ انھیں کسی بھی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔ اگر سرسوں کا تیل استعمال کریں تو پہلے ہی تیل میں تھوڑا دہی [illegible] ڈال کر کڑکڑا لیں تاکہ جھاگ ختم ہو جائے۔

مرسلہ: نیلوفر (پٹنہ)

باجرے کا استعمال کیجئے

باجرہ گرم ہوتا ہے اس لئے اس کا استعمال جاڑوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ باجرے سے کئی لذیذ چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں مثلاً باجرے کا ملیدہ۔ باجرے کے آٹے کو پانی یا دودھ میں گوندھیں۔ نہ زیادہ کڑا ہو نہ زیادہ نرم۔ ان کی پتلی پتلی ٹکیاں پکا کر سینک لیں۔ [illegible] روٹیوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر کے پسی ہوئی چینی شامل کریں اور گھی بھی شامل کر کے ملیں تاکہ شکر و گھی ایک جان ہو جائیں۔ ۲۵۰ گرام آٹے کی روٹی پکائیں تو اسی مقدار میں شکر ہونی چاہئے۔ گھی کم سے کم سو، سوا سو گرام ڈالیں۔ گھی دیسی ہو تو بہتر ہے ڈالڈا وغیرہ سے لذیذ نہ ہوگا۔ خوشبو کے لئے عرق کیوڑہ [illegible]

[illegible] شامل کریں۔ کسی قاب میں نکال کر چاندی کا ورق [illegible] روٹی کے ٹکڑوں میں شکر و گھی ملانے کے بعد اچھی طرح [illegible]

باجرے کی ٹکیاں

باجرے کا آٹا ۲۵۰ گرام۔ میدہ ۵۰ گرام۔ شکر [illegible] گرام
گھی تیل یا ڈالڈا حسب ضرورت۔

شکر کو پیس کر باجرے کے آٹے میں ملا کر گوندھ [illegible] رکھیں اس کے بعد چھوٹی چھوٹی پتلی پتلی ٹکیاں گھی یا تیل میں تل لیں، کافی دنوں تک خراب نہیں ہوتیں۔ میدہ [illegible] ملایا جاتا ہے کہ تلنے میں ٹکیاں بکھرنے نہ پائیں۔

باجرے کا حلوہ

سامان: باجرے کا آٹا ۲۵۰ گرام۔ شکر ۲۰۰ گرام۔ دیسی گھی ۲۵۰ گرام۔ میٹھا یعنی کیوڑے کا عطر ۲ قطرے۔ [illegible] ۵۰ گرام۔ اخروٹ کی گری ۵۰ گرام۔ بادام کی گری [illegible] الائچی خورد ۲۔ لونگ ۵۔

ترکیب: کل گھی میں لونگ الائچی ڈال کر قلعی دار پتیلی یا کڑھائی میں کڑکڑائیں کچھ دیر بعد باجرے کا آٹا ڈال کر ہلکی آنچ پہ بھونیں۔ تمام میوے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر بھونے ہوئے آٹے میں ملائیں اور شکر ڈال کر کچھ دیر تک پکائیں، جب جمنے کے لائق ہو جائے تو کسی طباق میں جمالیں۔ یہ حلوہ لذیذ [illegible] بہت مفید بھی ہوتا ہے۔

مرسلہ: فیروزی قسیم اشرفی (لکھنؤ)

ضرورت ہے

ہمیں "حریم کشیدہ کاری اور ادبی کام" کی ضرورت ہے اس کتاب کی ہمارے پاس کوئی جلد نہیں ہے اور ہم اسے دوبارہ چھپوانا چاہتے ہیں۔ اگر کسی قاری بہن کے پاس یہ کتاب ستھری حالت میں موجود ہو اور ازراہ عنایت وہ ہمیں بھیجنے پر تیار ہوں تو ہم کو لکھیں۔ کتاب روانہ نہ کریں۔ ہمارے لکھنے کے بعد بھیجیں۔ نیا اڈیشن چھپ جانے پر ہم نہ صرف کتاب واپس کر دیں گے بلکہ نئے اڈیشن کی دو جلدیں بھی پیش کریں گے۔

(انتظامیہ - نسیم بک ڈپو، لکھنؤ)

مرزا وصی حسین نیشاپوری مرحوم کے فرزند اکبر مرزا محمد شفیع سلمہٗ کی شادی ہمراہ عظمت بیگم دختر نواب احسن حسین خاں صاحب (اشتی کی گرلس کالج لکھنؤ کی عمارت میں ۲۹ جنوری ۸۵ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے ۔ اس سلسلے میں بیگم صاحبہ مرزا وصی حسین صاحب نے ۳۱ جنوری کی شب میں اپنی رہائش گاہ وزیر گنج میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی ۔ (نسیم انہونوی)

• سائرہ بانو ، تحسین آرا (آمبور) ہماری بہیلی و رشتے کی بھابی راویہ کوثر (بنت دی ، ایم بشیر احمد صاحب ، ویلور) کا عقد سید اعجاز احمد بی ۔ ٹیک (ابن جناب بن عبدالخالق صاحب مرحوم ۔ آمبور) کے ساتھ ۳۰ دسمبر ۸۴ء بمقام باقیات صالحات ۔ ویلور بحسن و خوبی انجام پائی اور ویلور ہی میں دعوت ولیمہ دی گئی ۔ دعا ہے کہ ان کی زندگی شاد و خرم گذرے ۔

• سیدہ زینت افزا (جے نگر ۔ بنگلور) میرے بھتیجے ڈاکٹر وحید احمد سلمہٗ کی شادی ارجمند فاطمہ (دختر نیک اختر آصف احمد صاحب انجینیر) کے ہمراہ ۲ جنوری ۸۵ء کو بمقام ترچنا پلی بحسن و خوبی انجام پائی اس سلسلے میں بھائی بشیر احمد صاحب آئی اے ایس نے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی ۔ اللہ پاک دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے ۔

• مسز نوشاد نسرین (جے نگر ۔ بنگلور) میری بہن مہ جبین سلطانہ ایم اے (بنت غوث شریف صاحب) کی شادی یٰسین فیاض اللہ خاں بی کام (فرزند ایس نظر اللہ خاں صاحب) کے ہمراہ ۳۰ دسمبر ۸۴ء کو بحسن و خوبی انجام پائی ۔ دعا ہے کہ اللہ پاک دونوں کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے ۔

• الحاج محمد عبدالرحیم عبدالستار وھوراجوی (حیدر آباد) کے فرزند محمد عبدالغفار سلمہٗ کی شادی رو بینہ ناز سلمہا (دختر نیک اختر عبدل بھائی جیوا بھائی والدیکا) کے ہمراہ ۱۴ فروری ۸۵ء کو بحسن و خوبی عمل میں آئی ۔ اس سلسلہ میں ۲۰ فروری کو ایک شاندار دعوت ولیمہ بھی دی گئی ۔ اللہ مبارک کرے ۔ (نسیم انہونوی)

• ہمارے مرحوم دوست عبدالحق خاں صاحب کی دختر نیک اختر عابدہ عرف بجّو سلمہا اور نواب سید شوکت علی سلمہٗ ، کانپور کے فرزند ڈاکٹر عمران سلمہٗ کی شادی شبینہ سلمہا دختر نیک اختر مسٹر رفیق احمد) کے ہمراہ بمقام الہ آباد ۲ فروری ۸۵ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اس سلسلہ میں ۴ فروری کو ایوان ہیرال پر ڈاکٹر عمران کی جانب سے ایک شاندار دعوت ولیمہ بھی دی گئی ۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سید سراج الدین احمد صاحب (پٹنہ) کی صاحبزادی ناہید سراج سلمہا کی شادی جی آر نادر سلمہٗ (فرزند عبدالخالق صاحب مرحوم ، سری نگر) کے ہمراہ ، سمن پورہ ، راجہ بازار ۔ پٹنہ میں ۸ فروری ۸۵ء کو بحسن و خوبی انجام پائی جس میں اکابرین شہر نے شرکت کی ۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• آر ۔ اے صدیقی صاحب (لکھنؤ) کی دختر نیک اختر نسیمہ اختر صدیقی سلمہا کی شادی آفاق احمد صدیقی سلمہٗ (فرزند حاجی مشتاق احمد صدیقی صاحب) کے ہمراہ ۱۴ فروری ۸۵ء کو حسنین مارکٹ ، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• مس نجمہ بانو صاحبہ سلمہا (دختر نیک اختر بی عبدالسمیع صاحب ۔ الدور) کی شادی مختار احمد سلمہٗ (فرزند حاجی عبداللطیف صاحب مرحوم ۔ کانی پلاسٹر بنگلور) کے ہمراہ ۱۳ جنوری ۸۵ء بمقام الدور ، بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے ۔ (نسیم انہونوی)

• سید سخاوت علی صاحب (لکھنؤ) کے صاحبزادے شہنشاہ علی سلمہٗ کی شادی حمینہ سلمہا کے ہمراہ اور دختر سائرہ سلمہا کی شادی نجم سلمہٗ کے ہمراہ ۲۳ جنوری ۸۵ء کی شب میں اسلامیہ کالج لکھنؤ کے کمپاؤنڈ میں بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• آر محمد عباس صاحب (الدور) کی صاحبزادی رشیدہ بانو سلمہا بی ۔ کام کی شادی نثار اے شریف بی اے (فرزند ایچ اے شفا شریف ریٹائرڈ انجینیر و مالک امپیریل سینما ۔ حسان) کے ہمراہ ۲۷ مارچ ۸۵ء کو خرم منزل الدور میں بحسن و خوبی انجام پائی ۔ اللہ مبارک کرے ۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• یہ خبر اردو حلقہ میں خصوصیت سے بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۱۷ فروری ۸۵ء کی شب میں ۳ بجے اردو کے مشہور ادیب ۔ نقاد اور شاعر پروفیسر نسیم قریشی صاحب

[illegible] کی دھڑکنوں میں ابوبکر شاہ کا نام سنائی دیتا تھا اور وہ گھنٹوں اس [illegible] میں کھوئی رہتی۔

ناصرالدین شاہ کبھی کبھی اسے اپنے پاس بلاتا۔ شبینہ ایک چپ لے کر اس کے پاس جاتی اور خاموش بیٹھ کر واپس آجاتی۔ جیسے زندگی اور اس کی بزم آرائیوں پر سے اس کا یقین بالکل اٹھ چکا ہو۔ وہ محسوس کرتی کہ ناصرالدین شاہ پریشان رہتا ہے۔ وہ اپنی رعایا کا بھی شاکی تھا اور امراء سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ سارا ملک انتشار اور بدامنی کا شکار تھا۔ ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ بے سکونی تھی۔ شبینہ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے سب دیکھ اور سن رہی تھی۔

ناصرالدین شاہ نے اسے کنیز بھیج کر بلوایا وہ پہونچی تو بادشاہ کو خلاف معمول آرام کرتے پایا۔ حسب عادت وہ خاموشی سے جا کر بیٹھ گئی۔ تو وہ بولا "اپنی رعایا کو ایک بادشاہ جس قدر آرام [illegible] آسائشیں دے سکتا ہے وہ سب کچھ ہم نے بخش دیا ہے لیکن وفاداری اور قدرشناسی سے یہ لوگ قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ ایک حکمراں ہونے کے ناطے آج کل ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے آج یک گراں باری سی محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تیری آواز میں بڑی نغمگی ہے درد ہے سوز ہے۔ اس وقت ہم نے تجھے اسی لیے طلب کیا ہے۔

شبینہ نے ایک نگاہ بھر کر بادشاہ کے بوڑھے چہرے کو دیکھا اور ساز اٹھا کر سُر ملانے لگی۔ خود اس کا دل بھی کئی دن سے بے چین تھا۔ اس کی بے قراری نغمہ بن کر پھوٹی وہ بے خود ہو کر گانے لگی۔

اس ادا سے نہ چلو کہ تمہاری ٹھوکر سے کسی کا دل ٹوٹ جائے۔ اس انداز سے نہ چلو کسی کی نظر لگ جائے۔

[illegible] نثار کرنے۔ باقی آئندہ

ہے۔ اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے۔

ابوبکر شاہ بارک اللہ کہتا ہوا اٹھا اور شبینہ کی معیت میں دالان غلام گردشیں اور در بدر خیز دیوان خانے طے کر کے محل کے جھروکے میں پہنچا۔ اور نیچے کئی ہزار سپاہیوں کو دیکھ کر جوش مسرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شبینہ نے ہاتھ سے داہنی سمت اشارہ کیا۔ ابوبکر شاہ نے گردن گھمائی اور خوشدلی سے مسکرایا۔ داہنی طرف فیروزی خواتین کا دستہ آلات حرب سے لیس نقابوں سے چہرے چھپائے مستعد کھڑا تھا۔ اور ان سب سے آگے اسلام خان کمانڈر کے لباس میں گھوڑے پر سوار تھا۔ ابوبکر شاہ کو دیکھ کر وہ قدرے خم ہوا۔ تلوار کا رخ زمین کی طرف کیا اور بآواز بلند بولا "شہنشاہ ہند ظل سبحانی خلد آشیان فردوس مکان فیروز شاہ تغلق کے یہ ادنیٰ غلام اپنی تمام محبتیں، شجاعتیں اور جذبہ جاں نثاری لے کر آپ کے حضور حاضر ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کی صحیح جانشین آپ کی ذات والا برکات ہی ہو سکتی ہے۔ جو عدل و انصاف کی خوگر ہے۔ خلوص و رحم سے رغبت رکھتی ہے اور مظلوموں کی حامی ہے کہ یہی رسول اللہ محمد مصطفیٰ کا ورثہ ہے۔ ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں"

ناصرالدین شاہ بھی سر سے کفن باندھ کر آیا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے محاصرہ سخت کر رکھا تھا اور ثابت قدمی سے جمے ہوئے تھے۔

ابوبکر شاہ بھی جوش و خروش سے اسلام خان اور دوسرے کمانداروں کے ساتھ ناصرالدین شاہ کے محاصرے کو توڑنے چل دیا۔ دونوں طرف کی فوجوں میں جھڑپیں چلتی رہیں۔ شبینہ ابوبکر شاہ کے ساتھ تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ دونوں طرف کے سپاہی کٹ رہے ہیں مگر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ گویا دونوں حکمرانوں کا [illegible] یکساں جوش، شجاعت تھا۔ [illegible] اس بات کا

انتظار تھا کہ جنگ مغلوبہ شروع ہو جائے تاکہ وہ بذات خود ناصر الدین کو للکارے لیکن دونوں طرف سے زبردست کر حملے ہو رہے تھے ایک ماہ تک یہی سلسلہ رہا۔ جب بھی ابوبکر شاہ کے سپاہی محاصرہ توڑنے کی کوشش کرتے ناصر الدین کے سپاہی اس حصے میں آگ لگا دیتے دہشت و بربریت انہیں اپنے حکمراں سے ملی تھی۔

اناج و پانی کی قلت، کم غذا، بیماری نے دار السلطنت میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ باہر سے کوئی چیز آ نہیں سکتی تھی۔ ابوبکر شاہ کی فوج میں بھی بددلی پیدا ہو چلی تھی۔ تب اسلام خاں نے شبینہ اور ابوبکر شاہ سے مشورہ کر کے جنگ مغلوبہ کا منصوبہ بنایا۔ فیروز شاہی غلاموں نے تجویز رکھی کہ وہ کمندوں کے ذریعہ شہر پناہ کی دیوار پھلانگیں گے اور پھر دروازے کھول دیں گے تاکہ بقیہ فوج یک لخت آگے بڑھے اور مخالف فوج کو تبروں کی باڑھ پر رکھ لے۔

رات کی تاریکی میں کمندوں کے ذریعہ کودنے والوں میں سب سے پہلے اسلام خاں اور شبینہ تھے۔ شبینہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ فیروزی دستے ملے پہریداروں کو تہ تیغ کر کے دروازے کھولے ایک شور و غل کا سماں تھا تلواروں کی جھنکار سے میدان اور شہر گونج رہے تھے۔ آہ و بکا تھی چیخیں تھیں۔ رات کا سناٹا گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے اور ہیبت ناک بن چکا تھا۔ شبینہ ہر طرف سے بے نیاز گھوڑے کو دوڑاتی چلی جا رہی تھی اور اس کا رخ میدان میں ابوبکر شاہ کے خیمہ کی طرف تھا جہاں شاہی چتر دور سے نظر آ رہا تھا۔ درمیان راہ میں آنے والے سپاہیوں کو وہ بے دریغ ہلاک کر رہی تھی۔ نہ اسے اپنا ہوش تھا نہ اطراف کی خبر۔ خیمہ قریب دیکھ کر وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور گھوڑے کی موج

کیوں ہے۔؟"

اللہ سے محبت کرنے والا ہر دور میں ہر زمانے میں آزمایا گیا ہے۔ اور اس آزمائش سے نبی اور پیغمبر بھی گزرے ہیں۔ اس امتحان میں صبر اور ضبط ہی اطاعت اور محبت کا ثبوت مانا گیا ہے۔ مجھے اپنا اس حال پر فخر ہے۔"

"نیلا علم دفضل کہتا ہے کہ ہم تم پر صرف رحم و کرم کریں۔ وہ بولا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تیرا اعتماد ہم پر بحال ہو۔"

شبینہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

"ہمیں علم ہو چکا ہے کہ ہمارے خلاف ہونے والی سازش کا سرغنہ کون تھا۔ اس لیے ہم تجھے معاف کر چکے ہیں۔ وہ نرمی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ البتہ یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ آدم خاں کو قتل کرنے کے جرم میں ہم نے اسلام خاں کی زندگی کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے شبینہ کے تاثرات کو اس کے چہرے پر پڑھنے کی کوشش کی۔ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اسلام خاں نے آدم خاں کو کیوں مارا ہوگا۔ وہ اس کا احسان مند تھی۔ اس کی ذات ایک ٹھنڈا سایہ تھی جس سے وہ محروم ہو چکی تھی۔

"تیری بھول تھی کہ تو نے ہمیں اپنا دشمن سمجھا اور مفرور رسالہ لوگوں پر اعتماد کیے رہی۔ اب تو جا سکتی ہے۔ اس محل میں تجھے خصوصی اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔"

شبینہ نے خود کو محل کے ایک تنہا گوشے میں محدود کر لیا تھا۔ اگرچہ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی کسی قسم کی نگرانی نہیں تھی لیکن وہ حالات کے تحت اپنی ذات میں سمٹتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حسن تھا مگر شوخی رخصت ہو چکی تھی۔ اداؤں میں نزاکت اور بانکپن کی جگہ وقار آ گیا تھا۔ آنکھوں میں خوابوں کی جگہ ایک جامد

زندگی میں اب کچھ نہیں رہا ہے نوشینہ جا چکی ہے اور مجھے بھی اب جینے کی خواہش نہیں ہے لیکن نوشینہ کے لیے بھی ہمیشہ ایک مصیبت بنا رہے گا۔ اس کی پاکیزگی کے لیے ایک خطرہ بن کر زندہ رہے گا۔ لیکن میں شبینہ کی راہ صاف کر کے جاؤں گا۔ وہ سیدھا اپنے بھتیجے آدم خاں کی حویلی پہنچا اور یہ کہہ کر اس پر وار کیا کہ "تیری گواہی نے مجھے موت سے قریب کر دیا ہے۔ وہ اب یقینی ہے لیکن تیری ناپاک زندگی شبینہ کے لیے ایک مستقل عذاب بنی رہے گی اس لیے تیری موت بھی ضروری ہے۔" آدم خاں کے چیخنے چلانے پر حویلی کے محافظوں نے اسلام خاں کو گھیر لیا مگر وہ اتنی ہی دیر میں آدم خاں کا کام تمام کر چکا تھا۔

دوسرے روز اسلام خاں کو ناصر الدین محمد کے حضور پیش کیا گیا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس پر دوہرے الزامات لگا کر اسی دن اسلام خاں کو تہ تیغ کروا دیا۔

●

شبینہ جب ناصر الدین شاہ کے سامنے لائی گئی تو قید و بند کی اذیت نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ اور ناصر الدین کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"جن لوگوں کے زعم میں تو ہم سے ٹکرانے چلی تھی کہاں ہیں آج وہ سارے؟"

شبینہ نے ایک زخمی مسکراہٹ پھینکی اور پرعزم لہجے میں بولی۔ "انسان کسی انسان سے ٹکرانے کی ہمت کہاں رکھتا ہے ناصر الدین شاہ۔ میرا زعم اللہ اور اس کے رسول مقبول پر تھا اور وہ آج بھی برقرار ہے۔"

"لیکن اللہ نے تو تمہارا ساتھ نہ دیا۔"

"ظالم کی رسی ہمیشہ دراز کی گئی ہے۔" اس کا انداز پر یقین تھا۔

"خوب! علم سے بھی رغبت رکھتی ہے۔ تو پھر یہ بھی بتا کہ تو آج اس حال میں

دیوار کو تلوار سے چاک کرتی ہوئی گھوڑے کو اندر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ چار سپاہیوں کا دستہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ تن و توش توانا اور قوی ہیکل سپاہی سے گھیر چکے تھے۔ وہ سمجھ گئی اندر کے حصہ میں ناصر الدین موجود ہے۔ اس نے چاروں پر ایک تیکھی نظر ڈالی اور بولی۔ "میرا تم لوگوں سے کوئی لین دین نہیں ہے۔ میرا مقصد اندر ہے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"کمسن نوجوان۔" ان میں سے ایک بولا۔ "تیرا یہ جوش و خروش اور جرأت قابل تعریف ضرور ہے۔ لیکن ہم انسان نہیں سیسہ پلائی دیوار ہیں اگر ہمیں پار کر سکے تو پھر تجھے روکنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"

شبینہ مسکرائی۔ "میں نے اس لیے کہا تھا تم سے کہ میرا تم سے کوئی لین دین نہیں ہے تاکہ بعد میں مجھے ظالم نہ کہہ سکو۔ آج لوہا، پتھر، سیسہ، آگ کوئی چیز میری راہ نہیں روک سکتی تم تو گوشت پوست کے انسان ہو۔ سنبھلو میری تلوار آج صرف خون چاٹنے کے لیے ہی آگئی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ان پر ٹوٹ پڑی۔ بولنے والا سکتہ کی حالت میں کھڑا رہ گیا بقیہ تین شبینہ کے مقابلہ پر آ گئے اور وہ بجلی بن گئی۔ اس کی تلوار لمحہ لمحہ میں پینترے بدل کر تینوں پر پڑتی تھی وہ اس کی پھرتی اور چابک دستی سے پریشان تھے۔ اپنی ہی تلوار سے اس نے اپنے گرد بھی ایک حلقہ سا بنا لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دو کو گرا دیا۔ ایک اکیلا کچھ پرے کر چلے اپنی تلوار پر لے رہا تھا اس کا انداز اب مدافعانہ ہو چکا تھا۔ بولنے والا ابھی بھی خاموش کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیبت ان سب پر بیٹھ چکی تھی۔ شبینہ ان کے ہر وار کو ہر حرکت کو دیکھ بھی رہی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی۔ زخمی وہ بھی ہوئی تھی مگر اس کا انداز زخمی شیرنی کا سا تھا خونخوار، نڈر، منتقم۔ تیسرے کو زخمی کر کے اس نے جب خاک چٹائی تو وہ خود بھی ہانپ رہی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر اس محافظ کی طرف دیکھا جو شروع سے خاموش

نے کرا اپنی مطلب براری کے لیے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ شبینہ کو نیچا دکھانا اور اسے حاصل کرنا اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ابو بکر شاہ خود ہی راستہ سے ہٹ گیا تھا اور اب وہ اسلام خاں کے خلاف زیادہ سے زیادہ ناصر الدین کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ ابو بکر شاہ کے بعد اسلام خاں شبینہ کا ہمدرد اور محافظ بن سکتا تھا ابو بکر شاہ کے بعد اسے حاصل کرنا بہت آسان تھا ناصر الدین شاہ کو اسلام خاں کی غداری اور بدعملی کی داستانیں سنا کر بغض و عناد سے اس کا دل بھر کر آدم خاں اپنی حویلی واپس ہوا خوش و خرم مسرور و شاداں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ قسمت اس پر مہربان ہے ورنہ تاریک زنداں سے رہائی کیسے پاتا۔

●

اسلام خاں کو اپنے دوست اور دست راست ملک ضیاء الدین سے معلوم ہوا کہ آدم خاں نے ناصر الدین شاہ کو اس کے خلاف کر دیا ہے اور جھوٹی قسم کھا کر یہ گواہی دی ہے کہ اس کے خلاف ہونے والی تمام سازشوں میں سب سے اہم کردار تم تھے۔

اسلام طیش سے بھنا اٹھا۔ وہ آدم خاں کی بدنیتی اور ہوس کو کچھ گیا اس کے مکر و فریب سے وہ واقف تھا۔ لیکن حکمرانوں کا اس قدر جلد حالات کے تحت بدل جانا اسے بہت اذیت ناک لگا۔ وفاداری، جاں نثاری، رشتہ داری سب کچھ کو کھلی حقیقتیں محسوس ہوئیں۔ اس نے جن کی حکومتوں کو بچانے کے لیے خود زخم کھائے تھے وہی اسے سب کچھ چھینے لے رہے تھے۔ محبت، پاکیزگی، عفت، عصمت، خود داری اسے اپنا دامن آج بالکل خالی لگا اس کے دل میں نفرت اور بغاوت کا لاوا ایک دم اٹھا وہ آدم خاں کو غائبانہ طور پر مخاطب کر کے بولا "آدم خاں میری

کوئی چارہ نہ تھا۔

"کہو اب کیا کہتا ہے۔ تیرے تمام ساتھی تیرے سامنے پڑے ہیں۔" وہ بولی۔

"تو اندھا جا سکتا ہے۔ یقیناً تیرا قرض بہت دل دوز ہوگا۔ ورنہ ہم سے مقابلہ آسان نہیں ہوتا۔ ہماری مضبوط پہلوانوں کو زیر کر چکی ہے شیر مردوں کو پچھاڑ چکی ہے..... پاپی اسے لڑکا ہی سمجھ رہا تھا۔

شبینہ اس کی تعلیوں کو ان سنی کر کے اندر داخل ہو گئی جہاں ناصر الدین شاہ ایک چوبی تخت پر بیٹھا تھا۔ خوش نما قیمتی قالین اور حریر کا پردوں سے مزین یہ خیمہ شاہی کروفر کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ شبینہ نے ناصر الدین کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

"تو نے ہم تک پہنچنے کے لیے جس قسم کا مظاہرہ کیا ہے اس کی داد دیں یا سزا؟" وہ بولا۔

"تم اس دنیا میں انسانوں کو صرف سزائیں ہی دینے کے لیے آئے ہو۔ ناصر الدین شاہ ظلم و ستم تمھاری سرشت ہے۔ تم ایک جفا پیشہ انسان ہو۔"

"تیری زبان سان پر رکھی چھری کی طرح تیز معلوم ہوتی ہے۔ تیری کم عمری کی بنا پر ہم رحم و کرم برت رہے ہیں۔ لیکن اب یہ بتا کہ تو نے ہمیں ظالم اور جفا پیشہ کیوں کہا جہانبانی اور حکمرانی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے جرأت و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہمیں فخر ہے کہ اپنے خلد آشیاں بابا جان کی یہ صفات ہم میں موجود ہیں۔"

ظلم و ستم کا نام تم نے جرأت و ہمت رکھ دیا۔ لیکن بروز حشر معصوموں اور مظلوموں کے خون میں تمھارے ہاتھ ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس دنیاوی جاہ و حشمت اور تخت و تاج کے لیے تم نے جتنا خون ناحق بہایا ہے اللہ اور رسول کے سامنے اس کا کیا جواز پیش کرو گے۔ جن کمزور دوشیزاؤں کی معصومیت اور عصمت کو تم نے پامال

فردوس مکان ہمارے بابا جان فیروز تغلق کا پروردہ ہے"

"ہم لوگوں پر آپ کا اطمینان ہی ہمارے لیے خیر و فلاح کا ضامن ہے آپ کی ذات سے عقیدت کرنے کی پاداش میں مجھے سالہا سال تاریک زنداں میں بند کیا گیا تھا یہ آپ کی نوازش عالیہ اور بلند ظرفی ہے کہ میں نے اس دنیائے رنگ و بو کو دوبارہ دیکھا" آدم خاں وقت کا غلام تھا اور اس وقت وہ بادشاہ وقت ناصر الدین تغلق کے سامنے عیارانہ انداز پر دبانائی کے جوہر دکھا رہا تھا۔

ناصر الدین شاہ نے اسے تولنے والی نظروں سے دیکھا اور چند لمحوں کے بعد بولا: "شبینہ کا ابوبکر شاہ تغلق سے کیا تعلق تھا۔؟"

"وہی جو ایک پانسہ پھینکنے والے کا پانسے سے ہوتا ہے۔" آدم خاں بے دھڑک بولا۔

"ہمارے سامنے کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کیا کرو" ناصر الدین کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"غلام گستاخی کی معافی کا طلب گار ہے۔" آدم خاں گھبرا گیا۔ "شبینہ اور اسلام خاں مل کر ہر سازش کرتے تھے۔ دماغ اسلام خاں کا اور عمل شبینہ کا۔ ابوبکر شاہ صرف مہرہ تھا۔ شبینہ کا مقصدِ زندگی صرف انتقام تھا۔ اور یہ راہ اسے اسلام خاں نے دکھائی تھی۔"

"انتقام کس سے۔ ؟ ہم سے؟" ناصر الدین رک رک کر بولا۔

"ہر حکمراں سے ہر بادشاہ سے آپ اسے ایک جنونی لڑکی کہہ سکتے ہیں۔ جو معمولی تجارت سے مجلس کر آفتاب کو بجھانا چاہتی ہے۔ لیکن اسلام خاں ایک افعی ہے زہریلا اور موذی۔"

ناصر الدین شاہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور آدم خاں اسے اپنے اعتماد میں

نے تار تار کیا ہے ان کی آہوں کا سامنا کیسے کرو گے۔ جن ماؤں کی گودوں کو تم نے تاراج کیا ہے ان کی فریاد کن کانوں سے سنو گے۔ مگر یاد رکھو کہ یہ سب تو بعد میں ہوگا۔ میں وہ بدنصیب ہوں جسے تم نے ہر پہلو سے تباہ کیا ہے اور میں تمہیں تباہ و برباد کر کے مروں گی۔ جس ہمت و شجاعت کا اعلان کر رہے ہو اب ذرا اس کا مظاہرہ بھی کر دو۔"

شبینہ کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر ناصر الدین نے دیوار پر سے تلوار اٹھائی اور اسی کے ساتھ محافظوں کو آواز دی۔ تو شبینہ نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور بولی "ابن تغلق اپنے بل پر جینا سیکھو تمہارے محافظ آرام کی نیند سو چکے ہیں، ویسے اس وقت اگر تم اپنی ساری فوج کو بھی بلا لو گے تب بھی میری زد سے نہیں بچ سکتے۔ میں فیروز شاہی غلاموں کی اولاد ہوں جو سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔ تم ان کی پشت پر کبھی زخم نہیں دیکھ سکو گے آؤ۔ میرا وار سنبھالو۔" خیمہ کی فضا میں دو تلواروں کے ٹکرانے کی آواز گونج اٹھی شبینہ کی تلوار اٹھ رہی تھی گر رہی۔ شروع میں اس نے سنبھل کر وار کیے پھر اپنے رنگ پر آ گئی۔ وہ انسان کے روپ میں ایک بجلی تھی پانی کا ریلا تھی ہوا کا زناٹا تھی۔ ناصر الدین نے آنا پھرتیلا تلوار باز ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحہ میں دو تین وار کر کے پینترے بدلنا اور خود کو بچائے رکھنا۔ اس کے فن کی انتہائی پختگی کو ظاہر کر رہا تھا۔

اچانک گھوڑوں کی ٹاپیں ابھریں اور اسی کے ساتھ دونوں کی تلواریں ٹکرا کر ایک دوسری پر رک گئیں۔ تلواروں کی قینچی سی بن گئی اور ان میں زور آزمائی ہونے لگی۔ شبینہ کا مقابلہ اس مرتبہ ایک بادشاہ سے تھا دوسرے وہ پچھلی کئی گھنٹوں سے لڑ رہی تھی اور زخمی بھی کافی ہو چکی تھی وہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے زور آزمائی جاری تھی۔ کہ چند سوار اندر داخل ہوئے۔ شبینہ کی نظریں اٹھیں اور بٹنا بھول گئیں زخموں سے چور ابوبکر شاہ ایک قیدی کی حیثیت سے

اس کے سامنے تھا۔ ان ہی چند ساعتوں میں شبینہ کا ہاتھ سست پڑچکا اور ناصر الدین نے ایک جھٹکے سے اسے نیچے گرا دیا۔ اور پھر بسرعت ابوبکر شاہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ اس کا خود سر سے گر چکا تھا اور سنہرے بال اس کی پشت پر بکھر گئے۔ بیہوش شبینہ کو ابوبکر شاہ نے زمین پر لٹا دیا۔ ناصر الدین کے چہرے پر ایک لحظ کو حیرت کے آثار ابھرے پھر منہ پھیر کر وہ سپاہیوں سے بولا۔ "ابوبکر شاہ تیر تیرا مقدر تھی اور اسی لیے تو آج ہمارے رو برو کھڑا ہے۔ لے جاؤ اس ازلی قیدی کو اور مہانہ کے تاریک زندان میں ڈال دو اس کا فیصلہ اطمینان سے ہوگا۔" سب واپسی کے لیے مڑ گئے تو ناصر الدین کی آواز گونجی "محافظ دستہ بحال کیا جائے۔"

شبینہ کی آنکھ کھلی تو وہ فرش ہی پر پڑی تھی اور ناصر الدین شاہ اسی چوبی تخت پر بیٹھا تھا۔ شبینہ نے ادھر ادھر دیکھا اور پچھلے واقعات یاد آتے ہی وہ کچھ گئی کہ حالات پلٹا کھا چکے ہیں اور انھیں شکست ہو چکی ہے وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ناصر الدین نے بغور اسے دیکھا اور بولا۔

"تیری نزاکت فن دیکھ کر ہمیں شبہ ہوا تھا کہ تو کوئی دوشیزہ ہے۔ لیکن تو نے ہم سے دروغ گوئی کی کہ تو فیروز شاہی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔"

"بہادر انسان دروغ گو نہیں ہوا کرتا۔" وہ بے اعتنائی سے بولی۔

"کیا تو ابوبکر شاہ کی فرستادہ نہیں تھی جو تخت و تاج ہی نہیں ہماری زندگی کا بھی خواہاں ہے۔؟"

"ابوبکر شاہ تم سے کیا چاہتا ہے کیا نہیں میرا ان خواہشات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ میں تمہارے لیے بادسموم کا گرم جھونکا بن کر ضرور آئی تھی جو تمہارے خوشیوں کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے۔"

"تو پھر کیوں نہ کیا۔؟" وہ ذرا تن کر بولا۔

ناصر الدین شاہ بن تغلق فتح سے سرشار ایک بار پھر دار السلطنت میں داخل ہوا اور تخت شاہی پر بیٹھ کر اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ ایک بار پھر بادشاہ کے بدلے سے قیدی بھی بدلے گئے۔ ناصر الدین شاہ نے تنہائی میں آدم خاں کو بلایا اور بولا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو ہمارے سلسلے میں مخلص رہا ہے اور آج بھی ہمارا وفادار ہے؟"

"بندہ پرور، سرکار عالی وقار ظل سبحانی کا اقبال تا قیامت بلند رہے ناچیز غلام ہمیشہ آپ کا بہی خواہ رہا ہے۔ ماضی میں شبینہ اور اسلام خاں نے مجھ سے آپ کے خلاف کام لینا چاہا اور میرے انکار پر شبینہ نے مجھے تاریک زندان میں ڈلوا دیا۔ اس دنیا میں کون ایسا انسان ہے جو اس وحشت زدہ ماحول میں بخوشی جانا پسند کرے گا۔ یا کسی کا خیر خواہ بن کر اپنی عزیز ترین متاع یعنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا۔"

"ہوں۔" ناصر الدین نے کچھ مسکرا کر ہنکارا بھرا۔ "آج کا ثبوت بھی پیش کرو۔"

"جہاں پناہ۔ یہ زندگی بڑی دلکش چیز ہے۔ اور کسی کی زندگی لینا معمولی کام نہیں ہے۔ جبکہ اس میں اپنا کوئی مفاد بھی نہ ہو۔ مگر محض آپ کی خاطر میں نے آپ کے بدترین دشمن ابوبکر شاہ کو ختم ہی کر دینے کا ارادہ کیا اگر میں اس وقت اس شخص کو جان سے مار سکتا تو یہ میری عین خوش قسمتی ہوتی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میرے اس خلوص نیت کی آپ کو خبر بھی نہ ہوتی اور میں اسی اندھیرے میں خود بھی ختم ہو جاتا۔ لیکن میرا مشرب کمینوں، غداروں کا ہمنوا بن کر احسان فراموش کہلانا نہیں ہے۔ حالانکہ میں فیروز شاہی غلام ہی ہوں۔"

"ہم مطمئن ہوئے اور تیری اس نیک نیتی اور وفاداری پر خوش بھی۔ ہم فیروز شاہی گروہ میں غداروں ہی پر ناخوش تھے ورنہ یہ گروہ خلد آشیاں

نصیحت نہ تیری ہے نہ میری ۔ وہ اسلام خاں کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے ۔ میرے ذریعہ
وہ اسلام خاں ہی کو بٹھانا چاہتی تھی ۔ تیری حکومت کی بیخ کنی اسی نے کی ہے
وہ انتقام کی آگ میں جلی ہوئی ہے ۔ ہر بادشاہ اس کا دشمن ہے اس کے دل
میں حسرت اسلام خاں.....

ابوبکر شاہ مارے طیش کے کھڑا ہو گیا اور ایک زناٹے سے تھپڑ آدم خاں کے گال پر
مارا ۔ تو اصفت ہاتھ کا تھپڑ کھا کر آدم خاں اوندھے منہ گرا ۔ ابوبکر شاہ نے زنجیروں
میں اسیر بندھے ہونے کے باوجود ایک ٹھوکر اس کے ماری اور بولا ۔ کم ظرف ، ذلیل
بدبخت اپنے خون کو گندہ کہہ کر اپنے ہی چہرے کو داغدار کرتا ہے تو اس
دوشیزہ پر الزام لگاتا ہے جو فرشتوں کی طرح نیک اور پاکیزہ ہے ، جو ہمارے
لیے فتح و کامرانی بن کر آئی جو اپنے خاندان کے لیے مشعل ماہتاب بنی ۔ جس نے اپنی
عفت و عصمت کو سیپ میں بند موتی کی طرح محفوظ رکھا ۔ ہم دو مرتبہ اسی کے
مشوروں سے فتح یاب ہوئے ۔ آج اس معمولی سی شکست پر بزدلوں اور بدبختوں
کی طرح اپنے ہمدردوں پر شک و شبہ کر کے ہم ناصر الدین کی طرح ظالم کہلانا پسند
نہیں کریں گے ۔ تو شبنم پر کوئی الزام لگائے اس سے بہتر ہے کہ اپنے ناپاک
وجود کو کسی دریا میں غرق کر دے.....

آدم خاں نے سر اٹھایا اس کے منہ سے نکلنے والے خون نے اس کی داڑھی کو
سرخ کر دیا تھا وہ خونی نظروں سے ابوبکر شاہ کو گھورتا رہا اور پھر ایک دم ہی
اس پر حملہ کر بیٹھا اس کے ہاتھوں کی زنجیریں ابوبکر شاہ کے سر پر پڑیں اور خون
کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا ۔ ابوبکر شاہ اپنے ہی خون میں نہا گیا ۔
زنجیروں کا شور باہر تک پہنچ رہا تھا ۔ ناصر الدین شاہ تک آدمی بھیج دیا گیا تھا
کہ اسے ان قیدیوں کی اس حالت سے آگاہ کر دیا جائے ۔

"اس لیے کہ تم بزدل انسان نکلے ۔"
"لڑکی زبان سنبھال اور دیکھ تیرا مقابل کون ہے ۔ تو نے ہمارے لیے جو سخت
الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ کیا ثبوت ہے تیرے پاس ۔؟"
"ناصر الدین تغلق ، ثبوت تو تم نے ابھی خود دیا ہے ۔ میں عورت تھی لیکن پھر
بھی میں نے للکار کر تم پر حملہ کیا اور تم نے مرد ہو کر بھی بے صبری میں مجھے زیر کیا
بے صبری میں دشمن کو مارنا بہادری نہیں ہوتی ہے ۔
"پھر بھی ہم ہیں خاک کرنے والے خود خاک نشین ہے : ناصر الدین کے چہرے پر
جھنجھلاہٹ نمایاں تھی ۔
"خاک نشین ہی مغروروں کی گردنیں جھکایا کرتے ہیں ۔ تم کہتے ہو کہ تم فتحیاب
ہو ۔ تم تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہو ۔ تمہاری بنیاد کھوکھلی ہو چکی ہے ۔ اور اب تمہاری
تباہ حال مظلوم رعیت تم سے اپنا حساب مانگے گی ۔ تمہارے حامی نہ انسان رہیں گے
اور نہ خدا ، و گار ہو گا ۔ تمہارا اعیاش اور بدکار بیٹا تمہارے ظلم بہیمیت وحشت و
بربریت کی سزا بن کر تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے گا ۔ رسول اللہ کا فرمان تمہارے
لیے حرف آخر ثابت ہوگا کہ اگر تو عدل نہ کرے گا تو محروم رہے گا اور اگر معاف نہ
کرے گا تو خسارے میں رہے گا..... ناصر الدین شاہ تم ابولہب کی شقاوت اور
ابوجہل کی جہالت کو اپنائے ہوئے ہو تم نے عدل انصاف رحم اور فراخ دلی سے کنارہ کشی
کی ہے ۔ اب تم مرنے والوں کے تڑپو گے.....

ناصر الدین کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا وہ زور سے چیخا ۔ بند کرو اپنی یہ زبان درازی
تو رحم و کرم کی مستحق ہے نہ حقدار..... کیونکہ ہم ظالم ہیں ۔ ہاں ہم ظالم ہیں ۔
ناتوانوں اور بے وفاؤں کے لیے ہم ظالم ہیں ۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا ۔
"لے جاؤ اس غدار گروہ کی ناگن کو قید و بند کی صعوبتیں اس کی راہ دیکھ رہی ہیں ۔"

اور یہی اس کا مقدر ہے۔

●

ابوبکر شاہ جس وقت قید خانہ کے تاریک کمرے میں داخل ہوا تو ایک طویل قہقہہ نے اس کا استقبال کیا۔ وحشت وطنز کا مظہر یہ قہقہہ اس کے اعصاب کو ہلا گیا۔ اس نے تاریکی میں آنکھوں کو سکوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا ہاتھوں پیروں میں پڑی ہوئی آہنی زنجیروں کی آواز نے اس کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ اندھیرے میں آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے ایک کونے میں آدم خاں نظر آیا۔ سر اور داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں نے اسے خوفناک صورت بنا رکھا تھا۔

"کون ہے تو ۔۔؟" ابوبکر شاہ نے شک دور کیا۔

"ایک ایسے شہنشاہ کا مجرم قیدی جو اس وقت خود بھی قیدی بنا میرے سامنے کھڑا ہے۔ گویا کہ اب مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اسی لیے میں شبینہ سے کہا کرتا تھا کہ حکومتوں کے عروج وزوال پر میرا یقین نہیں ہے۔ ہمیں صرف وقت کا فرمانبردار ہونا چاہیئے:"

"احمق انسان ۔ قیدی، قیدی میں فرق ہوتا ہے۔ تو مجرم ہے اور ہم اپنی حکمت کے زنداں میں ہیں:"

"میں الفاظ کے ان پھیروں پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ اس تاریک زنداں میں تو بھی ہے اور میں بھی اور دونوں کی زنجیروں سے ایک سی آواز نکل رہی ہے اور ہم دونوں کو اس حال میں پہنچانے والی بھی ایک ہی ہے:"

"تیرا اشارہ اگر شبینہ کی طرف ہے تو بات کو واضح کر:"

"ابوبکر شاہ تو نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے لیکن میں انسان کو صرف انسان کہتا ہوں۔ کسی کی بادشاہت کچھ دیتی ہے نہ عروج، انسان

کی اپنی عقل اور تدبیر اس کے کام آتی ہے۔ اسی لیے جب کسی کی عقل سازش کرتی ہے تو دوسرے کی تدبیر الٹ جاتی ہے اور وہ مسند بادشاہت سے اتر کر زنداں کی تاریکی کا حصہ بن جاتا ہے:"

ابوبکر شاہ کے چہرے پر تنفر آمیز مسکراہٹ ابھری: "جب انسان کے پاس واضح بات نہیں ہوتی ثبوت نہیں ہوتا دلیل نہیں ہوتی تو وہ لفظوں کا ایک مکروہ جال بچھاتا ہے۔ تیری اتنی دیر کی گفتگو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تو ایک حاسد انسان ہے اور خودغرض ہے:"

آدم خاں زور سے ہنس پڑا اور بولا: "یہ تاریک اور زمین دوز زندان ہے کہ جہاں سے تجھے اور مجھے صرف موت ہی رہائی دلوا سکتی ہے اس لیے تیری باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں خودغرض بھی ہوں اور ابن الوقت بھی لیکن تو کہتا ہے تو مانے لیتا ہوں کہ حاسد بھی ہوں۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اپنی ایک خوبی بھی بتا دوں کہ میں کسی کو بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھتا۔ صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہوں خواہ وہ دوست ہو یا دشمن۔ میں ہر کام سودا سمجھ کر کیا کرتا ہوں تاکہ کام کا منافع لے۔ شبینہ نے سودا تو کیا مگر بعد میں مکر گئی۔ اور میں یہاں بھیج دیا گیا۔ یہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ اس کی رفاقت ایک دن تجھے بھی یہاں ضرور لائے گی:"

ابوبکر شاہ نے بغور آدم خاں کو دیکھا اور بولا: "تو کیسا عجیب انسان ہے کہ اپنے ہی گروہ کی ایک معصوم اور مظلوم لڑکی پر اتہام لگائے جاتا ہے۔ تیرے جیسا مرد ایک عورت سے کس قسم کا سودا کر سکتا ہے ہمیں پورا اندازہ ہے اور اس کا مکر جانا اس کی عزت کی دلیل ہے:"

"تو حقیقت کی طرف سے غافل ہے اور سب کی دلکشی میں کھویا ہوا ہے

"پھر تو دیکھ لیا۔ جہاں جانا نہ چاہتا تھا وہاں بھی گیا مگر۔ نجانے وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے کہ دکھائی نہ دیا۔ میں البتہ تضحیک و تمسخر کا نشانہ بن گیا۔"

دفعتاً ایک آٹو رکشا گیٹ میں داخل ہوا۔ شاہت چونک کر دیکھنے لگے۔ مگر اسی میں سے ڈاکٹر عظمت کو اترتے دیکھ کر ان کے چہرے پر پھر سے مایوسی کی تاریکی چھا گئی!۔

عظمت نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا وہ جھپٹ کر اوپر آئے!۔ اور بڑی تشویش سے کہا "کیوں بھائی جان۔ خیریت تو ہے۔ آپ بے حد پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔!"

"میں واقعی بہت پریشان ہوں" شاہت نے خشک پپڑی بندھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "صبح سے لے کر اب تک ایسی ایسی جگہوں پر گیا ہوں اور اس طرح مارا مارا پھر رہا ہوں کہ پیروں کے ٹکڑے تو اڑ ہی گئے تھے۔ دماغ کے بھی پرخچے ہو گئے ہیں"

عظمت دکھلا کر آگے بڑھ گئے "مگر کیوں۔ بات کیا ہوئی؟ کچھ مجھے بھی تو بتایئے!"

"الیاس احمد نے بہت پریشان کیا ہے مجھے۔!" شاہت نے کہا "دھمکی دے کر گھر سے بھاگے تھے کہ کلب جاؤں گا! میں ان کے پیچھے اس لیے بھاگا تھا کہ۔!"

"اوہ۔ بھائی جان۔ آپ نے خوامخواہ اتنی تھکن اور پریشانی مول لی" عظمت نے کہا "آپ ادھر گھر سے گئے اور ادھر الیاس صاحب گھر واپس آ گئے۔ بخار اور دردِ سر میں مبتلا تھے۔ دردِ سر تو اب نہیں ہے۔ بخار بدستور ہے۔ میں انہی کے لیے انجکشن لانے تو گیا تھا!۔ یہ دیکھئے پیکٹ!"

"کیا کہہ رہے ہو۔!"

"بھائی جان وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ کہا بابا آپ کو پوچھ بھی چکے ہیں" عظمت نے ہنستے ہوئے کہا "تو شاہت نے ان کی تقریر کا جواب بھیجا تھا۔ وہاں سے جڑ کر گئے ہیں"

(باقی آئندہ)

"جی!" بے حد مضمحل مسکراہٹ اس کے پژمردہ لبوں پر ابھری۔

"یاد ہے تمھیں؟" وہ ہنسنے لگے۔

"جی ہاں!" کچھ گلابی ہو کر اس نے سر جھکا لیا۔

"اب مجھے وجہ بتاؤ کہ تم نے تعلیم چھوڑ کیوں دی۔؟"

"کیونکہ آپ نے میری کلاس لینی چھوڑ دی۔!" بے حد سادگی سے ماریہ نے بتا دیا۔ مگر شاہت کو یوں لگا جیسے ان کا مضبوط دل ایک ہچکولا لے کر حلق میں آ پھنسا ہوا۔ یک بیک ان کی ہتھیلیاں پسیج گئیں! انھیں کوئی جواب نہ سوجھا۔!

ماریہ اٹھی۔ ٹرے سنبھالی اور واپسی کے لیے مڑ گئی!۔

تبھی ایک ملازم وہاں آیا اور کسی کی آمد کی اطلاع دی۔

شاہت کے کانوں میں عجیب سی سائیں سائیں ہو رہی تھی! بے جبری میں ان کے منہ سے نکلا۔

"جو کوئی بھی آیا ہو۔ اسے یہیں بھیج دو۔!"

اور انھوں نے میز پر سر اوندھا لیا!۔

اب کون کہے گا کہ ماریہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے؟۔ ان کے ذہن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی!۔

"کیونکہ آپ نے میری کلاس لینی چھوڑ دی۔"

اظہار محبت و عقیدت اور اس سیدھے سادے طریقے پر۔ اف خدا۔ اپنی اس کیفیت سے وہ پریشان تھے۔ انھوں نے محبت کے جذبے کا آج تک مذاق اڑایا تھا۔ شاعر تھے۔ حسن کے ثنا خواں، عشق کے منکر۔ ایک نیم پاگل لڑکی کے منہ سے نکلا بے ساختہ جملہ انھیں گھبرائے دیتا تھا!

پھر انھوں نے سر اٹھایا۔ اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑے۔

شباہت صاحب تم خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے!
اور لمبے لمبے کش لے کر فضا کو غبار آلود کرنے لگے!۔

عجیب سا اتفاق ہوگیا وہ بھی
ماریہ اوپر سے نیچے آرہی تھی اور رضوانہ نیچے سے اوپر جارہی تھی!۔ ایک زینے پر دونوں کا ٹکراؤ ہوا۔ رضوانہ کے لبوں سے حیرت میں آلودہ ننھی سی چیخ نکلی: ماریہ۔ تم۔ یہاں۔؟"
رضوانہ۔!" ماریہ بھی متحیر تھی۔ دونوں میں بہت دور کی شناسائی تھی۔
تم یہیں رہتی ہو کیا۔ یہ چالے کی سروس۔!" رضوانہ کے لب سوکھے جارہے تھے!" کب سے ہو یہاں۔!
پورا رمضان شریف یہیں گزرا ہے!" ماریہ نے جواب دیا۔
عید بھی یہیں گزاروگی!۔
اس کی خبر خدا کو ہے۔!
روزہ نہیں ہو تم!۔
اماں اور ممون بھائی ہیں۔!
بس؟
بس!
اچھا میں چلوں!۔
شوق سے جاؤ!: ماریہ تیز تیز قدم رکھتی نیچے چلی گئی۔ وہ جب تک نیچے اتر کر کسی موڑ پر نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ رضوانہ اسے دیکھتی رہی پھر خشک لبوں پر زبان پھیرتی اور اوپر بڑھ گئی!۔
دروازے پر ایک مختصر سی کھانسی کھانس کر اس نے اپنی موجودگی کا اعلان

طمانیت قلب کا دھوکا دو۔ یہ اور حماقت ہے۔ اچھا۔ میں چلا۔ خدا حافظ!"
وہ چلے گئے اور سب کو بت بنا گئے! ان کے بھاری قدموں کی آہٹیں آہستہ آہستہ معدوم ہوگئیں!۔
الیاس احمد نے اتنا بہت سا کیا کہا تھا: ہکّا بکّا سی اماں نے پوچھا: کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا۔ وہ گئے کہاں ہیں؟۔ تم اصلیں کس بات سے منع کر رہے تھے کچھ مجھے بھی بتاؤ!"
الیاس کو واپس آنا پڑے گا!" شباہت نے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ ماریہ نے بھائی کی پوری تقریر بڑے ضبط و سکون سے سنی تھی۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر نوشابہ سے بولی۔
"تم نے دیکھی۔ میری ذات کی ایک اور نحوست!:
نوشابہ اور رضوانہ یوں گم صم تھیں جیسے بولنا بھول گئی ہوں:!۔

گیارہ بجے رات کو شباہت تھکے ماندے پریشان اور مضمحل سے گھر واپس آئے ان کے قدم اتنے بوجھل اٹھ رہے تھے جیسے ان میں آگے بڑھنے کا دم نہ رہا ہو۔ رومال نکال کے انھوں نے چہرہ پونچھا اور چبوترے کے اسٹول پر بیٹھ کر سانسیں درست کرنے لگے!
کمپاؤنڈ میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور نزدیک سناٹے کی حکمرانی تھی۔ اس دور سے ذرا سا منحوس سناٹے سے شباہت کو الرجی ہونے لگی تھی۔ انھوں نے اٹھ کر کمپاؤنڈ میں روشنی کردی!۔ اور زیر لب بڑبڑائے۔

گی۔ میں سوچا ہوں گا یہ شراب پینے کی سزا ہے۔ یہ بُری عورتوں کے قرب کی سزا ہے یہ بے ایمانی رشوت، سود خوری، دل شکنی، بے راہ روی اور بد چلنی کی سزا ہے میں بھی تو دیکھوں۔ قدرت آخر کتنی بے رحم ہے۔!"

الیاس۔ خدا کے لیے اپنے صاف ستھرے کردار میں داغ نہ لگاؤ۔!" شباہت کی ساری کا جھنپ اور غلیت اس وقت سر بگریباں تھی۔ الیاس کے غم آہ و زاری کی منزل سے ہٹ کر دوسرا رخ اختیار کر چکے تھے۔ یہ رخ تاریک اور بھیانک تھا۔

"تمھارے بچے؟" بڑی مشکل سے اماں نے کہا۔ جاہل مطلق تھیں تو کیا۔ اتنا تو سمجھتی ہی تھیں کہ وہ دوسری طرح کے پاگل تھے۔ ہوشمند پاگل۔

میں نے آپ سے کہا نا کہ انسان خود رَو مخلوق ہے۔ یہ بچے بھی خود رَو ہیں۔ پل جائیں گے۔ اگر نہیں پل سکیں گے تو ضائع ہو جائیں گے۔ ضائع ہو جانا آدمی کا مقدر ہے۔ آج نہیں تو کل: وہ بولے۔

آدمی اور آدمیت کو تم نے نہایت ارزاں کر دیا ہے: شباہت نے کہا۔

آدمی اگر بہت قیمتی شے ہے تو کس کام کا۔؟"

دنیا کی ہر شے فانی ہے۔!" شباہت نے دلیل دی۔

فانی شے کی حفاظت کرکے اسے لافانی کرنے کی خواہش حماقت ہی تو ہے:

"الیاس! میں پھر کہتا ہوں۔ ایک اچھی زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ تم آخر میں بہت پچھتاؤ گے۔ اور تب تمھارے پچھتاوے اور ندامت سب بیکار ہوگی:

"افسوس کہ میری رفاقت بھی تمھارے کسی کام نہ آئی!" شباہت نے کہا۔

تمھاری رفاقت: الیاس احمد حقارت سے ہنس پڑے: تم خودکشی بسیط تاریکی میں ہو۔ تمھیں اپنا ادراک نہیں ہے۔ تمھارے دماغ میں الاؤ سلگتے ہیں تمھارے دل میں جہنم بھڑک اٹھتا ہے۔ تم خود کہاں مطمئن ہو۔ اپنے آپ کو سکون

کیا اور بولی: میں آسکتی ہوں!:

یہ نئی آسکتی ہوں کون محترمہ تشریف لے آئیں۔ شباہت نے سوچا۔ سگریٹ کو ایش پاٹ میں ڈال کر وہ کھڑے ہوئے اور بلند آواز میں بولے: آپ تکلیف مت کیجئے۔ میں خود باہر آرہا ہوں!:

یا خدا۔ رضوانہ بڑبڑائی اور دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

شباہت نے پردہ ہٹایا۔

تسلیم: رضوانہ کا ہاتھ پیشانی سے جا لگا!۔

آپ ہیں۔؟ میں سمجھا کہ۔ آیئے آیئے!: اور پھر اندر چلے گئے۔ اپنی بے اختیار مسکراہٹ اور بے قابو مسرت کو بمشکل ضبط کرتی رضوانہ نے کمرے میں قدم رکھا! اسے حیرت تھی۔ یہ شخص جس کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا ہے۔ سیکنڈوں میں یہ انقلاب کیسے آگیا۔!

شباہت نے کرسی سنبھالی اور سر کے اشارے سے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے تکلف سے وہ چوڑے ہتھے والی کرسی پر ٹک گئی!۔ اور فرش سے نظر بازی شروع کر دی۔! اسے احساس تھا کہ ان کی نظریں اس کے چہرے پر ہیں۔ اسے اپنا چہرہ لمحہ بہ لمحہ آگ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ چہرے کے نقوش اس کے قابو کے نہیں رہے ہیں۔ ناک آگے بھاگ رہی ہے۔ نچلا لب ٹھوڑی تک لٹک گیا ہے اور آنکھیں دور تک چر گئی ہیں!۔

آپ کو میں نے بلایا تھا۔ مجھے یاد آیا: انھوں نے کہا: دیکھئے۔ وہ جو چند کتابیں اس میز پر رکھی ہیں۔ ان پر میں نے کچھ نہ کچھ تحریر کر دیا ہے۔ آپ وہ لے سکتی ہیں!:

جی بہت بہت شکریہ!: رضوانہ زبردستی مسکرائی۔ اور اٹھ کر کتابیں سمیٹ لیں جو بات کو بڑھانے کی غرض سے بولی۔

جیسے سجایا سنوارا جائے۔ زندگی اپنی نہیں ہے۔ اس پر اپنا اختیار نہیں ہے۔ جب چاہے فنا ہو جائے تو پھر اسے خوبصورت بنانا۔ اس کی فکر کرنا۔ اور اسے ضائع ہونے سے بچانا پرلے سرے کی حماقت ہی تو ہے۔ اپنی تقدیر کو رو رو کر کیوں بھگتا جائے۔ اسے اچھی طرح استعمال کر کے کیوں نہ دل کو مطمئن کیا جائے؟؟ میں اب یہی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی اس بے قابو بے اختیار زندگی کو خوب اچھی طرح استعمال کروں گا۔ اور ہرگز نہیں پچھتاؤں گا۔

الیاس یہ تم کیا بے تکی بکواس کر رہے ہو۔! شباہت متحیر تھے۔ الیاس احمد کا چہرہ آگ ہو رہا تھا! تمہارا علم وسیع ہے۔ تم متکلم ہو۔ تمہاری عقل تیز ہے۔ تم خدا پر مکمل یقین رکھتے ہو۔ اس کے ہر کام میں اچھائی اور مصلحت پوشیدہ دیکھتے ہو کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ میری آناً فاناً بربادی میں خدا کی کیا مصلحت تھی میری سفینہ کیوں مر گئی۔ کیوں اکیلا چھوڑ گئی مجھے۔ میری بچی جس کی پیدائش کے لیے مجھے خدا کے سامنے پیشانی رگڑنی پڑی تھی۔ کیوں اپنی ایک جھلک دکھا کے مجھے بے چین کر گئی؟ کیوں۔ آخر کیوں۔؟ کیا گناہ کیا تھا میں نے؟ میری پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ میرے کسی ایسے جرم و گناہ پر انگلی رکھ دو۔ جس کی سزا قدرت کی طرف سے مجھے ایسی ہی ملنی تھی۔ تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر یہ بے گناہی کی سزا ہے تو پھر قدرت سے انتقام لینے کا مجھے پورا حق ہے!"

انتقام لوگے تم قدرت سے؟! شباہت ان جیسے کم سخن شریف اور مہذب انسان کے منہ سے یہ عجیب سی باتیں سن کر حیران رہ گئے! قدرت تمہیں دکھائی تو نہیں دیتی!۔ قدرت جسم نہیں رکھتی۔ تازیانے کس کی پیٹھ پر برساؤ گے۔؟

کیا یہ انتقام تم خود اپنی ذات سے نہیں لوگے؟؟

یہی سہی۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ الیاس احمد نے کہا۔ اب جو سزا مجھے ملے

"آپ کی نئی کتاب "کف گلفروش" کب تک چھپ جائے گی؟! اس کا مجھے بے حد انتظار ہے!"

آجائے گی شاید ہفتہ عشرے میں!۔

"اگر آپ کی مرضی ہو تو اس کی ایک جلد بھی۔ اپنی تحریر کے ساتھ۔ مجھے دیجئے!"

بہت اچھا۔

آپ اگر مصروف نہ ہوں تو میں آپ کے چند منٹ۔

ضرور۔ میں اس وقت بالکل فارغ ہوں۔ فرمایئے!"

"دہ" میری کوئی گرید تی ہوئی ہوتا ہے۔ ماہنامہ "سحر" میں۔ میری نظم آپ کے انتساب کے ساتھ آپ نے دیکھی۔!

ہاں۔ پڑھی تھی۔ شاید میری صاف گوئی آپ کو بری لگے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے نہ آپ کی آزاد نظم پسند آئی اور نہ انتساب۔ آزاد نظم کی بھی کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ آپ نے ان کا خیال نہیں رکھا۔ میرا مشورہ تو آپ کو یہی ہے کہ اس شغل سے ہاتھ اٹھایئے۔ آپ اپنا جس قدر مطالعہ وسیع کریں۔ یہی آپ کے لیے کافی ہے۔۔ اچھا اور کچھ۔؟"

میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔! آپ اگر اجازت دیں تو میں کبھی کبھی یہاں آیا کروں۔ نوشابہ میری بہت پرانی سہیلی ہے۔!"

اس میں میری اجازت کا کیا سوال: وہ خشک لہجے میں بولے: سبھی لوگ آسکتے ہیں۔ اور کچھ۔؟

جی نہیں!۔

خدا حافظ!"

گئی تھی بقول نوشابہ کے جا پریوں کے اڑتی ہوئی۔ اور واپس ہوئی اس طرح

فرمائیے اور لڑکیوں کو بھی دے دیجئے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ رات کے کھانے پر ملوں گا۔ چار بجے ایک صاحب سے کلب میں ملنا ہے۔ چائے پر بھی میرا انتظار مت کیجئے گا!"

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔!

تم تو کبھی کلب ولب نہیں جاتے تھے!" شاہت نے پوچھا۔

دل کے بہلانے کے ذریعے ڈھونڈتا پھرتا ہوں!۔

میں نہیں سمجھا تمہارا مطلب۔ کیا تمہارا دل گھر میں نہیں لگتا؟۔

گھر میں میرا کیا کام ہے۔؟

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے بچوں سے بھی یکسر لاپرواہ ہو کر رہ گئے ہو۔

بچے؟" یاس احمد استہزائیہ انداز میں ہنس پڑے "تم شاید ایک لمبا لیکچر مجھے دے دوگے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب گھر بار سے، کاروبار سے، بچوں سے حتیٰ کہ خود سے بھی کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہیں رہ گیا۔ میری پچھلی زندگی بڑی پرسکون پاک وصاف، اور ہموار تھی!۔ میں اتنا خوش تھا کہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا نہ تھکتا تھا۔ مگر اب۔ جو المناک اور ناقابل یقین انقلاب میری زندگی میں آیا ہے۔ اس نے میرے ایمان وعقائد اور خیالات کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے ہیں میں اپنے شدید محسوسات میں کفر کی حدوں کو چھونے لگتا ہوں۔ میرے خیالات ملحدانہ ہو گئے ہیں۔ اب میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ دنیا محض عناصر اربعہ کی یکجائی کا کرشمہ ہے۔ انسان ایک خود رو مخلوق ہے۔ جو بالآخر عناصر ہی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ انسان بہت ارزاں بہت حقیر بہت بےبس مخلوق ہے۔! اگر وہ بڑے بڑے دعوے کرے کہ وہ قدرت کی تسخیر کی قوت رکھتا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ اپنا دانت تک تسخیر کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اور زندگی ہے کیا چیز

جیسے بدن میں سیسہ بھرا ہو۔ کیا کچھ نہ تھا دل میں کہنے کے لیے۔ مگر سننے والا کون تھا!۔ بیچے اتری اور منہ لٹکائے سامنے تخت پر جا بیٹھی۔!

کیوں۔ کیا بات ہے؟" وجاہت نے مسکرا کر پوچھا "اوپر سے آئی ہیں! آپ اگر ضرورت ہو تو جلدی چونا گیس کے لئے آؤں۔! اتنا استعمال کیے تھے کہ چہرے کا بیلٹ۔؟؟"

اپنی بیتی سنا رہے ہو کیا۔؟" جل کر رضوانہ نے کہا۔

ہم تو بڑا مجرب مرہم ہمیشہ تیار رکھتے ہیں۔ ادھر بیلٹ نے کمر پر پھول بوٹے بنائے کہ ادھر ہم نے ان پر مرہم تھوپ لیا۔ آپ چونکہ پہلی بار اس منزل سے گزری ہیں اس لیے بتا دیا کہ شاید آپ کو پتہ نہ ہو۔!"

بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو وجاہت" رضوانہ بولی "کچھ کتابیں تھیں وہ لینے آئی تھی!۔

"منہ لیکن آپ کا تنا ر کی طرح لیا۔!" وجاہت بولا۔

ادھر اماں آگئیں اور وجاہت چپ ہو گیا۔

ادی بی بی برسوں بعد صورت دکھائی ہے تم نے۔" اماں تنک کر بولیں "کیا تو نوشابہ سے دانت کاٹی روٹی تھی نہ کہ اس کے بیاہ میں بھی شریک نہ ہوئیں کچھ لڑائی وڑائی ہو گئی تھی کیا؟"

خالہ اماں ان دنوں میں بیمار ہو گئی تھی۔!"

"بہرحال بھابی نے آپ کی دشمنی ایسی آنچل میں باندھی ہے کہ کئی بار کہہ چکی ہیں وہ آپ کی شادی میں بھی شریک نہ ہوں گی!" وجاہت نے کہا۔

توبہ! اماں نے کہا "ایسا غضب بھی کیا۔ نوشابہ کو میں ضرور بھیجوں گی انشاء اللہ اس کے بیاہ کی گھڑی تو لائے!۔ لڑکیوں کو آپس میں عناد نہیں رکھنا چاہیے بلکہ

آگے چوں کہ کیا وقت پڑے۔ بل جل کے رہنے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ مگر آج
کل کے دماغ۔ توبہ۔ ایک ہم تھے۔ میری پرانی ہم محلہ بی کرامت النسا بیگم تھیں۔
ہم میں نہ کوئی خون کا رشتہ نہ کوئی نگوڑی عزیز داری۔ مگر دیکھو کہ نہ لڑائی جھگڑا
نہ کچھ۔ پچاس برس سے اوپر دن نکل گئے۔ ہمیشہ ہم دونوں ابھی تک ہر ایک کی
خوشی غمی میں شریک ہوتے ہیں۔ اب عظمت میاں کی شادی میں وہ مانجھے سے
چار روز پہلے آ گئی تھیں۔ بیاہ کے چار روز بعد گئیں۔ جیسے میری سگی بہن ہوں۔
ایسا مضبوطی ان کے آنے سے مجھے ہوئی ہے کہ کیا بتاؤں۔ تم لوگوں کو اب سے بیس
برس بعد والی دنیا میں جینا ہے۔ بات بات پر ایک دوسرے سے بدلہ لوگے تو پھر کے
زندگی اجیرن ہو جائے گی! کیوں رے۔ یہ تو منہ کیا بنا رہا ہے" انھوں نے
وجاہت کو دیکھ کر للکارا۔

"اماں آپ بوا رضوانہ کو نہیں دیکھتیں۔ وہ سر تھامے بیٹھی ہیں۔ آپ کی تقریر
سے ان کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں انھیں اشارے سے کہہ رہا تھا کہ آپ کی
باتیں سنیں۔ کام آنے والی ہیں۔ میں آپ کو منہ نہیں بنا رہا۔!"

اسے جوتے پڑیں۔ بے ساختہ رضوانہ کے منہ سے نکلا۔ "سن لیا اماں آپ نے
وجاہت نے کہا۔

بی بی تم۔!"

اماں میں بہت جی لگا کے آپ کی تقریر سن رہی تھی" رضوانہ بولی "یہ۔
خواہ مخواہ ایسی الٹی سیدھی بکواس کر رہے ہیں۔ اماں پرکھ لیجیے۔ نوشابہ میری
ایسی پیاری سہیلی ہے۔ میں اس سے بالکل ناراض نہیں۔ اب میں اس کے
پاس جا کے بیٹھوں گی اور بہت سی باتیں کروں گی!"

میاں تم اتنا جھوٹ بولنا۔ اور بیچ میں کٹنا پا کرنا کب سے سیکھ گئے" اماں نے

اماں نے کہا۔

"تم اور شباہت کوئی الگ الگ نہیں۔ لیکن اس طرح کی فضول خرچی سے تو میں
شباہت کو بھی روکتی ہوں۔ ابھی سب کے کپڑے عظمت کے بیاہ پر بنے ہی تھے نیا دھیر
ہیں۔ نئے کپڑوں کی کیا ضرورت تھی!"

"ایک دفعہ میری خوشی بھی پوری کر دیجیے۔ پھر اگلے سال تک حالات کیا ہوں
کیا نہ ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ اچھا تو اب حاضرین کو حکم دیجیے کہ اپنی اپنی پسند کے
پیس اٹھا لیں" الیاس نے کہا۔

چلو" شباہت نے بھی کہا۔ "تکلف مت کرو!"

سب سے پہلے شمعون نے بڑی فراخدلی سے پتلون اور بش شرٹ کے پیس
اٹھا لیے اور ایڑیاں بجا کر الیاس احمد کو سیلوٹ کیا۔

"یہ تھری پیس سوٹ آپ کی نذر ہے" انھوں نے ایک آئین کلاتھ میں لپٹا بنڈل
دونوں ہاتھوں پر رکھ کر شباہت کو پیش کیا۔

"شکریہ بھائی!" وہ مسکرائے۔

لڑکیاں چپ تھیں۔ نوشابہ شرما رہی تھی۔ ماریہ لاپرواہ نظر آ رہی تھی۔ اور
رضوانہ خود کو کباب میں نوکیلی سے بھی بدتر ہڈی سمجھ کر اس قدر نروس ہو رہی تھی
کہ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر طفیلی سمجھ کر
ایک ساڑی یا شلوار سوٹ کا کپڑا اسے بھی دیا گیا تو وہ کتنی شرمندہ ہوگی۔ شاید
پھر کوئی صورت ہی نہ رہ جائے!۔ خدا کرے کہ یہ زکوٰۃ اسے نہ ملے! اس کی دعا
خدا نے سن لی۔ وجاہت اور عظمت کے حصے کے بنڈل الگ کرتے ہوئے الیاس
احمد نے کہا۔

"اماں۔ میں آپ کو کوئی ساڑی پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ آپ کا تحفہ

یہاں سرے سے کوئی تیاری نہیں ہے۔ لہٰذا۔ ابھی میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ گھر بھر کے مشروبات میں بناؤں گا: الیاس احمد نے کہا وہ اس قدر ہشاش بشاش اور بے فکر نظر آ رہے تھے جیسے کہ لگتا ہی نہ تھا وہ کچھ ہی عرصہ قبل ایک بڑے خسارے سے دوچار ہو چکے تھے! ان کی اس بے حسی اور بشاشت پر سب کو تعجب ہو رہا تھا۔

شمون! : انھوں نے آواز دی۔

حاضر جناب!" شمون نے جواب دیا۔

"ادھیڑی کھال۔؟"

جی ادھیڑی تھی۔ پھر چڑھا دی۔!

ایک بار پھر ادھیڑو۔!

اچھا۔ جناب!"

بنڈل کھلا اور نہایت قیمتی اور خوش رنگ کپڑے تخت پر بکھر گئے! شباہت نے استفہامیہ نظروں سے انھیں دیکھا! ان کے کچھنے میں کیا دیر لگتی کہ اس طرح الیاس احمد ان کے ہاں کے قیام و طعام کا بدلہ اتار رہے ہیں۔ لیکن اس کا اظہار چونکہ الیاس احمد کی دل شکنی کا باعث ہوتا۔ لہٰذا شباہت نے تعریف کرنی شروع کر دی۔

بے حد عمدہ۔ بہت مناسب۔! دراصل اس طرف میرا دھیان گیا ہی نہ تھا نہ تو اماں نے کوئی توجہ دلائی۔ ویسے تم نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی تو کیا۔ میں نے [illegible] ہی ہے!"

الیاس احمد خوش ہو گئے۔ سب انھیں بے حد تعجب اور حیرت سے گھور رہے تھے [illegible] ایسے کپڑے وہ سب کو تحفۃً پیش کر دیں گے۔ چنانچہ

بڑی حیرت سے کہا۔

میں کیا جانوں: وجاہت نے جواب دیا: مجھ سے بھابی نے کہا تھا۔ ان عورتوں کے بیچ میں بے چارہ میں بھولا بھالا بچہ پھنسا بیٹھا ہوں:

کیوں جی۔ کیا کہا تھا میں نے: کچھ سن گن لے کر نوشابہ وجاہت پر الٹ پڑی!

کچھ نہیں۔ میں اماں کو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے کچھ کھلا پلا کر یا الٹی سیدھی پڑھا کر عظمت بھائی کو الو بنا دیا ہے تو فکر نہ کریں۔ یہ تو آپ کا حق ہے: وجاہت نے کہا اب وہ آپ کو کیا کہیں گی۔ زمانہ آپ کا نہیں ہے:

وجاہت سچ سچ تم۔!" نوشابہ چیخی۔

لو بیوی اس فسادی لڑکے کی باتیں سنو: اماں حیرت سے بولیں: سچے پچ لڑائی والی باتیں کرتا ہے:

اتنے میں نوشابہ نے ایک کرارا دو ہتڑ وجاہت کی پیٹھ پر رسید کر دیا۔

دانت پیس کر اماں نے کہا۔

ایک میری طرف سے اور۔!

میری طرف سے بھی ایک!"۔ رضوانہ ہنس رہی تھی!۔

دفعتہً الیاس احمد باہر سے آئے اور وجاہت چپکے سے باہر سرک گیا!۔

وہ بے حد پیار سے اماں کے پاس بیٹھ گئے۔ اور بولے۔

میرا ملازم کچھ سامان لایا ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو اندر بلواؤں۔!" اسے بیٹھو۔ شوق سے۔!" اماں نے کہا اور آنچل چہرے کے برابر آڑ کر کے منہ پھیر لیا۔

الیاس احمد نے آواز دی۔

کرم الٰہی صاحب۔ اندر لا کے رکھ دیجئے۔!"

ملازم نے ایک بڑا سا گٹھر تخت پر رکھ دیا۔ اور سلام کر کے چلا گیا

"میں بہت دنوں بعد اپنی مل دیکھنے گیا تھا اماں" ایاس احمد بولے۔ اماں
پھر سیدھی ہو بیٹھیں اور بڑی توجہ اور دلچسپی سے ان کی باتیں سننے لگیں۔
"ہاں بیٹا۔ زندگی کے دکھ سکھ اپنی جگہ پر۔ مگر اللہ کا کارخانہ ہی ایسا ہے
اپنے کاموں سے دلچسپی تو لینی ہی پڑتی ہے!"
"جی ہاں۔!"
"الیاس بھائی۔ سلام۔!" رضوانہ بولی "آپ نے پہچانا مجھے؟"
"وعلیکم السلام" الیاس چونکے "آپ برا نہ مانیں تو غور سے آپ کو دیکھ کر
پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔"
"ارے۔ میں رضوانہ ہوں" وہ ہنسنے لگی "سید احمد صاحب میرے ابا
ہیں۔"
"اچھا اچھا۔ وہ رضوانہ آپ ہی ہیں۔ جی ہاں۔ پہچان لیا" وہ بھی ہنستے
"سید چچا سے تو والد مرحوم کے اچھے تعلقات تھے۔ ۔ ۔ آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟"
"شاعری۔!" نوشابہ بول پڑی۔
الیاس احمد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اچھا مشغلہ ہے۔"
رضوانہ جھینپ کر نوشابہ کو گھورنے لگی!۔
"شباہت کہاں ہیں؟" الیاس احمد نے پوچھا "کچھ کپڑے اپنی مل کے
لایا ہوں۔ وہ آجائیں تو میں اس بنڈل کی کھال اتار دوں!۔"
"میں کھال ادھیڑ دوں؟" شمعون نے بڑی مستعدی سے اپنی خدمات
پیش کیں۔
"قصائی!" رضوانہ چپکے سے بولی۔
"ارے نہیں" الیاس احمد کو ہنسی آگئی "اچھا بیٹا تمہی ادھیڑ دو اس

کی کھال۔ میں شباہت کے پاس جاتا ہوں!۔"
وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے آنگن میں نکلے اور دو دو زینے پھلانگتے ہوئے
اوپر غائب ہوگئے!۔
شمعون نے جھٹ پٹ بنڈل کی کھال ادھیڑ دی۔ اور جیسے ہی آخری پرت
اترا۔ بہت سے ریشمی اور قیمتی کپڑے پھسل کر تخت پر پھیل گئے!۔
"آہا۔ یہ کیا۔؟" شمعون نے تالی بجائی "اپنی مل کا عطر نکال لائے
شاید الیاس بھائی"
"پیا نوچی کھسوٹی کر رہے ہو" اماں نے ڈانٹا "سب سمجھی کر کے رکھ دو
بجانے اپنی دوکان پر لے جارہے ہیں کہ کیا"
چنانچہ شمعون اور اماں نے پھر گٹھر باندھ کر الگ رکھ دیا۔
تھوڑی دیر بعد الیاس احمد اور شباہت آتے ہوئے نظر آئے۔ لڑکیاں
جو ایک جگہ بیٹھی تھیں سمٹ گئیں۔ شمعون بھی ایک طرف مؤدب ہو بیٹھا۔ الیاس
احمد کرسی کھینچ کر تخت کے پاس لے آئے اور شباہت کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا۔
"سمجھ میں نہیں آتا۔ الگ تھلگ رہتے کس طرح ہو۔ مجھے تلقین کرتے ہو
کہ گھل مل کے رہا کروں۔ تمہی سے اتنا ربط ہے میرا۔ اور سب چھوٹے ہیں۔
اماں بزرگ ہیں۔ تمہارا کیا منشا ہے۔ میں لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں کھیلوں
یا ہنڈکلھیاں پکایا کروں!؟"
"آج کل کی لڑکیاں نہ تو گڑیاں کھیلتی ہیں نہ ہنڈکلھیاں پکاتی ہیں"
شباہت نے کہا "تم ان بہنوں سے نہ گپ سکو گے!۔ مگر تم نے اتنی لمبی تقریر
کیوں فرمائی ہے؟"
"اس لیے فرمائی ہے کہ عید کے چار روز آتی ہے عید۔ اور میں دیکھنا چاہتا

ٹیلیفون نمبر آفس: ۲۲۵۵۰۹ — اس جگہ پر سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہو گئی۔ — ٹیلیفون نمبر رہائش: ۲۲۳۲۵

گذشتہ ۵۵ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ــــ اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۵) فہرست مضامین اپریل ۱۹۸۵ء نمبر (۴)

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔ حریم ہر انگریزی ماہ کی ۲۵ تاریخ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۱۰ / ہر ماہ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۱۵ / کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ / تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ بھیجنا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں

ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو - ۲۲۰ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے [illegible] میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

اڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	چھتیس روپیہ
مخصوص خریداری	•	چونتیس روپیہ
معمولی خریداری		چوبیس روپیہ

وی۔پی سے پرچہ طلب کرنے پر چھ روپیہ ساٹھ پیسہ اور فی پرچہ ایک روپیہ ساٹھ پیسے

غیر ممالک سے

[illegible] اپریل سے [illegible] ممالک [illegible]

لمعات

جرمنی کے ترقی یافتہ ملک میں ایک خودزاد خاتون کی کمسن اور معصوم بچی کو کسی ظالم مرد نے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اسے ہلاک بھی کر دیا۔

واقعات کے مطابق مذکورہ عورت اپنے شوہر اور معصوم بچی کے ساتھ اطمینان سے زندگی گزار رہی تھی، کہ ایک روز اسکی بچی سامنے پارک میں کھیلنے گئی، تو پھر واپس نہیں آئی، بعد کو اس کی لاش ہی ملی، تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص نے اس بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر ہلاک کر دیا، اس صدمے سے ماں باپ پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں وہ تو نیم پاگل سی ہو گئی۔ اٹھتے بیٹھتے دن رات بچی کو یاد کر کے روتی رہتی۔

عدالتی کارروائی کے دوران ایک روز یہ مظلوم عورت عدالت میں آئی تو اس نے اچانک اپنی بچی کے قاتل کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا، اور اب وہ خود قتل کے الزام میں ماخوذ ہو گئی، اس نے عدالت کو بتایا کہ اس کی بیٹی کا قاتل پہلے بھی ایک بچی کے ساتھ ایسی ہی زیادتی کر چکا تھا اور عدالت اسے صرف دو سال کی سزا دے کر کیس ختم کر چکی تھی، چنانچہ وہ سال جیل میں گزار کر رہائی پانے کے بعد اس نے پھر ایسے ہی بھیانک جرم کا ارتکاب کیا۔ اندیشہ تھا کہ عدالت پھر اسے اسی قسم کی سزا یا قید دے کر کیس ختم کر دیتی اور رہائی کے بعد پھر وہ کسی معصوم کو نشانہ بنا کر کسی اور خاندان کو کرب کی آگ میں جھونک دیتا، اس لئے میں نے اس سفاک کو قتل کر دیا تاکہ آئندہ کوئی لڑکی اس کی ہوس کا نشانہ نہ بن سکے۔

اس کارروائی کے بعد ملک میں ہر طرف اس بد قسمت عورت سے لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ امڈ آیا اور ہر طرف سے اسے رہا کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا، جبکہ عدالت نے کہا کہ چاہے کچھ بھی ہو کسی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں، تاہم اس عورت نے شدید ذہنی دباؤ میں آکر یہ اقدام کیا ہے اس لئے اسے صرف دو سال کی سزائے قید دی جاتی ہے، چنانچہ وہ عورت اب اپنی قید کی مدت پوری کر رہی ہے۔

اس واقعہ کا تفصیل سے تذکرہ میں نے عبرت کے لئے کیا ہے، اور اس سلسلے میں کہنا ہے کہ اس واقعہ کو پڑھ کر اسلام کے تعزیری قوانین کی اہمیت و افادیت کا ایک بار پھر قائل ہونا پڑا، اگر اسلامی قوانین کے مطابق بچی پر زیادتی کرنے والے مجرم کو حدود قانون کے تحت کوڑوں کی سزا دی جاتی یا سنگسار کر دیا گیا ہوتا تو دوسری بچی نہ اس کی ہوس کا نشانہ بنتی اور نہ ایک اور خاندان ساری زندگی کے لئے سسکیوں اور آہوں کی نذر ہوتا۔

بعض حلقے اسلامی تعزیراتی قوانین کو سخت، جدید تہذیبی دور کے خلاف اور غیر انسانی بھی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ معصوموں کو ہلاک اور ان کے پس ماندگان کو زندہ درگور کرنے والے کسی سلوک کے کیسے مستحق ہو سکتے ہیں، انسانیت کو ان کے شر سے بچانے کے لئے سخت اور عبرتناک سزا ضروری ہے۔

اسلام نے انسانیت و شرافت اور اخلاق کے دشمنوں کے لئے ایسی کڑی سزائیں اسی لئے مقرر کی ہیں کہ معاشرہ ایسے ظالموں سے محفوظ رہے۔

افسوس کہ آج ترقی پسند دنیا میں عبرتناک سزائیں اس لئے نہیں دی جاتیں کہ انھیں انسانیت کے خلاف سمجھا جاتا ہے ——— میں پوچھتا ہوں کہ کیا انسانیت یہی ہے کہ بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جائے۔ چوریاں کی جائیں۔ ڈاکے ڈالے جائیں۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی باتیں آج صرف اسی لئے ہو رہی ہیں کہ عبرتناک سزائیں نہیں دی جاتیں۔ کسی دوشیزہ کو بے عزت کر کے ہمیشہ کے لئے اس میں کلنک لگانے کی کیا بس یہی سزا کافی ہو سکتی ہے کہ چند ماہ یا

> شریف، نیک اور قناعت پسند عورت قدرت کا گراں بہا عطیہ ہے۔ خوش قسمت ہوتا ہے وہ مرد جسے ایسی بیوی مل جائے

جاہل کی سزائے قید دے کر ایسے بھیڑیوں کو پھر آزاد چھوڑ کر ویسے ہی جرائم کرنے کے مواقع دئے جائیں۔ اسلام سے زیادہ رحم وکرم کرنے والا کوئی دوسرا مذہب نہیں۔ اسی نے معصوم بچیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا۔ اسی نے عورتوں پر ہونے والے بہیمانہ سلوک ختم کرائے۔ اسی نے ستی جیسی انسانیت سوز رسم کا خاتمہ کرایا — ایسے مذہب نے سزاؤں کے سلسلے میں جو سختیاں برتیں ان پر مفکرین غور کریں تو وہ ظلم نہیں رحم کے مترادف ہیں۔ ایک زانی کو عبرتناک سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسری خواتین کو برباد نہ کرسکے۔ ایک آدم خور شیر کو مار کر بچاسوں انسانوں کی جانیں بچائی جاسکتی ہیں، اسی طرح جبریہ عصمت دری کرنے اور پھر جان بھی لے لینے کی سزا ایسی لرزہ خیز ہونا چاہیئے کہ سنکر ہی انسان پناہ مانگنے لگے۔

عبرتناک

مخلوط تعلیم کے حامیوں کے لئے یہ خبر عبرتناک ہوسکتی ہے کہ آندھرا پردیش کے مقام میالی کے اسکول میں، ایک ہی کلاس میں پڑھنے والے ایک بارہ سالہ لڑکے اور دس سالہ لڑکی میں جنسی تعلقات قائم ہونے پر مقدمہ چل رہا ہے لڑکی نے بیان دیا ہے کہ وہ لڑکے سے برابر ملتی تھی' وہ اسے اپنے کمرے میں لے جاتا تھا اور باہمی رضامندی سے دونوں جنسی اختلاط کرتے تھے۔ قانونی اعتبار سے دونوں ہی نابالغ ہیں، اس لئے سزا لڑکے کو بھی نہیں دی جاسکتی اور دی جاتی ہے تو لڑکی کو بھی سزا ملنا چاہیئے۔ آج کی مغرب زدہ دنیا میں کمسن بچیاں اور لڑکے بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جنسی خواہشات کیا ہوتی ہیں۔ یہ سب فیض ہے فلموں کا، ٹی۔ وی کا اور ان رسائل کا جن میں عریاں قسم کی تصاویر ہی شائع نہیں ہوتیں۔ ایسے مضامین اور افسانے بھی چھپتے ہیں جو بچوں کے اخلاق بھی تباہ کر رہے ہیں لیکن ان سے مفر کی کیا صورت ہوسکتی ہے، یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، بہرحال مخلوط تعلیم سے تو احتراز کرنا ہی چاہیئے۔

ناصرہ بہن سے

حریم فروری میں ناصرہ بہن صاحبہ کا ایک خط میں نے لمعات میں شائع کیا تھا۔ اس سے متاثر ہوکر کئی ہمدرد دلمت بہنیں متاثر ہوئیں اور وہ بہن موصوفہ کی مدد کرنا چاہتی ہیں، لیکن ناصرہ بہن نے اپنا پتہ شاید اپنی خودداری کے تحت نہیں لکھا تھا۔ ان کا خط بھی نوعیت کا تھا، میں نے اسے صرف اس لئے شائع کیا تھا کہ ایسے حالات سے نہ جانے کتنی بہنیں دوچار ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ معاشرے کی اصلاح کر کے ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اس طرح کی دشواریاں کسی کو پیش نہ آئیں۔ بہرحال میں ناصرہ بہن سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھ پر بھروسہ کر کے اپنا پتہ مجھے لکھدیں تاکہ میں ان صاحب خیر بہنوں کو لکھ کر جو رقوم مل سکیں منگوا کر بھجوا دوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات میرے سوا کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکے گی۔ میرے خیال سے ناصرہ بہن کو حریمی بہنوں کا تعاون حاصل کرنے میں جھجک محسوس نہ کرنا چاہیئے ممکن ہے اس طرح وہ اپنی بیٹیوں کے ہاتھ باآسانی پیلے کرسکیں۔ (نسیم انہونوی)

نوید مسرت

خنداں لکھنوی

عشرت کی نوید مستعار آئی ہے
خوشیوں کی سحر ہے نوربار آئی ہے
آغوش فہیم میں کھلا اک غنچہ
گلزار نسیم میں بہار آئی ہے

اعلان ملکیت ماہنامہ حریم لکھنؤ

فارم ۴ رول ۸

۱۔ پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر — سید محمد فہیم انہوی
۲۔ قومیت — ہندستانی
۳۔ پتہ — کاشانۂ فہیم گیٹ ملک گیتی لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
مقام اشاعت — ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
۵ تاریخ اشاعت — ماہوار۔ ۲۰ر۵ر ۱۹۸۰ ماہواری
۶۔ ان اشخاص کے نام جو ایک فیصد سے زیادہ حصص کے مالک ہوں — ۱۔ سید محمد فہیم انہونوی ۵۰ فیصدی، ۲۔ مسز شوکت جہاں بیگم ۵۰ فیصدی

قومیت .... ہندستانی
پتہ — کاشانۂ فہیم گیٹ ملک گیتی۔ لکھنؤ

میں سید محمد فہیم انہونوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔ دستخط فہیم انہونوی

حضرت بی بی ہاجرہ

مشتاق لکھیم پوری

میرا نام ہاجرہ ہے۔ میرے باپ فرعون مصر کے فرمانروا تھے اور سامی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بادشاہ کی بیٹی کی حیثیت سے میں نے بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی۔ میرے بچپن سے سن شعور تک پہونچنے کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جسے میں خاص اہمیت دوں۔ بس دنیا کے دیگر بڑے فرمانرواؤں کی اولاد کی طرح میں نے بھی آنکھ کھولنے سے بالغ ہونے تک ایک پرشوکت زندگی گذاری۔ لیکن اس کے بعد میری زندگی کا جو دور گزرا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ میں اس پر فخر کرسکوں اور دنیا کے سامنے ایک زندہ مثال کی طرح چھوڑ جاؤں تاکہ آنے والی نسلیں یقین کرسکیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا اور ہر حالت میں ان کی خبرگیری کرتا ہے۔

اپنی زندگی کا وہ سنہرا دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمارے شہر میں ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی سارہ کی آمد ہوئی میرے باپ ان سے مل کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ نہ صرف ہر قسم کے اعزاز سے ان کو نوازا بلکہ مجھے بھی ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دیدیا۔ اور میں ان کے ساتھ فلسطین چلی آئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور انھیں اس کا احساس بھی تھا۔ یہ میری خوش نصیبی اور خدائے وحدہٗ لاشریک کا کرم تھا کہ اس نے مجھے اس اعزاز سے نوازا اور ان کے پہلے بچے کی ماں بننے کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ لیکن یہ بات ان کی پہلی بیوی سارہ کو بے حد ناگوار گذری، اور بشری تقاضہ کے پیش نظر وہ مجھے اور میرے بچے اسمٰعیل (علیہ السلام) کو برداشت نہ کرسکیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ مجھے اور میرے بچے کو ان کی نگاہوں سے دور لے جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ بڑا سخت مرحلہ تھا وہ سارہ کو آزردہ رکھنا چاہتے تھے نہ مجھے اور نہ اسمٰعیل (علیہ السلام) کو اپنی نگاہوں سے دور رکھنا پسند کرتے تھے لیکن شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مصلحت سے مطلع کردیا تھا۔ اس لئے وہ مجھے اور میرے بچے کو لے کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور مکہ میں جہاں آج کعبہ ہے ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر ہمیں چھوڑ کر چل دئے۔ البتہ اس ویران اور غیر آباد پانی سے محروم مقام کی حقیقت سمجھتے ہوئے انھوں نے ایک تھیلی کھجور اور ایک مشکیزہ پانی ضرور رکھ دیا۔

میں نے ابتدا میں بتایا ہے کہ میری زندگی کس ناز و نعم کی تھی اب جو مجھ پر یہ مصیبت پڑی تو میں برداشت نہ کرسکی اور ان کے پیچھے دوڑ کر میں نے کہا۔

اے ابراہیم (علیہ السلام) تم ہمیں اس وادی میں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ مگر وہ کچھ نہ بولے اور خاموشی سے آگے بڑھتے رہے آخر میں نے دوڑ کر ان کا دامن پکڑ لیا اور کہا ———

اے ابراہیم (علیہ السلام) یہ تم کیا کر رہے ہو کیا تمہارے خدا کا یہی حکم ہے۔

انھوں نے اپنا مضمحل چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اثبات میں سر ہلایا اور پھر کعبہ کی طرف منھ کرکے یہ دعا کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

اے ہم سب کے پروردگار! تو دیکھ رہا ہے۔ ایک ایسے میدان جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں میں نے اپنی اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لاکر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھے۔ پس تو اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوجائیں اور اس کے لئے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کر تاکہ یہ تیرا شکرگذار ہوسکے۔ (ابراہیم)

ان کے جانے کے بعد چند روز تک جناب ہاجرہ مشکیزہ کے پانی اور کھجوروں سے کام چلاتی رہیں آخر وہ وقت بھی آگیا کہ یہ سب ختم ہوگیا۔

آہ ——— وہ وقت کتنا کربناک تھا میں کئی دن سے بھوکی پیاسی تھی۔ میرا دودھ خشک ہوچکا تھا اور میرا ننھا معصوم بچہ

بھوک و پیاس سے بے حال ہو کر تڑپ رہا تھا۔

مجھ سے اس کی یہ بیچارگی نہ دیکھی گئی اور میں بھاگ کر قریب کی ایک پہاڑی "صفا" پر جا چڑھی کہ شاید اللہ کا کوئی بندہ یا پانی کہیں نظر آجائے تو اپنے بچہ کی پیاس کا کچھ انتظام کر سکوں۔ لیکن دور تک سوائے ویرانی اور خشکی کے کچھ نظر نہ آیا۔ مجبوراً پھر واپس وادی کی طرف لوٹی۔ بچہ ہنوز اسی حالت میں تھا۔ میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ میں نے دوسری طرف کی پہاڑی "مروہ" کی سمت رخ کیا اور اس پر چڑھ کر دیکھا لیکن یہاں بھی ہر طرف بس خشک میدان ہی تھا۔

یا اللہ! کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ مایوسی اور ناکامی کے باوجود ایک موہوم امید کا سہارا لے کر میں نے سات بار صفا و مروہ کے چکر لگائے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر قسمت پر شاکر ہو کر اور اپنے کو اللہ کے سپرد کر کے میں بڈھال قدموں سے بچہ کی طرف واپس لوٹی لیکن جب یہاں پہونچی تو دیکھا ننھے اسمٰعیل (علیہ السلام) کی ایڑیوں کے پاس زمین سے پانی ابل ابل کر چاروں طرف بہہ رہا ہے۔

فرط خوشی سے میرے آنسو نکل آئے اور بے اختیار میں اپنے مالک کے حضور سجدۂ شکر میں گر گئی۔ اسی وقت مجھے ایک آواز سنائی دی۔

غم اور خوف نہ کر ہاجرہ! اللہ تعالیٰ تجھکو اور اس بچہ کو ضائع ہونے نہ دیگا۔ میرے دل کو ایک سکون حاصل ہوا۔ میں نے بسم اللہ کہکر پانی پیا اور پھر اسمٰعیل (علیہ السلام) کو گود میں اٹھا کر دودھ پلانے لگی۔

دوسرے ہی دن اس جگہ سے ایک قبیلہ بنی جرہم کا گذر ہوا اور اس کے سردار نے مجھ سے یہاں قیام کی اجازت مانگی۔ میں نے اس شرط کے ساتھ اجازت دیدی کہ وہ پانی کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتے انھوں نے شرط منظور کر لی اور وہیں آباد ہو گئے۔

وقت گذرتا رہا میرا شیر خوار ننھا بچہ اسمٰعیل (علیہ السلام) انھیں لڑکوں میں کھیل کود کر بڑھتا اور پلتا رہا یہاں تک کہ سن بلوغ کو پہونچ گیا۔ اور پھر اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سے میں نے اس کی شادی کر دی۔

اب چونکہ مجھے اپنی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی مل گئی تھی اس لئے میں نے سکون کا سانس لیا ہاں یہ بتانا میں بھول گئی کہ اس درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی وقتاً فوقتاً مجھے اور اپنے بچے کو دیکھنے نیز خبر گیری کرنے کے لئے آتے رہتے تھے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ آزمائش کا وہ دور گذر گیا اور اس نے اپنے رحم و کرم سے ہمیں نوازا اور اس امتحان میں کامیاب کیا۔

میری دعا ہے کہ خدا نسل ابراہیمی کو قیامت تک کے لئے نیکی اور سلامتی کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ خیر و شر کے ہر مرحلہ پر اپنے معبود کا دامن پکڑے رہے کہ اسی میں اسکی فلاح اور کامیابی ہے۔

مسکراہٹ اور آنسو

سمندر

• لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہوا ہوں۔

مشترک

• میری بیوی اور انکم ٹیکس والوں میں ایک بات مشترک ہے۔ دونوں صرف روپیئے کے بارے میں سوچتے ہیں۔

بیچارہ شوہر

• وہ بیچارہ ایسا شوہر ہے جو گھر میں صرف اس وقت منھ کھولتا ہے۔ جب اسے جماہی آرہی ہو۔

حسن

• حسین عورت کی آنکھیں، رخسار اور ہونٹ بولتے ہیں۔

آئینہ

• ہر روز بے شک آئینہ دیکھا کرو اگر تمہاری صحت بری ہے تو ہر کام کر کے دو برائیوں کو جمع نہ کرو۔ اگر تمہاری صحت اچھی ہے تو ہر کام کر کے اسے خراب نہ کرو۔

کنوارا

• کنوارا وہ آدمی ہے جو بیوی کی دخل اندازی کے بغیر ڈاکٹر کو اپنے مرض کی تفصیلات بتا سکتا ہے۔

نانی اماں

• نوے یا نواسیاں انسان کو بوڑھا نہیں بناتے بلکہ یہ احساس بوڑھا بنا دیتا ہے کہ اس نے کسی نانی اماں سے شادی کی ہے۔

• میری کامیابی کا راز یہ تھا کہ میں نے اپنے شوہر (شہنشاہ جہانگیر) کی تبسم آمیز اطاعت کو اپنی زندگی کا وصول بنا لیا تھا۔

فریبِ آرزو

(افسانہ)

بشریٰ گل

راحیلہ بظاہر ناول پڑھ رہی تھی۔ مگر حقیقت میں عالم کے ٹیلیفون کا بڑی شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ اماں بھی سخت گرمی سے گھبرا کر ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے کمرے میں جا سوئی تھیں۔ راحیلہ کی بے چینی قابلِ دید تھی۔ وقت گزاری کو صفحے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ آج تو نہ جانے نیند بھی کہاں غائب تھی۔ حالانکہ آفس سے آکر کھانا کھاتے ہی اتنی بے سدھ ہو کر سوتی تھی کہ اماں کے جگانے پر اٹھ کر عصر کی نماز پڑھتی تھی۔ راحیلہ کی نظریں بار بار کبھی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف جاتیں اور کبھی دیوار پر لگے کلاک کی طرف۔ ٹک ٹک کے درمیان گھنٹوں کے فاصلے محسوس ہوتے اور سوئیاں یوں لگتیں گویا چلنا بھول گئی ہوں۔ راحیلہ کے بار بار کان بجتے گویا گھنٹی بج رہی ہو۔ آخر سوا چار بجے فون کی گھنٹی بجی۔ راحیلہ جوتی پہنے بغیر فون کی طرف دوڑی ہیلو ہیلو دوسری طرف سے آواز آئی حاجی سنز" ؟

"او... نو..." اور اس نے ریسیور زور سے کریڈل پر دے مارا۔ بوجھل بوجھل قدموں سے واپس آکر صوفے پر نیم دراز ہو گئی — ذہن میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ خدایا! ابھی تک فون کیوں نہیں آیا۔ حالانکہ عالم نے ۴ بجے فون کرنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ بھی خوشخبری سنانے کو۔ راحیلہ کی امید کی کشتی یاس کے بھنور میں پھنس رہی تھی —

یہاں تک کہ ساڑھے چار ہو گئے تب ہی اس طوفان میں عالم کا سراپا ابھرا، مسکراتا ہوا چہرہ کھلتا ہوا رنگ گھنے سیاہ بال روشن روشن آنکھیں بھرا بھرا اونچا لانبا قد...... ایک لمحے کو اندھیرے میں روشنی کا دھماکہ ہوا اور عالم کے الفاظ راحیلہ کے کانوں میں گونجنے لگے۔ راحیلہ غم نہ کرو اب یہ دکھ گھڑیوں کے مہمان ہیں۔ میں ان لوگوں جیسا نہیں جنھوں نے تمہیں دکھ دیا اذیت دی۔ تمہاری ہستی کی دھجیاں بکھیریں۔ وہ تو وہ تھے میں نہیں...... تم دیکھو گی میں تمہارے لئے سارے زمانے سے ٹکر لوں گا۔ اور ان سے تمہارے حصے کی خوشیاں چھین لاؤں گا۔ تمہیں دنیا کے دکھوں غموں سے اتنی دور لے جاؤں گا جہاں غم کے سائے بھی تم تک نہ پہنچ پائیں۔ میں تمہیں اپنے دل کی رانی بھی بناؤں گا اور گھر کی بھی۔ مجھے تمہاری کمائی میں سے ایک پائی بھی نہیں چاہیئے بلکہ تم حکم کرو تو میں تمہارے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دوں۔ بس تم مجھ پر اعتماد کرو اتنا اعتماد کہ جسے اندھا اعتماد کہتے ہیں اور بس ... اب دیکھنا میں تمہارے لئے کیا کچھ کرتا ہوں حد یہ کہ میں کورٹ میرج کرنے کو بھی تیار ہوں مگر یہ تمہیں منظور نہیں۔

پھر راحیلہ کو آج کی صبح یاد آئی جب عالم نے راحیلہ کو بتایا کہ وہ آج دوپہر کے کھانے پہ امی سے بات کرے گا اور انھیں شادی کے لئے رضامند کرلے گا۔ کیونکہ اس کی امی اسے بے انتہا چاہتی تھیں۔ اپنی امی کو منانے کا وہ خود ذمہ دار ہے بس وہ چار بجے ٹھیک خوشخبری سننے کی منتظر رہے....

راحیلہ نے نگاہ اٹھائی تو گھڑی کی سوئیاں پونے پانچ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ راحیلہ کی آس کی شمع جلتے جلتے بجھنے کے قریب تھی کہ فون کی گھنٹی زور سے چیخی راحیلہ کے اندر ایک ساتھ کئی گھنٹیاں بج اٹھیں لپک کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کی آواز کے ساتھ ہی وہ جان گئی کہ بات کرنے والا کون ہے۔ ہیلو عالم مارے خوشی کے راحیلہ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ عالم اتنی دیر کیوں کر دی میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ کہو کیا خوشخبری ہے؟ ادھر سے عالم کی بجھی بجھی آواز سنائی دی۔ راحیلہ امی نہیں مانیں۔ اتنی دیر اس لئے ہو گئی کہ میں تمہیں یہ خبر سنانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا تمہیں اس خبر کو سن کر کتنا دکھ ہو گا۔ راحیلہ! میں نے امی کو منانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر انھوں نے جو ایک بار نہ کی تو دو گھنٹے کی بحث کے بعد بھی وہ ہاں میں نہ بدل سکی۔ میں نے ہزار دلیلیں دیں ہزار منتیں کیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا ہے! حالانکہ وہ خود سوشل ورکر ہیں اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینا عبادت سمجھتی ہیں۔ مگر شائد یہ سب کچھ دوسروں کے لئے ہے میرے لئے نہیں۔ بہرطور راحیلہ میں بہت شرمندہ ہوں مجبور ہوں یہ تعلق نہ سہی مگر اپنا محبت کے ناطے تو تعلق رہے

ہی۔ میں تمہاری دل سے قدر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ تمہارے لئے دعا بھی کروں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا تم بہت بہادر ہو۔ کبھی ہمت نہ ہارنا جیسے پہلے جیتی رہی ہو ویسے جیتی رہنا۔ آگے بڑھنا۔ میں اپنی امی کو منا نہ سکا۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر میں کیا کرتا امی کے قدموں تلے میری جنت ہے اور میں اپنی جنت کھونا نہیں چاہتا۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اپنی امی سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ ان کے پاؤں پوجتا ہوں۔ وہ جب تک نہ کہیں کرسی پر بیٹھتا نہیں بیٹھتا پھر بتاؤ میں انھیں کسطرح ناراض کرتا۔ یقین جانو مجھے بھی بہت دکھ ہوا ہے۔ شاید یہی خدا کی مرضی تھی۔ یا ہماری تقدیر میں ملنا نہیں تھا۔

ہیلو.... ہیلو...۔ راحیلہ سن رہی ہو۔ میں اپنی ندامت کا اظہار کر رہا ہوں اور تم جواب تک نہیں دے رہی ہو ہیلو.... ہیلو.... اور راحیلہ کے خاموش بہتے آنسو شدت غم سے تیز سسکیوں میں تبدیل ہوگئے۔ اور پھر جواب نہ پاکر عالم نے فون بند کر دیا....

راحیلہ نے تو بس اتنا سنا تھا کہ امی نہیں مانیں اس سے آگے عالم نے کیا کہا یہ راحیلہ نہ سن پائی بس نہیں نہیں نہیں کی آوازیں تھیں اور گرم گرم آنسو تھے جو چپ چاپ بہے چلے جا رہے تھے۔ راحیلہ کو تو بس اتنا پتہ تھا کہ یہ عالم ہے۔ جس نے ایک بار پھر اس ڈوبتی ہوئی راحیلہ کو کنارے پر لانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ مگر ناکام رہا۔ جس کے نصیب میں طوفان اور موجیں لکھی ہوں اس کو بھلا کون بچا سکتا ہے۔

راحیلہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ مقفل سے بند کیا اور بستر پر گر کر بے تحاشا رو لی کر آنکھیں جلنے لگیں۔ اماں نے ایک دو بار آکر دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب نہ پاکر یہ سمجھیں کہ راحیلہ سو رہی ہے۔ انھیں کیا خبر کہ راحیلہ آج پھر اس شدید ذہنی ہیجان سے گذر رہی ہے جس سے اس کی کوشش سے مجتمع کی ہوئی ہستی ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاتی ہے۔

روتے روتے اچانک خیالات پیچھے مڑ گئے۔ یہ عالم تھا جو اس کی فرم میں کام کے سلسلے میں آتا رہا۔ راحیلہ کی خوبصورتی، کم عمری کا شرافت اور اچھے طور اطوار دیکھ کر اس کی طرف مائل ہوگیا۔ راحیلہ نے لاکھ انجان بننے کی سعی کی مگر خوبصورت زندگی کی تمنا نے آخر اس کے دل میں بھی عالم کے لئے جگہ بنادی۔ شادی کی پیشکش کرنے پر راحیلہ نے اسے بھی اپنے ساتھ بیتا ہوا سب کچھ بتا دیا۔ وہ کڑوا سچ جس کی سزا وہ کئی بار بھگت چکی تھی یعنی کہ وہ کنواری نہیں ہے بلکہ بی۔ اے فائن آرٹس کرنے کے بعد اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوگئی تھی جو نہ صرف اس سے دگنی عمر کا تھا۔ بلکہ مار پیٹ، گالی گلوچ الزام تراشی اور اذیت پسندی کی ناپسندیدہ عادات کا شکار تھا۔ انہی سختیوں گرمیوں میں دو ننھے منے پھول بھی آنگن میں کھلے مگر نہ تدبیر کام آئی نہ تقدیر بدلی۔ زیور کپڑا چھین کر اسے گھر سے اس طرح باہر کیا جس طرح سے دودھ سے مکھی نکال پھینکتے ہیں۔ راحیلہ دھکے کھا کر ماں کی دہلیز پر آگری۔ موت کے آنے میں بھی بڑی دیر تھی۔ چاہتے ہوئے بھی موت نہ آئی۔ آخر دل کو سمجھایا زندگی مثبت انداز سے گذارنے کا فیصلہ کر کے ایک اشتہاری فرم میں ملازمت کرلی اب اس کو نوکری کرتے چار برس ہو چکے تھے۔ نہایت خوش اسلوبی اور ایمانداری سے کام کرتی جس کی وجہ سے تمام اسٹاف اس سے خوش تھا۔ اور تنخواہ بھی نہایت معقول پارہی تھی۔

عالم کے وعدوں دیوانگی اور اپنانے کی خواہش کو دیکھتے ہوئے راحیلہ ایک بار پھر اپنے زخموں کو بھلا چکی تھی اور زندگی کی خوشیوں کے بارے میں سوچنے لگی تھی مگر ہوا کیا وہی... جو بار بار ہو چکا تھا۔ یعنی سب حقیقت جاننے کے بعد انکار کا زہر جو اسے ہر صورت پینا تھا۔ آج بھی نہ چاہتے ہوئے حلق سے اتار گئی وہ جانتی تھی کہ اس کی ذات کی نفی اور تذلیل کی وجہ سے چند دن آنسو وجہ بے وجہ اس کی آنکھوں میں چھلک آئیں گے۔ ہونٹوں سے مسکان غائب رہے گی۔ لیکن آخر پھر وہ خول دوبارہ چڑھانا پڑے گا۔ جو دوسروں کی نگاہوں میں یہی تاثر دے گا کہ کتنی خوش باش لڑکی ہے کتنی اسمارٹ، کتنی مطمئن۔ کتنی زندہ دل .... مگر سوائے اس کے دل کے کوئی نہ جانتا تھا کہ روشن چہرے والی راحیلہ کے اندر کی دنیا میں کتنا اندھیرا ہے کتنی مایوسی ہے۔ کتنا کرب ہے۔ اس کی یہی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر تو کئی لوگ خواہ مخواہ دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے آتے۔ بھنورے کی طرح کا جنون وارفتگی شوق محبت بڑی قسمیں وعدے ارادے۔ اور جب راحیلہ ان کو اپنا سیاہ ماضی دیکھ کر یہ بتاتی تو انھیں بہت سی اپنی خاندانی مجبوریاں یاد آجاتیں۔

دنیا کا خوف ستانے لگتا۔ چاند تاروں کو توڑ کر لانے والے جیالے منٹوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔ پھر ہمدردی اور افسوس کے چند الفاظ اس کے کشکول میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے غائب ہوجاتے۔ راحیلہ کے سامنے کئی چہرے ابھرے اور ڈوبے۔ آخر راحیلہ نے ایک فیصلہ کرلیا۔ کبھی دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ اس معاشرے میں عورت کی بدقسمتی ہی اس کا جرم بن جاتی ہے۔ آزاد تو صرف مرد ہیں۔ جو جب چاہیں دوسری شادی کرلیں۔ جب چاہیں پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری نوعمر خوبصورت لڑکی بیاہ لائیں۔ جب چاہیں چند ٹکڑوں کے عوض غیر لڑکی کے پاس چلے جائیں اور جب چاہیں بیوی کو ایک پل میں غیر بنا دیں میں آئندہ کبھی کسی کو اپنے جذبات سے نہ کھیلنے دوں گی میں بظاہر ایک لڑکی نظر آؤں گی مگر حقیقت میں ایک بے حس چٹان بن جاؤں گی۔ جس کے نہ کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ خواہشات نہ امنگ نہ کوئی تمنا۔

امتیاز فاطمی

(ایم۔ اے)

اس وقت گھر میں ایک کہرام برپا ہوگیا جب شبنم کے یہاں چوتھی بار لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی ساس جلی کٹی اپنی اور اپنے بیٹے کی تقدیر کو کوس رہی تھی نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ اس منحوس کو اپنے گھر بیاہ کرلائی تھی۔ یہ نامراد تو اس کے خاندان کا چراغ ہی گل کردینا چاہتی ہے۔

شبنم نے نظر گھما کر اس ننھی سی گڑیا کی طرف دیکھا جس نے کچھ ہی دیر پہلے عالم بالا سے عالم امکان میں قدم رکھا تھا اور اپنی ننھی ننھی ستارہ سی آنکھوں سے دنیا کی روشنی سے مانوس ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ شبنم کی نگاہوں میں بجائے غصے اور نفرت کے اس معصوم وجود کے لئے دل کی گہرائیوں سے ایک پیار اور ممتا کی لہر ابھری۔ اور اس نے اپنے جگر کے اس ٹکڑے کو اپنے جگر کے گوشے میں اس طرح سمیٹ لیا جیسے وہ اسے اس ظالم دنیا اور سماج کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو۔ بچی نے بھی خود ممتا کی نرم گرم آغوش میں اس طرح سونپ دیا جیسے اس نئے جہان میں جہاں اس نے ابھی ابھی قدم رکھا تھا سوائے اس ٹھکانے کے اور کوئی دوسرا ٹھکانا نہ ہو۔

نجم جو بچی کی پیدائش سے کچھ دیر پہلے آنکھوں میں ایک امید افزا چمک لئے شبنم کے سرہانے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اب آنکھوں میں ایک نفرت اور بیزاری کی جھلک لئے بچی کی طرف بغیر دیکھے اس تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا جیسے قدرت کی اس تخلیق میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔

شبنم۔ جو ابھی ابھی موت کو شکست دے کر اس ننھے سے وجود کو دنیا میں لانے کی ذمہ دار بنی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک دلکش رات گھوم گئی اور وہ ماضی کی وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے بہت دور نکل گئی۔ اسے وہ دلکش شام آج بھی یاد تھی جب وہ دلھن بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ وقت اور حالات نے اتنے دنوں میں بہت

سے موڑ لیے۔ زندگی نے طرح طرح کے روپ اختیار کئے۔ لیکن اپنی زندگی کی وہ اہم رات اسے آج بھی اسی طرح یاد تھی جیسے ابھی کی بات ہو۔ وہ رات جو ہر انسان کی زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے اور اس رات نجم نے اس کی زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں چہرہ چھپا کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے تمام عمر خوشی دے گا۔

نجم کی والدہ نے پہلی بار اسے ایک تقریب میں دیکھا تھا جب وہ انٹر کی طالبہ تھی۔ ان کی نظروں نے اسے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے منتخب کرلیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی قدرت نے اس کی پیدائش کے وقت ہی اسے ممتا کے سائے سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا۔ باپ نے اسے ماں اور باپ دونوں بن کر پروان چڑھایا اور اس کے معصوم وجود کو سوتیلی ماں جیسی سنگلاخ شخصیت کی چٹان سے ٹکرانے نہیں دیا اور اپنی جوانی کی تمام بہاریں اس کی ذات پر قربان کر دیں۔ اپنی بیس سالہ زندگی میں شبنم غم اور نفرت جیسے الفاظ سے ناآشنا رہی۔ دنیائے شعور میں قدم رکھنے کے بعد سے اُسنے صرف باپ کی محبت اور چاہت ہی دیکھی تھی۔

وہ ایک بھیگی بھیگی سہانی سی شام تھی جب نجم کی والدہ نجم کے لئے پیغام لے کر اس کے یہاں آئیں اور اس کے باپ سے ہمیشہ کے لئے اسے مانگ لیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے اپنی نئی دنیا میں قدم رکھا جہاں اسے ساس کی شکل میں ماں کی ممتا ملی اور نجم کے وجود میں محبت کرنے والا شریک سفر۔ بہت ہی مختصر عرصے میں وہ اپنے باپ کا آنگن بھول چکی تھی جو ہر لڑکی کا ازل سے مقدر ہوتا آیا ہے۔

نجم نے جب اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا وہ اس کے معصوم حسن کے سحر میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ وہ وقت گزرتا رہا ساس اور شوہر کی رفاقت کے ساتھ وہ مسرت کی گھڑیاں گزارتی رہی کہ ایک وقت آیا جب اسے احساس ہوا کہ اس کے وجود کے اندر ایک ننھے سے وجود کا اور اضافہ ہو رہا ہے۔ ساس کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا لیا نجم کی یہ حالت تھی کہ اس کی نظریں ہر وقت اسے پھولوں میں تولتی رہتیں انسان کی شخصیت میں جب پیار محبت اور شفقت کی آمیزش ہوتی ہے تو حسن خود بخود نکھر جاتا ہے۔ شبنم ویسے بھی حسین تھی اس پر پیار کے رنگ اور ماں بننے کی آرزو کی خوشبو نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے نجم کی ماں پوتے کی آرزو میں بہو کو ہر وقت ہاتھوں ہاتھ لئے رہتیں۔ دلہن یہ کھاؤ۔ دلہن اتنی تیزی سے نہ چلا کرو۔ دلہن شام کے وقت آنگن میں نہ جاؤ۔ ان مسرت بھری وادیوں سے گزرتے ہوئے اس نے ایک شام روحی کو جنم دیا۔ ننھی روحی بالکل ہی نجم کی تصویر تھی۔ نجم نے دیکھتے ہی اسے گود میں سمیٹ لینا چاہا۔ دادی نے پیار سے اسے باپ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کا نام روحی رکھا۔ اب انشاءاللہ اس کے قدم کی برکت سے میں اس بار پوتا کھلاؤں گی۔ کچھ دنوں کے بعد ننھی روحی سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ نجم کو اس پیاری پیاری گڑیا سی بیٹی کے بغیر چین نہ آتا تھا ابھی روحی مشکل سے چھ مہینے کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ساس نے دوبارہ بہو کے پیر بھاری ہونے کی مسرت انگیز خبر سنی اور ان کی تمام توجہ پھر بہو کی طرف مرکوز ہو گئی۔

نو ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک خوشگوار سی صبح کو اس نے ننھی سی بچی کو جنم دیا۔ اس بار اسے گھر کے ماحول میں ایک عجیب سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ روحی کی پیدائش پر گھر میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی بچی کی پیدائش پر اس خوشی کا گھر میں دور دور تک پتہ نہ تھا بظاہر نجم کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ تھی مگر اسے اس بات کا شدت کے ساتھ احساس تھا کہ اسے جتنا پیار روحی سے تھا اتنا بھی سے نہ تھا لیکن وقت اور حالات سے سمجھوتہ کر کے گھر کے افراد اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نباہ رہے تھے کچھ دن زندگی کے اور گزر گئے اور گھر میں ایک بار پھر سے یہ خبر گردش کرنے لگی کہ بہو کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ اس بار بھی شوہر اور ساس کی توجہ کا مرکز بن گئی لیکن نہ جانے کیوں اندر ہی اندر وہ ایک انجانے خوف سے کانپتی رہتی اور جب دل کی بے چینی اور گھبراہٹ حد سے تجاوز کر جاتی تو وہ جانماز پر بیٹھ جاتی اور دونوں ہاتھ بلند کر کے خدا کی بارگاہ میں آواز دیتی خداوندا تو اس بار مجھے ایک بیٹا عطا کر دے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا اس کی ساس کی نگاہوں میں امید کی کرن بڑھتی جاتی اور شبنم ساس کی ان نگاہوں کی چمک سے لرز جاتی وہ اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی بکھرتی جا رہی تھی۔ آخر وہ گھڑی بھی آ ہی گئی جس کے تصور سے وہ کانپ جاتی تھی اور ایک دن اس نے معصوم رعنا کو جنم دیا اور یہ دیکھ کر اس کی ساس نے باہر جاتے جاتے دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ وہ اپنے تمام وجود سے کانپ گئی۔ رعنا کی پیدائش کے بعد گھر میں مکمل طور پر ایک تناؤ کی

فضا پیدا ہو چکی تھی اور نجم اب اس سے اب بالکل ہی بیزار نظر آنے لگا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت گھر کے باہر ہی گزرتا اور گھر میں رہنے پر اب وہ اکثر و بیشتر روبی کو بھی ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا اور وہ غریب سہم کر ماں سے لپٹ جاتی اور شبنم اسے ممتا کے آنچل میں سمیٹ لیتی رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ گھر میں اب اس کے لئے ایک بھیانک ٹریجڈی وقوع پذیر ہونے والی ہے اس کی ساس اب بیٹے کی دوسری شادی کرنے پر بضد تھیں لیکن نجم نے ابھی اس حد تک نہ سوچا تھا ماں کے اصرار پر وہ خاموش ہی رہتا۔ شبنم رات کی تاریکیوں میں جانماز پر آنسوؤں سے بھرا چہرہ لئے مالک حقیقی سے صرف ایک فریاد کرتی۔ اے معبود مجھے ایک بیٹے کی ماں بنا دے پروردگار مجھے برباد ہونے سے بچالے۔ میرے گلشن کو اجڑنے سے محفوظ رکھ لیکن اس کی تمام دعائیں عرش سے ٹکرا کر واپس آگئیں۔ شاید مالک نے بیٹیاں پیدا کرنا اس کا مقدر بنایا تھا اور آج اس ننھی سی بچی کی پیدائش پر گھر میں ایک کہرام برپا تھا [illegible] کی آخری امید اب دم توڑ چکی تھی اور اس دم توڑتی امید کے ساتھ ہی نجم نے اس کے ارمانوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی حسرتوں کا خون جگہ جگہ سے بہنے لگا۔

چوتھی بچی کی پیدائش پر نجم نے ماں کو اپنی دوسری شادی کے لئے رضامندی دے دی۔ بھلا خاندان کا نام لیوا بھی تو ضروری تھا۔ نجم کی والدہ تو رعنا کی پیدائش کے بعد سے ہی بیٹے کی دوسری شادی کے لئے بضد تھیں۔ انھیں صرف نجم کی رضامندی کا انتظار تھا جو انھیں آج حاصل ہو چکی تھی اور پلک جھپکتے نازک سی نجمہ بیگم مسز نجم بن کر اس گھر میں آگئیں۔ نجمہ کے گھر میں آنے کے بعد شبنم نے خود کو باورچی خانے کی کوٹھری تک محدود کر لیا۔ نجمہ کے آنے سے پہلے تک وہ کبھی کبھی آنگن میں اپنی بچیوں کو لے کر بیٹھ جاتی تھی اور نجم اس کی طرف سے منھ پھیر کر گزر جاتا تھا۔ ننھی شیما کو خود اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا شبنم نے خود کو اپنی بچیوں کی ذات میں اس طرح گم کر دیا جیسے اس گھر میں کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی ہو۔ وقت کے قدم کچھ اور آگے بڑھے اور ایک دن گھر میں یہ خبر بھی گردش کرنے لگی کہ نجمہ بیگم [illegible] والی ہیں اور ایک مرتبہ گھر میں وہی کہانی دوہرائی جانے لگی جو [illegible] شبنم کی امید سے ہونے پر دوہرائی گئی تھی۔ نجمہ بیگم یوں بھی نازک سی موم کی گڑیا تھیں تھیں شوہر اور ساس کی ناز برداریوں نے انھیں اور بھی چھوئی موئی بنا دیا۔ نجم کی والدہ جلد سے جلد پوتا کھلانے کی آرزو میں مگن تھیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نجمہ بیگم کو اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے ذہن میں ایک خیال خوفناک سانپ کی مانند سر اٹھاتا کہیں نجمہ کے یہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی تو؟ لیکن وہ جلدی ہی اس منحوس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتیں اور اپنے ذہن کو ماضی کی یادوں کی طرف موڑ دیتیں۔ نجم کے والد کی یاد ان کی عادتوں اور اصولوں کے متعلق سوچنے لگتیں اور انھیں یادوں کے سہارے وہ خوابوں کی وادیوں میں چلی جاتیں جہاں ایک گول مٹول سا بچہ باہیں پھیلائے ان کی جانب بڑھتا نظر آتا خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آگیا جب نجمہ بیگم نے ایک بچے کو جنم دیا لیکن مقدر سے کون لڑ سکا ہے یہ بھی لڑکی تھی۔ اور نجم کی والدہ کو تو اپنے خاندان کا نام لیوا یعنی لڑکا چاہئے تھا وہ شبنم سے نہ سہی نجمہ سے سہی ہوتا۔ مگر افسوس کہ نحوست کے مہیب سائے اب بھی چھائے ہوئے تھے نجمہ کے آنے سے بھی دلوں کی کلیاں نہ کھل سکیں۔

شبنم جو اس گھر کے لئے ایک بوجھ بن گئی تھی اپنی بچیوں کو لے کر ایک روز ہمیشہ کے لئے اس گھر سے رخصت ہو گئی —— اور فطرت مسکراتی رہی۔

- ہر طرح کی خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔
- کسی بات کا جواب چاہتی ہوں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں۔

میرا گھر کہاں ہے؟

ملیحہ مہناز

"بتاؤ میرا گھر کہاں ہے؟" نگو نے قریب سے گزرتے ہوئے شخص کو روک کر پوچھا۔ اور وہ بے چارہ بوکھلا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نگو سڑک کے کنارے کھڑی ہر گزرنے والے سے یہی ایک سوال کر رہی تھی۔ کوئی رک کر اسے جواب دیتا اور کوئی عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

میں نے اس کو دیکھا تو افسوس اور تاسف میری رگ رگ میں اتر آیا۔ اس وقت نگو شاید دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ جب اس کی ماں بشیرن نے میرے گھر کام شروع کیا تھا۔ بشیرن ایک خاموش طبع عورت تھی خاموشی سے آتی اور اپنے کام میں لگ جاتی اس نے کبھی مجھ سے کسی افواہ کا تذکرہ کیا نہ کبھی دوسرے گھروں کے قصے سنائے اس کو تو بس ایک ہی دھن تھی کہ اپنی بیٹی نرگس کو لکھا پڑھا کر اسکول کی مس بنادے اور اسی ایک مقصد کی خاطر وہ بڑی لگن سی گھر گھر کام کرتی اور اتنا کما لیتی کہ بیٹی کو یونیفارم اور کتابیں مہیا کر سکے۔

نرگس یعنی نگو ایک سمجھدار اور حساس لڑکی تھی اور اس کی ماں کی تمنا خود اس کی خواہش بھی تھی۔ اس لئے دل لگا کر محنت کر رہی تھی اپنی جماعت میں محنتی لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ اکثر جب اسکول کی چھٹی ہوتی وہ صاف ستھرے لباس میں ملبوس کتابیں لے کر میرے گھر آجاتی اور میں پڑھائی میں اس کی مدد کر دیتی۔ ایک روز کہنے لگی "جب کوئی لڑکی گھر کا کام کر کے نہیں لاتی تو ہماری مس اس کو بہت سزا دیتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بھئی ایسی لڑکیوں کو سزا تو ملنی ہی چاہیئے" تو نگو بڑے اعتماد سے کہتی لیکن جب میں مس بنوں گی تو کسی کو بھی سزا نہیں دوں گی۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟"

"میں تو پیار سے سمجھا دیا کروں گی کہ اچھے بچے اسکول کا کام ضرور کرتے ہیں۔"

لیکن نگو اسکول کی مس نہیں بن سکی کیونکہ ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہی اس کی شادی اس کے دور کے رشتہ دار کے بیٹے بشیر سے ہو گئی۔ نگو کی ماں بے چاری بہت روئی پیٹی بہت احتجاج کرتی رہی لیکن بے سود بھلا ایک کمزور سی عورت کس کس کا مقابلہ کرتی۔

بشیر سات جماعت پڑھا تھا اور اسکول میں چپراسی تھا مہینے کے پانچ سو روپئے کماتا۔ جس میں کنبے کے سات افراد کی کفالت کرتا تھا۔ ماں، دو بہنیں، دو چھوٹے بھائی خود بشیر اور نگو۔ شروع شروع میں تو وقت اچھا گزرا لیکن جلد ہی ساس اور نندوں کے روایتی انداز ظاہر ہونے لگے۔ نگو بیچاری نے تو اب تک گھر گرہستی کے کاموں پر توجہ ہی نہ دی تھی۔ اس لئے اکثر ہی کوشش کے باوجود کوئی نہ کوئی غلطی کر ہی بیٹھتی۔ پانچ چھ ماہ میں نگو گھر کے کام کافی مہارت سے کرنے لگی۔ اب وہ پوری توجہ اپنے گھر کو دینے لگی تھی ہر لڑکی کی طرح نگو کے ذہن میں بھی اپنے گھر کا سہانا تصور موجود تھا۔ "اپنا گھر" جس میں وہ رانی کی طرح راج کرنا چاہتی تھی۔ ہر وقت گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی۔ وقت گزرتا رہا شادی کو چار سال گزر گئے لیکن نگو ماں نہ بنی۔ ساس کو پوتے گود میں کھلانے کا ارمان تھا اور نندوں کو بھتیجے کا۔ سب نے بشیر کے کان بھرنا شروع کر دیئے کہ اب کوئی امید نہیں ہے۔ لہٰذا دوسری شادی کی سوچے۔

اس دن صبح صبح ساس نے آواز دی۔ "نگو۔ چل جلدی سے کپڑے دھو ڈال پھر سالن دیکھ لینا۔"

"اوہو! نواب زادی چائے کے بغیر کام نہیں کر سکتی ایسی ہی تھی تو اپنے گھر ہی رہنا تھا۔

"کیوں کیا یہ میرا گھر نہیں ہے" نگو کے دل پر چوٹ لگی۔

"چل چل تیرا گھر کہاں سے آیا یہ میرے بھائی کا گھر ہے" چھوٹی نند تنک کر بولی۔

نگو کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ "کیا واقعی یہ گھر بھی میرا نہیں ہے" پچھلا گھر باپ کا تھا وہاں سے مجھے یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ "یہ گھر تیرا ہے" اور اب لوگ کہتے ہیں یہ گھر بھی میرا نہیں وہ جتنا سوچتی اتنا ہی بے چین ہوتی وہ خود کو کام کاج میں مصروف رکھتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے یہ جملہ ساس نندوں یا دیوروں کی زبان

سے ادا ہوہی جاتا۔

شادی کو پانچ سال پورے ہوگئے نگو کی گود نہ بھری تو ساس نے بشیر کو دوسری شادی کے لئے مجبور کرنا شروع کر دیا آہستہ آہستہ بشیر بھی راضی ہوگیا۔ نذیرن کسی گھر میں ملازمہ تھی ہر روز وہ اپنے مالکوں کی چھ سالہ بیٹی کو اسکول چھوڑنے آتی تو بشیر سے کہتی۔ "ذرا عنبرین کا خیال رکھنا جب تک میں نہ آؤں اس کو گیٹ سے باہر مت جانے دینا" پھر دھیرے دھیرے بات چیت بڑھنے لگی، تعلقات بڑھنے لگے اور ایک دن بشیر نے نذیرن سے شادی کی خواہش کی۔

"نہ بابا تمھاری تو پہلے ہی بیوی ہے" نذیرن نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"اری تو کیا ہوا تو ہاں تو کر پھر دیکھ۔"

"بھئی پہلے اس کا فیصلہ کرو۔ پھر بات کرنا۔"

اس کو پہلے ہی بر کی تلاش تھی۔

بشیر نے ماں سے کہا۔ چپکے چپکے صلاح مشورں کے بعد فیصلہ ہوگیا کہ نگو سے چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے پھر نذیرن کو بیاہ کر لایا جائے۔ نگو کو ساس نے بلایا اور بولی "دیکھ پانچ سال میں تیری کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آخر کب تک صبر کروں اب تو میں دوسری بہو لاؤں گی پھر ہی بات بنے گی۔

"کیا مطلب آپ کا؟" نگو بولی

"تو کچھ دن کو اپنی ماں کے پاس چلی جا۔ کچھ دن بعد تجھ کو بلوا لوں گی۔

نگو جانتی تھی کہ واپس بلوانے کا تو بہانہ ہے۔ وہ ایک دفعہ چلی گئی تو پھر کبھی نہ لوٹ سکے گی۔ اس لئے فوراً بولی۔ "نہیں میں کیوں جاؤں۔ میرا گھر تو یہی ہے۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ ساس اور بشیر دونوں سمجھانے لگے لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ سمجھاتے سمجھاتے بشیر جھنجلا گیا۔ "سالی میرا گھر، میرا گھر کی رٹ لگا رہی ہے" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور نگو کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچنے لگا "کیا تیرے باپ کا گھر ہے یہ سن لے یہ میرا گھر ہے یہاں وہی رہے گا جسے میں رکھنا چاہوں گا۔ خبردار جو تو نے اس گھر میں قدم رکھا" کہتے ہوئے اس نے نگو کو دروازے سے باہر دھکا دے کر اندر سے کنڈی لگالی۔

یوں نگو بے گھر ہوگئی۔ حساس ذہن و دل کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ نہ چیخی نہ روئی۔ خاموشی سے چلتی ہوئی سڑک تک آگئی اور ہر ایک سے اپنے گھر کا پتہ معلوم کرنے لگی روزانہ شام ہوتے ہی اس کے ماں باپ پکڑ دھکڑ کر گھر لے جاتے ہیں اور اگلی صبح کو پھر سڑک پر آجاتی ہے۔

میں یہی سب کچھ سوچتے سوچتے نگو کے قریب آگئی ہوں۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا ہے اور کہہ رہی ہے۔

"باجی بتاؤ میرا گھر کہاں ہے" میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں کیونکہ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔

دعا اور دوا

عذرا خاتون

نائٹ اسکول کی روشن عمارت کے باہر اندھیرا خاصا گہرا ہو چکا تھا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے سرسبز درخت سیاہ پڑنے لگے تھے اور پرندوں کے چہچہانے کے بجائے کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

کلاس ختم ہوتے ہی وہ کتابیں سمیٹ کر جلدی سے باہر کی طرف لپکی اس کا چھوٹا بھائی خالد گیٹ کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف چل پڑی جب دونوں بہن بھائی سڑک پار کرکے اپنے گھر جانے والی تنگ و تاریک گلی میں مڑے تو درخت کے نیچے کھڑے ہوئے سائے نے بھی حرکت کی اور ان کے پیچھے چلنے لگا۔

وہ آج پھر ان کا تعاقب کر رہا ہے اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزنے لگا۔ پچھلے کئی دنوں سے ایسا ہی ہو رہا تھا پہلے وہ اسے اتفاق سمجھتی رہی تھی لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اتفاق نہیں ہے۔

گلی کا طویل راستہ اکّا دکّا کھمبے پر ٹمٹماتے بلب کی مدھم روشنی گھروں کے بند دروازوں پر پہرہ دیتی ہوئی خاموشی خوف سے اس کا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے پیچھے آنے والے قدموں کی آہٹ اور اپنے دل کی دھڑکن میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"باجی میرا جوتا۔"

"کیا ہوا۔؟" وہ بری طرح چونک پڑی۔

"پھر.... ٹوٹ گیا ہے۔" خالد کے لہجے میں جھلاہٹ کے ساتھ ہلکا سا احتجاج بھی تھا۔

"اس مہینے تنخواہ ملی تو —" اس سے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

خالد کے دھندلائے ہوئے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی اسے اپنی بہن کی ادھوری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

گلی کے سرے پر اپنا گھر نظر آیا تو اس کے ذہن پر چھائے ہوئے وسوسوں اور اندیشوں کی دھند بھی چھٹنے لگی گھر کے قریب پہنچ کر اس نے بڑا حوصلہ کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مدھم مٹیالی روشنی میں وہ کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا شاید اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوف سے اس کا خون منجمد ہو گیا۔

رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ وہ کون ہے؟ کیوں اس کا پیچھا کرتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کے پاس اپنے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ البتہ وہ اتنا جانتی تھی کہ اندھیرے میں اس کا پیچھا کرنے والا اس کے مقدر کا اندھیرا ضرور بن سکتا ہے۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں جانی پہچانی مانوس آوازوں کا شور تھا۔

ابّا کی کھانسی زیادہ بڑھ گئی تھی — اب تو دوا بھی ختم ہو گئی ہوگی خالد جوتے میں کیل ٹھونک رہا تھا اس کے لئے نیا جوتا خریدنا ہی پڑے گا۔

بھابی منے کو ڈانٹ رہی تھی وہ سادی روٹی کے بجائے پراٹھا کھانے کی ضد کر رہا تھا۔

"یتیم بچے ضد نہیں، صبر کرتے ہیں" اس نے عالم تصوّر میں اپنا ہاتھ منے کے سر پر رکھتے ہوئے سوچا۔

وسائل کی کمی اور پیسے کی تنگی نے گھر کی فضا میں کتنی گھٹن پیدا کر دی تھی وہ لمبی سی سانس کھینچ کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر گھر کے کاموں میں ایسی الجھی کہ اپنی پریشانی بھی بھول گئی۔

"پھوپھی آپ کا خط" منے کے ہاتھ میں سفید لفافہ تھا۔

اجنبی تحریر میں لکھا ہوا اپنا نام دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا خط کو اپنے دوپٹے میں لپیٹتے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ خط خالد کے نام تھا۔

"عزیزی خالد — یہ خط تمہارے نام ہے لیکن اسے تمہاری بہن کو ارسال کر رہا ہوں اسے سمجھنے کے لئے ابھی تم بہت چھوٹے ہو شاید

وقت آنے پر تمہاری بہن تمہیں یہ باتیں زیادہ بہتر طور پر سمجھا سکے۔

میں تمہارے لئے اجنبی ہوں لیکن تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو۔ کہتے ہیں گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا لیکن تمہارے روپ میں میرا بچپن ایک بار پھر میری زندگی میں لوٹ آیا ہے۔

روزانہ جب تم اس تنگ و تاریک گلی میں اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر بڑے اعتماد کے ساتھ جا رہے ہوتے ہو تو اس لمحے وقت برسوں پیچھے چلا جاتا ہے اور میں ایسی ہی تنگ و تاریک گلی میں اپنی آپا کی تلاش میں بھٹکنے لگتا ہوں۔

میری بھی آپا تھی جو تمہاری بہن کی طرح ہمارے سکھ اور آرام کے لئے بہت دکھی اور بے آرام رہا کرتی تھی۔ ابا مر گئے تو آپا نے گھر میں سلائی کا کام شروع کر دیا۔ اماں پر فالج کا حملہ ہوا تو آپا نے گھر کا کام سنبھال لیا۔ بڑا بھائی ذہنی توازن کھو بیٹھا تو اس کے لئے آپا شام کو ٹیوشن پڑھانے لگی۔ اس وقت کیا معلوم تھا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی ذمہ داریاں آپا کو کتنی دور لے جائیں گی۔

ٹیوشن پڑھانے کے لئے آپا کو دو تین گھروں میں جانا پڑتا تھا اس لئے خاصی رات ہو جاتی تھی اور واپسی پر میں آپا کو لینے جایا کرتا تھا۔

اس رات اندھیرا ہمیشہ سے زیادہ گہرا اور راستہ معمول سے زیادہ سنسان اور ویران تھا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ چلتے چلتے میں نے آپا کا ہاتھ تھام لیا۔ سڑک پار کر کے ابھی ہم گلی میں مڑے ہی تھے کہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں نے اپنی آپا کی صرف ایک چیخ سنی اور پھر ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں پاگلوں کی طرح ان کی طرف بھاگا لیکن اندھیرے نے میری آپا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نگل لیا جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا اور میرا پاگل بھائی میرا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

ہماری زندگی ہوش مندی اور پاگل پن کی حدوں سے بہت دور نکل گئی تھی۔ میں ہوش میں تھا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا بھائی پاگل تھا اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اماں کا اسی رات ہارٹ فیل ہو گیا تھا لوگ بتاتے تھے کہ میرے پاگل نے اماں کی تجہیز و تکفین کا سارا کام خود کیا تھا اور پھر اماں کو لحد میں اتار کر وہ میری دیکھ بھال کے لئے ہسپتال میں آ گیا تھا۔

میری آپا کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ پولیس تفتیش کرتی رہی اور ہم دونوں بھائی اپنی بہن کا انتظار کرتے رہے۔ یہ تھی ہماری زندگی۔ ظلم و صبر کی انتہا۔

میرے بھائی نے دو سال تک میرا ساتھ دیا اور ایک دن خاموشی سے مر گیا۔ وہ خوش نصیب تھا زندگی کی اذیتوں سے چھٹکارا پا کر اسے موت کے پرسکون اندھیروں میں پناہ مل گئی تھی

پھر میں نے اپنی بہن کا انتظار کرنا چھوڑ دیا صرف اس کے لئے دعا کرنے لگا۔ اس کی موت کی دعا۔ اپنی آپا کی موت کی دعا یہ دعا کرتے ہوئے مجھے سولہ برس ہو گئے ہیں۔ کاش کوئی مجھے میری دعا کی قبولیت کا یقین دلا دے تو مجھے سکون مل جائے مجھے تو یہ خیال مرنے بھی نہیں دیتا کہ میرے بعد میری آپا کے لئے کوئی دعا کرنے والا نہ ہوگا۔

آج تم اپنی بہن کے ساتھ اسی راستے پر جا رہے ہو جس راستے پر میری بہن مجھ سے بچھڑی تھی خدا نہ کرے تمہاری زندگی میں ایسا وقت آئے کہ تم اپنی بہن کے لئے میری طرح دعا مانگو اس لئے .... اس راستے سے واپس لوٹ آؤ کیونکہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر چلنے والا بھائی کبھی اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تمہیں ابھی انتظار کرنا ہے اس وقت کا جب تم اس قابل ہو جاؤ کہ تمہاری بہن تمہارا ہاتھ پکڑ کر چل سکے۔ تمہاری حفاظت میں تمہاری اماں ہیں۔"

میں کئی روز سے نائٹ اسکول کے باہر تم لوگوں کا انتظار کرتا ہوں اور پھر گھر تک تمہارے ساتھ ہوتا ہوں۔ شاید تمہیں اس کا علم نہ ہو لیکن تمہاری بہن یقیناً یہ بات جانتی ہے کیونکہ وہ بھی میری آپا کی طرح بہت حساس ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اصولاً ٹھیک نہیں ہے لیکن میرے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ میں ایک بار پھر اپنی بہن کو مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتے اندھیروں میں گم ہوتے ہوئے دیکھوں۔

اس خط کے ساتھ دس ہزار کا چیک ہے فی الحال میرے پاس

بھی رقم ہے اس سے گزارہ کرو۔ میں عنقریب باہر جا رہا ہوں پھر باقاعدگی سے ہر ماہ پیسے بھیجتا رہوں گا۔ تم سے صرف ایک التجا ہے اپنی بہن کی حفاظت کرنا۔ اسے اپنی ضرورتوں، اپنی خوشیوں اور اپنی خودغرضیوں کی بھینٹ نہ چڑھنے دینا۔

اپنی بہن سے کہنا وہ میری آپا کے لئے دعا کرے شاید اس کی دعا قبول ہو جائے۔

مخلص۔ احمد علی

سارا خط آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے لیکن دعا کی بجائے ان ہاتھوں میں منہ چھپا کر بری طرح رونے لگی۔

کتابوں کی معلومات کے لئے

ہمارے ماہوار

سرپنچ

کی خریداری قبول فرمائیں۔ مزاحیہ مضامین اور ایک مسلسل ناول کی اشاعت کے باوجود

قیمت سالانہ منی آرڈر سے صرف آٹھ روپے۔ وی پی سے دس روپے

منیجر۔ سرپنچ۔ نسیم بکڈپو لکھنؤ

سچے موتی

• لائق آدمیوں کی حق تلفی کرکے نالائق آدمیوں کی پرورش کرنا انصاف کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔

• ضرورت میں انسان جو وعدہ کرتا ہے وہ کم پورا ہوتا ہے۔

• کوئی آئینہ ایسا نہیں جس نے صورت سے کہا ہو کہ تو بدصورت ہے۔

• مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ دشمنوں سے بچنے کا انتظام میں خود کر لوں گا۔

• اگر تمہارے نصیب سوئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر تم اپنی بیداری مت چھوڑو۔

لطیفے

• عورتوں کے پیچھے بھاگنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا کوئی تباہی نہیں آتی۔ تباہی تو اس وقت آتی ہے جب وہ آپ کے ہاتھ آجاتی ہے۔

• اے کاہل انسان اگر تیری بیوی تجھے گھر سے باہر جانے اور کوئی کام تلاش کرنے کے لئے مجبور کرے تو کیا کرے گا۔؟

۔ دوسری بیوی کی تلاش۔

• ایک عورت دس عورتوں کے برابر ہو سکتی ہے۔ دس عورتیں اکٹھی ہو جائیں تو وہ ایک نہیں ہو سکتیں۔

• تمہاری بیوی کے مرض کا کیا حال ہے؟

۔ اب تو وہ بالکل صحت مند ہو گئی ہے۔

۔ کمال ہے۔ تم تو کہتے تھے کہ اس کا مرض لاعلاج ہے۔

۔ ہاں تمام ڈاکٹروں کا یہی خیال تھا مگر ایک ڈاکٹر کے علاج سے وہ اچانک صحت مند ہو گئی۔

۔ ڈاکٹر نے کون سا نسخہ تجویز کیا؟

نسخہ تو کوئی نہیں تجویز کیا بس اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ یہ مرض تو بوڑھی عورتوں کو ہوا کرتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری بیوی ٹھیک ہو گئی۔

• فکر کرنے سے کیا فائدہ؟ اپنی تمام فکروں کو لپیٹ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دو اور مسکراؤ، مسکراؤ، مسکراؤ۔

• خوشگوار مسکراہٹ زندگی کی جان پہچان اور شان ہے۔

• مسکراہٹ۔ بین الاقوامی زبان ہے۔

افسانہ

رہائی

شگفتہ یاسمین

وہ آزادی چاہتی تھی۔ رہائی کی طلبگار تھی۔

پچھلے بیس برسوں سے وہ اس سیلن زدہ فلیٹ اور گھٹے گھٹے ماحول میں رہتی چلی آرہی تھی اور اس کی بڑی حد تک عادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کا بچپن، لڑکپن اچپ چاپ، خزاں و بہار میں تمیز کیے بغیر اس کا باپ نما فلیٹ میں ابا کی کھوں کھاں اور اماں کی ڈانٹ پھٹکار میں بیت گیا تھا پر اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ وہ لڑکپن کی حدود پھلانگ چکی تھی اور جوانی اس کے قدم چوم رہی تھی۔ بیتا ہوا موسم خزاں موسم بہار کی نوید دے رہا تھا اور اس کے من سنگھاسن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ احساسات بیدار ہو گئے تھے اور جذبات انگڑائیاں لے رہے تھے ـــــ وہ اس حسین رُت میں کھلے تمام پھولوں کو اپنے دامن میں بھر لینا چاہتی تھی۔ زمانے بھر کی خوشیاں سمیٹ کر اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح اٹکھیلیاں کرنا چاہتی تھی۔ انکی ان رس گھولتی باتوں میں شریک بننا چاہتی تھی لیکن یہ سب کچھ کر گزرنا اس کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ محض اس لئے کہ وہ مکمل نہیں تھی۔ ذہنی اعتبار سے گو کہ وہ ایک نارمل لڑکی تھی لیکن جسمانی طور پر اپاہج تھی۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو ہاتھوں کے بل رینگتا ہی پایا۔ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی اس نے جب بھی کوشش کی ٹھوکریں ہی اس کا مقدر بنیں۔

دنیا کو اس کی بالکل ضرورت نہ تھی اس کے تنگ دست والدین نے اس کی آمد کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی پر وہ بھی ڈھیٹ نکلی اور اپنے بے حد کمزور وجود کی کلکاریوں سمیت اس دنیا میں آ پہنچی۔ اس کے بچنے کی امید بہت کم تھی، بچ نکلی۔ لیکن ابھی دو ماہ اس کے ننھے منے وجود پر پولیو کا شدید حملہ ہوا۔ غریب والدین نے مقدور بھر اس کا علاج کروایا اور یوں وہ اس کڑے حملے کے گرداب سے بھی بچ نکلی پر اور بات ہے کہ اس کے وجود کا اہم حصّہ نچلا دھڑ سختی اس گرداب کی نذر ہو گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے چلنے سے معذور ہو گئی۔ مگر اس کے بازو بھی اس شدید گرداب کی زد میں آ گئے تھے

تاہم وہ انھیں ہلا جلا سکتی تھی۔

بچپن کی معصوم سرحدوں تک اسے اپنے ادھورے وجود کا کچھ احساس نہ تھا لیکن جب شباب اس کی روکھی پھیکی زندگی کے اجاڑ آنگن میں آہستہ خرامی سے اترا تو یہ احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ اس احساس کی شدت جب حد سے سوا ہو جاتی تو وہ لکڑی کے ان بے جان ٹکڑوں کو جو اک مدت سے اس کے ہمدرد اور رفیق تھے جو اس کے وجود کو تھامتے چلے آرہے تھے جھنجھلا کر دور پٹخ دیتی۔ لڑکھڑا کر اپنے بے رنگ گھر کے در و دیوار کو تھام لیتی اور جل برساتی آنکھوں پر اپنے کمزور بازوؤں کا بند باندھ لیتی۔"

درد دل جب اس سیل رواں کے ساتھ بہہ کر باہر نکل جاتا تو پھر اسے اپنے اس بے جان سہارے کا خیال آجاتا جو اس کے وجود کا ایک حصّہ بن چکا تھا گھسٹ کر وہ اس تک پہنچتی اسے آنکھوں سے لگاتی اور پھر ہمیشہ کی طرح انھیں تھام کر اپنے دو کمروں پر محیط بوسیدہ گھر میں کھٹ کھٹ کرتی پھرتی اور بالآخر تھک ہار کر اپنے بوسیدہ گھر کی بوسیدہ گیلری میں آ کھڑی ہوتی کہ یہی اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ یہاں سے سارے بازار کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ تیزی سے دوڑتی ہوئی بسیں کاریں، رکشہ اور اسکوٹر اور خریداری کرتی ہوئی لڑکیاں اور شوخ و شنگ فقرے کستے لڑکے۔ یہ سب کچھ اسے بیحد اچھا لگتا تھا۔ وہ زیادہ وقت اسی گیلری میں انھیں نظاروں کو دیکھتے ہوئے گزارنا پسند کرتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ یہاں سے ایک پل کے لئے بھی ادھر ادھر نہ ہوتی لیکن اماں کو تو اس کے اس پسندیدہ مشغلے سے جیسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ادھر اس نے گیلری میں قدم رکھا ادھر انھوں نے کوئی نیا کام اس کے سپرد کیا۔ اکثر اپنے اس اکلوتے شوق کی خاطر اسے گھنٹوں اماں کی صلواتیں سننا پڑتیں اور وہ کمال ضبط سے گھنٹوں کے اس زہر کو پیتی رہتی۔

پچھلے بیس سالوں سے یہی منظر روز دیکھتے دیکھتے اب وہ دل میں یہ آرزو کرنے لگا تھا کہ اپنے اس تین منزلہ بوسیدہ فلیٹ کی جھولتی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر بازار کی رونقوں کو قریب سے دیکھے۔ چیزوں کو چھو کر محسوس کرے، لوگوں سے باتیں کرے، منچلے لڑکوں کے فقروں کا نشانہ بنے اور مصنوعی خفگی کے ساتھ اپنی ہم جنسوں میں ۔۔۔ مگر اس کی یہ خواہش اب تک سوچ کی حدوں تک ہی محدود تھی

کا روپ نہ دھار سکی تھی۔

اماں اکثر سبزی، گوشت لینے نیچے بازار تک جاتی تھیں۔ وہ روز سوچتی کہ کسی روز موقع پاکر اماں سے ساتھ جانے کی بات کرے گی۔ پر اس کی ہمت نہ پڑتی

بالآخر ایک دن اس نے حوصلہ کیا اور اماں سے نظریں بچائے بغیر اپنے دل کی بات کو زبان پر لے ہی آئی اور نتیجہ اس کی توقع کے عین مطابق ہی رہا۔ اماں نے اسے صلواتیں سنانے کے ساتھ ساتھ دو گھونسے بھی لگائے "اے بی ہوش کے ناخن لو۔ باپ بیمار پڑا کھوں کھوں کر رہا ہے اور کلموہی کو سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مجھ اکیلی سے اپنا بوجھ تو سنبھلتا نہیں اوپر سے اس سٹنڈی کو لئے لئے تماشا بنی کیا دیدہ ہوائی ہوگیا ہے۔ اسے بے اسی دن کے لئے منع کرتی تھی کہ گیلری میں نہ نکلا کر۔ آخر ہو گیا نا اثر کمبخت نہ خود مرتی ہے نہ ہمیں چین سے مرنے دیتی ہے۔

اماں نے سختی کے ساتھ اسے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر آئندہ انھوں نے اسے نامراد گیلری میں کھڑے دیکھا تو ٹھیک نہ ہوگا۔

اماں کی کڑی نگرانی کے ڈر سے وہ پورے ایک ہفتے تک گیلری کے پاس تک نہ پھٹکی۔ بس دور دور سے چڑیوں کو کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ پرواز کرتے دیکھتی رہتی اور گھنٹوں اپنے کمزور بازوؤں میں سر نیوڑائے یہ سوچتی رہتی کہ کاش وہ انسان کی بجائے کسی پرند کے روپ میں اس دنیا میں آئی ہوتی تاکہ آزاد فضا کی خوشبوؤں سے وہ اپنے وجود کو مہکا تو سکتی۔

اس کے دن رات اس قفس میں، انھیں سوچوں کے درمیان بیتے جا رہے تھے۔ اس کے اندر کا بے کل پنچھی باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ انھیں اور اس دنوں ہی خاندان میں کسی قریبی عزیز کی موت واقع ہو گئی اور اماں رات بھر کے لئے وہیں ٹھہر گئیں۔ یہ رات اس کی زندگی کی حسین ترین رات تھی آج وہ حد سے زیادہ خوش تھی ...... بے حد خوش۔ آج اماں کی خشمگیں نگاہیں اس کی پہریداری نہیں کر رہی تھیں اور وہ گیلری میں اپنی پسندیدہ ترین جگہ میں جانے کے لئے آزاد تھی۔

رات طوفانی تھی آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی اور بادلوں کی کڑک دل دہلائے دے رہی تھی۔ ایسی خوفناک راتیں وہ اماں کی چھاتی سے چمٹ کر گزارا کرتی تھی لیکن آج ...... آج اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ بس ایک ہی احساس اس پر غالب تھا کہ آج اماں کی خشمگیں نگاہیں اس کی کھوج میں نہیں ہیں اور وہ گیلری کی کھلی فضا میں جا کر آزادی کی سانسیں لے سکتی ہے اس کا یک سے کچھ دیر کے لئے رہائی پا سکتی ہے۔ کھوں کھوں کرتے ابا کی بھی آج اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ دوڑ کر گیلری میں آ کھڑی ہوئی اور کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جیسے آج کے بعد یہ موقع پھر نہ مل سکے گا۔ یہ لمحہ بیت گیا تو پھر نہ آسکے گا۔ بارش زور و شور سے ہو رہی تھی۔ اسے اپنے بھیگنے کی بھی ذرا پرواہ نہ تھی۔ اس نے ریلنگ سے ٹیک کر رسانیت سے ٹاس کر رسانیت سے اپنی پلکیں موند لیں تبھی بادل زور سے کڑکے، تیز آندھی کا ایک طوفان آیا وہ اپنی بوسیدہ گیلری کے کمزور سہاروں سمیت نیچے آ رہی نیچے اس بازار میں جہاں آنے کی خواہش اس نے ہمیشہ کی اور کچھ دیر کے لئے اپنے گھٹے گھٹے کابک سے رہائی مانگی تھی۔ آج اسکی یہ خواہش تقدیر نے پوری کر دی تھی۔ آزادی چاہی تھی۔ آج اس کی یہ خواہش تقدیر نے پوری کر دی تھی۔ اس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے چاروں جانب دیکھا۔ اک حسین، طمانیت سے بھرپور احساس اس کے چہرے پر بکھر گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ایک جانب کو ڈھلک گئی۔

آج اس نے آزادی پالی تھی۔ رہائی کی دولت اسے نصیب ہو گئی تھی۔ وہ صرف اپنے کابک نما فلیٹ سے باہر آگئی تھی بلکہ اپنے نامکمل وجود کی قید سے بھی آزادی ہو گئی تھی۔

افسانہ

ایثار

زیبا بدر

فرہاد ہاتھ سر کے نیچے رکھے سونے کی کوشش میں مصروف تھا تب ہی باہر صحن میں رکھے ہوئے ریڈیو سے نغمے کی لہریں پھوٹیں اور فرہاد کی نیند اڑ گئی۔

میری پیاری بہنا بنے گی دلہنیا
سج کے آئیں گے دولہے راجہ
سجنا کے گھر چلی جائے گی بوجھنا
ہونٹ ہنسیں گے مرے لو رو دیں گے نینا

گانے کے یہ بول اس کے کانوں سے ٹکرائے تو بے اختیار اس نے کام کرتی ہوئی ناجیہ کی طرف دیکھا جس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتی بن کر دمک رہے تھے۔ کیا میری بہن کی مانگ میں افشاں کبھی نہیں سجے گی؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ تب ہی دماغ نے کہا کیوں نہیں "مگر جہیز کہاں سے لاؤ گے؟ چاہے کچھ بھی ہو لیکن میں اپنی بہن کو دلہن ضرور بناؤں گا" اس نے ایک اضطراب کے عالم میں سوچا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

فرہاد اور ناجیہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ خورشید علی ان کے والد بے حد ایماندار شخص تھے ایک سرکاری عہدے پر فائز تھے اس لئے جب ان کا انتقال ہوا تو لوگ کسی طرح یقین نہ کرتے کہ وہ اپنی اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑ گئے لوگ سمجھتے تھے کہ انھوں نے بھی کافی مال کمایا ہوگا۔

ناجیہ کا کوئی رشتہ آتا بھی تو ساتھ ہی ایک لمبی چوڑی فہرست ہوتی جسے پورا کرنا جمیلہ بیگم کے بس سے باہر تھا فرہاد ایل ایل بی (سال دوم) میں تھا۔ اس لئے آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لئے اوپر کی منزل کرائے پر دے کے وہ لوگ نیچے چلے آئے یہ بھلا ہوا تھا کہ خورشید علی نے سستے وقتوں میں اپنا گھر بنا لیا جو آج ان کے کام آ رہا تھا۔ اب ایک جگہ ناجیہ کا رشتہ طے ہوا شروع میں تو انھوں نے بڑی شرافت دکھائی لیکن باقاعدہ بات پکی ہونے کے بعد انھوں نے ایک لمبی چوڑی فہرست جمیلہ بیگم کے ہاتھ میں تھما دی جسے پڑھ کر وہ رو دینے کو ہو گئیں چاہا کہ رشتہ توڑ دیں۔ مگر فرہاد نے انھیں سمجھا بجھا کر ایسا کرنے سے منع کیا اور خود زیادہ سے زیادہ ٹیوشن پڑھانے میں مصروف ہو گیا اس سے جو پیسے حاصل ہوتے وہ جمیلہ بیگم بہت سوچ سمجھ کے خرچ کرتیں مگر اتنا عرصہ ہونے کو آیا مگر وہ ان کی آدھی فہرست بھی نہ مکمل کر پائے اب یہی سوچ سوچ کر جمیلہ بیگم پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ناجیہ بھی کونے کھدروں میں روتی رہتی تھی۔

رات کا کھانا کھا کے وہ سونے لگا تو جمیلہ بیگم اس کے پاس چلی آئیں وہ انھیں آتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

فرہاد بیٹا ناجیہ کے سسرال والے پھر آئے تھے وہ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں اور ادھر یہ حال ہے کہ کوئی تیاری نہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ ناجیہ کے ابا بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ اب انھیں کیا معلوم جو کچھ تھا وہ سب قرض اتارنے میں ختم ہو گیا، اب بتاؤ بیٹا کیا کریں؟ جمیلہ بیگم کی آواز بھر آگئی۔

"آپ فکر نہ کریں اماں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"

"کیسے فکر نہ کروں، سینے پہ ایک بوجھ سا رہتا ہے تمہاری تنخواہ تو گھر کے خرچ میں پوری ہو جاتی ہے اس کی شادی کہاں سے کریں گے" وہ رو دینے کو تھیں۔

"اماں بس آپ شادی کی تاریخ طے کریں سب ہو جائے گا" فرہاد نے تسلی دی تو جمیلہ بیگم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں اور فرہاد سوچوں میں گم ہو گیا۔

شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ فرہاد کو سیٹھ صاحب کے کام سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا جن کے پاس وہ ... واپس آنے تک ... جمیلہ بیگم حیران ہو گئیں سوکھ کے کانٹا ہو رہا تھا۔ زرد رنگت ...

"کیا ہوا بیٹے اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو" انھوں نے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں بس آپ یونہی پریشان ہو جاتی ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں آپ یہ دیکھیں" اس نے جمیلہ بیگم کے سامنے بریف کیس کھولا جو روپوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ کہاں سے آئے؟" وہ خوفزدہ ہو کے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

کہیں سے بھی نہیں۔ یہ سیٹھ صاحب نے ادھار دیئے ہیں۔"
فرہاد نے کہا۔

"لیکن بیٹا اتنے پیسے واپس کیسے کرو گے؟" وہ پریشان ہوگئیں۔

"ارے ہو جائیں گے واپس بھی آپ شادی کی تیاریاں کریں"
فرہاد زور سے ہنس دیا اور ہنستا ہوا بہن کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ ہی دنوں بعد شادی کے ہنگامے شروع ہوگئے محلے کی لڑکیوں اور ناجیہ کی کالج فیلوز نے آکر ڈھولک سنبھال لی تو بابل کے گیتوں سے فضا گنگنا اٹھی۔ جوڑے پیک کیے جانے لگے ایسے میں ناجیہ کا چہرہ خوبصورت سے رنگوں میں گھر جاتا اور فرہاد خدا کے حضور جھک جاتا تاکہ اپنی بہن کی خوشیاں امر ہونے کی دعائیں مانگ سکے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد وہ پرمسرت گھڑی آن پہنچی جس کے لئے فرہاد اور ماں نے دن گن گن کے گذارے تھے ایک شور تھا جو ان کے گھر میں ہو رہا تھا کھانا کھاتے ہی دولہا والے رخصتی کے لئے اصرار کرنے لگے تو جمیلہ بیگم جو اتنی دیر سے دل سنبھالے اپنی آہوں کا گلا اندر ہی اندر گھونٹ رہی تھیں کہ ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں ناجیہ بھی رو رو کے بے حال ہو رہی تھی ---- فرہاد پتھر کی طرح ساکن تھا وہ آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ فہد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

فہد میرے بھائی ہم نے اپنی سب سے عزیز ترین شے تمہیں سونپ دی ہے۔ خدارا اسے دکھی نہ کرنا یہ رو دے گی تو میں خوب اشکوں کا زمرہ نہ رہ پاؤں گا۔" فرہاد نے کہا تو فہد اس کے گلے لگ گیا اور ہمیشہ خوش رکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہی۔

تب فرہاد نے ناجیہ کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا دیا فہد بھی دوسری سائیڈ کا دروازہ کھول کر ناجیہ کے قریب بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو فرہاد نے ناجیہ کا گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر افشاں ماتھے پر ٹیکہ ناک میں باریک نتھ جھومر سجائے میک اپ سے بنا سنورا خوبصورت چہرہ جس پر بے تحاشہ آنسوؤں کے نشان اور دلکشی عطا کر رہے تھے۔

"بھیا اپنا خیال رکھئے گا" یہ ناجیہ سسکی تو فرہاد ہوش میں آگیا۔

"خوش رہو گڑیا!" اس نے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا اور گاڑی سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ضبط سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر وہ بہن کو جاتا دیکھ رہا تھا ناجیہ کو رخصت کرکے وہ جمیلہ بیگم کو سہارا دے کر اندر لایا اور انہیں محلے کی عورتوں کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

تب کمرے کی دیواریں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ پہاڑ کے جذبات رکھنے والا جس کی آنکھوں میں بہن رخصت کرتے ہوئے ایک آنسو نہ تھا۔ وہاں اب سمندر کی سی طغیانی آئی ہوئی تھی۔

وہ بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ تب ہی دھڑکنیں اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر گئیں۔ صبح جب جمیلہ بیگم نے اسے اٹھانے کے لئے دروازہ کھولا تو حیرت کے مارے دنگ رہ گئیں۔

"فرہاد یہ نیچے کیوں لیٹے ہو" انہوں نے اس کو اٹھانا چاہا مگر فرہاد کوئی جواب نہیں دیا تب جمیلہ بیگم کی چیخیں سن کر لوگ دوڑے آئے اور اسے ہسپتال لے گئے۔

ڈاکٹرز نے معائنہ کیا جب ایکسرے لئے تو معلوم ہوا کہ فرہاد کا ایک گردہ خراب ہو چکا ہے اور دوسرا سرے سے ہی موجود نہیں ہے جمیلہ بیگم نے سنا تو حیران رہ گئیں انہوں نے فرہاد کے کمرے کی تلاشی لی تو ان کے ہاتھ ایک اخبار کا تراشہ لگا جس میں لکھا تھا۔

"ایک بچے کے لئے گردے کی ضرورت
ہے اس کے دونوں گردے خراب ہوچکے
ہیں اگر کوئی نوجوان ایک گردہ دے تو
اسے ۵۰ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔"

"آہ فرہاد میرے بیٹے تو نے یہ کیا کر دیا" جمیلہ بیگم بدلی ہوئی ہسپتال آئیں اور فرہاد کے کمرے میں داخل ہوئیں تو ناجیہ فہد کے ساتھ کھڑی تھی ---

ولیمہ کی تقریب فرہاد کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی تھی۔

"بھیا یہ آپ نے کیا کیا" وہ روتے ہوئے فرہاد پر جھکی جسے اب کچھ ہوش آ گیا تھا۔

"میری گڑیا بہن اگر میں یہ سب نہ کرتا تو تجھے دلہن کیسے بناتا۔ مجھے خوشی ہے کہ تو آج اپنے گھر کی ہوگئی اور میں نے کیا ہی کیا ہے

بہنوں کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں تو بہنوں کے آنچل کا تحفظ اور سائبان بنتے ہیں، میں نے بھی اپنی بہن کو سائبان دیا ہے قید کی صورت میں" یہ فرہاد نے کمزور آواز میں کہا تو ناجیہ کی ہچکی بندھ گئی فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر بہن کو تسلی دینا چاہا مگر ہاتھ بے جان ہو گئے جسم سے روح کا ناطہ ٹوٹ گیا اور ناجیہ پاگلوں کی طرح چیخ اٹھی۔

"بھیا!"۔۔۔ اکثر میں ایک دن کی بیاہی دلہن اپنے بھائی سے ملنے آئی تھی تم مجھے دعائیں نہ دو گے، پیار نہیں کرو گے"
مگر فرہاد کے لبوں کی خاموشی نہ ٹوٹ سکی ناجیہ بے ہوش ہو گئی۔
اور جمیلہ بیگم اپنے بیٹے پر نظریں جمائے خدا کے حضور فریاد کر رہی تھیں اے میرے مالک تو نے کہا تھا کہ بیٹیاں باعث رحمت ہوتی ہیں تو پھر یہ کیسی رحمت ہے جو بھائیوں کو موت کی نیند سلا دیتی ہے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ اور موزوں ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو جس ماہ میں شعر چھپنا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تک جو اشعار وصول ہوتے ہیں وہی شائع کئے جاتے ہیں۔

مئی کے لئے عنوان ہے "اثر" اور جون کے لئے "اضطراب"

نیرنگیٔ خیال سے ہے شورش حیات
لازم نہیں ہے ایک ہی اب کا خیال ہو

مرسلہ:- نجمہ انصار۔ (دھلکل)

کھینچ دیتا ہے تصویر یار کا خاکہ خیال
فکر بھی کام اس پہ کرتی ہے پرواز کا

مرسلہ:- امتیاز فاطمہ کاظمی ایم اے۔ مظفر پور

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مرسلہ:- کے نسیمہ صبا (آمبور)

خدا کے خیال نے مجھے تم سے ملا دیا
اور میری بے خودی پہ قلم مسکرا دیا

مرسلہ:- شمونہ روحی (حیدرآباد)

کب خیال آپ کا نہیں ہوتا
درد دل سے جدا نہیں ہوتا

مرسلہ:- نیلوفر (دھلی)

کیا آگیا خیال دل بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

مرسلہ:- گلنار جبیں (آمبور)

یاد اک زخم بن گئی ورنہ
بھول جانے کا کچھ خیال تو تھا

مرسلہ:- قرۃ العین (منڈپال)

خیال شب غم سے گھبرا رہے ہیں
ہمیں دن کو تارے نظر آرہے ہیں

مرسلہ:- کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

تو عروس شام خیال بھی تو جمال روئے سحر بھی ہے
یہ ضرور ہے کہ بہ ایں ہمہ مرا اہتمام نظر بھی ہے

مرسلہ:- صوفیہ مظفر (نگر۔ جمشید پور)

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

مرسلہ:- تنصیرہ تبسم عطیہ سلطانہ (آمبور)

میں اس خیال سے آج تک کبھی دل کی بات نہ کہہ سکی
کہ تو درد دل سے ہے بے خبر کہیں مسکرا کے نہ ٹال دے

مرسلہ:- عالم آرا (آرہ)

خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں؟
کہ زندگی ہے سراپا رحیل بے مقصود

مرسلہ:- مسلمہ بی بی (دوام پور)

خیال و خواب کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا
بھنور میں ناؤ گھری ہے بھنور کی بات کرو

مرسلہ:- تحسینہ شاہین (دہلی)

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

اور پھر سحر نہ ہوئی!

صفیہ عاشی

حسب معمول شام بے رنگ سا آنچل اوڑھے بڑی اداس سی تمہارے گھر کے اس چھوٹے سے آنگن میں اتر آئی ہے چاروں طرف پھیلا ہوا بیکراں سکوت میری روح کو کھائے دے رہا ہے۔ مہندی کی باڑ سے گھری یہ کچی سی قبر فضا میں پھیلی اگربتی کی غم انگیز خوشبو انجام حیات کا نوحہ سناتی محسوس ہوتی ہے اور میں معمول کے مطابق اس ہفتے بھی تم سے ملنے چلی آئی ہوں کوثر۔ یاد ہے جب میرے آنے میں ذرا سی دیر بھی ہو جاتی تو تم کس قدر بے قرار ہو اٹھتی تھیں اور پھر گھر کی ساری مصروفیات چھوڑ کر میرے پاس چلی آتی تھیں لیکن اب دوستی کا یہ فریضہ ادا کرنے کو میں تنہا ہی رہ گئی ہوں میری دوست مجھے بسنت کی وہ صبح اب بھی یاد ہے جب حسب دستور پھولوں کا گلدستہ لے کر میں جیسے ہی تمہارے گھر میں داخل ہوئی عود و لوبان کی خوشبوؤں نے میرا استقبال کیا میری دھندلائی ہوئی نظروں کے سامنے تم سرخ ڈوپٹے میں منہ چھپائے بے حس و حرکت دالان میں اپنی مخصوص جگہ لیٹی تھیں ہر روز میرے انتظار میں در پہ لگی آنکھوں نے ہمیشہ کے لئے غلافی پلکوں کی چادر اوڑھ لی تھی۔ تم تو شہاب کی دلہن بننے والی تھیں نا۔ وہ شہاب جس کی محبت تمہاری خوبصورت آنکھوں کی چمک تھی اور تمہارے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ کی طرح بکھری رہتی تھی۔ تم جب بھی ہفتہ کی شام دلی فارمیسی سے گھر آتیں تو تمہارے وجود کا ہر حصہ دلی خوشی سے سرشار ہوتا اور میں دل ہی دل میں تمہاری نظر اتارا کرتی۔ شہاب فارمیسی کا سینئر کیمسٹ تھا۔ تم دونوں کا چیمبر اتفاق سے ایک ہی تھا دو سال پہلے جب تم نے فارمیسی میں قدم رکھا تو اس کی آنکھوں نے تمہیں بہت کچھ سمجھایا تھا اور دھیرے دھیرے جب تم اس زبان کا مفہوم سمجھنے لگیں تو شہاب کو ہی اپنی منزل مان بیٹھیں۔ تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر جلد ہی تمہیں ترقی ملی اور تم ایک مشرقی لڑکی کی مانند مستقبل کے سہانے خواب بننے لگیں۔ تم پر گھر میں سب سے بڑے ہونے کے ناطے چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داری بھی تھی تم آدھی تنخواہ گھر لے آتیں اور بقیہ میں سے ایک بڑا حصہ شہاب کے چھوٹے سے فلیٹ کو سجانے میں صرف کرتیں جو تصورات کی چھاؤں میں تمہارا اپنا گھر ہونے والا تھا۔ بعض وقت تمہارے پاس تنخواہ کا ایک پیسہ نہ بچ پاتا اور ایک اجنبی جگہ پر تمہیں اکثر بے انتہا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مجھے تمہاری خوددار فطرت کا علم تھا اس لئے جب کبھی ہماری ملاقات ہوتی تو میں چپکے سے کچھ روپئے تمہارے پرس میں رکھ دیا کرتی۔ اور دوسری بار جب ہم ملتے تو تم بے حد خفا نظر آتیں۔ بے حد لڑتیں اور پھر تھک کر میری آغوش میں سر رکھ کے بڑے درد سے کہتیں ۔۔۔ "صبا میرے لئے دعا کرتی رہا کرنا" تمہاری وہ درد بھری آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور میری نگاہیں اکثر آسمانوں میں خدا کے انصاف کو پکارتی اور بھٹکتی رہتی ہیں...

تمہاری سادہ لوحی اور وفا پرستی ہی تمہارے لئے زہر بن گئی کوثر۔ شہاب نے یک لخت نگاہیں پھیر کر تمہاری بے لوث محبت کو ٹھکرا دیا۔ تمہاری حس اور خودداری کو ایسی ٹھیس لگی کہ تم بری طرح بکھر گئیں۔ وہ سفاکی کی حد تک تمہارے جذبوں کا مذاق اڑاتا رہا اور فارمیسی میں ہر ایک کی طنز بھری تعریف کچھ بولتی کچھ پوچھتی نگاہیں تمہارے ذہن میں انتشار پیدا کئے رہتیں ایک عرصہ بعد میں نے تمہیں دیکھا تو ایسا لگا جیسے میں نے خزاں کو مجسم دیکھ لیا ہو۔ تمہاری ہستی دھیرے دھیرے اپنی تمام رونق کھو رہی تھی ایسی خاموشی تمہاری شخصیت پر منجمد ہو گئی تھی کہ جس کی تہہ تک پہنچ جانا میرے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ اسی فلیٹ میں جسے تم نے اپنی محنت کی کمائی اور خون دل کے رنگوں سے سنوارا تھا۔ شہاب نے اپنی بیوی کو لا کر رکھا۔ والدین کی مرضی کی آڑ میں اس نے خود ہی یہ نسبت طے کر لی تھی۔ تم ضبط کی حدوں سے گزر کر گھر واپس آ گئیں اور بستر مرگ پر لگ گئیں روز بروز تمہارے لاغر ہوتے وجود پر مجھے شب کے پچھلے پہر پگھلتی ہوئی شمع کا گمان

ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کی نظر میں تمہارا مرض لاعلاج بن چکا تھا۔ اگر کوئی دوا تھی بھی تو محض یہ کہ کوئی ایسا شخص جو شہاب کا بدل بن کر تم سے بے پناہ محبت کرے۔ تمہارے شکستہ اعتماد کو بحال کرکے تمہارے اندر زندہ رہنے کی مرتی ہوئی خواہش کو دوبارہ جلا بخشے اور یقین کی دولت سے مالامال کردے۔ یہ مرحلہ بہت صبر آزما تھا۔ ایک ماہر نفسیات سے مشورہ کرکے میں نے اپنے کزن شاداب کو جن کی بلند کرداری پر مجھے ہمیشہ سے ناز تھا ان واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بخوشی اس قربانی کے لئے تیار ہوگئے۔ مگر ہماری یہ تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ تم نے اپنی خشمگیں نگاہوں اور اپنی برفیلی لاپرواہی سے ان سے مکمل طور پر بے رخی برتی ... اور ہم دونوں تمہاری صحت کی طرف سے بالکل ہی ناامید سے ہونے لگے۔

ایک شام تم حسب معمول ٹھہر ٹھہر کر ہلکی آواز میں اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں کہ اچانک اپنے لاغر ہاتھ سے تم نے میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ صبا تم جانتی ہو ناکہ قاتل کی شکل مقتول کی آنکھوں میں اتر آتی ہے ... ذرا غور سے دیکھو ... میری آنکھوں میں شہاب کی شکل نظر آتی ہے تمھیں۔ تم ہانپتے کانپتے الفاظ میں کہہ رہی تھیں اور میں تمہاری دہشت انگیز حرکت پر سہمی جارہی تھی۔ پھر تم نے تھک کر اپنا سر تکیے پر لٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں ... سانسوں کی رفتار مدھم ہونے لگی تھی ... میں نے گھبرا کر تمھیں آوازیں دیں مگر تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں تمہارے پہلو میں شب کے پچھلے پہر تک بیٹھی تمہارے جاگنے کا انتظار کرتی رہی لیکن تم نے آنکھیں نہ کھولیں شاید نیند نے تمھیں اپنی نرم آغوش میں لے لیا تھا .... میں نے نبض کی رفتار سے اندازہ لگایا اور واپس گھر آگئی ... دور بادل گرج رہے تھے اور بجلی رہ رہ کے چمک اٹھتی تھی۔ وہ رات بہت بھاری گزری تھی مجھ پر جس رات کی سحر تمہارے واسطے نہ ہوسکی کوثر۔

اس سانحے کو ایک سال گزر گیا ہے میری دوست لیکن تمہارا غم اب بھی دل کی گہرائیوں میں تازہ ہے ۔ تمہاری کولیگ شبریں، اکثر فارمیسی سے مجھے خط لکھتی رہتی ہے۔ پچھلے خطوں میں اس نے شہاب کے بارے میں کافی کچھ لکھ رکھا ہے کوثر جو میں تمھیں بتلانے آئی ہوں۔ تم یاد ہے اس کی سنگ دلی کے اس کی خیریت کی دعا ہی کیا کرتی تھیں نا ... لیکن افسوس آج وہ قتل کے الزام میں جیل کی کسی تاریک کوٹھری میں اپنے قطعی فیصلے کا منتظر ہے۔ یہ قتل اس نے محض شک و شبے کی بنا پر اور جذبۂ رقابت سے مجبور ہو کر اپنے اس دوست کا کیا ہے جو رشتے میں اس کی بیوی کا کزن بھی تھا۔ کوثر، میں جب بھی شیریں کے خطوط پڑھتی ہوں تو ایک بزرگ کی بات یاد آجاتی ہے کہ قدرت کسی کے ساتھ کبھی مذاق نہیں کرتی صرف پل پل کا حساب چکاتی ہے۔

چار باتیں

• عورت میں چار باتیں ضروری ہیں۔
(۱) اس کے چہرے پر حیا ہو (۲) اس کی زبان میٹھی ہو۔
(۳) اس کے دل میں نیکی ہو (۴) اس کے ہاتھ کام میں لگے ہوں۔

لاعلمی

• انسان کی زندگی میں دو مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔

مرد اور عورت

• مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کی عزت کریں کیونکہ وہ ان کی دکھی اور پریشان زندگی کو جنت کے پھولوں کی طرح خوشبودار اور حسین بنا دیتی ہیں۔

مادری زبان

• ساری دنیا میں زبان کو مادری زبان اس لئے کہا جاتا ہے کہ باپ کو اسے استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

دوسرے اداروں کے شائع کردہ حالیہ ناول

ناول	مصنف	قیمت
پھول	مشرف تمیز	۴۰/-
ذرے ذات	عفت قریشی	۴۰/-
اجنبی	سلمیٰ کنول	۵۰/-
عروج		
آگ		۳۵/-
چلمن چلمن تیری تجلی	رضیہ بٹ	۵۰/-
جب یاد تیری آئی	دیبا خانم	۴۲/-
راز داں	ماہ ناز صبرینا	۴۳/-
گوری	فردوس حیدر	۲۵/-
	روحی معظم	۲۵/-
بے نشاں راستے	بلقیس ظفر	۳۰/-

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف لکھی جائے ساتھ ہی پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجی جائے۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد دفتر میں وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

● میں ۱۲ مارچ کی شب میں لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا تھا جہاں مجھے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے منعقدہ اردو کتب کے مسائل پر منعقدہ ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ میرا قیام حاجی محمد شفیع صاحب بیکارڈ واچ کمپنی کی کوٹھی ۲۳ انصاری روڈ پر تھا۔ وہیں ۲۲ مارچ کی صبح ۹ بجے میرے عزیز پڑوسی اور دوست جناب مشیر احمد صاحب نے اپنے فون سے اطلاع دی (میرے گھر اور آفس دونوں جگہ کے فون خراب تھے) کہ اللہ پاک نے میرے لختِ جگر عزیزی فہیم انہونوی سلمہٗ اور بشریٰ سلمہا کو ۲۲؍۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کی درمیانی شب میں ۳ بجے پہلی بار شادی کے تقریباً ۳ سال بعد ایک فرزند عطا فرمایا۔ اس خبر کو سن کر دل چاہا کہ اڑ کر لکھنؤ پہنچ جاؤں لیکن جس مقصد کے لئے دہلی گیا تھا اس کی تکمیل بھی ضروری تھی اس لئے کہ اس میں مجھے ایک مقالہ بھی پڑھنا تھا۔ حریمی بہنوں اور بھانجیوں سے درخواست ہے کہ وہ میرے پوتے کے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے تندرست رکھے اور فخرِ خاندان بنائے۔

نسیم انہونوی

● شاہدہ بانو۔ (جبل پور) میرے برادر مکرم عبدالوہاب خاں صاحب مالک روشن درسی کتب خانہ جبلپور کو اللہ پاک نے ۹ مارچ ۱۹۸۵ء کی صبح ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ میرے بھائی اور بھابی رابعہ بیگم کی گود ہمیشہ بھری رہے۔

● شہناز بیگم (دیگا راپیٹ) میری چاند آپا کلثوم جان اور بھائی محمد اکبر صاحب کو اللہ پاک نے یکم فروری ۱۹۸۵ء بروز جمعہ بوقت پونے گیارہ بجے شب پہلی بار دختر عطا فرمائی نام بی بی ہاجرہ خاتون اور پیار کا نام کہکشاں رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

● خالدہ نصرت (میسور) میری پیاری بہن عشرت اور بہنوئی ڈاکٹر افتخار الدین صاحب کو اللہ پاک نے ۱۰ فروری ۱۹۸۵ء بروز اتوار صبح ۸ بجے پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی تاریخی نام عفت شفقت عرف عرشیہ عنبرین رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اپنے والدین کے زیرِ سایہ پھولے پھلے اور فخرِ خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

● برادر عزیز سید جمیل الحسن صاحب ردولوی منیجر اودھ روح رواں نسیم بکڈپو کی سب سے چھوٹی بیٹی عزیزی راحلہ سلمہا کی شادی عزیزی سید قاضی ریاض مہدی سلمہٗ (خلف الصدق سید قاضی محمد مہدی حسن صاحب لکھنوی) کے ساتھ ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء کی شام کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جناب سید شبیہ الحسن صاحب نونہروی کی مجلس آراستہ ایوان کمال لکھنؤ میں انجام پائی جس میں جمیل صاحب کے اعزہ اقربا اور عمائدین شہر نے شرکت فرمائی۔ میری دعا ہے کہ راحلہ سلمہا اور ریاض مہدی سلمہٗ کی ازدواجی زندگی سدا بہار رہے۔ (نسیم انہونوی)

● میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شریف الحسن (مرحوم) کے فرزند ارجمند جاوید اقبال سلمہٗ کی شادی کے سلسلے میں جو مبشرہ حمید سلمہا (دختر نیک اختر ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صاحب) کے ہمراہ عمل میں آئی بیگم شریف الحسن صاحب نے برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ میں ۱۰ مارچ کی شام کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی جس میں اعزا اقربا کے ساتھ ہی عمائدین شہر نے بھی شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● حاجی محمد حنیف صاحب کی پوتی اور جناب شمس الدین صاحب (کمپونڈر فریدی کلینک لکھنؤ) کی دختر نیک اختر حنا پروین سلمہا کی شادی ہمراہ محمود عالم (دلپسر عبد الحق صاحب ساکن [illegible]) ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء کی شب میں شمس الدین صاحب کے مکان واقع ابن سینا روڈ لکھنؤ پر بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ [illegible]

• کلیم بکڈپو احمد آباد کے مرحوم مالک جناب جمیل کلیمی کے فرزند خالد کلیمی سلمہٗ اور عابد کلیمی سلمہٗ کی شادیاں یکم مارچ ۸۵ء کی شب میں کلیم منزل مرزاپور. موٹر کا سواد۔ احمد آباد میں بحسن وخوبی انجام پائیں۔ ۳ر مارچ کو اس سلسلے میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• فریدہ بیگم۔ (مدراس) میری چھوٹی بہن صابرہ بانو سلمہا (بنت جناب متولی ایچ عبدالصمد صاحب مرحوم ۶ اور نیشنل ہالس انڈسٹری بنگلور) کی شادی ایل اشفاق احمد سلمہٗ (ابن جناب ایل عبدالغفور صاحب بنگلور) کے ہمراہ ۳ر فروری ۸۵ء کو ۱۱½ بجے دن میں بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد وخرم رکھے۔

• فاطمہ بائی جوزف سیمن (کمبھار واڈا۔ وسائی۔ تھانہ) میرے بیٹوں اقبال اور حنیف سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادیاں بالترتیب عالیہ سلمہا (بنت مجید خاں سبحان خاں صاحب) اور خدیجہ سلمہا (بنت اے کریم صالح محمد صاحب مرحوم) ۸ر مارچ ۸۵ء بروز جمعہ بوقت ۶ بجے شام بحسن وخوبی انجام پائیں۔
اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• جمیل احمد شمسی صاحب (کانپور) کی دختر نیک اختر فرزانہ جمیل سلمہا کی شادی ہمراہ محمد نفیس شمسی سلمہٗ (ابن حاجی محمد توفیق شمسی صاحب مرحوم) اور ردانہ جمیل سلمہا کی شادی خالد نجم شمسی سلمہٗ فرزند محمد عادل صاحب شمسی) ۹ر فروری ۸۵ء بروز سنیچر صدیق نبیض بیام کا ریج کانپور میں بحسن وخوبی انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے۔
(نسیم انہونوی)

انتقال پرملال کی خبریں

• کوثر ترنم۔ مدثر انجم (آمبور) افسوس ہمارے نانا جان ریکارڈ عبدالعزیز صاحب ۱۲ر فروری ۸۵ء بروز منگل ۳ بجے شب میں کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے رحلت فرماگئے مرحوم نے اسی شب عشاء کی نماز باجماعت ادا کی تھی اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سلمیٰ کنول (گنور۔ بدایوں) میری شفیق پھوپھو نفیس فاطمہ صاحبہ ۱۵ر فروری ۸۵ء بروز جمعہ ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہیٔ عدم ہوگئیں مرحومہ بڑی خوش اخلاق اور پابند صوم وصلوٰۃ تھیں۔ حریمی بہنیں ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

(بقیہ پسندیدہ اشعار)

بزم اغیار میں کیا تجھ کو کبھی اے غافل
مجھ سے بھی پیکر حرماں کا خیال آتا ہے

مرسلہ: شہناز یوسف احمد (ترچی)

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیال رزق ہے رزاق کا خیال نہیں

مرسلہ:۔ این پروین ناز (بہری۔ مدراس)

قریب نظر

ثمینہ ممتاز

"واہ واہ! کیا بکواس ہے آتے جاتے اس منحوس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے نامراد ناہنجار کیا ڈھیٹ سا ادھر ہی نظریں رکھتا ہے بھیڑیے کی اولاد اور پھر کیسے بتیسی نکال کر مسکراتا ہے۔ بے مقصد اگر کوئی گھاس ڈالے تو پتہ نہیں کیا کرے۔"

یونہی بڑبڑاتی منہ ہی منہ میں کوستی پاؤں کو زور زور سے پٹختی گاڑی کے دروازے کو پوری قوت سے بند کر کے اسٹیرنگ کو سنبھال کر ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈال کر ڈاکٹر شہلا ہواؤں کو چیرتی یہ جا وہ جا اپنے کلینک پہ پہنچ گئی جہاں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا زندگیاں سسک رہی تھیں جن کی آنکھیں ڈاکٹر کی راہ تکتے تکتے پتھرا سی گئی تھیں۔ ایک ایک پل بھی ان کے لیے صدی کے برابر تھا۔

وہ گاڑی کی آواز پر ایسے اٹھے جیسے ان کے مسیحانے انہیں نئی زندگی کی نوید سنائی ہو۔ شہلا سلام کا جواب دیے بغیر ہاتھ کا اشارہ کرتی اپنے روم میں پہنچ گئی باری باری سب مریض آتے گئے اور اپنی اپنی درد بھری داستان سناتے گئے ڈاکٹر کی تسلی بخش باتوں اور دواؤں کو دیکھ کر نئی زندگی کی آس لگائے مریض چلے جاتے اور نئے مریض آجاتے اسی طرح شام تک تانتا بندھا رہتا۔

ڈاکٹر شہلا کا موڈ کافی خوشگوار ہو گیا تھا وہ صبح کی تلخی بھول چکی تھی اب وہ ہشاش بشاش اپنی نرسوں اور اپنے مریضوں سے ہنس ہنس کر محو گفتگو تھی شام کے پانچ بجا چاہتے تھے شہلا نے اپنا گاؤن ٹھیک کیا دوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھا بیگ اٹھایا گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل دی اپنی کوٹھی کے گیٹ کے پاس جا کر اس نے ہارن دیا فوراً نعمن بابانے بھاگ کر گیٹ کے پاس جا کر گیٹ کھولا شہلا نے گاڑی اندر لے جانے سے پہلے مڑ کر پیچھے دیکھا پھر وہی چہرہ اس کا منتظر تھا وہی مخصوص مسکراہٹ لیے آنکھوں میں ڈھیروں پیار لیے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے ادھر ہی نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"دھت تیرے لعنت ہو تیری جیسی پرواہ کیا ہے کہیں کا مجھے دیکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں الو کی اولاد کو" یک دم شہلا کا پارہ ۱۰۴ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ گیا وہ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے غصے سے تمتماتے گال لیے اندر داخل ہوئی ملازمہ نے اس کا گاؤن اور دوپٹہ لے کر سلیقے سے ہینگر میں لٹکایا بیگ ٹیبل پر رکھا اور کھانا لگانے چلی گئی شہلا نے اپنا تھکا ہارا وجود بیڈ پر گرایا اور آنکھوں کو بند کر کے دو چار ہی سانس لیے تھے جبھی ملازمہ نے کہا ڈاکٹر صاحب جی کھانا لگ گیا ہے وہ پاؤں میں ہلکی سی چپل ڈال کر خراماں خراماں ڈائننگ ٹیبل پر جا کر کھانا کھانے لگی۔

تقریباً دو ڈیڑھ ماہ ہونے کو آیا یہ روز کا یہی معمول تھا۔

ڈاکٹر شہلا کے گھر کے سامنے سڑک کے اس پار شاپنگ سینٹر تھا۔ شہلا کی کوٹھی کا ایک گیٹ تو دوسری طرف تھا جو چھوٹا تھا مگر آنے جانے کے لیے دوسرا گیٹ جو بڑا اور کشادہ تھا وہ سڑک پر تھا جو بالکل شاپنگ سینٹر کے سامنے سائیڈ پر کھلتا تھا سینٹر کی شاپس اکثر تبدیل ہوتی رہتی تھیں کاروباری لوگ جانے کہاں کہاں سے آتے اپنا کاروبار کرتے۔ کاروبار نہ چلنے کی صورت میں اکثر دکانیں بدلتی رہتی تھیں کئی ایک شاپس ایسی بھی تھیں جو عرصہ دراز سے چل رہی تھیں اور سامنے والی شاپ میں دو ایک ماہ سے کوئی شخص ریڈی میڈ گارمنٹس کا کام کرتا تھا قیمتی اور نظروں کو چکا چوند کر دینے والے عروسی جوڑے سے لے کر سلیپنگ سوٹ تک اس دکان میں تھے شہلا کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ خوبصورت لباس شہلا کی کمزوری تھی لاکھ اماں دادی لاکھ کرتیں کہ لڑکی پہلے بکس بھر بھر کپڑے ختم کرو پھر اور کپڑے خریدنا۔ مگر شہلا نے جہاں کسی نئے پرنٹ اور ڈیزائن کو دیکھا تو دم خود بخود ادھر ہی اٹھتے گئے لیکن اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی اسے یہ دکاندار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ جب اپنے کلینک جانے کے لیے روانہ ہوتی تو وہ اسے ایک ٹک دیکھے جاتا اور مسکرائے جاتا۔

شہلا کو مردوں کا اس طرح دیکھنا اور مسکرانا کبھی اچھا نہیں لگا وہ اپنی اماں کی اکلوتی اولاد تھی باپ بچپن میں

وفات پاگیا بھائی کوئی ہے نہیں سوائے ملازموں کے۔ اس نے کبھی کسی مرد سے بات نہیں کی جب میڈیکل طالبہ تھی تو اس زمانے میں بھی اس نے ہر کسی سے ضرورت سے زیادہ بات نہیں کی۔ کبھی کسی کلاس فیلو کو جرأت نہیں ہونے دیا یہ مضبوط قوت ارادی کی مالک تھی اس نے نازک سے نازک موقع پر بھی خود کو کبھی جھکنے نہیں دیا مرد حضرات کو اس سے بات کرنے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی مگر ایک یہ ہے۔ دو ٹکے کا آدمی جو مجھے دیکھ کر ہنستا ہے جانے کس گھر سے آیا ہے۔ شاید پہلی بار صنف نازک کا دیدار ہوا ہے جو باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔

یہ شخص شہلا کے لیے دردِ سر بن گیا آخر وہ کون سے راستے سے گزرے جہاں یہ کالا ڈون مجھے نظر نہ آئے وہ خود کو ملامت کرتی کہ آخر میں کیوں اسے دیکھتی ہوں میری جانے بلا۔ مگر پھر بھی نظریں غیر ارادی طور پر ادھر اٹھ جاتیں اور وہ جل بھن کر رہ جاتی۔ شہلا کا بہت دل چاہتا کہ وہ اس دکان پر جائے اور خوبصورت کپڑے خریدے مگر دکان کے مالک سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ دکان تو ایک طرف اس نے تمام شاپنگ سینٹر پر ہی جانا چھوڑ دیا۔ وہ گھر سے خوشگوار موڈ لیے نکلتی مگر ابھی گاڑی گیٹ سے باہر ہی نکلی تھی کہ وہ غصہ سے لال بھبھوکا ہو جاتی اور ہزاروں صلواتیں دل ہی دل میں سناتی کلینک اور کلینک سے گھر آجاتی یہی اس کا معمول تھا۔

شہلا بیٹی فارغ ہو تو میرے کمرے میں آنا اماں نے آواز لگائی شہلا بھاگ کر اپنی ماں کے کمرے میں گئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بھینچ بھینچ کر اس کا منہ چوم ڈالا اماں میری، میری پیاری منی سی پیاری سی پیاری اماں میں آپ کے لیے ہر وقت فارغ ہوں بتائیں کیا حکم ہے۔ پاؤں دباؤں؟ اور پھر جھٹ اماں کی ٹانگ کھینچ اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے دبانے لگی اے ہے لڑکی ڈھنگ سے بیٹھ تو کوئی بات کروں۔ ہاں ہاں آپ بات کریں میں ذرا جنت کے دروازے کھول لوں تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے آپ اپنی بات جاری رکھیں۔

شہلا میری بچی اپنے پیشے کے لحاظ سے تمہیں بہت سنجیدہ ہونا چاہیے مگر لگتا ہے ابھی تک بچپنا نہیں گیا ادھر آ میرے نزدیک بیٹھ کر میری بات سن۔

جی۔ جی میری جان اماں۔

سن بیٹی روایتی ماؤں کی طرح میں بھی تجھے یہ بات کہنے والی ہوں کہ اپنی زندگی میں تیرے ہاتھ پیلے کر دوں تیرا باپ ہے نہ کوئی بھائی میرا دم ہے جانے کب آنکھیں بند کر لوں چاہتی ہوں اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اب اگر تیری کوئی پسند ہے تو بلا جھجک بتا دے ورنہ میں تیرا رشتہ تیری پھوپھو کے بیٹے حسن سے کر دوں گی حسن جو تجھے بچپن سے پیارا ہے تمہیں معلوم ہے حسن بیٹا امریکہ سے آیا ہے تمہاری پھوپھو نے کئی بار پیغام بھیجے ہیں میں نے تمہاری رائے لینا مناسب سمجھا۔

شہلا نے سر کو جھکا کر کچھ لمحے کے توقف سے۔ ماں کو مخاطب کیا ماں جانی آپ کی شہلا ان لڑکیوں میں سے نہیں جو آوارہ خیال کو اپنے اردگرد جگہ دیتی ہیں جو آئیڈیل کی تلاش میں تمام عمر بھٹکتی رہتی ہیں جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں سب کچھ گنوا دیتی ہیں شہلا آپ کی بیٹی ہے جس نے آپ کی تربیت پائی ہو اس کے لیے بھلا انکار کی گنجائش کہاں۔ آپ نے آج تک میرے لیے جو سوچا جو کیا وہ ایک مثالی ماں کی بہترین کاوش ہے۔ مجھے اس اعلیٰ مقام پر آپ ہی نے پہنچایا اس قسمت کو کاتب آپ ہی نے بنایا میرا ماضی آپ نے سنوارا۔ میرا حال آپ کا مرہون منت ہے اب میرے مستقبل کی ڈوری بھی آپ کے ہی ہاتھ میں ہے جس سے چاہیں باندھ دیں۔

ماں نے شہلا کو پیار کیا اور اس کی فرمانبرداری پر سر بسجود ہو گئی اور پھر شہلا جلد ہی شہلا حسن بن گئی اس نے اپنی شادی کی شاپنگ ہر جگہ کی مگر سامنے ریڈی میڈ گارمنٹس والے کو دیکھا تک نہیں وہ اسے جلانے کے لیے باہر ہی گاڑی کا ہارن دیتی۔ ملازم آتا تو سب پیکنگ اسے تھما کر گاڑی اندر لے جاتی مگر وہ اللہ کا بندہ پھر بھی اسی طرح اسے والہانہ نظروں سے تکے جاتا مسکرائے جاتا۔

حسن اور شہلا کی جوڑی خوب سجی تھی خدا نے حسن کی وافر دولت دونوں کو بخشی تھی حسن امریکہ میں انجینئر تھا خوش پوش اور خوش اخلاق سا یہ انسان شہلا کی زندگی میں آکر خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا وہ ہر وقت اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ اٹھائے لاتا اس کا دل چاہتا کہ وہ بازار جائے اور بازار کی سب چیزیں شہلا کے قدموں میں لا ڈالے

آج اس کی نظر سامنے شاپنگ سنٹر کی اس دوکان پر پڑی وہ اندر آ گیا اور اتنے خوبصورت لباس دیکھے اور گھر آ کر شہلا سے بضد تھا کہ چلو میرے ساتھ تم سے وہ سامنے سنٹر میں اتنے عمدہ اور خوبصورت ڈیزائن ہیں شہلا بیگم جلدی سے چلو وہاں سے شاپنگ کریں گے مگر شہلا کو تو اس دکان پر جانا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی غنڈے آوارہ بدمعاش کے ڈیرے پر زبردستی لائی جائے نہیں نہیں حسن مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے پلیز میرے پاس ڈھیروں لباس ہیں۔

نہیں شہلا میں تمہیں اپنی پسند کے لباس لے کر دوں گا جبکہ شادی کی سب چیزیں تو ان کی پسند کی ہیں۔

مگر میں اس فضول دکان سے کچھ نہیں خریدوں گی چلنا ہے تو شہر میں اور کہیں چلیں۔

شہلا جانی، آپ جس دکان کو فضول کہہ رہی ہیں شہر کی سب سے بڑی اور خوبصورت دکان ہے۔ میں نے دو چار دن میں اندازہ لگا لیا کہ کون کون سی دکانوں میں خوبصورت چیزیں ہیں جو میری شہلا کی شایان شان ہوں۔ چلو چلو شاباش جلدی سے میں دوکاندار کو کہہ کر آیا ہوں کہ میں اپنی بیگم کو ساتھ لے کر آتا ہوں تاکہ تسلی بخش چیزیں خرید سکیں۔

حسن کے اپنے پرزور اصرار کے آگے شہلا نے ہتھیار ڈال دیے اور بادل ناخواستہ چل پڑی ہر قدم پر اسے ایک نفرت اور انجانی سی دہشت کا احساس ہو رہا تھا۔ دکان میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آیئے آیئے تشریف لایئے باجی آپ تو غالباً سامنے والی کوٹھی کی ڈاکٹر صاحبہ ہیں۔ باجی۔ باجی با... جی، با... با.... با.... جی.... جی....

شہلا کو اس لفظ سے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ دوکاندار کپڑے بھی کاؤنٹر پر پھیلاتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی خوشی کا اظہار بھی کیے جا رہا تھا۔ باجی میری بھی ایک بہن ہے۔ بالکل آپ ہی کی طرح وہ ڈاکٹر ہے تو میں نے بہت شوق سے اسے ڈاکٹر بنایا ہے.. اب وہ سعودیہ چلی گئی ہے۔ جب آپ کلینک جاتی ہیں تو میں سوچتا ہوں سعدیہ بھی ہسپتال چلی گئی ہو گی جب آپ تشریف لاتی ہیں میں کہتا ہوں میری سعدیہ بھی گھر آ گئی ہو گی بڑے غصے والی ہے جو آپ کی طرح اگر میں کہتا کہ سعدیہ مریضوں پر بھی ایسے ہی غصہ جھاڑتی ہو تو پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اب وہ اپنے خاوند کے پاس سعودیہ میں ہے جی۔ اس کا خاوند بھی ڈاکٹر ہے خدا اسے اپنے گھر خوش رکھے آپ کو بھی خدا سب خوشیاں عطا کرے ڈاکٹر باجی آپ مجھے ایسے لگتی ہیں جیسے میری سعدیہ بہن آ گئی ہے۔

"اور میرے خدا میں نے اس نیک مخلص انسان کو کن کن القاب سے نوازا میں نے اس کی مسکراہٹ اور خلوص بھری نظروں کو کتنا غلط انداز دیا"

یہ سوچتی ہوئی شہلا سامانوں سے لدی پھندی اپنے گھر میں داخل ہوئی تو سکون و اطمینان کے احساس سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

● جب زندگی گنگنا رہی ہو تو اس وقت مسکرانا آسان ہے بات تو جب بنتی ہے کہ ہم اس وقت بھی مسکراتے رہیں جب ہماری زندگی سسکیاں لے رہی ہو۔

ملا۔ اس نے دنیاوی عیش و آرام چھوڑ دیا۔ ہر طرح کی آرائش زیبائش اور رنگینی
سے خود کو الگ کر لیا۔ ہاتھ کے بنے ہوئے موٹے سوت کا سفید لباس پہن کر سفید چادر
سے خود کو ڈھک لیا۔ اس کا دل دنیا سے بیزار ہو گیا اور پھر دہلی کی ساری رونقیں
کو چھوڑ کر وہ پھر سے میوات پہنچ گئی اور قلعہ میوات ہی کے ایک سنسان گوشے میں
پناہ لے لی۔ اسی قلعہ میں اس نے ابوبکر شاہ کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔
قلعہ کے لوگ اسے نیک پاکردار پاکیزہ رحمدل عورت کے روپ میں دیکھتے آئے
تھے۔ اب اس کی سادگی اور عبادت گزاری نے اسے ان کے لیے ایک صوفیہ بنا
دیا۔ وہ اس سے متاثر بھی تھے اور مرعوب بھی لیکن اس کی زندگی میں کوئی نہیں جان
سکا کہ وہ انتقام کی آگ کا سوختہ دل لیے اپنی زندگی گزار رہی تھی اور
کبھی کبھی سوچتی تھی کہ وہ دلہن تو ایک بار بھی نہ بنی مگر بیوہ دو مرتبہ کی گئی۔
ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ قلعہ میوات میں اس صوفی منش خاتون کے مزار
پر لوگ پھول چڑھانے اور منتیں مانتے کہ پروردگار انھیں اپنے مخالف پر غلبہ
دے۔ فتح دے اور یہ منت پوری ہو جاتی تھی!

ختم شد

اس پر عنایت کیوں
کسی کی روح پر زخم لگاؤ گے۔
تو مرہم کہاں سے لاؤ گے۔
جسم پر پہرے لگاؤ گے۔
تو خیالات پرواز کر کے محبوب تک پہنچ جائیں گے۔
کہ محبت، پیار، نرمی، اور وفا و ایثار۔
لازوال حقیقتیں ہیں۔
تم ان کو کیسے جھٹلا سکتے ہو۔"

ناصر الدین شاہ دم بخود ایک شکوۂ خونچکاں سن رہا تھا۔ جبینہ نے گیت ختم
کیا تو وہ نہ واہ کر سکا نہ آہ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اسی وقت خواجہ سرا نے
اندر آنے کی اجازت طلب کی اور آ کر صرف اسی قدر کہا۔
"جہاں پناہ کے حکم کے خلاف تخلیہ میں دخل اندازی پر شرمسار ہوں اور معافی
کا خواستگار ہوں مگر سانہ سے ایک اہم خبر آئی ہے۔"
"اجازت ہے۔ ہم خبر سننے کے منتظر ہیں۔" ناصر الدین نے لیٹے لیٹے کہا۔
"سانہ کے تاریک زندان کے داروغہ کا ایلچی خبر لایا ہے کہ کل دوپہر ابوبکر بن محمد
تغلق نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ علاج کے باوجود ان کے زخم مندمل نہ ہو سکے۔"
خواجہ سرا کی آواز شبینہ کو کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اس کی زندگی
سے سب رخصت ہو چکے تھے صرف ابوبکر شاہ کی یاد باقی تھی آج وہ بھی اس کی زندگی
سے چلا گیا تھا۔ دل کے سناٹوں نے اسے بے حال کر دیا۔ ناصر الدین شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا
تھا اور اب شبینہ کا ردعمل جاننے کی کوشش کر رہا تھا پچھلے کئی ماہ سے وہ عجیب قسم کے
تذبذب کا شکار رہا تھا۔ شبینہ کو دیکھتا تو اس پر لطف و کرم کی بارش کرنے کو دل چاہتا

اور جب اس سے متعلق مردوں پر نظر ڈالتا تو مخمصے میں پھنس جاتا وہ ابھی تک
نہیں جان سکا تھا کہ شبینہ کے اسلام خاں، آدم خاں اور ابوبکر شاہ سے کیسے
تعلقات تھے۔ کبھی دل اسے بے گناہ اور معصوم سمجھتا کبھی عیار اور چالاک۔ وہ
لاکھ کوشش کرتا کہ شبینہ خود سے کسی کے بارے میں کچھ بتائے لیکن اس نے
اپنی زبان پر ہزار قفل ڈال دیے تھے اور چہرہ پتھر کر لیا تھا اب نہ آواز تھی
نہ تاثرات۔

کافی دیر تک شبینہ کے چہرے کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے اس کو واپس
جانے کی اجازت دے دی۔ شبینہ بھاری دل لیے واپس اپنی خواب گاہ میں آئی رنگین
لباس اتار کر اس نے اپنے جسم سے تمام زیورات بھی اتار دیے۔ سفید لباس پہن
کر اس نے ابوبکر شاہ سے وفاداری، محبت اور انس کا حق ادا کیا۔ وہ مغموم تھی
اس کی زندگی نے آنسوؤں ہی سے پیار نہ کر رکھا تھا مسرتوں کی طرف جانے والا
ہر راستہ غم کے اندھے کنوئیں تک جا کر ختم ہو جاتا اور وہ حسرت زدہ کھڑی
رہ جاتی۔

سادہ سفید لباس اور ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے بے نیاز چہرہ دیکھ کر
ناصر الدین نے اس سے معلوم کیا۔ کیا تمھیں ابوبکر شاہ کی موت نے زیادہ صدمہ
پہنچایا ہے۔؟ تب اس نے اسی قدر کہا۔ مظلوم انسانوں کی موت نے مجھے
ہمیشہ ملول و دل گرفتہ کیا ہے۔ یہ انسان چند روزہ زندگی میں ذرا سی ذہنی
آسودگی کے لیے دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

ناصر الدین شاہ اس کے لہجے کی اداسی اور کاٹ سے پرکھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں
کر سکا۔ ویسے بھی اسے اب شبینہ کی دلجوئی منظور تھی۔ فیروز خاں کے غلاموں سے
دشمنی اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ وہ خود اب بوڑھا ہو چکا تھا اور اس تخت شاہی

لیکن اس وقت میں تمھیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے میری بہن
نو شبینہ اور میں انتقام کی وہ آگ تھے جو تمھارے پیچھے مستقل تھی اور اس آگ نے
تمھارے جسم تمھاری طاقت اور تمھاری سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تمھاری جڑیں
کھوکھلی کیں۔ تمھارے ہر ارادے کو بھسم کیا تمھارے ارمانوں کو جھلسا دیا۔ نو شبینہ
یہ سب بتانے سے پہلے ہی قربان ہو گئی مگر میں سب کچھ سہ کر بھی زندہ رہی کہ ایک دن
تم سب کو یہ بتا سکوں کہ بے گناہوں پر ظلم کرنے کا نتیجہ کتنا عبرت ناک ہوتا ہے اور مظلوم
کی آہ کس طرح ظالم کو نیست و نابود کرتی ہے۔ ہمیں تاراج کر کے تم بھی آباد نہیں ہو اب
اس مقام سے آگے خدا کا انصاف تمھارا منتظر ہے۔ شبینہ کھڑی جلول پر ہمایوں شاہ
بے دم سا ہو کر گر پڑا اس کا دم پھول رہا تھا اور جسم کانپ رہا تھا۔ شبینہ نے کنیز کو بھیج
کر طبیب کو بلوایا اور خود واپس اپنی محلسرا میں آ گئی۔ اس کا دل کسی نرم دھنکا کی
طرح پُرسکون ہو چکا تھا جو شدید طوفانی دھاروں سے نکل کر آ گئی ہو۔

ابوبکر شاہ کے بعد اس کا دل دنیاوی عیش و عشرت شان و شوکت سے اکتا گیا تھا
عہدے اور منصب بے معنی لگنے لگے وفاداری اور جاں نثاری کے جذبے دھوکا معلوم ہوئے۔
حکومتوں کا دبدبہ اور شاہوں کا جلال، غرور و فخر اور ظلم و ستم کا ایک طویل سلسلہ تھا جو
صدیوں پر محیط تھا۔ ملک گیری کی ہوس میں انسان کا انسان پر ظلم ایک مکروہ جال محسوس
ہوا۔ وہ انسان کی بے بسی پر آزردہ رہتی۔ اس نے ماں باپ کو جس حال میں مرتے دیکھا
تھا اس وقت اس کا دل جوش انتقام سے بھر گیا تھا۔ پھر بہن کی موت نے جلتی پر
تیل کا کام کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات نے اسے ایک روشنی دی ایک انوکھی آگہی دی
اور ناصر الدین محمد کی موت کے صرف ایک ماہ بعد جب اسے ہمایوں خاں کے انتقال
کی خبر سنائی گئی تو اس کے دل میں ان کے لیے نفرت نہ تھی انتقام اور نہ محبت بلکہ صرف
انسان کی چند روزہ زندگی میں اس کی مطلق العنانی اور فرعونی صفت پر افسوس تھا۔

فیروز شاہی غلاموں کا صبر رنگ لا رہا ہے۔ ان مظلوموں کی آہیں عرش تک پہنچ چکی ہیں۔

ناصر الدین شاہ کے جسم پر کپکپی سی طاری تھی۔ شبینہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اور اس بات کے دوسرے روز ناصر الدین محمد کا انتقال ہو گیا اور ہمایوں خاں بنام ناصر الدین محمد تغلق، سکندر شاہ کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اگرچہ شبینہ اب اس سے منسوب تھی لیکن اسے ہمایوں خاں سے نہ انس تھا نہ رغبت۔ وہ بدستور گوشۂ تنہائی میں رہے جا رہی تھی۔ ہمایوں خاں سے اس کی نسبت سیاسی اغراض کے لیے طے کی گئی تھی لیکن اول فیروزی غلام منتشر ہو چکے تھے دوسرے ہمایوں خاں گھن کھائی لکڑی کی طرح کمزور اور بودا ہو چکا تھا۔ اس کا جسم اس کی عیاشیوں، رنگ رلیوں، بدکاریوں اور شراب و کباب نے کھا لیا تھا حتیٰ کہ شاہی طبیب اس کے علاج سے ہاتھ اٹھا گئے چلے گئے۔ چند ہی روز میں اسکے مرض نے شدت اختیار کر لی اور مجبور ہو کر وہ گوشہ نشین ہو گیا۔

اسکی بیماری اور کمزوری نے سب کو شیر کر دیا۔ لوگوں کے دلوں میں نہ اس کی عزت تھی نہ کوئی ڈر۔ امیر وزیر حتیٰ کہ اسکے مصاحب بھی اب اس کی طرف سے بے پرواہ ہو چکے تھے۔ اس تنہائی میں پہلی مرتبہ اسے اپنی منسوبہ کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خواہش ہوئی اب کسمپرسی میں اس کے سہارے کی خواہش ہوئی۔ اس نے کنیزوں کو حکم دیا کہ شبینہ کو دلہن بنا کر اسکے پاس لایا جائے۔ جب شبینہ اس کے پاس پہنچی تو شوق دیدار میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور شبینہ کو دیکھ کر سکتہ کی سی حالت میں رہ گیا۔ اس کے سامنے نوشینہ کھڑی تھی مگر کہیں زیادہ نزاکت حسن لیے ہوئے، رعنائی اور معصومیت کا پیکر، جمال و جلال کی تصویر بنی ہوئی۔ شبینہ اسکی پھٹی ہوئی آنکھیں اور زرد چہرہ دیکھ کر زور سے ہنس پڑی اور بولی۔ ہمایوں خاں میں منتظر تھی کہ تو مجھے کب بلائے گا۔ تیرے بابا ناصر الدین شاہ مجھے تیری دلہن بنانا چاہتے تھے تاکہ اس مملکت پر اور ہم سب پر حکومت کر سکے

پر اب ہمایوں خاں کو بٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن فیروزی غلاموں کو دشمن بنا کر یہ کام بہت مشکل تھا۔ وہ ہر طرح بدلہ لینے پر یقین رکھتے تھے۔ شبینہ کے ذریعہ ہی وہ انھیں اپنا ہمنوا بنا سکتا تھا۔

شبینہ ابوبکر شاہ کو اپنا ہم سفر مان چکی تھی۔ اس کی رفاقت کو منظور کر چکی تھی اس کی چاہت کو اپنی زندگی کی زیبائش بنا چکی تھی۔ لیکن اس کی دائمی جدائی نے شبینہ کے ہر جذبے کو شکستہ کر دیا تھا ہر آرزو پامال ہو چکی تھی۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی لیکن دل ایسی جگہ ہے جہاں خوشی بھی پوشیدہ رہتی ہے اور غم بھی اور کبھی وہاں پھول کھلتے ہیں۔ کچھ ویرانے بنتے ہیں۔ شبینہ بھی اپنے دل کے صحرا میں ماتم کناں تھی۔ ابوبکر شاہ اسے بیچ بھنور میں چھوڑ کر چپ چاپ رخصت ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ اس کا غم پورے طور پر منا بھی نہیں سکی تھی کہ ناصر الدین شاہ کے پیغام پر ششدر رہ گئی۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں پیغام لانے والے کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ ناصر الدین شاہ اس کی دلجوئی اور پچھلی مکافات کی خاطر اپنے بیٹے ہمایوں خاں سے اس کا عقد کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر امور سلطنت کے تمام اختیارات ہمایوں خاں کو سونپ کر شبینہ جیسی پڑھی لکھی سنجیدہ اور بردبار حسین لڑکی کو ہندوستان کی ملکہ کا خطاب دے گا۔ اس طرح فیروزی غلاموں پر شاہی لطف و کرم کی تجدید کر کے حسن سلوک کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرے گا۔ شبینہ سب کچھ کہہ رہی تھی لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ ہمایوں خاں حسن کا نام اس کی رگوں میں آگ بھڑکا دیتا تھا جس کے ذکر ہی سے اس کے دماغ میں بگولے اٹھنے لگتے تھے جیسے وہ اپنی بہن نوشینہ کا قاتل سمجھتی آئی تھی۔ آج اسی شخص سے رشتۂ الفت استوار کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ زندگی کے جس موڑ پر وہ کھڑی تھی وہاں انکار اور اقرار دونوں ہی مشکل تھے۔ مجبور ہو کر اس نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی جائے

مل گئی۔ اب ایک اور آزمائش اس کی منتظر تھی۔ اور اس غفلت کے عرصہ میں وہ صرف روتی رہی۔ صبر و ضبط کا اب یارا نہ تھا اور مدافعت کس کے سہارے پر کرتی پے در پے آنے والے صدموں نے اسے بے حال کر دیا تھا ہمت و حوصلہ بھی ایک حد تک ہوتا ہے۔ وہ سجدے میں گر کر خدا کی رحمت کو آواز دیتی اور اس کے آنسو سجدہ گاہ کو بھگوتے رہتے تھے۔ امید و بیم کے درمیان جھولتا انسانی وجود کبھی کبھی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں دعا دوا اور تدبیر سب کچھ چھوڑ کر خود کو قادر مطلق کے فیصلے پر چھوڑ دیتا ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں بندہ انتہائے بے بسی میں خود کو خالق کائنات رب العالمین کی ذات میں جذب کرنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔

انسان یعنی خاک کے پتلے کی بندگی کا یہ انداز اسے بہت پیارا ہے بہت عزیز ہے کہ جب وہ سراپا خود کو اللہ کے سپرد کر دے۔ اور پھر وہ اپنے اس بندے کو مایوس نہیں کرتا اس کا انصاف حرکت میں آجاتا ہے۔ شبینہ بھی اب اسی منزل پر تھی جہاں سکوت ہی میں سکون ملتا ہے۔

وقت کی رفتار بہر کچھ دیکھے گزرتی ہے۔ اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ کر ناصر الدین شاہ مطمئن ہوگیا۔ وہ ہمایوں خان کی شادی کر کے لاہور کی بغاوت دور کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا تاکہ ادھر فیروزی غلاموں کی دشمنی کا خطرہ دور ہو جائے اور بقیہ ملک میں امن و امان کا سلسلہ شروع ہو تو وہ بیٹے کی رسم تاج پوشی شان و شوکت کے ساتھ ادا کرے۔

اس نے شبینہ کو ہمایوں خان سے منسوب کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب کا اعلان کر دیا۔ تاکہ یہ بات واضح ہو جائے۔ شبینہ کی نگاہوں میں اب کوئی بات بھی غیر معمولی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کلی طور پر اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اپنے

سلسلے میں اس تقریب کی خبر نے بھی اس کے اوپر خاص اثر نہیں کیا۔ اور پھر ایک صبح مشاطائیں اس کی آرائش اور سنگھار کرنے پہنچ گئیں۔ عمدہ لباس قیمتی زیورات اور حسن افزا اجزاء کے استعمال سے وہ کچھ سے کچھ بن گئی۔ صرف اس کی آنکھوں میں وہ جذبے نہیں تھے جو اس سنگھار سے پیدا ہوتے ہیں۔ بے خواب آنکھیں ویران اور اداس تھیں اور اس اداسی نے اس کے جسمانی نکھار کو کسی قدر ماند کر دیا تھا۔ بادشاہ نے اسے ہیرے کی انگوٹھی بھیجی۔

اللہ کا انصاف شروع ہو چکا تھا۔ اچانک ہی ناصر الدین محمد کی طبیعت خراب ہو گئی۔ تمام لوگوں میں بے چینی پھیل گئی فوراً شاہی طبیب اکٹھا کر لیے گئے۔ قیمتی دوائیں تجویز ہوئیں۔ لیکن فالج کے شدید حملے نے اس کے آدھے جسم کو بے کار کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے سارے منصوبوں سمیت بستر پر پڑ گیا۔ بے حس و حرکت، مجبور، معذور۔

شبینہ اپنی تمام حشر سامانیوں سمیت اس کی مزاج پرسی کو پہنچی اور جا کر کسی مومی مجسمے کی طرح اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ناصر الدین شاہ کا سارا غرور اور اعتماد ٹوٹ چکا تھا وہ شبینہ کی صورت دیکھتا رہا جہاں اچانک ہی ایک انوکھی چمک اور توانائی پیدا ہوئی تھی۔ شبینہ نے اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالی اور بولی۔ ناصر الدین شاہ! جب تم با اختیار تھے، صحت مند تھے حکمران تھے طاقت ور تھے تب کبھی یہ سوچا تھا کہ خدا بزرگ و برتر کو اس کی قدرت ہے کہ وہ تمہیں ان چیزوں سے محروم کر دے؟ کہاں ہے تمہارا وہ زعم و کر و فر وہ غرور۔ ناصر الدین محمد تغلق! میں پچھلے دنوں یہ سوچنے لگی تھی کہ کیا خدائے واحد کی کیا یہی آزمائش بھی کر سکتا ہے کہ اس کا ایمان متزلزل ہونے لگے لیکن شکر ہے خدائے ذوالجلال کا کہ اس نے مجھے تمہارے گناہ کی اس ذلت سے بچا لیا اور اب تم تیار ہو جاؤ اس حساب کتاب کے لیے جواب تمہیں خدا کے سامنے دینا ہے۔

ذرا آپ یہ دیکھئے کہ ان جیسے انسان کے لیے جذبات سے متاثر ہو کر کچھ کہنا بہت آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل۔ کیا آپ انھیں کلبوں میں ڈھونڈھتے پھرتے تھے؟"

"ہاں" مردہ آواز میں شباہت نے کہا: "صرف کلبوں میں۔ بلکہ خدا معاف کرے۔ میں تو بائی جی قسم کی خواتین کے کوٹھوں پر بھی جھانک آیا ہوں۔ کیا خیال کیا ہوگا ان عورتوں نے۔ اُف توہ۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ جب میں بڑی تیزی سے زینہ اتر رہا تھا تو میں نے ایک قہقہہ اپنے پیچھے سنا تھا!"

عظمت کو ہنسی آگئی: "اچھا آیئے۔ چلتے ہیں ان کے پاس!"

"میری تگ و دو کا حال مت بیان کرنا!"

"بالکل نہیں"

شباہت نے کمرے میں قدم رکھا اور بھاری کراہیں سنیں۔ عجیب سی کراہیں تھیں۔ درد آلود مگر یہ کتاں سی۔!

"کون۔ شباہت؟" الیاس نے سر اٹھایا اور پھر تکیے پر گر گئے: "بیٹا کہاں تھے۔ اب آئے ہو۔ میں بہت پریشان ہو رہا تھا۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں۔۔!؟"

"پہلے آپ ایک انجکشن لے لیجئے۔!" عظمت نے دخل دیا: "کچھ کھایا پیا ہے آپ نے؟"

"کہاں!" اماں نے لقمہ دیا: "ہزار ہزار بہو اور ماریہ کہہ کے تھک گئیں۔ نہ ایک قطرہ دودھ پیا نہ چائے کافی۔ شباہت ہی کے انتظار میں بھوکے سوکھتے رہے۔ بخار بڑھا لیا۔ یہ وقت آیا ہے۔!"

شباہت ان کے پہلو میں آبیٹھے اور بے حد پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔ اور بے حد محبت سے پوچھا۔

"کیوں۔ الیاس۔ کیا بات ہے؟ صبح تک تو تم بالکل اچھے تھے۔ یکایک۔

ماریہ کا مسئلہ پھر بھی رہا جاتا ہے!" شباہت نے دبی زبان سے کہا۔ اس کا مسئلہ تو کب کا حل ہو چکا ہوتا: الیاس نے آہ بھر کر کہا: "شادی سے ایک ہی روز پہلے تو میرے گھر میں قیامت آئی۔ اگر وہ سیٹھ کرمانی صاحب اور ان کے نام نہاد صاحبزادے کتنے واہیات نکلے۔ پھر اس طرف رخ ہی نہ کیا!"

"ماریہ کی شادی تم کرنا تو چاہتے ہو نا!؟"

"ارے بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" الیاس احمد نے جلدی سے کہا: "آج مجھے کوئی اچھا آدمی ملے۔ میں اس کے ہاتھ میں ماریہ کا ہاتھ تھما دوں!"

"اپنے اس دوست کا ہاتھ قبول کر لو۔ اگر اچھا آدمی سمجھتے ہو!"

"کیا۔؟" الیاس احمد نے حیرت اور مسرت سے منہ کھول دیا۔ آنکھیں پھیلا دیں۔

"واقعی؟" وہ بس یہی بول سکے!۔

"ہاں!" ایک دلفریب مسکراہٹ شباہت کے خوشنما لبوں پر بکھر گئی: "اماں کے سامنے کوئی بہانہ کارگر نہیں ہو رہا ہے۔ انھوں نے الٹی میٹم دے رکھا ہے کہ یا تو میں شادی پر رضامند ہو جاؤں یا تو وہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنی جان کے پاس چلی جائیں گی!۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں سچ مچ نہ چلی جائیں! اماں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا!"

"تم نے اپنا فیصلہ اماں کو سنا دیا؟"

"نہیں۔ پہلے تم سے پوچھنا چاہتا تھا!"

"قبول کیا میں نے تمہارا ہاتھ شباہت!" فرط جذبات سے مغلوب ہو کر الیاس احمد نے شباہت کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ان پر بڑی گرمجوشی سے بوسہ دیا!۔ دفعتاً اندر سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی لڑائی ہو رہی ہو۔۔۔

(باقی آئندہ)

بخار کیسے آگیا ہے ؟۔

شباہت!؟" الیاس رونے لگے!۔

روتے کیوں ہو۔ بھائی۔ کیا بہت تکلیف ہے!"

شباہت!" گریۂ بے اختیار میں شدت آگئی!۔

" نہ رو۔ الیاس۔ میرے بھائی۔ صبر کرو!" انھوں نے ان کے آنسو پونچھے۔

شباہت! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں" الیاس نے گلوگیر آواز میں لوٹتے ہوئے لہجے میں کہا" تم میرے دوست ہو۔ میرے بھائی ہو۔ میں نے تمھاری بات نہیں مانی اور اپنی دھن میں بجانے کیسی کیسی کفر آمیز بکواس کرتا رہا تمھارے روکتے روکتے گھر سے چلا گیا۔ باہر جاکے مجھے بڑا افسوس ہوا پھر مجھے کچوکے دینے لگا! دل نے مجھے تائب کیا۔ شباہت میں نے سوچا۔ میں بڑا سطحی۔ بڑا کم ظرف ہوں اتنے معمولی سے غم پر میں خدا سے خفا ہوگیا ہوں۔ اور اپنے ان پیغمبروں کو بھول گیا ہوں جو سزا مچھلی کے پیٹ میں رہے ہیں۔ آرے سے چروائے گئے ہیں۔ سولی پر چڑھائے گئے ہیں۔ تپتی ریت پر بھوکے پیاسے شہید کیے گئے ہیں پھر میں کانپنے لگا۔ اور خدا سے معافی مانگ کر اسی وقت گھر واپس آگیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم کہیں چلے گئے ہو۔ میں تم سے بھی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ مگر تم نہیں آئے۔ راہ تکتے تکتے مجھے بخار آگیا۔ میں ڈر گیا کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو۔ بس۔ اس جانکنی خیال نے میری بھوک پیاس ختم کردی۔ شباہت میں اکیلا ہوں۔ پریشان ہوں۔ میری بکواس کو بھول جاؤ۔ معاف کردو مجھے۔ خفا ہو مجھ سے۔!"

شباہت کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ مگر وہ ہنستے ہوئے بولے" میں تم سے بالکل خفا نہیں۔ میرے بھائی تم بڑے بیوقوف ہو۔ اتنی سی بات کا اتنا اثر

بارے میں بات چیت کی جائے!" شباہت نے دبی زبان سے کہا۔

ان کی صاحبزادی۔! یعنی۔ رضوانہ۔ وہی ہے نا؟" الیاس نے تعجب سے کہا" وہی"

سعید صاحب اور ان کے مختصر سے کنبہ سے میں اچھی طرح واقف ہوں"

یہ اور بھی اچھی بات ہے۔!

مگر۔ خود۔ رضوانہ۔!؟" الیاس کچھ سوچنے لگے!۔

کیا جواب دوں اماں کو۔!؟" شباہت نے پوچھا۔

شباہت۔ کیا واقعی تم رضوانہ کے حق میں دستبردار ہوجاؤ گے؟۔

کیا مطلب!؟" بے انتہا حیرت سے شباہت نے پوچھا" رضوانہ پر میرا حق کون سا ہے۔؟ تم کیا کہہ رہے ہو الیاس!؟"

سنو بھائی۔ ایک مرتبہ رضوانہ۔ مرحوم سکینہ سے تمھاری محبت اور تعلق خاطر کا حال کہہ رہی تھی!۔ اتفاقاً میں نے ان کی باتیں سن لیں" الیاس احمد نے کہا" میں نے ان واہی تباہی گفتگو پر دھیان نہ دیا۔ اور نہ یہ سوچا کہ شاید تم بھی۔ مگر رضوانہ بیگم خود۔ ان کی وہ نظریں میں نے تاڑ کی ہیں جو تم پر پڑتی ہیں۔ کیا واقعی تم اس کے خیط سے لاعلم ہو۔؟!"

استغفراللہ۔ حماقت کی انتہا ہے" شباہت نے منہ بناکر کہا" مجھے بیشمار لڑکیاں اور خواتین روز ملتی ہیں۔ کچھ سے رسمی سی صاحب سلامت ہے کچھ زیادہ بے تکلفی اختیار کرلیتی ہیں۔ اس کا مطلب قطعی وہ نہیں۔ جو تم نے نکالا خیر۔ ارے گولی" الیاس نے کہا" اور بھئی۔ سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ میں خود کو تمھارے احسانات کے سپرد کرچکا ہے۔ جیسا چاہو۔ مجھ سے سلوک کرو۔!"

لیا کہ بخار بلا لیا۔ اچھا اب اٹھ کے بیٹھو۔ انجکشن لو اور اپنے اس بخار کو بھگا دو!"

تم مجھ سے ناراض ہو کے گھر سے چلے گئے تھے نا؟" الیاس نے پوچھا۔
نہیں۔ بالکل نہیں۔!"

میں بتا دوں آپ کہاں تھے!" عظمت نے کہا۔
"ارے ارے۔!" شباہت نے جلدی سے کہا۔
بتا دو۔ تمھیں میری قسم بتا دو۔!" الیاس گڑگڑائے۔
شہر کے سارے کلبوں میں آپ کو تلاش کرتے رہے" عظمت نے کہہ دیا۔
نہیں!" حیرت کے مارے الیاس اٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شباہت کو تکنے لگے!

ہاں بھائی۔ دل نہ مانا!" شباہت کو اعتراف کرنا پڑا۔
"ہرگز نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں جاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی کلب کا نام بھی نہ لوں گا!" الیاس دفور جذبات سے بوکھلائے جا رہے تھے عظمت نے ان کی روانی گفتار پر بند باندھا۔ اور نوشابہ کا لایا ہوا دودھ کا گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔ انجکشن کے بعد الیاس احمد پر غنودگی طاری ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد وہ بے خبر سو گئے!

اس رات کو کھانا انھوں نے بارہ بجے کے قریب کھایا۔ وہ سب لوگ طعام خانے ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تذکرہ اماں ہی نے چھیڑا۔ وہ متوحش سی تھیں۔ بولیں۔

مجھے تو بہم جڑھنا ہے۔ آج بخار آیا۔ عظمت نے انجکشن دے دیا۔ کل کو کوئی اور بیماری بھی دبوچ سکتی ہے۔ ہر وقت ہم ہی لوگ اس دکھیا کو کہاں

تم ایک بار پھر گھر بسا لو!۔ اور ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایمان لاؤ کہ جو شخص تمھیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔! اس کی یاد، اس کی یاد میں رونا۔ پاگل ہو جانا۔ سب بے کار ہے۔ جب تک دنیا میں رہنا ہے۔ دنیا داری کرنی پڑتی ہے۔ تمھارے سامنے بچوں کا مستقبل ہے۔ تمھارے سوا ان کی صحیح تربیت کوئی نہیں کر سکتا۔ تمھاری سی محبت بھی کوئی انھیں نہیں دے سکتا۔ یہ سب وہم ہے کہ تمھارے بچوں کو اماں یا نوشابہ اپنا لیں گی۔ نہیں۔ الیاس اس خیال خام کو دل سے نکالو۔ اماں ضعیف ہیں۔ اور کل کلاں کو عظمت کے اپنے بچے ہو جائیں گے!۔ تم یہ برداشت نہ کر دگے اگر عظمت یا نوشابہ نے انھیں ایک بار بھی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لیا۔! لہٰذا ابھی سویرا ہے۔ بچے چھوٹے ہیں۔ جس ہستی سے مانوس کراؤ گے۔ مانوس ہو جائیں گے۔! اس کے علاوہ تمھیں اپنی پہاڑ سی زندگی گزارنی ہے۔ تمھارے سامنے اس کا مسئلہ ہے۔ اس لیے میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ ان کے ان ملی دلچسپیوں سے ہٹ کر ٹھوس طریق کار اختیار کرو۔ میں ہر طرح تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں!"

الیاس احمد نے سوچتے ہوئے کہا: "تم نے جو کچھ کہا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ ابھی اس دن اماں نے بھی ایسے ہی دلائل پیش کیے تھے۔ میں نے انھیں جواب دیا تھا کہ شباہت سے پوچھ کر آپ سے کچھ عرض کر سکوں گا!! اور اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ۔ میں گھر بساؤں تو کیونکر۔ کوئی خاتون میری نظروں میں نہیں ہیں۔ کوئی ایسی درد مند، رحمدل اور مخلص خاتون۔ جو مجھے اپنی محبت اور توجہ دیں چاہے نہ دیں۔ مگر میرے بچوں کو ماں کی ممتا ضرور دیں!" اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم راضی ہو سکو تو سید صاحب کی صاحبزادی کے

کی طلب ختم ہو چکی تھی۔ کلب، شراب، ریس، قمار بازی کا ارادہ کرنے والے نے بالکل اس کے برعکس پروگرام بنا رکھا تھا!

اب پنجوقتہ نمازیں شروع کر دی تھیں۔ باقاعدہ تلاوت کرتے تھے اور عشا کے بعد ہاتھ میں تسبیح نظر آتی تھی! وجاہت نے پیش گوئی کر دی تھی کہ اسی سال کے آخر تک الیاس احمد ڈاڑھی بھی رکھ لیں گے! شاید پیری مریدی کا کام شروع کر دیں۔

ان کے اس طرح بدل جانے سے شباہت بہت خوش ہوئے تھے! الیاس احمد پچھلی زندگی کی طرف لوٹنا چاہتے تھے۔ شباہت سے کہا: "اگر برا نہ مانو تو اب مجھے اجازت دو! اتنے دن رہ لیا تمہارے ہاں۔ عید منائی۔ اچھے دن گزارے مگر کب تک۔ مدتوں سے گھر بند پڑا ہے۔ ایک بار بھی تو وہاں نہیں گیا!! نجانے اندر کمروں کا کیا حال ہوگا۔ دیکھ آؤں!"

"میں تو برا نہیں مانتا۔ مگر تم بہت برے ہو جاؤ گے وہاں جا کے۔ پھر پچھلی یادیں ہوں گی۔ پھر وحشت ستائے گی، پھر تم اس زندگی سے فرار ڈھونڈو گے اور تب۔ میں تمہارے پاس نہیں ہوں گا! میں تم سے دور اور مجبور رہوں گا۔ پریشان ہوا کروں گا کہ اس وقت نجانے تم کس حال میں ہو گے۔ کیا کر رہے ہو گے۔ ! میرا دل نہ لگے گا!"

"تو شباہت بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ زندگی گزارنے کا کوئی لائحہ عمل کوئی نصب العین بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بس اسی کے مطابق زندگی گزارتا چلا جاؤں گا!"

"نصب العین تو ہے۔ اگر تم مانو!"

"کہو!"

ملیں گے! اور پھر وہ سوا کے لیے بارہا یہاں رہیں گے کا ہے کے لیے۔؟ میں تو ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ میاں پھر گھر بساؤ۔ ابھی عمر ہی کیا ہے! اکیلا آدمی ننھے ننھے بچوں کا ساتھ۔ جوان بہن کی ذمہ داری سر پر۔ آخر یوں ہی کیسے گزرے گی۔ آج کے بیکار خیالوں نے یہ حال کیا ہے۔ اب تو ایسے ہی اندھا دھند خیال دماغ میں گھر بنالیں گے۔ اے اور کیا خالی گھر خالی دماغ شیطان کا گھر۔ شباہت۔ تم ان کے دوست ہو۔ اچھی طرح سمجھاؤ۔ اگر وہ راضی ہو جائیں تو اللہ رکھے اپنے خاندان ہی میں لڑکیاں بہت سی ہیں ایک سے ایک گن ڈھنگ۔ گھر بس جائے گا۔!"

اچھا اماں۔ میں ان سے تذکرہ کروں گا۔ ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو" شباہت نے کہا۔ اور کچھ سوچنے لگے۔ اماں انھیں گھورنے لگیں۔ شباہت نے سر اٹھایا اور اماں کو گھورتے دیکھ کر گھبرا گئے۔!

وہ پھٹ پڑیں: "الیاس کو سمجھاؤ گے، مناؤ گے۔ اور خود اپنے لیے کچھ نہ سوچو گے۔

ماشاءاللہ تیس اوپر پانچ سال عمر ہو رہی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا کتابوں میں کھو دیے دیے ہی سر سفید ہو جائے گا! نہیں۔ آج مجھے بتاؤ کہ آخر تم نے اپنے لیے سوچا کیا ہے؟ ہمیشہ ایڈی بینڈی باتیں کرکے بگوڑی اماں کو بہلا دیا کرتے ہو۔ آج تو میں تم سے ایک جواب لیے بغیر نہ رہوں گی! بتاؤ۔"

ہاں۔ بھائی جان۔ یہ کچھ نامناسب سے لگتا ہے" عظمت نے کہا: "اماں بار بار آپ کی خوشامد کرتی ہیں۔ آپ کے گریز و اجتناب کی کوئی وجہ ہو تو بتایئے"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" شباہت نے جواب دیا۔

کاہے کی کسی نگوڑی بلائے بے درماں کو تو پسند نہیں کر لیا" اماں نے لاکا ما۔

انھوں نے تم سے کہا تھا کہ تم انھیں پسند ہو؟۔
وہ کیوں کہتے!۔
"پھر تم ان پر کیوں لٹو ہو رہی ہو؟۔ میں نے تو دیکھا ہے کہ مارے غرور کے وہ کسی سے سیدھے منہ بولتے نہیں ہیں۔ تمھیں یہ الہام کہاں سے ہوا کہ وہ تم کو پسند کر کے اپنے خاندان میں شامل کر لیں گے۔!"
"میں ان کے خاندان میں شامل ہونا نہیں چاہتی!۔
لڑکی۔ حواسوں پر تو اثر نہیں ہو گیا۔ کیسی بیہودہ بکواس کر رہی ہے" ان کی یاد میں میں یونہی ساری عمر گزارنا چاہتی ہوں۔ میں شادی وادی بچوں وچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے ایک اتنا نوی زندگی گزارتے دیکھئے!۔ انسان اپنے خیالوں کے سہارے بھی پہاڑ سی زندگی بسر کر ہی لیتا ہے"۔
"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" بیگم حیران رہ گئیں۔
"آپ خاموش رہیے امی!" عمرانہ نے جل کر کہا" ان سے ابا جان ہی بات کر لیں گے!۔ آیئے چلیں۔!"
سید صاحب کہیں چلے گئے تھے۔ بیگم نماز پڑھنے اپنے کمرے میں آ گئیں۔ عمرانہ کچن میں چلی گئی۔ رضوانہ نے باہر جھانکا۔ سڑک پر آ کر رکشا کیا اس پر بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئی؟۔

الیاس احمد نے حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں شاہت کو دیکھا۔ جیسے ان کی آنکھوں سے سچائی پڑھنا چاہتے ہوں۔ اب وہ ٹھیک تھے۔ ان

کالج میں بلا ہے بے ڈر ہاں نہیں اچھی لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں" شاہت مسکرانے لگے!۔
"تو میرا شبہ صحیح ہے کیا؟" اماں کا رنگ بے رنگ ہونے لگا!۔
"جی بالکل نہیں"
"سن لو میاں کہ مجھے کالج کی پڑھی ہوا ایک منٹ کو بھی نہیں چاہیے"
"تو پھر یہ آپ نوشابہ کو کیسے لے آئیں؟" شاہت نے کہا۔ اور ایک طرف عظمت گڑبڑا گئے تو دوسری طرف نوشابہ بوکھلا گئی!۔ اماں نے حیران ہو کر کہا۔
"نوشابہ کو کیسے لے آئی۔ کیا مطلب ہوا"
"ارے بھائی جان میں نے تو صنعت و حرفت کے کالج سے سند لی ہے" نوشابہ بدحواسی کے مارے کھڑی ہو کر اس طرح بولی ہے کہ عظمت کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ شاہت بھی معاملہ سمجھ کر مسکرائے۔ اماں نے نوشابہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔
"میری بچی گن ونتی ہے۔ اللہ اس کی مانگ افشاں سے گودی بچوں سے بھر دے۔ مجھے تو اس نے ایک طرف بٹھال ہی دیا ہے۔ فجر سے لے کر رات تک ایک پاؤں پر پھرا کرتی ہے۔ سلیقہ، طریقہ ایسا کہ کیا مجال گھر کی ایک چیز تو بے ٹھکانے ہو جائے۔ وقت وقت سے کھانا چائے لے لو۔ گھر دیکھو تو چندن بنا ہے۔ زبان کی ایسی میٹھی کہ بات کرے تو منہ سے شہد ٹپکے۔! یہ گرہست لڑکیوں کا چلن ہے۔ نگوڑ مارے کالج کی پڑھی ہوتی تو اسے بناؤ سنگھار ہی سے فرصت نہ ملتی۔ نہ بڈھی ساس کا ادب کرتی نہ میاں کی خدمت۔ چھوٹا سا بٹوہ کہنی میں لٹکاتی اور چلی جاتی کرکٹ کھیلنے۔!"
نوشابہ سر جھکائے بدقت ہنسی روک رہی تھی! عظمت بھی جب ہنسی نہ روک

سکے تو بولے۔

اماں، آپ نے پرانی بہو کی تعریف شروع کر دی۔ نئی بہو کے بارے میں کچھ ذرا سی تھیں۔ اب بھائی جان کو سستا مت چھوڑیے! کہیں نہ کہیں دیکھ کر میری بھابی کو لے ہی آئیے!"

اب تمہی لوگ دیکھو گے بیٹا۔ ان کی مرضی پسند کی لڑکی میں کہاں ڈھونڈتی پھروں گی!

پہلے آپ الیاس کا معاملہ دیکھئے۔ میری کوئی جلدی نہیں: شباہت یہ کہہ کر اٹھ گئے! اماں بھی نکل کر چلی گئیں۔

خوب تم نے اماں کو شیشے میں اتارا ہے" عظمت نے نوشابہ سے کہا۔ شباہت صاحب کے لیے ایک آئیڈیل صاحبزادی کہاں تلاش کی جائے گی" ماریہ نے حیرت سے کہا۔

کہیں آس پاس ڈھونڈ لیں گے!" عظمت نے ہنستے ہوئے کہا۔ سچ بتائیے نا۔ انھوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" ماریہ بولی۔

اس سوال کا جواب ہمی کو آج تک نہیں ملا" عظمت نے کہا۔

کسی سے محبت کرتے ہیں کیا؟" ماریہ نے دبی زبان میں نوشابہ سے پوچھا

ایک دن ان سے پوچھ دیکھو!" نوشابہ بولی۔

کتنے اچھے آدمی ہیں۔ صورت میں بے مثال، علمیت قابلیت میں منفرد جو ہستی ان سے منسوب ہوگی۔ وہ کتنی خوش نصیب ہوگی"

ادھر کئی دنوں سے خفیہ طور پر سب بھائی بھاوج اور اماں میں یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ اگر شباہت راضی ہوں تو ان کے آگے ماریہ اور رضوانہ کے نام رکھے جائیں۔ دونوں لڑکیاں اچھے خاندان کی، اور شریف تھیں۔ اماں کو ماریہ زیادہ

اور خود کو قابو میں کرنے کے لیے پیٹھ پیچھے ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے!۔

بیگم نے رضوانہ پر لعنت ملامت کی بارش کر دی۔ کوئی بات کہنے سے اٹھا نہ رکھی۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ پھر بیگم نے نرمی اور محبت سے اسے سمجھایا۔ منایا۔ پیار کیا اور درخواست کی کہ وہ ان دونوں کی "ناکوں" سے نہ کھیلے۔ مشرقی حیا دار بیٹی کی طرح باپ کی مرضی پر سر جھکا دے!۔

آپ لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو ہوتا" وہ منمنائی! ناشاد۔ کیا سچ مچ خود کو بونڈہ سمجھ رہی ہے" وہ بھپر گئیں" باپ تیرے سامنے بیٹھ کر پوچھتا کہ بیٹی تیرے لیے خصم چنتا ہے۔ تجھے پسند ہے کہ نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ یہ ڈھٹائی بے حیائی اور دیدہ دلیری تجھ میں آئی کہاں سے ہے؟۔ رضوانہ۔ اب بھی وقت ہے۔ مان جا۔ ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ ہم کتنے برباد ہوں گے۔ باپ کا غصہ کیا تجھ سے پوشیدہ ہے"

وہ لڑکا مجھے پسند نہیں ہے" رضوانہ بولی۔

امی۔ ان کی آنکھوں پر شباہت صاحب کی محبت کی پٹی بندھی ہے ان کے دماغ میں وہی گھسے ہیں" عمرانہ بھی خفا ہی تھی۔ بگڑ کر بولی— "آپ ان سے یہ پوچھیے کہ یہ ذرہ ہو کر آفتاب کی برابری کیوں کر رہی ہیں؟ شباہت صاحب!" بیگم نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں" ارے وہ کہاں ہم کہاں بیٹی۔ کیا سچ مچ اس کا بھیجا الٹ گیا ہے؟" پھر انھوں نے اس سے پوچھا" تم ان سے ملی تھیں کیا؟۔

ہاں!۔

کب؟"

تھوڑے دن ہوئے!۔

بیٹھا بسرمت بنا۔ کہہ دے صاف صاف جو کچھ کہنا چاہتی ہے!"

سید صاحب کی آواز ان کے تن و توش کے اعتبار سے خوب گونجدار اور بھاری تھی۔ اب تو وہ غصے میں بھی تھے۔ لہذا ان کی دہاڑ چنگھاڑ سے دالان گونجنے لگا تھا!

عذرا نہ ایک گوشے میں دبک گئی! اور رضوانہ کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چہرہ زرد۔ بدن سرد۔ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بیگم سید نے ایک ملامت خیز نظر اس پر ڈالی اور بولیں: "اسی لیے کہتی تھی کہ تنکے کو شہتیر اور رائی کو پربت نہ بنایئے۔ لڑکی ذات ہے اسے لڑکی ہی بن کر رہنے دیجیے۔ آپ نے اسے لڑکا بنایا تھا۔ اب دیکھیے وہ لڑکوں کے لب و لہجہ میں بول رہی ہے! آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے۔ پوچھیے اپنے صاحبزادے سے کہ وہ اسے کیا سمجھتے ہیں:"

"ذبح کر دوں گا" سید صاحب قہر آلود نگاہوں سے رضوانہ کو گھورتے ہوئے بولے "لڑکا بنایا تھا اس لیے کہ زندگی کی دوڑ میں حصہ لے سکے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں بہتر اندازے کر سکے۔ برے وقت پر گھبرا نہ جائے، اس کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ ماں باپ کی عزت سے کھیلے۔ ماں باپ کے چہروں پر کالک تھوپے۔ اپنے شرمناک عشق کی داستان سنائے" پھر وہ غرائے "بیگم! میں صرف آج کی رات کی مہلت دیتا ہوں۔ اس سے پوچھ کر یہ کیا چاہتی ہے۔ مجھے صبح تک جواب مل جانا چاہیے۔ ورنہ تم مجھے جانتی ہو۔ اپنی تذلیل پر میں جان بھی دے دوں گا۔ اس بدمعاش کی جان لے بھی لوں گا۔"

وہ غصے سے دھاڑ کرتے ہوئے باہر دیوان خانے میں چلے گئے

پسند تھی۔ اس کا غم دیکھے ہوئے تھیں اور چاہتی تھیں کہ اسے اپنی بہو بنا کر اس کے سارے دکھوں کا مداوا کر دیں۔ لیکن بڑا سوال وجاہت سے تذکرہ کرنے اور ماریہ کو آگاہ کرنے کا تھا! وجاہت کی سنجیدگی اور تنہائی پسندی ان کے لیے مصیبت تھی تو ماریہ کی طبیعت سے بھی الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ جتنی شوخ و شریر اور چلبلی تھی اب اس قدر خاموش، تنہائی پسند اور گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ نوشابہ کا خیال تھا کہ وہ ایک اچھی بیوی نہ بن سکے گی! کیونکہ وہ وجاہت کی مزاج آشنا نہیں تھی!

"اچھا تو پھر تمہاری واحد سہیلی رضوانہ کیا بری ہے" عظمت نے کہا: "وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ بھائی صاحب کی بہت زبردست فین بھی ہیں۔ بھائی صاحب اگر راضی ہو جائیں تو پھر رضوانہ کے والد صاحب سے درخواست کی جائے!"

"مجھے رضوانہ پسند نہیں" اماں نے صاف کہہ دیا: "برسوں سے اسے جانتی ہوں۔ مگر سوائے کتابوں کے آج تک اس کے منہ سے کوئی بات سلیقے کی نہیں سنی۔ نہ وہ کبھی باورچی خانے میں گئی۔ معاف کرو۔ مجھے اپنے گھر کو لائبریری بنانا نہیں ہے!"

ان لوگوں کو پتہ نہ تھا کہ رضوانہ کی بات چیت چل رہی تھی۔ نہ کبھی رضوانہ نے نوشابہ سے تذکرہ کیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ سب مہمل ہے۔ وہ جب چاہے گی، انکار کر دے گی! گھر میں ہونے والے تذکروں کو وہ بڑے استغنا سے سنتی اور کچھ اہمیت نہ دیتی۔

لیکن سید صاحب کو ہونے والے داماد صاحب پسند آگئے! اور انھوں نے مزید معلومات کے لیے ایک دن وجاہت سے رجوع کیا۔ وہ بھی اسی قسم کی فیکٹری سے منسلک تھے؟ اور شاید جانتے بھی تھے کہ وہ صاحبزادے کہاں برسر روزگار ہیں!

انھوں نے سید صاحب کو اطمینان دلا دیا۔ اور اپنی طرف سے بھی کہہ دیا کہ

رشتہ اچھا ہے۔ انکار نہ کیا جائے!۔

اسی شام کو سعید صاحب نے لڑکے والوں کو اپنی منظوری دے کر گھر میں بھی خوشخبری سنا دی۔ ابولے۔

لڑکی کا معاملہ ہے۔ شادی کی صبح تک تیاریاں ختم ہونے میں نہیں آئیں! بس اب خریداری شروع ہی کر دو! دن کتنے رہ گئے ہیں:

بیوی کی باچھیں کھل گئیں: میں نے تو برسوں سے سارا سامان دونوں لڑکیوں کا جوڑ رکھا ہے۔ کپڑے زیور، برتن سب اللہ کے دیے موجود ہیں فرنیچر اور معمولی سامان خرید لائیں گے!:

دوسرے روز سعید صاحب معہ بیوی کے شوپنگ کرنے چلے گئے!۔ رضوانہ جو خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھی! عمرانہ سے بولی۔

"ابا جان نے مجھے بھی پانچ برس پہلے کی رہ گئی ہوئی رکھ رکھا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکیل تھما دی۔ گائے ادھر ہی چلی گئی۔! میں نہیں چاہتی کہ عین وقت پر ان کی سبکی ہو۔ وہ خاندانوں میں ذلیل ہوں اور سب لوگ کچھ پر انگلیاں اٹھائیں۔! لہٰذا تم ابا جان سے کہہ دو کہ اب بھی وقت ہے۔ ان کم بختوں کے ہاں انکار میں جواب کہلا بھیجیں۔ مجھے شادی وادی نہیں کرنی ہے۔!"

عمرانہ کو غصہ آ گیا: تمہارے دماغ میں شاہت صاحب گھسے ہوئے ہیں۔ جانے تم کن ہواؤں میں ہو۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم شاہت صاحب کو رام کر سکوگی!۔ ارے وہ جنات ہے۔ آدمی نہیں ہے۔ تمہاری طرف رخ بھی نہ کرے گا۔ اسے اپنی شکل و صورت کا بڑا غرور ہے۔ تم ان کے پاسنگ بھی نہیں ہو۔ اس خناس کو دماغ سے نکالو۔ ابا جان کی مرضی پر سر جھکا لو پا گلنی ہوں کہ اپنا دھڑکا رہو گی نہ ادھر کی!"

اپنی منحوس پیش گوئی رہنے دو!: رضوانہ بھی بگڑ گئی!: تم کچھ جانتی بوجھتی ہو نہیں نصیحت کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ تمھیں کیا معلوم کہ کیسے بڑے جن کو میں نے بوتل میں اتار لیا ہے۔ میرا آئیڈیل۔ میرے محبوب شاہت صاحب اگر مجھے نہیں ملیں گے۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ دنیا بھر کے مردوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں کسی کو بھی اپنے قابل نہیں سمجھتی!:

پاگل مت بنو آپا۔!" عمرانہ نے کہا: شاہت صاحب کو بھول جاؤ۔ بھلا کہاں وہ ہیں اور کہاں تم ہو۔ عرش و فرش کا فاصلہ تم دونوں میں ہے.... کیا تم اپنی توہین بھول گئیں۔ دستخط تک انھوں نے دینے گوارہ نہ کیے تھے۔ اپنی ہستی تمہاری خدمت میں کیونکر پیش کر دیں گے؟:

میں نہیں کہتی کہ وہ اپنی ہستی کو کشتی میں سجا کے میری خدمت میں پیش کر دیں!:

تو پھر۔ میرا بائی کی سی جوگن ہو گی کیا؟:

انھیں دیکھنا، ان کی یاد و محبت میں زندگی گزار دینا ہی میری عبادت ہے!۔

پچ مچ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔!

تم سے کوئی مطلب نہیں۔ تم میرا کہا ابا جان اور امی سے دہرا دو اور بس مجھے اور شاہت صاحب کو اپنے اپنے حالوں پر چھوڑ دو!۔

عین اسی وقت ایک گرجدار آواز آئی: بدتمیز گستاخ۔ بے ادب لڑکی۔ تجھے پال پوس کر اسی لیے ہاتھ منھ کا کیا ہے کہ تو آج ہماری ناک کٹوا دینے پر تل جائے۔ ہمیں بدنام کر دے۔ ہمیں رسوائیوں کو گلے لگا کر زندہ رہنے پر مجبور کرے!۔ میں نے تیری تمام شرمناک باتیں سن لی ہیں۔ عمرانہ کو اپنا قاصد اور

HAREEM

ایک طرف تو وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اب لوگ بسوں اور ریلوں جیسی تیز رفتار سواریوں پر بھی قناعت نہ کر کے ہوائی جہازوں سے سفر کرنے لگے ہیں، لیکن تقاریب وغیرہ کے سلسلے میں ابھی تک وقت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، خصوصیت سے باراتوں کی آمد کا انتظار آج بھی اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح اس وقت کیا جاتا رہا ہوگا جب لوگ گھوڑا گاڑیوں اور بہلیوں وغیرہ پر سفر کیا کرتے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں لڑکی والوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے انتظامات وقت مقررہ پر ہی تیار کرا لیتے ہیں کہ شاید بارات بر وقت ہی آجائے۔ اعزہ اقربا بھی وقت کی پابندی کرتے ہیں تاکہ بارات کا استقبال کر سکیں، لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ بارات وقت مقررہ پر آجائے۔ باہر سے آنے والی باراتوں کے سلسلہ میں وقت کی پابندی کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے کہ ریل یا بس ہی پابند اوقات نہیں تو بارات والوں کی شکایت کیا کی جائے۔ البتہ ان باراتوں کا بھی گھنٹوں تاخیر سے آنا سخت تکلیف دہ بات ہوتی ہے جو مقامی ہوتی ہیں۔ دلہن والوں کی جانب سے مدعو حضرات و خواتین صرف اس خیال سے وقت کی پابندی کرتی ہیں کہ نکاح میں شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے، لیکن بارات گھنٹوں نہیں آتی، لڑکی والے پریشان ہو جاتے ہیں، اپنے مہمانوں کی بے چینی کا انھیں احساس ہوتا ہے، لیکن کچھ کر نہیں پاتے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ مثلاً آمد بارات ۶ بجے۔ نکاح ۷ بجے۔ طعام ۸ بجے۔ لیکن بارات دس بجے تک نہیں آئی بچے بھوک سے پریشان ہو کر سو جاتے ہیں۔ رسم و رواج کے تحت جب تک باراتی کھانا نہ کھا لیں۔ لڑکی والے اپنے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلاتے۔ اس رسم کو ختم ہونا چاہئے۔ بارات والوں کے انتظار میں اپنے مہمانوں کو بھی بھوکوں مارنا کوئی معقول بات نہیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے تک تو خیر بارات کا انتظار کرنا چاہئے لیکن اس کے بعد اپنے مہمانوں کو بارات کا انتظار کئے بغیر کھانا کھلا دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اکثر حضرات جو کھانے کے سلسلے میں [illegible] یا مجبوراً وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ بلا کھانا کھائے چلے جاتے ہیں۔

اس مسئلہ پر غور کر کے ایسی تحریک چلانا چاہئے کہ بارات آنے میں غیر معمولی تاخیر ہو تو اپنوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔

ایک اور بات بھی قابل توجہ یہ ہے کہ عام طور پر کھانا مردوں کو پہلے کھلایا جاتا ہے، عورتوں کو بعد میں۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ بچے خواتین ہی کے ساتھ رہتے ہیں اور انھیں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ بچے جلد کھانے اور جلد سونے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے اگر عورتوں کو کھلانے میں دیر ہوتی ہے۔ جیسا کہ عام دستور ہے تو اکثر بچے بھوک بھوک کرکے سو جاتے ہیں اور پھر سوئے بچوں کو جگا کر کھلانا [illegible] نہیں رہتا۔ ہمیں امید ہے کہ اس مسئلہ پر بھی پوری توجہ سے غور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ عزیز بہنیں اس کے لئے، جہاں بھی [illegible] اس ذکر کو چھیڑ کر فضا کو ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ [illegible] اصلاحی کام میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مخالفت سے [illegible] مسئلہ کے روشن پہلو کو اجاگر کریں۔ رفتہ رفتہ اصلاح ہو سکتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا قول ہے کہ کھانے کی بڑھی ہوئی حرص اور بدہضمیوں کے ہوتے ہوئے صحت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

بوفے کی لعنت

ہم ہندوستانیوں نے انگریزوں کی نقالی میں [illegible] ہے آنکھیں بند کر ان کے معاشرتی اور تہذیبی اصولوں کو [illegible] کے دور حکومت میں ہی شروع کر دیا تھا اور اب بھی جبکہ وہ ہم پر حاکم نہیں رہے، ہم ان کی نقالی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ [illegible] دکھنے والی باتیں بہت سی ہیں، لیکن اس جگہ ہم صرف بوفے کی [illegible] کریں گے۔ یہ لفظ تقریباً عام ہو گیا ہے پھر بھی ترقی کی [illegible] والے شہروں سے دور کے قصبات میں ممکن ہے کہ سب لوگ [illegible] مطلب نہ سمجھتے ہوں، اس لئے اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دی [illegible]

[illegible] مسلمان خواتین

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض

اسلامی تاریخ کے روشن صفحات شروع سے لے کر آج تک عورتوں کی جاں نثاریوں اور شجاعتوں سے خالی نہیں رہے ہیں۔ عورت ہمیشہ اسلام کی چودہ سو سالہ جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی ہے اور یہ بات بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام نے کبھی سیاسی اور سماجی جدوجہد بلکہ ہولناک جنگوں میں عورتوں کو شریک ہونے سے محروم نہیں رکھا۔ (نسیبہ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے زخمیوں کی مدد کے لئے جنگِ احد میں شرکت کی لیکن آخری وقت ہاتھ میں تلوار پکڑلی۔ حالانکہ خود زخمی تھیں لیکن رسول اللہ کے ساتھ ہوکر لڑتی رہیں) ہماری بات کے دلائل تاریخ اسلام کے اوراق میں موجود ہیں۔ وہ عورتیں مقدس ہیں جن کے نام آغاز اسلام سے لے کر ہمیشہ رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہار کے ساتھ آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ ان خواتین کی جان نثاری اور قربانی کے بغیر اسلام کی پیش رفت رک جاتی تھی۔

جدوجہد کرنے والے انہی درخشاں چہروں میں ایک چہرہ حضرت خدیجہؓ کا ہے جن کے بطن سے پاک و طیب اور اسلام کی تقدیر ساز نسل پیدا ہوئی۔ حضرت خدیجہؓ پہلی مسلمان عورت ہیں۔ تاریخ میں اس عظیم عورت کے بارے میں بہت کوتاہی برتی گئی ہے اور ان کی جزئیات کو لکھا نہیں گیا۔ دنیا کی اکثر مسلمان خواتین حضرت رسول اکرمؐ کی اس پہلی رفیقۂ حیات اور دنیا کی خاتونِ اول حضرت فاطمہؑ کی والدہ کے حالات اور واقعات سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں تاریخ میں جو کچھ بچا ہے وہی ان کی شخصیت کو ممتاز کرسکتا ہے۔ ہم یہاں ان کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں۔ شاید یہی چند سطور عصرِ حاضر کی مسلمان خواتین کو ان کی ذمہ داریاں نبھانے اور اخلاقی تکمیل میں رہنما ثابت ہوسکیں۔

ان کا نام خدیجہؓ اور والد کا نام خویلد [illegible] ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوئیں اور ایسے [illegible] میں پرورش پائی جو دانش مند بھی تھے اور خانۂ کعبہ کے [illegible] مظلوموں اور ستم زدوں کی بھی ہمیشہ حمایت کرتے تھے۔

اوائل جوانی میں انھوں نے عتیق بن عائذ نامی ایک شخص سے شادی کی لیکن وہ شخص جلد ہی انتقال کرگیا اور یہ [illegible] تنہا رہ گئیں۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ بنی تمیم کے ایک [illegible] بن بناس سے شادی کرلی لیکن وہ شخص بھی فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے پیچھے وافر دولت چھوڑی۔ اگرچہ اب حضرت خدیجہؓ کے پاس کافی دولت موجود تھی لیکن ان کی شخصیت لیاقت اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے کی بہترین مثال یہ ہے کہ اس کثیر دولت نے انھیں سود خور نہیں بنایا تھا جو کہ اس زمانے میں عربوں میں عام تھا۔ یہ دولت اخلاقی کجروی کا باعث بن سکتی تھی اور اس خاتون کو [illegible] بنا سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے اس وافر دولت کو تجارت اور دیانتدار لوگوں کو کام پر لگانے میں صرف کیا اور اس جائز کاروبار سے ان کی دولت میں مزید اضافہ ہوا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان کے کارندوں نے مصر، شام اور حبشہ سے ہزاروں اونٹ تجارت کے لئے حاصل کر رکھے تھے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں جب عورت ہمیشہ کے بدوی معاشرے میں حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کا [illegible] کاروبار ان کی لیاقت اور تجارت میں مہارت اور اپنے آپ پر [illegible] کی دلیل ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی زندگی کا روشن ترین لمحہ ان کا [illegible] حضرت محمدؐ کے ساتھ شادی ہے۔ سابقہ دو شادیوں [illegible] کھانے کے بعد بھی عرب کے اشراف اور سردار حضرت خدیجہؓ کے خواستگار رہے۔ لیکن حضرت خدیجہؓ اپنا آئیڈیل [illegible] کی خواہش میں ان تمام سرداروں کو مسترد کرتی تھیں [illegible] ہے کہ حضرت خدیجہؓ کو کبھی کسی دولت مند شوہر [illegible] نہیں رہی ہے اور نہ وہ اس طریقے سے اپنی دولت میں اضافہ کرنے کا خیال رکھتی تھیں وہ ایک ایسے شخص کی تلاش میں [illegible]

میں عورتوں کی آلائشوں سے پاک دھات رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ حضرت محمدؐ کی رسالت کے بارے میں ان پیش گوئیوں سے آگاہ تھیں۔ جب حضرت محمدؐ کی امانت اور لیاقت اور تجارتی قافلوں کے دیانتدار فرد ہونے کی شہرت حضرت خدیجہؓ تک پہنچی تو انھوں نے اپنا میسرہ حضرت محمدؐ کے کردار پر نظر رکھنے کے لئے ایک قافلے کے ساتھ روانہ کیا۔ میسرہ نے قافلے کی واپسی پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے مشاہدات اور ان کی ایک عیسائی عالم کے ساتھ ملاقات اور تجارت میں لیاقت کا حال حضرت خدیجہؓ کو سنایا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد گویا حضرت خدیجہؓ کو اپنا گمشدہ مطلوب مل گیا۔ انھوں نے حضرت محمدؐ کو بلایا اور ان سے کہا۔ "اے محمدؐ چونکہ میں نے آپ کو شریف، دیانت دار، خوش خلق اور راست باز پایا ہے لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کروں"

حضرت محمدؐ نے یہ مسئلہ اپنے چچاؤں اور دیگر رشتہ داروں کے سامنے پیش کیا۔ وہ رشتہ مانگنے کے لئے حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے۔ جو شادی کی تقریب میں حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ سے کہا میں نے آپ کے ساتھ شادی کی اور اپنا مہر اپنا مال ٹھہرایا۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے اور میں آپ کی کنیز ہوں۔ اس طرح رسول اللہ کو ۲۰ سالہ تنہائی کے بعد ایک غمگسار اور مشیر ملا۔

حضرت خدیجہؓ پہلی خاتون اور انسانی فرد ہیں جو وحی کے بعد اسلام لائیں۔ انھوں نے اپنی بے حساب دولت کسی شرط کے بغیر حضرت رسول اکرمؐ کے سپرد کر دی۔ مالی خوشحالی نے کبھی حضرت خدیجہؓ کو مغرور نہیں کیا جو کچھ بھی ان کے پاس تھا۔ انھوں نے رسول اللہؐ پر نثار کر دیا۔ ایک مورخ ابن ہشام لکھتا ہے۔ رسول اللہؐ حضرت خدیجہؓ کو بہت چاہتے تھے اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ وہ روشن خیال خاتون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت اچھی وزیر اور مشیر تھیں۔ پہلی خاتون جو اسلام لائی وہ خدیجہؓ تھیں۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں۔ حضرت رسول اللہؐ کہا کرتے تھے کہ خدیجہؓ اس امت کی بہترین خاتون ہیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ سے خدیجہؓ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا خدا کی قسم خدا نے خدیجہؓ سے بہتر بیوی مجھے نہیں دی خدیجہؓ اس وقت ایمان لائی جب دوسرے کفر میں مبتلا تھے اور اس وقت میری تصدیق کی جب دوسرے مجھے جھٹلا رہے تھے۔ اس نے اس وقت اپنا سارا مال بلا شرط میرے اختیار میں دے دیا جب دوسرے مجھے محروم کر رہے تھے خدا نے میری نسل اس کے بطن سے بڑھائی۔

روایت میں ہے کہ جبرئیل جب وحی لے کر حضرت اکرمؐ پر نازل ہوتے تو عرض کرتے۔ خدیجہؓ کو خبر دیجئے کہ خدا نے ان کے لئے بہشت میں ایک خوبصورت محل تیار کیا ہے"

اس شادی سے اسلام کا پہلا مختصر معاشرتی ادارہ قائم ہوا بالظاہر اس چھوٹے سے ادارے کی بھاری ذمہ داری حضرت خدیجہؓ پر تھی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد پر مکمل ایمان رکھتی تھیں اور ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کسی ایثار اور قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ان ایام میں جب حضرت رسول اکرمؐ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جا رہی تھیں یہ حضرت خدیجہؓ کی محبت اور گرمجوشی تھی جو رسول اللہؐ کو تسکین پہنچاتی تھی آنحضرتؐ ہمیشہ اپنی مشکلات اور مسائل کے بارے میں اپنی مہاجر اور مہربان بیوی سے مشورہ کرتے تھے جب حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ سے شادی کی تو مکہ کی عورتوں نے ان سے تعلقات توڑ لئے اور ان کے گھر بھی آنا جانا چھوڑ دیا بلکہ یہ کوشش کرتی تھیں کہ کوئی دوسرا بھی ان کے گھر نہ جائے۔ سرداروں کی بیگمات نے حضرت خدیجہؓ کو تنہا چھوڑ دیا۔ اس رویے سے حضرت خدیجہؓ غمناک اور اداس ہو گئیں لیکن آہستہ آہستہ اس تنہائی سے مانوس ہو گئیں جب حضرت فاطمہؓ ان کے شکم مبارک میں تھیں تو انھیں تنہائی سے نجات مل گئی اور اپنے بطن کے اندر بچے سے ذہنی طور پر مانوس ہو گئیں۔ اس وقت جبرئیل حضرت رسول اکرمؐ پر نازل ہوئے اور انھیں بشارت دی کہ خدیجہؓ کے رحم میں جو بچہ ہے وہ ایک عظیم بیٹی ہے جس سے آپ کی نسل قائم ہوگی اور ان کی اولاد دین کی پیشوا بنے گی۔ حضرت خدیجہؓ اس خوشخبری سے بہت خوش ہوئیں۔ یہ خبر ان کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے کافی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے اسلام اور توحید کی خاطر رسول اللہ کے ساتھ شادی پر سب کچھ قربان کر دیا۔ مال، دولت، امراء کے ساتھ تعلقات جب ولادت کے دن قریب پہنچے تو انھوں نے کسی سے قریش عورتوں کے پاس یہ کہلوا بھیجا کہ اس خطرناک موقع پر میری خبرگیری کی جائے۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی اور جواب دیا کہ چونکہ تم نے ایک غریب اور یتیم کے ساتھ شادی کی ہے لہٰذا ہم تمہاری مدد کو نہیں آئیں گی۔ حضرت خدیجہؓ نے خدا سے مدد چاہی آسمان کے دروازے کھل گئے اور آسمان سے مقدس عورتیں اتر آئیں

اور وضع حمل کے وقت انہوں نے حضرت خدیجہؓ کی دیکھ بھال کی حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ کو اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اپنی اولاد کو کسی بہانے سے بھی ماں کے دودھ سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے اور ماں کے دودھ سے بہتر بچے کی روحانی اور جسمانی غذا کچھ نہیں ہو سکتی۔

جلد ہی رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا برملا اظہار شروع کیا اور اس کے ساتھ ان پر سختیوں اور مشقتوں کا دور شروع ہو گیا۔ کفارِ قریش ہمیشہ رسول اللہؐ کو ایذا پہنچانے کے در پے رہے۔ کفار کی طرف سے اس ہتک آمیز رویے اور تکلیفوں کے باعث مسلمانوں اور خود رسول اللہؐ نے ابو طالب کی مدد سے شعب ابو طالب میں جا پناہ لی حضرت خدیجہؓ اور فاطمہؓ جو اس وقت چھوٹی تھیں۔ وہ بھی ساتھ تھیں۔ تین سال تک یہ لوگ تنگدستی اور بھوک کے عالم میں وہاں رہے۔ حضرت خدیجہؓ نے بھی یہ عرصہ نہایت بردباری اور ثابت قدم بیوی اور مہربان ماں کی حیثیت سے وہاں گذارا۔ تین سال کے بعد مسلمان شعب ابو طالب سے نکلے۔ خدیجہؓ اور پانچ سالہ فاطمہؓ رسول اللہؐ کے ساتھ اپنے گھر آئیں۔ اب خوشیوں کا عالم تھا۔ لیکن یہ خوشی ناپائیدار ثابت ہوئی، اور خدیجہؓ خدا کو پیاری ہو گئیں۔ اس طرح حضرت رسولؐ کا گھر ایک بار پھر اداس ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ نے بعثت کے دسویں سال میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگرچہ رسول اکرمؐ نے بعد میں بھی شادیاں کیں۔ لیکن کوئی بیوی حضرت خدیجہؓ کی جانشین ثابت نہ ہو سکی اور رسول اللہؐ کے گھر میں بھی اور ان کے دل میں بھی وہ رونق نہ آسکی جو حضرت خدیجہؓ کے دم سے تھی۔

اسلامی معاشرتی ادارے کا یہ گراں بہا موتی دنیا میں اپنی روشن مثالیں چھوڑ کر بہشت میں اپنے خوبصورت محل میں جا بسا۔ اس پر خدا اور خلقِ خدا کا سلام ہو۔

شادی کے گیت

بھولا بنڑا لے آیا نو ہار بنّے کی سوسالیاں
بنّے تیرے سہرے میں لگے ہیں لعل
ارے ہیرے لعل بنّے کی سوسالیاں
بھولا بنڑا لے آیا نو ہار بنّے کی سوسالیاں
بنّے تیرے جامے میں لگے ہیں لعل
ارے ہیرے لعل بنّے کی سوسالیاں

بھولا بنڑا لے آیا نو ہار بنّے کی سوسالیاں
بنّے تیری بہنوں کے لاکھوں سنگھار
پڑے ہیں ہیرے لعل بنّے کی سوسالیاں
بھولا بنڑا لے آیا نو ہار بنّے کی سوسالیاں
بنّے تیری اماں کے چہرہ ماہتاب
ارے موتی لعل بنّے کی سوسالیاں
بھولا بنڑا لے آیا نو ہار بنّے کی سوسالیاں

حسن اور دلکشی کا راز

خوبصورتی قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے جو خال خال خوش نصیب انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ اس میں بہت تھوڑے انسان ہوں گے جو خوبصورتی کے تمام اوصاف سے متصف ہوں اکثریت ایسے انسانوں کی ہے جو چہرے مہرے، قد کاٹھ اور دوسری جسمانی خوبیوں کے اعتبار سے اوسط درجے تک بمشکل پہنچتے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں غالباً کوئی بھی انسان خوبصورتی اور حسن کا مکمل نمونہ نہیں ہوتا ایک خوبصورت خاتون اگر باسلیقہ نہیں ہے اور اپنی شخصیت کی کشش اور جاذبیت کی حفاظت کرنے کی اہل نہیں ہے تو اس کی خوبصورتی بھدے پن کا شکار ہو جاتی ہے اس کا یہ وصف دیکھنے والوں اور خود اس کے لئے کسی مسرت کا باعث نہیں ہوگا۔

بعض خوبصورت عورتیں لباس، رنگوں، کپڑوں کی سلائی، چہرے کے میک اَپ اور چال ڈھال کے معاملے میں اتنی بے پروائی کا ثبوت دیتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی اور شخصیت کا مجموعی تاثر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے ایسی عورتیں نہ صرف قدرت کی اس نعمت سے محروم ہو رہی ہیں وہ نہ صرف خدا کی ناشکرگزاری کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ بلکہ اپنے حسن کو عدم توجہی بے پروائی اور غفلت کی نذر کرکے حسن و کشش کو بھی وقت سے پہلے اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھتی ہیں ایک درمیانے درجے کی صورت شکل والی کوئی خاتون اگر خوش لباس صاف ستھری اور باسلیقہ ہے تو وہ ایک بے سلیقہ اور بدلباس مگر خوش شکل خاتون کے مقابلے میں کہیں پسندیدہ اور قابل تعظیم سمجھی جائے گی اور اس کی شخصیت کی خامیاں دیکھنے والوں کے لئے خوبیوں میں بدل جائیں گی۔

اگر خدا نے آپ کو اوسط درجے کی شکل و صورت عطا کی ہے اور آپ اپنے ماحول میں بہت سی حسین ہنستی اور جاذب نظر خواتین کو دیکھتی ہیں تو اس سے کسی قسم احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ناممکن الحصول ہوں شرط یہ ہے کہ آپ اپنی ذات کو حسن کا رنگ دینے کے لئے ایسے طریقے اور معلومات کو اپنائیں کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ خوب سے خوب تر نظر آئے۔ معمولی شکل و صورت یا شخصیت کی مالک ہوتے ہوئے آپ یہ دیکھیں کہ جو کچھ قدرت نے آپ کو عطا کیا ہے اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ صورت کے جو خال اور خطوط جو زیادہ جاذب نظر نہیں ہیں یا دوسرے نقوش سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے ان کو کس طرح متوازن اور خوبصورت بنایا جا سکتا ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں کہ ایک آدھ خوبی پر قانع ہو جائیں اور اپنی تسلی کے لئے اسے ہی پیش نظر رکھیں اپنی شخصیت کی باقی ماندہ خامیوں کا الزام قدرت کے سر تھوپ کر آپ خود سے انصاف نہیں کریں گی جب کہ ان خامیوں کو آپ تھوڑی سی توجہ سے خوبیوں میں بدل سکتی ہیں۔

جہاں ہمارے ملک کی بیشتر خواتین اپنی صحت و خوبصورتی برقرار رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کے لئے کوئی محنت اور توجہ صرف نہیں کرتیں۔ وہاں متمول گھرانوں کی خواتین اندھا دھند سامان آرائش پر روپیہ برباد کرتی ہیں اور بناؤ سنگھار کے لئے اعلیٰ درآمدی سامان خرید کر استعمال میں لاتی ہیں یہ انتہا پسندی بھی کسی طور مستحسن نہیں کیونکہ مغربی ممالک سے درآمد شدہ اکثر چیزیں ہمارے ملک کی آب و ہوا اور موسموں کے اثرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہیں تیار کی جاتیں زیادہ سے زیادہ ایسی چیزوں کو آپ سردیوں کے چند مہینوں میں ہی استعمال کر سکتی ہیں بہتر یہی ہے کہ افزائش حسن اور حفظان صحت کے لئے آپ ایسے طریقے اختیار کریں جو ہمارے ملک کی آب و ہوا اور موسمی کیفیات سے مطابقت رکھتے ہوں اور اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کئے گئے ہوں۔

کاہلی، بیکاری اور سستی ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو جسمانی اور روحانی طور پر ناکارہ کر دیتی ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں ان بیماریوں کا زیادہ شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کا حسن تیس برس کے اندر ہی اندر ختم ہو جاتا ہے اور چند بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کے چہرے اور جسم پر بڑھاپا مسلط ہو جاتا ہے کیا آپ نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ بظاہر تو اس کی وجہ حد سے زیادہ آرام طلبی، غیر متوازن غذا حفظان صحت کے اصولوں سے بے توجہی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی کچھ معاشرتی اور نفسیاتی وجوہ بھی سامنے آئیں گی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شادی کے بعد دو ایک بچوں کو جنم دینے کے بعد عورت مطمئن ہو جاتی ہے۔ اپنی ذات سے لاپرواہ ہو جاتی ہے گویا حسن اور جسم کی حفاظت اور نگہداشت صرف شادی سے پہلے ضروری تھی جب شادی ہو گئی بال بچے گھر میں کھیلنے لگے تو عورت آرائش جمال اور حفظان صحت کو بے کار سی چیز سمجھنے لگی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

...ہے سے پڑے ہیں یہ کہ لیا ہوا تھا وہ بڑے بڑے نیلے رنگ کی چادر کا ٹکڑا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے شیلا بولا۔ وہ کچھ اپنے خیالات سے چونک گئے اور حکم کے انداز میں بولے۔

"علاقے کے سارے ہسپتالوں، میٹرنٹی ہوم اور دائیوں سے پوچھ گچھ کرو۔ شام تک مکمل رپورٹ دی جائے۔"

محض جو بچہ تین روز پہلے پایا گیا ہے وہ تھا اس کی ماں کا پتہ چل گیا ہے اور اس شخص نے ہم نے اس کو گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا ہے۔" سب انسپکٹر جمال نے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے انہیں بتایا۔

"انہیں یہاں لے کر آؤ۔" وہ تیزی سے بولے اور کچھ دیر بعد ہی سپاہی دو عورتوں اور ایک مرد کو لے کر ان کے کمرے میں آگیا۔ تینوں بُری طرح سہمے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لڑکی کی آنکھیں رو رو کے سوج گئی تھیں۔

"کون ہو تم ان کے۔؟" بخاری صاحب نے عورتوں کو سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں مرد سے پوچھا۔

"میں بدنصیب اس لڑکی کا باپ ہوں جی۔۔۔۔؟" زمین پر نگاہیں جمائے وہ آہستہ سے بولا، دکھ اور شرمندگی اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"بچے کو راتوں میں تم نے ہی پھینکا تھا۔؟" انہوں نے دوسرا وار کیا لیکن اس بار جواب دینے کے بجائے اس مرد نے گردن ہلائی، آنسو بُری طرح اس کی داڑھی اور دامن کو بھگونے لگے۔

"اتنا بڑا جرم کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی ایک معصوم زندگی کو تم نے موت کے حوالے کر دیا۔"

ان کی بات سن کر لڑکی نے دہشت بھری نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ نوچ کر بُری طرح بکنے لگی۔ ماں نے آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو اس نے دھکا دے کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"تم لوگ میرے بچے کے قاتل ہو، تم نے اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لئے میری کوکھ اجاڑ دی، میری ممتا کو رسوا کر دیا۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ لڑکی۔۔۔۔" اس کی بے حد اور سینہ زوری دیکھ کر بخاری صاحب ڈانٹ کر بولے "گناہ کرتے ہوئے تمہیں اس بات کا خیال نہیں تھا کہ اس کا نتیجہ کس قدر بھیانک ہوگا۔؟"

"گناہ کرتے وقت میں ماں نہیں تھی ایک لڑکی تھی جو جذبات میں آکر غلطی کر بیٹھی تھی، میرے جرم، میری غلطی کی سزا میرے معصوم بچے کو کیوں ملی؟ وہ تو بالکل بے قصور تھا، اپنے کئے کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، مجھے جیل بھجوا دو یا پھانسی پر چڑھا دو لیکن پہلے مجھے میرا بچہ واپس دو، میرا بچہ۔۔۔۔ جس کی میں ماں ہوں، جس نے میری کوکھ سے جنم لیا، جو میرے وجود کا ٹکڑا میرا لخت جگر تھا، جو دنیا والوں کے لئے ناجائز تھا لیکن میری اولاد تھا، ماں کی ممتا سب کے لئے یکساں ہوتی ہے۔" شدت گریہ سے لڑکی بیہوش ہونے لگی تھی۔

لڑکی کی آہ و بکا اور تڑپ دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو بخاری صاحب بھی لرز سے گئے۔ لیکن فوراً ہی اپنے فرائض کی بجا آوری کا احساس ان کے جذبات پر غالب آگیا۔ اور وہ لڑکی کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے اس کی ماں سے مخاطب ہوئے۔

"تم نے عورت ہو کر اتنا بے رحمانہ انداز کیوں اختیار کیا۔؟"

اس نے جھینپتی ہوئی نظروں سے بخاری صاحب کی طرف دیکھا اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے آہستہ سے بولی "عزت بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا جی، آپ خود سوچیں اگر ایسا نہ کرتی تو پھر کیا کرتی۔؟ اپنے چہرے پر بدنامی و رسوائی کی کالک مل کر دنیا کا سامنا کس طرح کرتی۔؟"

"لیکن اب جو بدنامی ہوگی اس کی شدت کا اندازہ ہے تم لوگوں کو۔؟" وہ میز پر مکہ مارتے ہوئے بولے۔

"کاش زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں" عورت ہچکی ہوئی آواز میں بولی، لڑکی نے روتے روتے چونک کر سر اٹھایا اور زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بولی۔

"نہیں اماں اب زمین نہیں پھٹے گی اب تو آسمان پھٹے گا آسمان۔" صدمے نے اسے دیوانہ کر دیا تھا اور وہ جو منہ میں آرہا تھا کہے چلے جا رہی تھی اولاد کے دکھ نے جیسے اس کے سارے احساسات ختم کر دئیے تھے، بدنامی، رسوائی یا سزا کا اسے ذرہ برابر بھی خوف نہیں تھا۔

"میں اپنے کئے کی سزا خود بھگتوں گی، مجھے دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے میں دنیا کا سامنا کر لوں گی۔ لیکن خدا کے لئے میرا بچہ مجھے دے دو، میں اس کی ماں ہوں" اب وہ اپنی ماں کا دامن دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آہ و زاری کر رہی تھی۔

بخاری صاحب نے بیل بجا کر سپاہی کو بلایا اور اشارے سے انھیں باہر لے جانے کا حکم دیا۔ اُن سب کے باہر جانے کے بعد بخاری صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ آج کے واقعے نے ان کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسے دوش دیں اور کسے قصوروار ٹھہرائیں۔ کبھی لڑکی کی آہ و زاری کا سوچ کر اس کے ظالم ماں باپ کی شرمندگی اور ان کی بدنامی و رسوائی کا خیال کر کے ان پر ترس آ جاتا تھا اور جب بچے کی نُچی ہوئی لاش کا منظر ان کی نگاہوں میں آتا تو اس سے انھیں قانون کی بالادستی کا خیال آ جاتا تھا۔ جرم ہر حال میں جرم ہے اور مجرم کو یقینی طور پر اس کی سزا ملنی چاہیئے۔ اب یہ میرا مسئلہ نہیں بلکہ عدالت کا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور کمرے سے باہر آ کر کھلی فضا میں سانس لینے لگے۔ اس عمل سے ان کے اعصاب پر پڑا ہوا بوجھ کافی حد تک کم ہو گیا۔ اور وہ نئے سرے سے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد فرصت کے وقت انھیں اپنی بیٹی کا خیال آ گیا آج ویسے بھی بشریٰ بیگم سے وہ کہہ آئے تھے کہ ہو سکا تو بجائے گھر جانے کے ان کی نانی کے ہاں سے لے آؤں گا۔ اسی وقت فرصت تھی چنانچہ وہ اسے لینے کے لئے چل دیئے۔

ندرت کی نانی انھیں دیکھ کر کچھ حیران سی ہو گئیں۔ بیٹے آج تم بغیر اطلاع کے اچانک کیسے آ گئے۔ کیونکہ بخاری صاحب اپنی سسرال شاذ و نادر ہی آتے تھے۔

"ماں جی ندرت کہاں ہے۔" سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ بیٹی کے بارے میں پوچھنے لگے۔

"سو رہی ہے کمرے میں" مختصر سا جواب دے کر وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔

ساس کی بات سے انھیں تسلی نہ ہوئی وہ ندرت سے ملنے خود اوپر چلے گئے سامنے پلنگ پر رضائی اوڑھے ندرت لیٹی ہوئی تھی، پیلا زرد ستا ہوا چہرہ، رنج و غم کی تصویر بنی وہ مسلسل چھت کو تک رہی تھی، اپنے سوچوں میں وہ اس قدر گم تھی کہ باپ کی آمد کا اسے پتہ بھی نہیں چلا بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر بخاری صاحب کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ بیقرار ہو کر آگے بڑھے اور شفقت پدری سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بیتابی سے بولے۔

"ندو میری بچی! طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔۔؟"

ندرت نے سہم کر باپ کی جانب دیکھا، پسینے کے بے شمار قطرے اس کے ماتھے پر ابھر آئے۔ پھر وہ بے اختیار رونے لگی۔ بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر انھیں شدید دھچکہ پہنچا تھا ان کی بیٹی اتنی بیمار تھی اور انھیں خبر تک نہ کی گئی، اپنی ساس کی اس لاپرواہی پر انھیں بڑا غصّہ آ رہا تھا حالانکہ ماں جی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ندرت کو سب سے زیادہ چاہتی ہیں لیکن ندرت کی حالت دیکھ کر آج انھیں احساس ہوا کہ ماں باپ سے بڑھ کر اولاد سے اور کوئی محبت نہیں کر سکتا انھوں نے ندرت کو اسی وقت گھر لے جانے کا فیصلہ کیا۔

"ندو۔ بیٹے بس جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہاری امی تمہارے بغیر اداس ہو گئی ہیں۔ خود مجھے تمہارے بغیر گھر سونا سونا لگتا ہے۔

ماں جی جو چائے کی ٹرے لے کر اوپر ہی چلی آئی تھیں، بخاری صاحب کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولیں۔

"دو چار دن میں خود ندو کو لے کر آ جاؤں گی، ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پوری رات بخار رہا ہے۔ ہوا میں اس کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔

بخاری صاحب نے ندو کی نانی کی بات سن کر سوالیہ انداز میں بیٹی کی جانب دیکھا لیکن وہ بالکل خاموش رہی بس ایک پل کے لئے خالی خالی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا، خاموش چہرے پر درد و کرب کے سائے پھیل گئے جسے محسوس کرتے انھیں اپنے دل پر برچھیاں سے چلتی محسوس ہونے لگیں۔ ندرت کے خوف زدہ چہرے اور خاموشی نے انھیں عجیب کشمکش میں ڈال دیا تھا، کچھ دیر وہ سوچتے رہے اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اٹھتے ہوئے ان کی نظر کرسی کے نیچے چلی گئی، نجانے کس جذبے کے تحت بے اختیار ہو کر وہ جھکے، دوسرے ہی لمحے بڑے بڑے نیلے اور سرخ پھولوں کی چادر کا بچا ہوا آدھا حصّہ ان کے ہاتھوں میں تھا اور پھر جیسے ایک پل کے ہزارویں حصّے میں ان کی سمجھ میں ساری بات آ گئی انھیں یوں محسوس ہوا جیسے نیلے اور سرخ شعلوں کے درمیان وہ گھر گئے ہوں۔

"کاش اس وقت زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں" شدت کرب سے وہ زیر لب بولے۔

"اب زمین نہیں پھٹے گی۔۔۔ اب تو آسمان پھٹے گا" آواز ان کے کانوں کے نزدیک جیسے کوئی تیز آواز سے چیخا، انھوں نے

ان کو نہیں تھا۔

میرا بس چلے تو اس قسم کی ننگِ خاندان اور بے غیرت لڑکیوں کو سرعام عبرتناک سزائیں دلواؤں کہ دیکھنے والوں کو بھی عبرت حاصل ہو۔" ان کے اپنے کہے ہوئے الفاظ بازگشت بن کر گونجے، تب ان کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے ندرت کا گلا دبا دیں۔

"میں اپنے گناہ کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں، لیکن میرا بچہ مجھے دے دو، میں ماں ہوں، وہ میرے وجود کا ٹکڑا میرا لختِ جگر ہے، اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ دنیا کے لئے وہ ناجائز ہے لیکن میری اولاد ہے، ماں کی ممتا ہر بچے کے لئے یکساں ہوتی ہے۔" انہیں اس لڑکی سے بچھڑ کر دکھ اور آنکھوں کی وحشت یاد آگئی، ندرت کی گردن کی طرف بڑھنے والے ان کے ہاتھ کانپ گئے وہ اپنی جگہ پر رک گئے۔

بتاؤ۔ اس سارے کھیل میں میرا کیا قصور ہے؟ بڑے بڑے نیلے اور سرخ پھولوں کی چادر میں لپٹے ہوئے معصوم فرشتے نے جیسے دامن پکڑ کر ان سے التجا کی ہو، ندرت کا دکھ ان کی سمجھ میں آگیا اور وہ کچھ سوچنے لگے، صبح کا منظر ان کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اپنے چہرے پر بدنامی و رسوائی کی کالک مل کر ہم دنیا کا سامنا کس طرح کرتے ہیں۔" ان کے چہرے پر پسینے کی بے شمار بوندیں چمکنے لگیں اور انہوں نے بے چین ہو کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

ندرت نے کروٹ لی اور رضائی میں سے منہ نکال کر دیکھا، بخاری صاحب ابھی تک کمرے میں موجود تھے۔ باپ کو یوں خاموش اور چپ چاپ سا دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔

"ابو جی۔ آپ گئے نہیں۔" وہ ہولے سے بولی بخاری صاحب نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ندرت نے غور سے باپ کی جانب دیکھا اور نقاہت سے اٹھ کر ان کے قریب آئی۔ وہ سو رہے تھے۔ ندرت نے صوفے کی پر رکھے ہوئے ان کے شانے کو ہلایا تو گردن ایک جانب لڑھک گئی۔ ماں جی... ماں... جی، وہ پوری قوت سے چلائی، اور جب ماں جی نے آ کر ندرت کے ساتھ مل کر انہیں سیدھا کرنا چاہا تو دیکھا کہ بڑے بڑے نیلے اور سرخ پھولوں کی چادر کا ٹکڑا انہوں نے اپنے دل سے لگا رکھا تھا، ندرت نے ماں جی کی جانب دیکھا اور پھر منہ پھیر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

کامیاب زندگی کے اصول

مسز عشرت اکرم

سات اصول ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۱۔ اچھے ساتھی کا انتخاب کیجئے اور خود بھی اچھا ساتھی بننے کی کوشش کیجئے۔

۲۔ اپنے ساتھی پر چھا جانے کی کوشش ترک کر دیجئے۔

۳۔ ایک دوسرے پر نکتہ چینی ہر وقت نہ کیجئے۔ ہوتے ہوتے اس طرح نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے۔

۴۔ خلوصِ دل سے اچھے طرزِ عمل کی داد دیجئے۔

۵۔ خوش گفتاری کی عادت ڈالئے۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی ذات سے کچھ خوشی حاصل کر سکتی ہے تو صرف اس کی قدر دانی اور تحسین کے ذریعے۔

۶۔ مرد کا دیا ہوا پھول کا تحفہ بھی عورت کے لئے بیش بہا ہوتا ہے کیونکہ پھولوں کو ہمیشہ محبت کی زبان کہا جاتا ہے۔

پھول کمیاب یا مہنگے نہیں ہوتے۔ لپ اسٹک اور غازے سے بہت سستے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کم ہی مرد ایسے ہوتے ہیں۔ جو گھر جاتے وقت اپنی بیوی کے لئے پھول لے جاتے ہوں۔ آپ بیوی کی خاطر پھول لے جانے کے لئے اس وقت تک انتظار میں کیوں رہتے ہیں جب تک وہ ہسپتال میں داخل نہ ہو جائے یا قبرستان نہ پہنچ جائے۔

۷۔ سخت کلامی ازدواجی زندگی کے لئے سرطان کا اثر رکھتی ہے۔ حالانکہ ہر فرد اس کے نتائج جانتا ہے مگر میاں بیوی کو جب دیکھا سخت کلامی کرتے پایا۔ ٹی وی پر بھی میاں بیوی کو جھگڑتے ہی دکھایا جاتا ہے۔

شکاگو کے ایک جج نے پچاس ہزار مقدمات کا فیصلہ کیا اور دو ہزار شادی شدہ جوڑوں کی ازدواجی زندگی کو تباہ ہونے سے بچایا۔ اس کا کہنا ہے کہ ازدواجی تلخیوں کی تہ میں چھوٹی چھوٹی رنجشیں اور شکایتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ مثلاً شوہر دفتر جاتے وقت بیوی کو محبت سے الوداع کہہ دے تو بہت سی [illegible] شادی شدہ زندگی کو ناکامی سے بچا سکتی ہے۔

پُرمسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاص دھیان دیجئے۔ اور یہ میاں بیوی دونوں کا فرض ہے۔

جاپان میں یہ رواج ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتار دیتے ہیں۔ کاش ہمارے مرد بھی اس رواج پر کاربند ہوں۔ لیکن اس طرح کہ جوتے اتارنے کے بجائے تمام دن کی تلخیاں اور پریشانیاں باہر جھٹک کر گھر میں داخل ہوں۔ اس طرح تمام دن ان کی راہ تکنے والی بیوی کو بھی محبت کا احساس ہوگا۔ اس طرح خاتونِ خانہ کو بھی چاہئے کہ گھر کی ذمہ داریوں اور پریشانیوں کا اظہار شوہر کے گھر واپس آتے ہی نہ کرے۔ جیب ٹٹولنے کے بجائے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی خیریت معلوم کرنی چاہئے۔ یوں ازدواجی زندگی خوشگوار گزرتی ہے۔ اگر ایک شادی شدہ انسان پرسکون ازدواجی زندگی گزار رہا ہے تو اسے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھنا چاہئے۔

آخر میں ان ازدواجی مسائل کا بھی ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔ جن کے باعث شادیاں عموماً ناکام ہوتی ہیں۔

ایک ادارے کی ناظم ڈاکٹر کیمپ [illegible] کی رپورٹ کے مطابق۔ شادی کی ناکامی کے چار بنیادی اسباب سامنے آئے ہیں۔

۱۔ جنسی ناموافقت
۲۔ فرصت کے اوقات گزارنے کے مشغلے پر اختلافِ رائے
۳۔ مالی مشکلات
۴۔ ذہنی جسمانی یا جذباتی بے اعتدالیاں

قابلِ فخر قمر النسا

نسیم انجم نوری

سنسکرتی ایوارڈ ایسی خواتین کو دیا جاتا ہے جو سماجی فلاح و بہبود کا کوئی عملی کارنامہ انجام دیتی ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ اس سال یہ ایوارڈ ایک مسلم خاتون قمر النسا صاحبہ کو دیا گیا ہے۔

قمر النسا صاحبہ ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ وہ پردہ نہیں کرتی ہیں، اس کے باوجود وہ میری نظروں میں قابلِ تعظیم ہیں، اس لئے کہ انھوں نے اپنی جوانی کے پچیس سال غریب اور مظلوم مسلم اور ہندو خواتین کی زندگیوں کو بہتر بنانے میں صرف کئے ہیں۔

قمر النسا صاحبہ کا دائرۂ عمل دہلی کا علاقہ جامع مسجد، اجمیری گیٹ اور دوسرے کئی علاقے رہا، جہاں بڑی تعداد میں خصوصیت سے غریب مسلم خواتین رہتی ہیں جو بیشتر رکشا چلانے والوں، قصائیوں یا ایسے ہی دوسرے غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں اور بیشتر کئی کئی بچوں کی مائیں ہوتی ہیں۔ وہ بہت سویرے سے رات گئے تک گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ زردوزی اور کاغذ کے لفافے وغیرہ بنانے کا کام کرتی رہتی ہیں۔ ایسی تمام خواتین ان پڑھ، غریب ہوتی ہیں۔ ان کے کام دلالوں کے ذریعے سے ہوتے ہیں جو انھیں برائے نام ہی اجرت دیتے ہیں۔ ایسی تمام عورتیں کسی نہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ افلاس، گندگی، بیماری اور ان تھک محنت کرنے کے باعث ان کی عمریں ۳۰۔۳۵ سال سے زیادہ وفا نہیں کرتیں۔ بچوں کی اور شوہروں کی دیکھ بھال ان کے معمولات میں داخل ہے۔

قمر النسا صاحبہ کو [illegible] دہلی کے لئے ایک سروے کرنا ہوا جب ان علاقوں میں گئیں تو ان کا دل بھر آیا اور انھوں نے سارے کام چھوڑ کر اپنی زندگی ان کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی۔

انھوں نے ان تمام خواتین کو صرف منظم کیا بلکہ دہلی کے مشہور سماجی کام کرنے والے ادارے "سیوا" سے الحاق بھی حاصل کیا جس کی بانی محترمہ ایلا بھٹ صاحبہ ہیں۔ اس طرح قمر النسا صاحبہ کی انتھک کوششوں اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

- تمام کام کرنے والی عورتوں کو [illegible] اجرت ملنے لگی۔ ان کے لئے ایک انشورنس اسکیم کا قیام بھی عمل میں آیا تاکہ کسی کا شوہر مر جائے تو یکمشت رقم اسے مل سکے۔
- ان کے یہاں ولادت یا کوئی اور تقریب ہو تو مالی امداد بھی ملتی ہے۔
- انھیں اس فن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے جس کا وہ کام کرتی ہیں تاکہ ان کی مہارت بڑھے۔
- انھیں بینکوں سے بآسانی قرض بھی مل سکتا ہے۔
- بیشتر خواتین کی زندگی بدلتی جا رہی ہے۔ امورِ خانہ داری اور باہری دنیا کے اہم اور ضروری مسائل میں رہبری مل رہی ہے۔
- صحت مندی کے لئے صحت کیمپ لگائے جاتے ہیں۔
- سنسکرتی ایوارڈ سے جو پانچ ہزار کی رقم قمر النسا صاحبہ کو ملی ہے، اسے انھوں نے اپنے اسی مشن کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ انھیں بیس ہزار روپیہ اور مل جائیں تو وہ ایک ٹرسٹ قائم کر دیں گی، جس سے خواتین کو بروقت ضرورت مدد مل سکے گی۔
- انھوں نے اپنی خدمات ان ہندو خواتین کو بھی پیش کی ہیں جو لفافے وغیرہ بنانے کا کام کرتی ہیں۔

لیکن افسوس کہ قمر النسا صاحبہ کے پاس روپیہ کی کمی ہے، اس لئے ان کا یہ فلاحی کام بڑی سست رفتاری سے چل رہا ہے۔ کاش حکومت انھیں اس سلسلے میں مالی مدد دے کر ان کے حوصلے بلند کر سکے۔

لکھنؤ میں ایسی مسلم خواتین لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جو چکن اور زردوزی سے متعلق بہترین ہنر جانتی ہیں اور بڑے فنکارانہ انداز میں یہ کام کرتی ہیں، لیکن بڑے بڑے ہندو اور مسلم مالدار کاروباری انھیں اتنی کم اجرت دیتے ہیں کہ ان کا گذارہ مشکل ہی ہو پاتا ہے۔ کاش کوئی قمر النسا لکھنؤ کو بھی مل جائے تاکہ یہاں کی غریب فنکار عورتوں کے حالات کچھ بہتر ہو سکیں۔ حال ہی میں اخبار "سنڈے" نے ان پر ایک بڑا تفصیلی مضمون شائع کیا تھا۔ ممکن ہے اس کا کچھ اثر ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل حکومت کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہو پاتے اور حکومت — افسوس کہ غریبوں کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ اس دور میں بس سرمایہ داری [illegible]۔

میرے ہوش وحواس پر چھا گئی تھی۔

(ایک تاریخی افسانہ) (مولانا عبدالباقی)

دارا نے اپنے تذکرے میں اس واقعہ کی تفصیل لکھی ہے پڑھیے اور انسانی فطرت کا مطالعہ کیجئے

سنہ ۱۶۶۲ء کا ذکر ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر طالب اقتدار تھے اور ان کا بھائی دارا شکوہ تلاش حق میں مصروف تھا۔ دنیوی زندگی سے جو دو بھائیوں کے دلوں فرق ڈال دیتی ہے وہ بیزار تھا اور درویش بن کر ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھان رہا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دارا شکوہ مغل شہزادہ ہے۔ شاہی محلوں میں پلا ہے اور ہندوستان کی شاہی پر اس کا حق اسی طرح تسلیم کیا جاتا ہے جس طرح کسی دوسرے مغل شہزادے کا تسلیم کیا جاتا ہے۔

دارا کے مزاج میں علم و انکسار تھا سیاسی اقتدار کی کشمکش سے دور ہونے کے بعد اس کی طبیعت میں ایک سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا وہ انسانوں سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا لیکن راہ میں کوئی مصیبت زدہ مل جاتا تو اس کے دکھوں میں شریک ہو جاتا اور اس کے غم کے آنسو پونچھتا۔

دارا اپنے لمبے سفر پر بہت سی منزلیں طے کرتا ہوا دکن پہنچا اور بیجاپور میں ایک مسافر کی طرح سرائے میں مقیم ہوا قریب کے مکان میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔

دارا جب بیجاپور پہنچا اسے معلوم ہوا کہ اس مکان میں ایک موت واقع ہوئی ہے اور یہ ایک نوجوان کی موت تھی جو اپنی اکلوتی بہن کا آخری سہارا تھا مہمان خانہ یا سرائے کا مہتمم لوگوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ لڑکی برہمن زادی ہے اور بلا کی حسین ہونے کے ساتھ ہی غیور اور خود دار بھی ہے اور کسی شاہی محل کی زینت بن سکتی ہے۔ دارا شکوہ نے خود اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ دنیا سے بیزار ہونے کے باوجود میرا دل چاہا کہ میں دوشیزہ سے جان پہچان پیدا کروں میں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی خدمت کروں۔ میں نے اپنے نفس کا جائزہ لیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی بے نفس نہیں ہوں۔ اور لڑکی سے دلچسپی لینا چاہتا ہوں۔

دارا نے اپنے تذکرۂ بہار میں اس واقعہ کی تفصیل لکھی ہے اور اس سے اس کی سیرت و کردار کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اس افسانہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسانی فطرت کا صحیح مطالعہ کیا جائے۔

دارا نے لکھا ہے کہ لڑکی رات دن گھر میں چھپی رہتی اور اس کے حسن کے چرچے چونکہ عام تھے اس لئے میرا اشتیاق دید بڑھتا ہی گیا لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہبی عقیدے کی پکی ہے۔ پوجا کرتی ہے اور مردوں سے نفرت کرتی ہے۔ دارا کو معلوم ہوا کہ لڑکی صبح کو پاس کے مندر میں پوجا کرنے جاتی ہے۔ دارا نے آہستہ آہستہ لڑکی کا انتظار کرنا شروع کیا۔ ایک دن گزرا، دوسرا دن گزرا۔ سات دن کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی شخص سفید چادر میں لپٹا ہوا مکان سے نکلا اور مندر کی اس نے راہ لی۔ دارا دور سے تماشا دیکھنے لگا۔ لڑکی مندر میں گئی دارا بھی ساتھ ہو لیا۔ لڑکی نے مندر میں پوجا کی دارا بھی مندر میں رہا دارا کو یقین ہو گیا کہ لڑکی حسین و جمیل ہے اس کے حسن میں پاکیزگی ہے اور وہ برسات کی پھوٹی ہوئی کونپل سے زیادہ نرم و نازک ہے کئی دن بیت گئے لڑکی کبھی کبھی مندر جاتی۔ دارا بھی مندر جاتا دارا کا بیان ہے کہ اب مندر سے مورتیوں سے اسے نفرت نہ تھی اور چونکہ لڑکی مورتیوں کی پجارن تھی اس لئے دارا محسوس کرنے لگا کہ اگر دل صاف ہو تو خدا مندر میں بھی مل سکتا ہے۔

ایک دن لڑکی مندر سے آ رہی تھی اور دارا بھی دھیرے دھیرے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ لڑکی یکایک رک گئی۔ دارا نہ چاہتا کہ لڑکی کو معلوم ہو کہ وہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دارا دل میں شرمندہ ہوا کہ لڑکی اپنے پیچھے دیکھ کر کیا کہے گی۔ لڑکی رکی اور اس نے دارا کو پکارا دارا آیا تو لڑکی نے بنارسی زبان میں کہا۔

"بھائی! تم شاید مورتی پوجا تو نہیں جانتے۔ تم کون ہو۔ شاید پردیسی ہو مندر میں کیوں آتے ہو۔"

دارا نے جواب دیا۔ "میں دانتی پردیسی مسافر ہوں میں مسلمان ہوں۔ میں مندر میں صرف تمہاری پوجا کے لئے جاتا ہوں۔"

لڑکی بولی۔ "تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہیں روزانہ دیکھتی ہوں۔"

دارا لڑکی کے حسن سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ "کہو تم بھی

پوجا کی اجازت دے سکتی ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟
لڑکی نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا۔ "میرا نام زحل ہے ایک بھائی اگر ایک بہن کی پوجا کر سکتا ہے اور اگر ایک بہن بھائی کی پوجا کرسکتی ہے تو تمہیں اجازت ہے۔
اور اس کے بعد زحل خاموش ہو گئی۔

دارا کا بیان ہے کہ وہ قیام گاہ پر آیا تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ زحل سے وہ مانوس ہو چکا تھا اس نے اپنے دل سے سوال کیا تو جواب ملا کہ اس کی محبت میں نفس شامل ہے وہ زحل کو اپنی محبوبہ بنا سکتا تھا بہن نہیں بنا سکتا تھا۔ منافقت اس سے ممکن نہ تھی وہ کسی لڑکی کو بیک وقت محبوبہ اور بہن نہیں بنا سکتا تھا اس نے سوچا کہ دوسرے دن وہ حال دل زحل کو کہہ سنائے گا۔

دوسرے دن جب زحل راستے میں ملی تو قبل اس کے کہ دارا اس سے کچھ کہتا زحل نے اس سے کہا۔ "بھائی تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر تک چلو۔" اور جب دارا زحل کے گھر آیا تو وہاں تنہائی تھی۔ دارا کے دل میں شعلے بھڑک اٹھے اس نے زحل سے کہا۔
"میں تمہیں بہن نہیں بنا سکتا۔ محبوبہ بنا سکتا ہوں۔ مجھ پر ظلم نہ کرو۔"

زحل نے جواب دیا۔ "میں تمہیں بھائی کہہ چکی ہوں تم آخری سانس تک میرے بھائی رہو گے۔ تم مجھے محبوبہ سمجھ سکتے ہو مگر میں تمہیں اپنا بھائی سمجھوں گی۔ اگر ایک بہن اپنے بھائی کی محبوبہ بن سکتی ہے تو میں تمہاری محبوبہ بھی ہوں۔"

دارا اب ناکام رہا۔ دارا اب فلسفہ اور نفسیات کی یہ گتھی سلجھانے میں محو رہتا کہ ایک بہن محبوبہ کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ کبھی سوچتا زحل دولت سے خریدی جا سکتی ہے۔ کبھی سوچتا کہ زحل جب یہ سنے گی کہ وہ شہنشاہ ہند کا لڑکا ہے تو اس سے مرعوب ہو جائے گی اور اس کی بات مان لے گی۔ پھر وہ کہتا کہ میں نفس پرست ہوں میں نے دنیا سے اس لئے کنارہ کیا تھا کہ میں نفس کی اصلاح کروں لیکن یہاں تو نفس کی تیزی دیکھنے کی ہے۔

دارا زحل سے روزانہ ملا کرتا دارا نے اپنا اور زحل کا ایک مکالمہ قلم بند کیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے ذیل میں درج کیا ہے۔
"زحل۔ "تم نے اب تک نہیں بتایا کہ تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔ تمہارے انداز میں ایک شاہانہ وقار ہے۔ تمہارے مزاج میں درویشانہ حلم ہے۔"

دارا۔ "میں درویش بن کر تمہیں کھونا نہیں چاہتا اس لئے سوال یہ ہے کہ اگر میں بادشاہ ہوں یا شاہی خاندان سے ہوں تو کیا زحل مجھے مل سکتی ہے۔"

زحل۔ "تمہیں مل چکی ہے وہ تمہاری بہن ہے اور اگر تم شاہ ہند بھی ہو تو وہ تمہاری بہن ہی بننا پسند کرے گی۔"

زحل قدرے سکوت کے بعد پھر بولی۔ "دارا۔ تم مجھے بہن کیوں نہیں کہتے۔ تم ایک بہادر نوجوان ہو کیا تم اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ تم ایک بار مجھے اپنی بہن کہہ دو تو میں تمہاری پوجا کروں۔ اپنی زندگی تمہاری یاد میں وقف کر دوں۔ تم جہاں کہو تمہارے ساتھ چلوں۔

دارا بے تاب ہو گیا اور زحل کے یہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ دارا عبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتا ہندوستان کی شہنشاہی قربان کر سکتا تھا۔ محلوں کی زندگی سے بیزار ہو سکتا تھا۔ تاج شاہی ٹھکرا سکتا تھا مگر نفس کی ایک حرارت جو زحل کو چھونا چاہتی تھی اس کی زندگی بن چکی تھی۔ وہ خاموش رہنے لگا۔ بار بار وہ اپنے دل سے سوال کرتا کہ کیا وہ زحل کو اپنی بہن بنا سکتا ہے! اور اسے جواب ہمیشہ نفی میں ملتا وہ سوچتا کہ زحل سے جھوٹ کہہ دے کہ وہ اسے بہن سمجھنے لگا ہے اور اس طور پر اس کا خیال تھا کہ وہ بے تکلف ہو جائے گی مگر اس ریاکاری اور منافقت کے لئے اس کا دل تیار نہ ہوتا وہ کہتا کہ یہ چلن تو بادشاہوں کا ہو سکتا ہے جنہیں تاج و تخت عزیز ہو۔ وہ جھوٹ بول سکتے ہیں، ریاکار بن سکتے ہیں ایک دل والا انسان ریاکار نہیں بن سکتا۔ زحل اس کی بہن بن سکتی ہے یا محبوبہ تیسری کوئی صورت نہیں۔

دارا ایک دن زحل کے یہاں گیا تو کچھ نئے مہمان دیکھے زحل نے بتایا کہ ایک برہمن خاندان ہے اور اس خاندان کا سردار جو کنوارا ہے اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا ہے۔ دارا سے زحل نے سوال کیا۔ "بھائی میں کیا جواب دوں۔ دارا انگاروں پر لوٹنے لگا اس نے جواب دیا۔ "کیا میں تمہیں اپنی بہن بنا لوں تو تم برہمن زادے سے شادی نہ کرو گی"
زحل نے جواب دیا۔ "لیکن ابھی تمہارا ارادہ کمزور ہے پہلے فیصلہ کر و پھر جواب دو۔" دارا اپنے ارادے کی کمزوری سے آگاہ تھا اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

زحل نے برہمن خاندان کو جواب دے دیا کہ ابھی شادی کی جلدی نہیں ہے میں سوچ کر جواب دوں گی۔

دارا نے اپنے نفس پر قابو پانے کے سب ہی جتن کر ڈالے وہ روزے رکھتا، نمازیں پڑھتا، راتیں یاد اللہ میں کاٹ دیتا مگر نفس شیر سے زیادہ بھوکا ہوتا ہے اور زندگی بری طرح نفس سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

دارا اور زحل کے تعلقات پر چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں دارا ایک پردیسی تھا اس لئے اس کی حرکتوں پر لوگوں کی کڑی نظر رہتی دارا کی عبادت ریاکاری اور ظاہرداری سے تعبیر کی جانے لگی آخر دارا اور زحل دونوں جوان تھے اور ایک جوان مرد اور ایک جوان عورت کا تنہائی میں ملنا دنیا والوں کی نگاہ میں علت سے خالی نہ تھا۔ سرائے کا داروغہ کہتا کہ دارا ایک بدوضع آدمی ہے وہ لڑکیوں کی عصمت لوٹتا ہے شہر والے داروغہ کی بات پر بھروسہ کرتے معاملہ حاکم تک پہنچا۔

حاکم نے زحل سے پوچھا تو اس نے بڑی جرأت سے جواب دیا کہ بھائی بہن کا رشتہ دل سے ہوتا ہے۔

جب دارا سے پوچھا گیا تو وہ چپ تھا اصرار پر اس نے کہا زحل مجھے اپنا بھائی سمجھتی ہے اور میں اسے اپنی محبوبہ سمجھتا ہوں۔

حاکم نے فیصلہ کیا کہ دارا فوراً شہر خالی کردے۔ اور اب اگر اس نے زحل سے ملنے کی کوشش کی تو اسے پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

دارا اور زحل کی زندگی ایک عجیب منزل پر کھڑی تھی زحل بہن تھی اور دارا عاشق تھا اور یہ گتھی سلجھائے نہ سلجھتی تھی۔

اورنگ زیب کو دارا کی تلاش تھی سرکاری جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ایک خوبصورت نوجوان بیجاپور میں مشتبہ حالات میں دیکھا گیا ہے اورنگ زیب نے مزید تحقیقات کی تو تصدیق ہوگئی کہ مشتبہ شخص دارا شکوہ ہی ہے چنانچہ دارا کی گرفتاری کے لئے سپاہیوں کا ایک دستہ بیجاپور بھیج دیا گیا۔

ادھر دارا نے فیصلہ کیا کہ وہ جان کی بازی لگا کر زحل سے ضرور ملے گا اور وہ زحل سے ملنے کے لئے اس کے گھر آیا دارا نے آج پہلی بار فیصلہ کیا کہ وہ زحل کو اپنی بہن سمجھے گا اور اس فیصلہ کا اعلان وہ زحل کے سامنے کرے گا ابھی وہ اپنے فیصلے کا اعلان نہیں کر سکا تھا کہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے مکان کا محاصرہ کیا زحل مردانہ وار سپاہیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ دارا کے سر پر ایک سپاہی کی تلوار چمک کر کوندی اور وہ تیورا کر زمین پر گرا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ بہن زحل۔ ادھر زحل زخموں سے لہولہان یہ کہتی ہوئی دارا سے بغل گیر ہوئی۔ میرے سوامی۔ میرے پتی دیوتا۔

زحل کی روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔ مگر دارا کے زخم مندمل ہو گئے۔

دارا اب اورنگ زیب کا قیدی تھا۔ مگر حالات میں یہ کیسا المناک تضاد تھا کہ زحل زندگی کی آخری ساعتوں میں دارا کی بیوی یا محبوبہ بنی اور دارا نے زحل کو اپنی بہن سمجھا۔

کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد دارا نے شادی نہ کی اور زحل کو اپنی بہن اور محبوبہ دونوں سمجھتا رہا۔

جذبات کی دنیا کا یہ عجیب فیصلہ تھا جس پر دارا شکوہ کبھی نادم نہیں ہوا۔

میری کامیاب

ازدواجی زندگی کا راز

(شاہین اقبال)

ہمارے لیڈیز کلب کی ممبر ایک اکیاسی سالہ خاتون ہیں جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس عمر میں بھی وہ سب سے جوان اور زندہ دل لگتی ہیں۔ مسز گرین والڈ بڑی محبت کرنے والی خاتون ہیں انھوں نے ساٹھ سال تک خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی گزاری ہے اور غالباً جرمنی میں طویل ترین ازدواجی زندگی کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

کلب کی گزشتہ میٹنگ میں ایک واقف کار خاتون خاصی پریشان حال نظر آئیں تو سب نے باری باری ان سے پوچھا کہ بھئی رنجیدگی کی وجہ کیا ہے ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن تمھاری شادی کو ہوئے ہیں اور یہی تو خوش رہنے اور ہنسنے چہکنے کے دن ہیں۔

خاتون پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں احباب کی ہمدردیاں ملیں تو ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ہماری اکیاسی سالہ جوان دوست مسز گرین والڈ آگے بڑھیں تو بیاہتا خاتون کو گلے لگا لیا اور بڑی شفقت سے پوچھا "مائی چائلڈ کیا بات ہے؟"

خاتون زار و قطار رونے لگیں اور مسز گرین سے تقریباً جھگڑتے ہوئے بولیں۔ "آپ نے ساٹھ سال اپنے شوہر نامدار کے ساتھ کیسے گزار لئے مجھ سے تو ساٹھ دن بھی نہیں گزر رہے۔"

مسز گرین والڈ کے بوڑھے چہرے پر تشویش کے گہرے سائے نظر آنے لگے انھوں نے روتی ہوئی خاتون کو دلاسا دیا اور ساری خواتین کو مخاطب کر کے بولیں۔ "مائی ڈیر چلڈرن۔ سب اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ جائیں میں آپ سے کچھ کام کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

کلب میں موجود خواتین اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور ہمہ تن گوش ہوگئیں۔ مسز گرین والڈ بولیں۔ "میری بچو! شوہر کو اپنے سب سے چھوٹے بچے سے سال بھر چھوٹا سمجھو۔ اور اگر بچے نہیں ہیں تو سمجھو کہ یہی تمھارا اکلوتا راج دلارا آنکھ کا تارا بچہ ہے ایسا بچہ جو بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا ہے اور یہ تمھارا پہلا اور آخری بچہ ہے۔ اس کے بعد چاہے دس بچے پیدا کرو مگر شوہر کے لئے اکلوتے بچے والا فارمولا ترک نہ کرو۔"

بڑی بی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سیانوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ محبت معدے کے راستے ہوکر دل تک پہنچتی ہے لہٰذا اپنے شوہر کے لئے عمدہ سے عمدہ چیزیں پکاؤ اور صرف پکا کے ہی فارغ نہ ہو جاؤ بلکہ محبت و شفقت سے اسے پیش کرو۔ اور پیار سے کھلاؤ۔ شوہر چھوٹا ہے تو سمجھو کہ مزیدار کھانوں کے ذریعے اسکا دل جیتنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ البتہ شوہر اگر چھوٹا نہیں تو اسے چھوٹا بناؤ ایک ہفتے لذیذ اور شاندار کھانے کھلانے کے بعد دو دن اسے نہایت بُرے اور بدمزہ کھانے دو تاکہ اسے اچھے اور بُرے کھانے میں تمیز ہو سکے بس تھوڑا سا وقت چاہیئے اور تھوڑی سی محنت اسے چھوٹا بننے میں دیر نہیں لگے گی اور پھر اس کی لگام آپ کے اپنے ہاتھ میں ہوگی۔

مسز گرین والڈ نے ہم سب کو ذرا ڈانٹتے اور ڈپٹتے ہوئے کہا۔ دیکھو گھر کا کوئی کام شوہر کی دلداری کرنے سے زیادہ اہم نہیں ہوتا شوہر کے چھوٹے بڑے سارے کام اس کے سامنے اپنے ہاتھوں سے کرو اور ساتھ ساتھ اسے احساس بھی دلاتی جاؤ کہ بس شوہر کی ذات اور اس کے کام ہی آپ کی زندگی کا اصل مقصد ہیں۔ شوہر سے پیار کرنے میں پہل کرو۔

میں مسز گرین والڈ کے چہرے پر نظریں جمائے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی میرے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون نے تقریباً چیخ کر کہا۔ (یہ چیخ دائیں اور بائیں بیٹھی خواتین نے بھی سنی) "یہ ہم سے نہیں ہوتا۔"

مسز گرین نے شاید حکم عدولی کا یہ فقرہ سن لیا تھا خفا ہو کے بولیں۔ "کیوں نہیں ہوتا؟ آخر شوہر تمھارا اپنا شوہر ہے اس کی خوشیاں اور تمہاری خوشیاں ایک ہیں یہ بالکل ہو سکتا ہے۔"

ایک ماڈرن اور خود مختار سوسائٹی کی پروردہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسز گرین والڈ بولیں۔ میری بچو! یاد رکھو شوہر کے بغیر کسی معاشرے میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جس عورت کے ساتھ ایک مرد ہوتا ہے اسے کوئی کمینہ شخص ایکسپلائٹ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا مرد کا دبدبہ ہی بہت ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی ہی کافی ہوتی ہے اور کجا یہ کہ شوہر کماتا بھی ہو، آپ سے محبت بھی کرتا ہو آپ کا اور آپ کے بچوں کا نگہبان ہو اور آپ کی ساری ضروریات کا کفیل بھی ہو۔

مجھے زندگی میں پہلی بار آہستہ آہستہ اپنے میاں کی اہمیت معلوم ہو رہی تھی اس میں آخر میرا قصور بھی کیا تھا۔ میں نے اپنی خواہشوں کو دباتے ہوئے سوچا۔ اس سے پہلے کسی مسز گرین والڈ نے حقیقت حال واضح بھی تو نہیں کی تھی۔ اب اگلی پچھلی ہلکی پھلکی لڑائیاں اور زیادتیاں بھی یاد آنے لگیں۔ مگر میں نے ان کو کمال ہوشیاری سے دبا لیا اور سر نہ اٹھانے دیا۔ ان سب

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ ہر ماہ ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے۔ نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے۔ ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

▲ ۱۲ر فروری ۸۵ء کی صبح صادق میں ۵ بجکر ۳۰ منٹ پر بمقام برمنگھم انگلینڈ۔ میری منھ بولی بیٹی مسز عائشہ داود پاریکھ (دختر نیک اختر مرحوم یوسف محمد پاریکھ صاحب) کے بیٹے محمد داؤد سلمۂ اور یاسمین سلمہا کو اللہ پاک نے ایک فرزند اور ایک دختر کے بعد ایک اور فرزند عطا فرمایا۔ بچے کا نام عائشہ سلمہا نے اپنے چچا کے نام پر احمد رکھا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے اور اپنے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
(نسیم انہونوی)

▲ کوثر ترنم۔ مدثر انجم (آمور) ہماری آنٹی فہمیدہ نسرین اور انکل نثار احمد کو اللہ پاک نے ۸ر اپریل ۸۵ء بروز پیر ۳ بجے شب میں پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد عثمان عرف اصفار احمد رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

▲ کاکا۔ سمیرا۔ سمیّہ (عمر آباد) ہمارے ماما بشیر احمد اور مامی بی شمیم بانو کو اللہ پاک نے ۲۲ر مارچ ۸۵ء بروز جمعہ تیسرا فرزند عطا فرمایا نام عبداللہ نصیف رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عمر طویل بخشے اور فخر ملک وملت بنائے۔

پیغامات نشاط

▲ مس شیریں محمود (دھنباد) میرے ماموں

محمد سیف الرحمٰن صاحب کی شادی محترمہ شہلا (بنت اشفاق احمد) کے ہمراہ، بمقام بستی پوز نجیر وخوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ دونوں کو ہمیشہ شاد آباد رکھے۔

▲ میری بڑی ہی دیندار اور مخیر بہن فاطمہ ملک صاحبہ کا ذکر بزم حریم کے کالموں میں اکثر آچکا ہے۔ موصوفہ ویسٹ مڈلینڈ انگلینڈ میں رہتی ہیں مجھ سے ملنے لکھنؤ بھی ایک بار تشریف لاچکی ہیں ان کی زندگی قابل رشک ہے جو مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے گویا وقف رہتی ہے۔ وہ صاحب ثروت نہیں۔ لیکن دل غنی رکھتی ہیں۔ ہر سال ہزارہا روپیہ حاجت مندوں، مسکینوں اور یتیموں کے لئے میرے ہی ذریعے سے تقسیم کراتی ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور اس کار خیر کا انھیں اجر عطا فرمائے۔

بہن فاطمہ ملک صاحبہ کی صاحبزادی ناہید سلمہا کی تقریب عقد نکاح ۴ر نومبر ۸۴ء کو عزیزی جمیل بھٹی سلمۂ (فرزند جناب مفضل حسین بھٹی صاحب) عمل میں آئی تھی۔ ۲۷ر جنوری ۸۵ء کو بہن موصوفہ کی رہائش گاہ واقع ہربکن ڈرائیو میں رخصتی کی رسم بھی نہایت سادگی سے عمل میں آئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ناہید وجمیل سلمہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور باہم شیر وشکر ہوکر زندگی گزاریں۔
(نسیم انہونوی)

▲ میرے محب صادق جناب بھوج راج صاحب مالک ماڈرن بکڈپو نینی تال کے فرزند دل کی شادی آنجہانی شری ہربنس لال بترا کی بیٹی نیلم کے ہمراہ ۱۷ر ۱۸ر اپریل ۸۵ء کی درمیانی شب میں دلہن کی قیام گاہ ماہ نگر لکھنؤ میں بحسن وخوبی انجام پائی۔ اس سلسلے میں بھوج راج صاحب نے ۱۹ر اپریل ۸۵ء کی شام کو ہوٹل میٹرو پول نینی تال میں دولہا دلہن سے ملنے کے لئے اپنے اعزہ اقربا اور معززین کو دعوت دی۔ دعا ہے کہ دل ونیلم کی جوڑی ہمیشہ شاد وخرم رہے۔
(نسیم انہونوی)

▲ صبیحہ انجم خاں سلمہا۔ (دختر نیک اختر جناب محمد مصطفیٰ خاں صاحب) کی شادی بشارت اللہ خاں سلمۂ (فرزند چودھری عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم۔ ہری ہر پور۔ گونڈہ)

کے ہمراہ عزیز بلڈنگ بھنڈی بازار میں ۱۱ر اپریل ۱۹۸۵ء کو بصد شان و شوکت انجام پائی۔ صمیم قلب سے محترمہ بیگم عبدالعزیز خان صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک صبیحہ اور بشارت اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ کی ازدواجی زندگی کو سدا بہار بنائے۔ (نسیم انہونوی)

▲ جناب شمس علوی صاحب مالک ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی صاحبزادی عائشہ خاطمہ علوی عرف نازش سلمہا کی شادی شکیل اشرف سلمہٗ (خلف انوار اشرف صاحب) کے ہمراہ ۲ر اپریل کی شام کو شمس صاحب کی رہائش گاہ نعمت اللہ بلڈنگ لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس تقریب سعید میں علمی ادبی حلقوں کے تمام مقتدر حضرات کے ساتھ ہی عمائدین شہر نے بھی شرکت فرمائی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ تنزیل الرحمٰن صاحب شمسی (دہلی بھیت) کی صاحبزادی شبانہ بی سلمہا کی شادی محمد نعیم شمسی سلمہٗ (پسر جناب محمد ایوب شمسی کالی) کے ہمراہ ۹ر اپریل ۱۹۸۵ء کو بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ تبسم بانو سلمہا (دختر نیک اختر جناب محمد علی شاہ علی بک سنٹر دھرپوری۔ فلقار) کی شادی شیر محمد بابو سلمہٗ (فرزند جناب عبدالرزاق سیٹھ۔ مندسور) کے ہمراہ ۱۵ر اپریل ۱۹۸۵ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ شفیق احمد صاحب (دہارپور) کی دختر نیک اختر نیر تبسم سلمہا کی شادی شمشاد الحسن سلمہٗ (فرزند چراغ الحسن صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۱۴ر اپریل ۱۹۸۵ء کی شب میں بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ پاک مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ ڈاکٹر اطہر علی صدیقی صاحب ڈگیٹ ملک گنیتی لکھنؤ کی بھتیجی شبنم بانو سلمہا کا نکاح مسنونہ چودھری عبدالعزیز سلمہٗ (فرزند چودھری عبدالباری صاحب مرحوم۔ سلون۔ رائے بریلی) کے ہمراہ ۱۴ر اپریل ۱۹۸۵ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ اے۔ قادر ایوب صاحب (بنگلور) کی صاحبزادی نفیسہ کوثر سلمہا کی شادی ارشاد احمد سلمہٗ (پسر سلیمان قاسم سیٹھ صاحب) ۱۲ر اپریل ۱۹۸۵ء کی سہ پہر کو بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

▲ محمد قسیم شمسی صاحب۔ (کانپور) کی صاحبزادی عائشہ نزہت کی شادی مسعود اختر سلمہٗ (فرزند حاجی محمد شمیم صاحب۔ کانپور) کے ہمراہ ۱۲ر اپریل ۱۹۸۵ء کی شام کو بنگلہ سلطان نیازی صاحب ایڈوکیٹ — پریڈ کانپور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

▲ اردو کے مشہور ادیب و افسانہ نگار رئیس اختر صاحب فیض آبادی کی بھتیجی اور جناب منظر علی عابدی۔ ایس۔ ڈی۔ آئی کی صاحبزادی عزیزی نورِ فاطمہ سلمہا کا نکاح سید محمد جعفر سلمہٗ (فرزند دلبند سید محمد ثامن صاحب مرحوم) کے ساتھ ۲ر مئی ۱۹۸۵ء کی شام کو بمقام امام باڑہ فیض آباد بحسن و خوبی انجام پائی اس موقع پر اعزہ، اقربا کے ساتھ ہی عمائدین شہر نے بھی شرکت کی۔ افسوس کہ میں اپنی علالت کے باعث شرکت نہ کر سکا بہرحال رئیس صاحب اور منظر صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک نور فاطمہ اور سید محمد جعفر سلمہ اللہ تعالیٰ کی ازدواجی زندگی کو ہمیشہ پر بہار رکھے۔ (نسیم انہونوی)

▲ مس عاصمہ نشاد (پرنام بٹ) میرے دیرینہ شفیق احمد (فرزند جناب کو کلوکار رشید احمد) کی شادی فرحت بتول (بنت جناب چیا منظور الحق) کے ہمراہ ۲۴ر مارچ ۱۹۸۵ء بروز اتوار بمقام آمبور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

انتقالِ پُرملال کی خبریں

▲ میرے قدیم دوست، جناب عزیز صاحب مرحوم بانی بمبئی الکٹرک کمپنی لاٹوش روڈ کی اہلیہ صاحبہ ۳ر مارچ ۱۹۸۵ء کی جمعہ، ۴ بجے لکھنؤ کے بلرامپور اسپتال میں رحلت فرما گئیں۔ گذشتہ ہی سال قلبی تکلیف ہونے پر ان کے پیس میکر لگایا گیا تھا۔ لیکن موت کے صد ہا بہانے ہوتے ہیں، دوسری تکالیف میں مبتلا ہو کر اسپتال میں داخل ہوئی تھیں۔ مرحومہ نے پانچ بیٹے اور کئی بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

▲ حاجی اصطفیٰ خاں صاحب مرحوم، مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ کے فرزند اکبر حاجی اکبر علی خاں صاحب ۱۰ر اپریل کی شب میں بمقام علی گڑھ انتقال ہو گیا۔ مرحوم اپنی چھوٹی صاحبزادی کے یہاں مقیم تھے۔ تدفین مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ صاحب

مرحوم کے پانسنتی اور اپنی والدہ مرحومہ کے بغل میں ہوئی۔ حاجی اکبر علی صاحب بڑے ہی نیک نفس پابند صوم و صلوٰۃ اور ہر دل عزیز تھے مرحوم کے صاحبزادے مظہر علی خاں صاحب مدینہ منورہ میں رہتے ہیں ان کے علاوہ مرحوم کی یادگار دو بیٹیاں بھی ہیں۔

• صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی کے برادر نسبتی سید احتشام علی صاحب کا ۵ اپریل ۸۵ء کو فاطمہ اسپتال لکھنؤ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے بعمر ۴۸ سال انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک مشہور و معروف علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور کشور خطابت کے مشہور خطیب جناب مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ نونہروی اعلی اللہ مقامہ کے داماد تھے تدفین غفران مآب کے امام باڑے میں ہوئی پسماندگان میں والدہ اور دو بہنوں کے علاوہ اہلیہ ایک بیٹی اور ایک بیٹے ہیں۔ خدا پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے تمام حریمی بہنوں سے سورہ فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرنے کی استدعا ہے۔

(نسیم انہونوی)

• راجہ یونس (اونا کنٹ) میرے چچا زاد بھائی محمد موسیٰ سیٹھ صاحب ۷ ارنومبر ۸۴ء بروز ہفتہ رات کے ۱۲ بج کر ۱۵ منٹ پر حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ اپنی یادگار ایک بیوہ اور دو لڑکے چھوڑے ہیں مرحوم پابند صوم و صلوٰۃ اور بزرگان دین کے بڑے معتقد تھے اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• فیروزہ مظاہر۔ (دارا ناسی کینٹ) نہایت ہی رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری والدہ ماجدہ کنیز فاطمہ صاحبہ ۸ مارچ ۸۵ء بروز جمعرات بوقت ۷ بجے شام رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بڑی دیندار مومنہ تھیں اور ہم چھ بہنوں کے لئے ان کی مقدس ہستی نعمت تھی ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب بہنوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ حریمی بہنوں سے درخواست ہے کہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

• آر، ایو، اودا جی (موٹا اوراچی) کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حریم کی قدیم خریدار بہن سنرا کے انکو صاحبہ کا ۱۳ مارچ ۸۵ء کو اچانک انتقال ہو گیا مرحومہ کو انتقال سے پہلے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

(بقیہ میری کامیاب ازدواجی زندگی)

سالوں کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ باوجود ہر بات کے بھی ان یوروپین بیویوں کی طرح نہ تو کبھی میاں کو چھوڑنے کا خیال آیا نہ کبھی اسے ناپسندیدہ شخص قرار دیا۔

مسز گرین والڈ نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولیں تم چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ اور لائق فائق کیوں نہ ہو۔ اپنی قابلیت اور علمیت کا رعب میاں پر نہ ڈالو۔ میاں گھر سے باہر دوست احباب کے حلقے میں اس بات پر فخر تو کر سکتا ہے مگر آپ کے رعب تلے نہیں آ سکتا۔ آپ اس کے نزدیک صرف ایک عزیز سی ملکیت ہیں اس نے آپ کو خریدا نہیں ہوتا مگر سمجھتا زر خرید بیوی ہی ہے۔ اسے یہ سمجھنے دیں اور اس کا مان نہ توڑیں۔ شوہر کی اکثر و بیشتر زیادتیوں کو برداشت کر لیں کہ شوہر اس زیادتی کے بدلے میں آپ کو بہت کچھ دیتا ہے حالانکہ اس دنیا میں ایسے بہت سے کمینے لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ زیادتیاں کرتے ہیں مگر۔ سوری تک نہیں کہتے اور پھر زیادتی اس کے ساتھ کی جاتی ہے جسے انسان اپنا سمجھے اور اپنے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلے پر تل جائے یا بدلہ لینے کا سوچے۔

ہماری ناصح بولیں ۔ دیکھو شوہر ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ صرف پیار کیا جا سکتا ہے۔

ہاں ظاہر ہے۔ میں نے سوچا کہ تمھاری ساٹھ سالہ ازدواجی زندگی کا راز بھی اسی میں ہے۔

ہماری سینئر دوست نے تو اس جملے کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر دی مگر ہم سب کو سوچ بچار کے ایک سمندر میں ڈھکیل دیا۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی راہ لے رہی تھیں مگر کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی جیسے صرف اپنے اندر جھانکنے میں مصروف ہو۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی بھی کامیابی کا راز قربانی اور مسلسل قربانی میں ہے۔ آپ اپنی خوشیاں دوسروں کی خوشیوں پر قربان کر دیں اپنا آپ تیاگ دیں شوہر کو اپنے اوپر طاری کر لیں۔ تو پھر یقیناً ایک شاندار ازدواجی زندگی گزر سکتی ہے۔ بہرحال سودا یہ بھی برا نہیں۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو —— سنجیدہ اور موزوں ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ چھپنے والے مہینے سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہونے والے اشعار ہی شائع کئے جاتے ہیں جون کے لئے مقررہ عنوان ہے "اضطراب" اور جولائی کے لئے "شکوہ یا شکوے"

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مرسلہ:۔ سہیلا بانو (ہاسن)

مرسلہ:۔ وحیدہ خانم (کلکتہ)

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ۔ لال باغ لکھنؤ

واقف نہیں تم اپنی نگاہوں کے اثر سے
اس راز کو پوچھو کسی برباد نظر سے

مرسلہ:۔ قرۃ العین (سندبال)

چلا آئے جس سے وہ حسنِ گریزاں
دعاؤں میں ایسا اثر ڈھونڈھتا ہوں

مرسلہ:۔ امروز جہاں (آرہ)

طبیعت اور ہے شائستۂ نغمہ جو ہوتی ہے
اثر ہوتا نہیں پتھر پہ نغماتِ عنادل کا

مرسلہ:۔ نجم النصار (کھٹکل)

یارب مری دعاؤں کو اتنا اثر ملے
جب بھی نظر اٹھاؤں تو اس سے نظر ملے

مرسلہ:۔ سمیعہ صبا (آمبور)

کیا اثر حسن میں ہوتا ہے الٰہی توبہ
اُن کا منہ پھیر کے جانا مرا دیکھا کرنا

حیدر۔ لکھنوی

بے اثر ہوتے نہیں آنسو کسی ناکام کے
تجھکو بھی رونا پڑے گا ایک دن دل تھام کے

مرسلہ:۔ امتیاز کاظمی۔ ایم۔ اے (مظفرپور)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

مرسلہ:۔ راحت نکہت (آمبور)

شدتِ دردِ جدائی کا یہ ہوتا ہے اثر
آنکھ کے سامنے آجاتی ہے صورت ان کی

مرسلہ:۔ عرب نیلو فر زبیر (کلیان)

ہماری یاد آجائے تو ضبطِ غم بھی کر لینا
عزیزوں کے بچھڑنے کا نہ تم دل پر اثر لینا

مرسلہ:۔ نور جبین دل افروز (رجہت نوادہ)

صرفِ فغاں ہوا جو فراق بنی میں دل
نالوں میں خود بخود مرے پیدا اثر ہوا

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

دعا جب بے اثر ٹھہری تو پھر حکم دعا کیوں تھا
بری باتوں سے نفرت تھی تو منہ میں کیوں زباں کھدی

مرسلہ:۔ اقبال سلطانہ (محبوب نگر)

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

مرسلہ:۔ ناہید شمس و میسور (کرناٹک)

نظر آجاتا ہے مسجد میں کبھی تو عید کے دن
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

مرسلہ:۔ آفتاب حاجی سیٹھ (جین پٹن)

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

مرسلہ:۔ ب۔ ن آنسہ ابراہیم (بنگلور)

میری آہ بے اثر ہے تو اثر کہاں سے لاؤں
ترے قلب تک جو پہنچے وہ نظر کہاں سے لاؤں

مرسلہ:۔ گلنار جبیں (آمبور)

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

مرسلہ:۔ شیریں سحر (دھنباد)

• سحر صاحبہ جون کے لئے آپ کا شعر ناموزوں ہے نہ چھپ سکے گا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے۔" سعید صاحب گرجے۔

"میں یہ عرض کر رہا تھا جناب کہ آپ ان کے سامنے خفت اور سبکی نہ [illegible] ان کو آپ کی صاحبزادی چاہئیں۔ آپ دوسری بچی سے ان کا رشتہ کر دیجئے اور براہِ کرم صاحبزادی کو ہمیں دے دیجئے۔ ہم ایک بہترین اور مناسب رشتے کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔ جو آپ کو ہرگز ناپسند نہ ہوگا!"

"میں نہیں سمجھا یہاں۔ صاف صاف کہو۔" سعید صاحب بولے۔

"آپ الیاس احمد سے تو بخوبی واقف ہیں۔" شباہت صاحب نے کہا۔ "ان کے والد سے آپ کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ الیاس کی حیثیت۔ آپ پر واضح ہے۔ شریف ہیں۔ مہذب ہیں، تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے کاروبار سے بھی آپ ناواقف نہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں جناب کہ اشتیاق حسین صاحب کے صاحبزادے سے الیاس احمد بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر جیسا آپ مناسب فرمائیں! شاید آپ کو یہ اعتراض ہو کہ ان کے دو بچے ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے سے مشفق پرہیزگار، شریف، رحمدل اور نیک انسان کو بن ماں کے بچوں کی موجودگی پر خدانخواستہ کوئی اعتراض ہوگا۔ ان معصوموں کو ایک چاہنے والی ماں کی ضرورت ہے اور آپ خوب جانتے ہیں۔"

"جزاک اللہ۔ مرحبا۔" دفعتاً سعید صاحب نے کہا۔ "شباہت بیٹے خدا تم کو سلامت رکھے۔ تم نے یہ بات خوب سوچی۔ میری عزت آبرو بھی رہ گئی۔ صاحبزادی کو اچھا گھر مل گیا۔ اور بچوں کو ان کی ماں۔ ہاں، میں اشتیاق صاحب سے کہوں گا کہ اگر وہ چاہیں تو عزیزی اکرام اللہ کا عقد [illegible]

[illegible] خدا خدا کر کے آدھی رات کے قریب شباہت کو [illegible] اترا۔ حواس درست ہوئے۔ [illegible] کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑا وہ دل ہی دل میں [illegible] کہ ماریہ اپنی نحوست اپنے ساتھ لیتی گئی۔ وہ دعا مانگ [illegible] پلٹ جائے وہ اپنی تجویز واپس لے لیں۔

الیاس احمد کے نکاح کے دن ماریہ نے بہت خوشامد سے ان سے کہا تھا۔

"میں ذرا گھر کی سجاوٹ کر دوں گی۔ نئی بھابی سے اچھی طرح باتیں کروں گی مجھے آج ایک دن کی چھٹی اور دے دیجئے وہ تو آپ کے اتنے دوست ہیں کیا آپ کی بات نہ مانیں گے۔"

الیاس احمد اپنے گھر واپس آگئے تھے۔ ماریہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ الیاس احمد نے اماں سے کہا تھا کہ اس موقع پر سفینہ مرحومہ کی بڑی بہن۔ الیاس احمد کے دوسرے عزیز اقارب کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بصورت دیگر شکایت پیدا ہوگی۔ لہٰذا اماں نے انھیں اجازت دے دی تھی۔ الیاس احمد نے خود ایک ایک کے گھر جا کے صورتحال سے سب کو آگاہ کیا تھا اور ان کی مجبوری کے تحت سب نے انھیں حق بجانب سمجھتے ہوئے انھیں عقد ثانی کی اجازت دے دی تھی اکثر خواتین تو ان کے ساتھ چلی بھی آئی تھیں۔

دوسرے مہمان بھی شام تک پہنچ گئے اور بعد نماز مغرب [illegible] نکاح منعقد ہو گیا۔ مختصر [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔ آپ نے میری بڑی عزت افزائی کی۔ مجھے بہت بڑا مرتبہ عطا
[illegible]۔۔۔۔
[illegible] معاف کریں۔
"آج شام میں فرزانہ سے ملا تھا۔ اس نے آپ کی حماقت کی ساری کہانی مجھ
سے کہہ دی۔" شباہت نے کہا۔ "اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اپنے، لڑکی اپنے
[illegible] اور ایسے غیرے کے سامنے اس طرح مجھے بدنام کرنے میری عزت اور نیک نامی
کو اچھالنے کا مطلب کیا تھا۔؟"
"یہ میری بدقسمتی ہے شباہت صاحب کہ آپ کسی کی نظریں نہیں پہچانتے" یہ فرزانہ
نے [illegible] کر جواب دیا۔
"پاگل ہو گئی ہو [illegible] سعید صاحب" شباہت نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم تینوں
طرف سے خسارے میں رہو گی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں ایک بہن کی نظروں سے دیکھا ہے
لہذا تمہارے کسی احمقانہ جذبے کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔ تم اس کے دل میں بھی گھر
نہ کر سکو گی۔ اگر اسے تمہاری حماقت کا پتہ چل جائے گا اور تم اشتیاق حسین صاحب
کی بہو بن کر خوش نہ رہ سکو گی۔ پھر تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے۔ تم نے اپنے لئے کیا سوچا؟"
وہ سسکیاں لینے لگی۔ "شباہت صاحب آدمی دل سے مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ
کو کیا معلوم۔ میں آپ کے علم و فن کی کتنی قدردان ہوں۔ میری پرستاری کی کیا خاک ہے
[illegible] آپ کو اپنے دل میں کیا درجہ دے رکھا ہے۔ آپ مجھے اس بیدردی سے کسی
[illegible] آپ کے سوا کسی اور کا ——"
"[illegible] بند کرو۔" شباہت نے ڈانٹ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "اتنی پاگل
[illegible] رمزانہ [illegible]
[illegible] بات کہوں۔"

سمجھایا، دھمکیاں دیں۔ مگر وہ ہنستے رہے، کہتے رہے۔
"وہم ہو گیا ہے اسے۔ آپ اس کو سمجھائیے کہ زندگی برباد نہ کرے۔ میں
ان چیزوں کو نہیں مانتا۔ کیا کسی کی موت و زندگی کسی دوسرے کے وجود
نحوست و برکت سے وابستہ ہوتی ہے؟ [illegible] ہر کام کا سبب اللہ
ہوتے ہیں۔ اماں۔ تعجب ہے کہ آپ اتنی مذہبی ہو کر بھی ان چیزوں کو مانتی ہیں؟"
"مگر میاں۔ وہ ان گنت واقعات ——" اماں ہکلائیں۔ "مجھے
بتائیے۔ جس خاندان میں ماریہ نہیں ہے۔ کیا اس خاندان کے لوگوں کو
موت نہیں آئے گی۔ کیا وہ لافانی ہیں؟ پھر ماریہ کا وجود منحوس کیوں ہے
وہ ناقص العقل ہے۔ اس کے دماغ میں ایک بات بیٹھ گئی ہے۔ آپ
میرے نظریے سے اسے قائل کیجئے۔"
اماں بھی کچھ کچھ قائل ہو گئیں اور ماریہ کو سمجھایا کہ وہ کبھی وہم نہ کرے
موت و حیات سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ماریہ تباہی کا فرشتہ نہیں۔"
لیکن ماریہ کو قائل کرنا آسان نہ تھا۔ بظاہر تو وہ خاموش ہو گئی۔
اور پھر اس کے بیاہ کی بھی سیدھی سادی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس
عرصے میں اتفاقاً شباہت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ معمولی سا نزلہ تھا
جس نے آناً فاناً انفلوئنزے کی شکل اختیار کر لی۔ سارا وقت وہ بہن بھائیوں
کے درمیان نیچے ہی دالان میں رہے۔ اور بے چین رہے۔ ان کی خفیف
سی تکلیف بھی اماں کے لئے پہاڑ بن جاتی تھی۔ اب تو ایک وہم بھی
ہماری کی طرح اپنے پنجے گاڑے ان کے دماغ میں کچھ کے [illegible] ایک
دن [illegible] نکاح [illegible] تھا اور [illegible] بیماری — اماں کا دل [illegible]
تھا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے [illegible] کے آثار [illegible] کے سامنے

اور تم نے محبت کے معنی نہیں سمجھے۔ محبت قربانی مانگتی ہے محبت وسیع الظرفی
مانگتی ہے محبت ہمیشہ خاموش رہتی ہے! اگر تم واقعی محبت کی دعوے دار
ہو تو محبت کے تقاضے بھی پورے کرو۔

"آپ پر سے قربان ہو جاؤں میں؟"

رضوانہ۔ لڑکیوں کے اظہار محبت کو میں بہت رکیک شرمناک اور معیار سے
گری ہوئی حرکت سمجھتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارا وہ مقام جو میری نگاہوں میں
تھا وہ گرتا جا رہا ہے۔ تم ایک حیادار، آبرومند، شرمیلی خاموش اور بے زبان مشرقی
لڑکی نہیں۔ فلمی ہیروئن معلوم ہوتی ہو میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ اپنا مسلک
بدلو۔ اپنے خیالات کو جلا کرو۔ خود کو کچھ بلند کرو، جب تم میرے سامنے آؤ یا
میرے قریب جاؤ کرو تو جھجک اور شرم نہ محسوس کرو۔ بس جو کچھ مجھے کہنا تھا
میں نے کہہ دیا۔ اب تم جا سکتی ہو۔ ٹھنڈے دل سے میری باتوں پر غور کرنا۔
تمہارا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم ایک محبت کے قابل گرہست خاتون
بھی بن سکتی ہو۔ ایک قابل نفرت ہستی بھی۔ تمہاری مرضی جیسی حیثیت چاہو
اختیار کرو۔ لیکن اگر تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی ملوث کیا تو میں نہیں کہہ سکتا پھر میرا
سلوک تمہارے ساتھ کیسا ہوگا۔ جاؤ اچھی طرح سوچو۔ خدا حافظ۔"

انھوں نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر دیا صبح کو معلوم
ہوا کہ رضوانہ اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی۔! شباہت نے اطمینان کی
گہری سانس لی۔

[illegible] کے بعد ماریہ بحران کھسنے کا فی دے گئی۔ اب
[illegible]

بعد وقت کے شباہت نے اپنی مرضی اور پسند نوشابہ کے ذریعہ اماں کو کہلا بھیجا
تھی۔

اماں نے بڑی حیرت سے کہا۔ "ذہین۔ جس بہو پسند آئی ہے تو اچھی بات۔ [illegible]
اللہ کا احسان ہے ٹھکانے سے تو لگے۔ میں تو سمجھتی تھی ہمیشہ ہی خانہ بدوش رہیں گے"
انھوں نے ایک حسرت بھری سانس لی اور چپ ہو گئیں۔

"اماں آپ کو ماریہ اچھی نہیں لگی کیا۔۔" نوشابہ نے پوچھا۔

"بی بی میں تو تمہاری ایسی کرنی چاہتی تھی۔۔" اماں نے کہا۔۔ "مگر اب کہاں
ملے گی ایسی ہونہار، گرہست، شائستہ ہو۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ زندگی جسے گزارنی ہے
اسی کو پسند ہے تو میری بھی بلا سے۔"

"اماں انھوں نے یہ بھی کہلایا ہے کہ دونوں نکاح ایک ساتھ ہو جائیں گے پہلے
الیاس بھائی رضوانہ کو رخصت کرا کے لائیں گے۔۔" نوشابہ نے کہا۔ "پھر دونوں
بھائی صاحب کے نکاح میں شرکت کریں گے اور بعد کو اپنے گھر جائیں گے۔"

"میں تو تھوڑی کچھ نہیں سمجھی" اماں نے پھر آنکھیں پھاڑیں۔۔ "بیشک الیاس
بیوی کو رخصت کرا کے یہیں لائیں گے۔ مگر شباہت کی ہونے والی بیوی اس گھر میں
کیسے بنی رہے گی۔ حیا نہ لگے گی اسے؟ واہ بلاؤ شباہت کو میں پوچھوں کہ کیا
کچھ کبھی بڑی ماریہ سے ہوئی ہے۔" "مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ماریہ کو میں اس کے
گھر سے رخصت کرا کے لاؤں گی۔"

"بھائی جان کالج گئے ہیں۔" نوشابہ نے اطلاع دی۔

اماں بڑبڑاتی رہیں۔

دفعتہً وہاں ماریہ آ گئی اس وقت اس کے چہرے پر [illegible]
[illegible] اماں کے سامنے [illegible]

ارے بھائی وہ کوئی حادثہ ہمارے یہاں نہ کرادیں۔" ممّون اچھل پڑا۔ "توبہ!" وجاہت نے کہا
بھائی جان آرہے ہیں۔" عظمت نے کہا ۔۔۔۔ "عظمت!" انھوں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"جی!" عظمت نے مستعدی سے کہا۔

"کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے مجھے۔" انھوں نے کہا۔ "سانس رکی جارہی ہے اور دم
گھبرا رہا ہے۔ ذرا میری نبض تو دیکھنا۔"

"ابھی آپ کمزور ہیں۔ کچھ کم تکلیف تھی آپ کو۔" عظمت نے جھپٹ کر ان کی نبض تھام
لی اور ممّون سے کہا کہ فوراً اسٹیتھس کوپ لے آئے۔ ممّون بھاگ کر مطلوبہ آلہ لے آیا۔
عظمت نے انھیں لٹایا اور آلہ ان کے سینے پر رکھ دیا۔ شباہت نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں
بند کرلیں۔ اس وقت کا ماحول اتنا متاثر کن ہو گیا تھا کہ اماں یکایک بے ضبط ہو کر رو پڑیں
سب لوگ پریشان ہو گئے۔ خود شباہت کا یہ حال ہوا کہ ایک بارگی سفید ہو گئے۔

"اماں۔ یہ کیا۔ آپ بدشگونی ۔۔۔۔" عظمت ہکلا گئے۔

"خدا کے لئے انھیں منع کرو۔ وہ منحوس چھلپائی میرے گھر میں نہ آئے۔" اماں اب
آپے سے باہر تھیں۔

"بھائی جان آپ پر ہلکا سا نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا ہے۔ ویسے آپ بالکل
ٹھیک ہیں زیادہ کوئی بات مت سوچیے اور اتنا زیادہ لکھیے پڑھیے بھی نہیں۔" عظمت
نے مشورہ دیا۔ "بہتر ہو کہ آپ دو ہفتوں کی چھٹی لے لیں۔ آرام آپ کے لئے بہت
ضروری ہے ۔۔۔ اماں آپ خواہ مخواہ رو رہی ہیں۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جی قابو میں نہیں۔" اماں بولیں۔
عین اسی وقت کسی نے بڑی دہشتناک آواز میں ڈاکٹر صاحب کو آواز دی۔
"خدا خیر کرے ۔۔۔!" ممّون کے منہ سے نکلا اور وہ بھاگتا ہوا باہر گیا۔ دو ہی لمحوں بعد
وہ آگیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لب کانپ رہے تھے۔ "سب بھی نکل چکیں

"پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہے۔" وجاہت اور اماں بہت مضطرب تھے۔ شباہت الگ
تھلگ ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑے آپریشن روم کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے ان
کے چہرے سے معلوم کرنا دشوار نہ تھا کہ ان کی شخصیت میں کتنا زبردست زلزلہ آیا ہے اور
ارمانوں کی کتنی بلند عمارتیں منہدم ہو رہی ہیں ۔۔۔ دیر بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا اسے باہر
لا رہے تھے وہ اسٹریچر پر پڑی ہوئی تھی۔ سینے تک سفید چادر اوڑھے۔ وہ باہر نکلی اور فضا میں
جلے ہوئے گوشت کی ہولناک بدبو پھیل گئی۔ الیاس احمد روتے ہوئے اُدھر چلے گئے۔ اسٹریچر ٹھہر گیا
کسی نامعلوم سی کشش نے شباہت کو بھی کھینچ لیا! ایک ساتھ دونوں نے اس پر نگاہ ڈالی۔

"اُف میرے خدا۔" الیاس احمد آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ شباہت
اس پر جھکے اور مرتعش لبوں سے اسے آواز دی ۔۔۔! یہ اندھی ہو چکی تھی اس کا چہرہ پہچانا نہیں
جا رہا تھا۔ گال آنکھیں سب پر کا گوشت جل کر سکڑ گیا تھا ناک اور منہ سے خون جاری تھا نہ جانے دماغ
کی کون کون سی رگوں کا شکست و ریخت کا کام ہو رہا تھا۔

"ماریہ۔" شباہت کے دماغ میں بھی چکر آنے لگے۔ اس کے لب ہلے مگر کوئی آواز نہ نکلی۔
تھوڑی دیر کی شدید کشمکش کے بعد اس نے اسٹریچر پر ہی دم توڑ دیا۔ ایک بھیانک سناٹا تھا جس
نے کہرے کی طرح سب کو اپنے اندر محصور کر لیا تھا۔ ماریہ کی غیر متوقع اور المناک موت نے انھیں
دفعتہً بڑے شدید غم سے دوچار کر دیا تھا۔ انھیں یقین آرہا تھا اب ماریہ ان کے درمیان نہ تھی
شباہت دم بخود تھے۔ تیسرے روز ان کے نام ایک خط ملا۔ شاید ماریہ نے وہ خط پوسٹ کر کے
ایک انتہائی اقدام کیا تھا سب کے درمیان سب کے سامنے شباہت نے خط پڑھا۔

میری تقدیر، میری محبت، میری زندگی۔

"آپ کی یاد سینے سے لگائے میں ایک لمبے سفر پر جا رہی ہوں! آپ کی تصویر میرے
سامنے ہے اور موت مجھے بے حد آسان لگ رہی ہے آپ نے ایک جنت گم شدہ کی جھلک
مجھے دکھائی تھی۔ کچھ دیر کے لئے میرے قدم بھی ڈگمگائے تھے مگر پھر مجھے اپنی قسمت یاد آگئی

عظمت نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کیا میرا کوئی بیمار تھا۔

"اجو بھیا!" شمعون نے ہانپتے ہوئے کہا "الیاس بھائی کے ملازم کرم الٰہی تھے۔" ماریہ نے خودسوزی کی کوشش کی۔ بری طرح جل گئی ہے۔ الیاس بھائی انھیں جنرل ہسپتال لے گئے ہیں۔ آپ سب کو فوراً بلایا ہے۔"

"زندہ ہے کہ نہیں۔" عظمت نے پوچھا ——— "جاں بلب!" شمعون بولا۔ "یقین نہیں آرہا ہے۔" شباہت نے کہا وہ اپنی بیماری بھول کر جلدی سے اٹھے اور سلیپر پہن کر گھر ہی کے لباس میں بڑی جلدی چلے گئے۔

"میں کیسے دیکھوں گی اسے"۔ نوشابہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"بی بی تم اپنے میکے چلی جاؤ"۔ اماں کا چہرہ فق تھا۔ "شمعون چھوڑ آئے گا میں جب تک نہ بلاؤں نہ آنا۔ تم اللہ رکھے دو جی سے ہو۔ کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے میں بھی ماریہ کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ کیسا وقت کیسے ہو؟ اللہ رحم کرے۔" شمعون نوشابہ کو لے کر چلے گئے!

ماریہ بری طرح جل گئی تھی۔ الیاس احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ رضوانہ نے اسے غسل کر کے لباس بدلنے کی ہدایت کی تھی وہ اپنے ساتھ غسل خانے میں مٹی کا تیل اور دیا سلائی لے گئی۔ سر پر سے تیل انڈیل کر آگ لگالی۔ اس کی چیخوں کی آواز پر ہم سب دوڑ پڑے۔ دروازہ نیم وا تھا۔ وہ جل چکی تھی بمشکل تمام آگ بجھائی گئی مگر سر کے بال، پلکیں، آنکھیں۔ آدھا سینہ سب جل گیا۔ آہ۔ میری بہن یہ تو نے کیا کیا۔ میں تیرے تبسم و ابرو کے اشارے کا منتظر رہتا تھا کہہ دیتی مجھ سے کہ تو کیا چاہتی تھی!

ماریہ آپریشن تھیٹر میں تھی کسی کو ڈاکٹروں نے اندر آنے کی قطعی اجازت نہ دی صرف ڈاکٹر عظمت اندر چلے گئے تھے ——— رضوانہ الگ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، الیاس معہ سب تھے اور سب سکتہ میں تھے، کیا اتفاقات ماریہ کی قسمت بن گئے تھے!

اور میں نے سوچا کہ نہیں میں جس سے محبت کرتی ہوں اسے اپنے ہاتھوں برباد نہیں کر سکتی مجھے یقین تھا کہ میری ذات اپنے ساتھ بہت سی بربادیاں لے کر آپ کے گھر تک آئے گی اسی لئے میرے آدرش میرے پیارے مشام میں اپنا منحوس وجود لے کر اس خدا کے حضور جارہی ہوں تاکہ اس سے شکوہ کروں۔ میری تقدیر میں خوشیاں لکھنا وہ کیوں بھول گیا۔ آپ سے التجا ہے کہ میرا اتنا شدید غم نہ کیجئے گا کہ میری روح کو بھی چین نہ آئے۔ خدا آپکو ہمیشہ خوش رکھے میری دعا ہے کہ آپ کو ایک خوش قسمت اور حسین ساتھی دے ——— میرے لئے بھی دعا مانگئے۔ میری مشکل آسان ہو۔ میری روح کو قرار آئے ——— آہ ایک حسرت اپنے ساتھ لئے جا رہی ہوں۔ کاش اس وقت آپ کا چاند سا چہرہ میرے سامنے ہوتا اور آپ کو تکتے تکتے میرا دم نکل جاتا۔

میرے بعد آنسو پونچھ دیجئے گا۔" "ماریہ"

شباہت کو اپنی پچھلی ڈگر پر واپس جاتے بڑا طویل عرصہ لگا تھا۔ دنیا والے بدستور اپنے مشاغل میں لگ گئے تھے۔ مرنے والے کا ماتم کب تک؟

پھر کبھی شباہت نے شادی بیاہ کا نام بھی نہ لیا انھیں محسوس ہوتا تھا کہ ماریہ انھیں ایک خاموش سزا دے گئی تھی۔ زخم لگا گئی تھی جس کا اندمال تا زیست ممکن نہیں تھا۔

ختم شد

طبعزاد — غیر مطبوعہ

افسانہ

مہ ناز رحمن

سچ پوچھئے تو اس سارے قصے کا آغاز چیرمین کی جانب سے دی جانے والی دعوت سے ہوا۔ جمیلہ اس پارٹی میں میرے ہمراہ نہیں جا سکی تھی کیونکہ ہمارے جڑواں بچوں کو خسرہ نکل آئی تھی۔

جمعرات کی شام کو میں نے جمیلہ سے کہا تھا "میں صرف شکل دکھا کے بھاگ آؤں گا۔ معاملہ چیرمین کا ہے اس لئے جانا ضروری ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگے گا"

"کوئی بات نہیں جان۔ پھر کیا ہوا" جمیلہ نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

"میں بہت تھک گئی ہوں" اس نے جمائی لے کر بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا "اور میرا بس چلے تو ایک ہفتے تک سوتی رہوں سچ"

چنانچہ میں اس دعوت میں تنہا گیا۔ میں نے دانستہ وہاں پہنچنے میں تاخیر سے کام لیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میرا وقت بوریت میں کٹے گا لیکن آپ کو پتہ ہے ہوا کیا؟ میری وہ شام بے حد خوشگوار گزری۔ میں پورا وقت سلمٰی سے باتیں کرتا رہا۔ سلمٰی ہمارے دفتر کی نئی استقبالیہ کلرک تھی۔

دفتر میں سارے مرد اس کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ وہ کم عمر تھی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ سال رہی ہوگی۔ ظاہر ہے میری عمر اس سے بہت زیادہ تھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی جب وہ خود ہی اٹھ کر میرے پاس آئی اور اس طرح باتیں کرنے لگی جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

اس کی آواز میں عجیب دلکشی تھی۔ اس نے اپنے سیاہ گھنگریالے بالوں کو دلکش انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ جب وہ اپنی لمبی سیاہ پلکوں کو جھپکا کر بات کرتی تو دیکھنے والا جگر تھام کر رہ جاتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کی اتنی لمبی پلکیں نہیں دیکھی تھیں۔ میری انا کو اس وقت واقعی بے حد تسکین ملی جب اس نے اپنی باتوں سے مجھے احساس دلایا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔

وہ صوفے پر مجھ سے اس قدر قریب ہو کر بیٹھی تھی کہ میں اس کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو کے ساتھ اس کے بدن کی گرمی بھی محسوس کر سکتا تھا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی کہ میں اس وقت جمیلہ اور اپنے بیمار بچوں کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

"یہاں ڈرائنگ روم میں بہت حبس ہو رہا ہے" چند لمحوں بعد اس نے کہا اور اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ تو ننھی منی آفت کی پڑیا ہے" میں نے سوچا اور اس کا ہاتھ تھام لیا "چلو باہر لان میں تازہ ہوا میں چلیں" میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔ جواباً اس نے جس طرح معنی خیز انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا اس سے میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ پتہ نہیں کتنی صدیوں بعد کسی نے مجھے اس طرح دیکھا تھا۔ ہم تھوڑی دیر لان میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے اور پھر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ سلمٰی نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔ معدے میں عجیب سی جلن ہو رہی تھی اس وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں کھسک کر دوسرے کونے میں ہو گیا۔ میں ایک سترہ سالہ لڑکی کی حماقتوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا اور پھر مجھے جمیلہ کے بارے میں بھی تو سوچنا تھا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آنا چاہیئے.... تم کہاں رہتی ہو؟"

"اللہ کیسے ہیں آپ، ہم تو ایک ایک لمحہ آپ کی قربت میں گزارنا چاہتے ہیں اور آپ دامن بچا رہے ہیں۔ پتہ ہے جب آپ کو پہلی مرتبہ دفتر میں دیکھا تھا۔ تب ہی ہم آپ پر مر مٹے تھے"

"مذاق مت کرو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اتنے سارے اسمارٹ نوجوانوں کی موجودگی میں بھی؟"

"مجھے میچور مرد اچھے لگتے ہیں۔" وہ میرے قریب کھسکتے ہوئے بولی۔

"بس اب گھر چلو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "تم ایک خوبصورت لڑکی ہو۔ ہر مرد تمہاری قربت میں گزارنا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے اور میری بیوی پریشان ہو رہی ہوگی۔" میں نے دانستہ آخری جملے کا اضافہ کیا۔

"اسے تم جیسے دلکش شخص کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔" اس نے میری گردن پر اپنے گرم سانس چھوڑتے ہوئے کہا وہ مردوں کو بے بس کرنے کا فن جانتی تھی۔

جب میں نے اس کے خستہ حال کوارٹر کے سامنے گاڑی روکی تو وہ سو چکی تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

"اندر چلو عمران۔" اس نے نیند بھری آواز میں کہا میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔"

ایک لمحہ کو میرا دل چاہا کہ اس کی پیش کش قبول کر لوں لیکن پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے جمیلہ سے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اسے خدا حافظ کہہ کر میں نے گاڑی موڑ لی۔

"واہ عمران میاں کیسی شاندار شام گزری تم نے خواب میں بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔" میں نے خود سے کہا اور چور نگاہوں سے آئینے کی طرف دیکھا۔ کہیں جمیلہ کو میرے چہرے پر کچھ لکھا نظر نہ آ جائے۔

گھر میں خاموشی تھی۔ جب میں کچن میں چائے بنانے گھسا تو ہماری پالتو بلی میری ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی میرے اندر اتنی اتھل پتھل ہو رہی تھی کہ فوری طور پر سونا میرے لئے ناممکن تھا۔ جب میں پلنگ پر جا کر لیٹا تو جمیلہ نے کروٹ بدلتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں پوچھا "کیا وقت ہوا ہے؟"

"گیارہ بجے ہیں۔" میں نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ اس وقت دو بج رہے تھے۔

"دعوت کیسی رہی؟"

"معمول کے مطابق۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے چند باتیں ہوئیں، کھانا کھایا۔" جملہ مکمل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ دوبارہ سو چکی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا۔ پورا دن ٹوٹی ہوئی چیزوں کی مرمت کرنے، بچوں کو کہانیاں سنانے اور ان کے ساتھ لوڈو کھیلنے میں گزر گیا۔ رات کو جب جمیلہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کولڈ کریم لگا رہی تھی تو میں نے ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد وہ تھوڑی موٹی ہو گئی تھی۔ بالوں میں بھی وہ پہلی سی چمک نہیں رہی تھی تب مجھے سلمیٰ کا خیال آیا۔ اس کی کمر کتنی پتلی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط یاد آئے تو میری نبض کی رفتار تیز ہو گئی۔

"شاید میری اور جمیلہ کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، ہم بہت جلد گھریلو ذمہ داریوں کے چکر میں پھنس گئے ——— اب ہمارے پاس مکان کے کرایہ، دودھ والے کا بل، بچوں کی پڑھائی اور گیس اور بجلی کے بل کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ہوتا۔"

احساس جرم کے ساتھ میں نے بے وفائی کے خیال کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا "جمیلہ کتنی نیک ملنسار اور پیاری بیوی ہے۔"

"اور سیکسی بھی۔" میرے اندر سے ایک آواز ابھری لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

وہ پلنگ پر لیٹتے ہوئے بولی اُف خدایا میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے جمائی لی "میری کمر میں درد ہو رہا ہے۔ آج میں دن میں کوئی بیس مرتبہ سیڑھیاں چڑھی اور اُتری ہوں گی لیکن بچوں کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اوہ عمران اگر ممکن ہو تو کل واپسی میں گھر کا سودا سلف لیتے آنا۔" اس نے دوبارہ جمائی لی اور تکیئے پر سر رکھتے ہی سو گئی۔

میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ سلمیٰ کا حسین چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

ہفتے کی صبح دفتر جانے سے پہلے مجھے گھر کے کئی چھوٹے موٹے کام نمٹانے پڑے۔ میرا بس چلتا تو پر لگا کر دفتر پہنچ جاتا اور دیدار یار کرتا۔ خوش قسمتی سے جس وقت میں دفتر پہنچا تو وہ سوئچ بورڈ کے سامنے تنہا بیٹھی تھی۔ "کیسی ہو؟" میں نے گرم جوشی سے پوچھا۔ پلکوں کی جھالروں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں مسکرا دیں۔

"دوپہر کو چائے پینے چلو گی۔" میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا لیکن میرا دل سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکلا ہی چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔ "ایک بجے کیسا رہے گا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سیٹی بجاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

میں شعوری طور پر تن کر چل رہا تھا اور خود کو مردانہ وجاہت کا نمونہ سمجھ رہا تھا یہ سب سلمٰی کی نگاہِ التفات کا کرم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب میں جمیلہ کی بنائی ہوئی لذیذ سویٹ ڈشیں کھانا چھوڑ دوں گا تاکہ کچھ وزن گھٹا سکوں۔ نئے فیشن کے کپڑے خریدوں گا اور اگر بالوں کا اسٹائل بھی بدل دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ آخر میں اتنا بوڑھا تو نہیں ہو گیا ہوں۔ پھر کیوں نہ اچھی طرح رہوں۔

دوپہر کو میں سلمٰی کو ایک چھوٹے سے چینی ریسٹوران میں لے گیا۔ ظاہر ہے اسے اندازہ ہوگا کہ ایک نکے میں اسے صرف چائے نہیں پلاؤں گا چنانچہ اس نے چھوٹتے ہی مینو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ "مجھے چینی کھانے بےحد پسند ہیں۔" اس نے مسرت سے کہا اور اپنے مخصوص قتل کر دینے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ کھانوں اور مشروبات میں اس کا انتخاب بےحد عمدہ اور مہنگا تھا۔ وہ تھی ہی اچھی چیزوں کے قابل۔ میں اب سچ مچ اس کا دیوانہ ہو چلا تھا۔ بس وہ اسی طرح میرے پہلو میں بیٹھی رہے۔ اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دیئے رہے تو میں دنیا کی ہر شے اس کے قدموں میں لا کر ڈال سکتا تھا۔

اگلے چند ہفتوں میں، میں دوہری زندگی گزارتا رہا۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت سلمٰی کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ شہر کی کوئی تفریح گاہ کوئی ہوٹل ایسا نہیں تھا جہاں ہم نے وقت نہ گزارا ہو۔ لیکن ایک ماہ بعد جب میں نے اخراجات کا تخمینہ لگایا تو میری سٹی گم ہو گئی۔ میں اپنی جمع پونجی کا بڑا حصہ خرچ کر چکا تھا۔ تقریباً روزانہ ہی میں نے سلمٰی کو کسی مہنگے ہوٹل میں کھانا کھلایا تھا۔ وہ بنارسی ساڑھی جو میں نے اس کے لئے خریدی تھی اور چاندی کا کنگن اور اونچی ایڑی والی سینڈلیں اور لمبے لمبے طلائی آویزے جنہیں خریدنے کا میں اس سے وعدہ کر چکا تھا۔ پھولوں کے گجرے، چاکلیٹ کے پیکٹ اور پرفیوم کی بوتلوں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کی تو اب گنتی بھی مجھے یاد نہیں رہی تھی۔ اس چیز نے مجھے قدرے پریشان کر دیا تھا۔ اگر جمیلہ نے کبھی میری چیک بک دیکھ لی تو وہ قیامت ڈھا دے گی۔ نہیں کبھی میں اتنا مہنگا عشق لڑانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ مگر میں سلمٰی کو چھوڑ بھی تو نہیں سکتا...... میں کیا کروں......؟

میں روز بروز چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ سارا غصہ جمیلہ اور بچوں پر نکلتا۔ اس وقت میں شدید احساسِ جرم میں مبتلا ہو گیا جب میں نے جمیلہ سے کہا کہ اس مرتبہ میں بچوں کے لئے نئے جوتے نہیں خرید سکتا اور یہ کہ جمیلہ کو گھریلو اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لینا چاہیئے۔

"عمران۔ آج کل تم بہت محنت کر رہے ہو۔" ایک صبح جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ وہ بےچاری سمجھ رہی تھی کہ میں دفتر میں کام کی زیادتی کی بنا پر چڑچڑا ہو گیا ہوں۔ "آپ رات گئے تک دفتر میں کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو کچھ دنوں کی چھٹی نہیں مل سکتی۔ ہم کچھ دنوں کے لئے کوئٹہ امی کے پاس چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔"

"تم بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔ دفتر میں اتنا کام ہے کہ مجھے ایک دن کی چھٹی بھی نہیں مل سکتی۔"

جمیلہ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی چلتے تو کتنا مزہ آتا۔ ہم کچھ وقت ایک ساتھ گزارتے، مہینوں سے ہم کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے۔"

"بند کرو یہ باتیں۔" میں نے غصہ سے کہا، "کہہ دیا نا مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں۔"

وہ پژمردہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کو مجھے ضمیر کی خلش نے بےچین کیا۔ لیکن اس لمحے بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جمیلہ کے جانے کے بعد میں سلمٰی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں گا اور اگر میں نے کچھ پیسے جمع کر لئے تو میں اسے پکنک پر شہر سے باہر بھی لے جا سکتا ہوں۔

"ٹھیک ہے میں آج امی کو فون کر دوں گی۔" جمیلہ نے کہا "آپ ہمیں کار سے چھوڑ آئیں گے یا ہم ٹرین سے چلے جائیں۔"

"ٹرین سے چلی جانا۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں نے کہا نا مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن کم از کم آج رات تو آپ ذرا جلدی گھر آ سکتے ہیں۔" پھر قدرے رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "کوشش کیجئے گا۔"

"میں وعدہ نہیں کر سکتا۔" میں نے چڑچڑاپن کے ساتھ کہا "کیا ابھی تک میں جو کچھ تمہیں بتاتا رہا ہوں۔ وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"آپ.... آپ کو یاد نہیں ہے نا۔" اس نے دکھ سے کہا "آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔"

"او خدایا مجھے افسوس ہے جمیلہ، میں واقعی بھول گیا تھا۔" اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے شادی کی سالگرہ یاد نہیں رہی تھی۔

اس نے کرسی کے کشن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا ڈبہ

نکالا اور مجھے تھما دیا۔ میں نے کھولا یہ ایک نیا الیکٹرک شیور تھا۔ مہنگا نیا ماڈل۔

"اوہ جمیلہ۔ تمہیں اتنی مہنگی چیز نہیں خریدنی چاہیئے تھی" میں نے احتجاج کیا۔ مجھے خیال آیا کہ میں تو اپنا بینک بیلنس تقریباً ختم کر چکا ہوں"

"میں سودا سلف میں سے بچ جانے والے پیسے جمع کرتی رہی تھی" اس نے مسکرا کر کہا" میں روزانہ بچی ہوئی ریزگاری گولک میں ڈال دیا کرتی تھی"

"تم کتنی اچھی ہو" میں نے اُسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا" مجھے بہت ندامت ہو رہی ہے کہ میں سالگرہ کی تاریخ بھلا بیٹھا تھا"

کوئی بات نہیں۔ آج کل تم پر کام کا اتنا زیادہ دباؤ بھی تو ہے" جمیلہ نے مجھے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے آج میں دفتر سے جلدی اُٹھ جاؤں گا" مجھے واقعی اپنی کمینگی پر ندامت ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال آرہا تھا کہ آج میں سلمیٰ کو ایک نئے ہوٹل میں کھانا کھلانے کا وعدہ پورا نہیں کر سکوں گا اور پھر مجھے جمیلہ کے لئے تحفہ بھی تو خریدنا ہوگا۔ ویسے ہی میری جیب تقریباً خالی تھی۔ ایسا کون سا تحفہ ہو سکتا ہے جو زیادہ مہنگا نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ اوہ خدایا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں سلمیٰ کے لئے اتنے مہنگے تحائف خریدتا ہوں اور اپنی بیوی کو کوئی سستا سا تحفہ دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ واقعی میں کس قدر کمینگی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ لیکن آخر میں کر دل بھی کیا۔

میں دفتر کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا شاید سلمیٰ کوئی مفید مشورہ دے سکے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہ استقبالیہ ڈیسک پر موجود نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں کام کرتے ہوئے مجھے اس کا خیال آیا تو میں پھر اس کے کمرے کی جانب لپکا۔ میں دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹھک گیا۔

"وہ عمران" میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی" وہ تو مجھ پر بُری طرح لٹو ہو گیا ہے۔ ہر وقت ہاتھ باندھے خدمت کے لئے کمربستہ رہتا ہے" وہ ہنسی اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولی۔ ہاں، ہاں میں ندیم سے بھی ملتی ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی قلاش ہے ... ہے نا؟" پھر وقفہ ...... شاید وہ فون پر کسی سے گفتگو کر رہی تھی" نہیں اس کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں ہے اور پھر وہ مجھے بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھلاتا ہے۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے اور پھر ایک طویل وقفہ ...... اور میں باہر سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ وہ اس انداز میں میرے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ وہ میرا مذاق اڑا رہی تھی۔

"ہاں بھئی، بہت مزہ آتا ہے" وہ کہہ رہی تھی" بڑے میاں خود کو نئے سرے سے جوان سمجھنے لگے ہیں۔ بال بھی بڑھا لئے ہیں۔ ٹائٹ جینز پہننے لگے ہیں..... سچ۔ جھوٹ تھوڑی کہہ رہی ہوں .... کیا؟ ہاں اسے اپنی بھدی بیگم کا خیال بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔ بس تب ہی مجھے اور ندیم کو اکٹھا ہونے کا موقع ملتا ہے"

میں دروازے سے ہی واپس پلٹ آیا۔ مجھے یوں لگا کہ میں ابھی ڈھے جاؤں گا۔ اپنی توہین کا احساس بے حد تکلیف دہ تھا۔ اس کی نظروں میں میری یہ اہمیت تھی ایک ایسا شخص جسے وہ بے وقوف بنائے اور پھر اپنی سہیلیوں کو مزے لے کر اس کے قصے سنائے اور اپنے اس دوست ندیم کو بھی اور جانے کتنے ہوں گے۔ میں نے صرف ایک کا نام سنا تھا۔

اس لڑکی کے لئے میں جمیلہ سے بے وفائی کر رہا تھا۔ جمیلہ جس نے میرے لئے ستاری کی سالگرہ کا تحفہ خریدنے کے لئے ایک ایک پیسہ جوڑ کر میری سارے بہانوں کو سچ سمجھ کر ایمان لے آئی تھی جو میری کوتاہیوں کے باوجود مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں بھی کتنا بے وقوف تھا۔ نئی نسل کی ایک بے راہرو لڑکی کے پیچھے خوار ہو رہا تھا

ٹھیک ہے جمیلہ اس کی طرح کم عمر، حسین یا جذبات کو بھڑکانے والی لڑکی نہیں تھی۔ لیکن اس میں وہ خوبیاں تھیں جن سے سلمیٰ یکسر محروم تھی ——— سلمیٰ کی باتوں نے مجھے بے حد اذیت پہنچائی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں پانی سر سے گزر جانے سے پہلے ہی اپنے حواسوں میں آگیا تھا۔

اب سارا معاملا ختم ہو چکا ہے۔ میں آج ہی سلمیٰ سے کہہ دوں گا کہ وہ آئندہ مجھ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ پھر میں پھولوں کی دکان پر جا کر جمیلہ کے لئے سُرخ گلابوں کے گلدستے کا آرڈر دوں گا۔ وہ بے چاری۔ میری پیاری جمیلہ، میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی تلافی ضرور کروں گا۔ اسے وہ ساری محبت اور وفائیں دوں گا۔ جس کی وہ مستحق ہے۔

سیب

سب سے زیادہ صحت و توانائی بخش پھل

از حکیم راحت نسیم

اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو بڑی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے، انہی نعمتوں میں پھل ایک نمایاں حیثیت ہیں، جو نہ صرف غذائی اجزا سے بھرپور ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں صحت و تندرستی کے لئے ایسی، ایسی عجوبہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں کہ ان کے سامنے بڑی بڑی دوائیں بھی ہیچ ہیں، یہی وجہ ہے کہ مغرب میں غذاؤں، پھلوں سے علاج تو باقاعدہ طبی سائنس کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

پھلوں میں سیب کو سب سے زیادہ صحت و توانائی بخش اور لذیذ ترین پھل قرار دیا گیا ہے، اس کا ذکر قدیم ترین طبی و مذہبی کتابوں میں بھی کیا گیا ہے، سیب ایک خوش ذائقہ، خوش رنگ اور خوش شکل پھل ہے، اس کی سینکڑوں اقسام ہیں، جن میں سے پندرہ سو باقاعدہ دریافت ہو چکی ہیں، صرف ایک چھوٹے سے خطے جنت ارضی کشمیر میں تقریباً سو کے لگ بھگ قسم کے سیب ہوتے ہیں، جو قد و قامت ذائقہ اور رنگ و بو کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، سیب میں نصف حصہ ٹھوس ہوتا ہے اور اس میں زیادہ پروٹین اور کھانڈ ہوتا ہے۔ سیب اپنی غذائیت کے لحاظ سے دنیا بھر کا معروف پھل ہے، بچے، بوڑھے، نوجوان، بیمار اور تندرست سب ہی رغبت سے کھاتے ہیں۔ تازہ سیب میں ۸۴ فیصد پانی ہوتا ہے، سیب میں فاسفورس سارے پھلوں اور سبزیوں میں سے زیادہ ہوتا ہے اور چھلکوں میں حیاتین ج (وٹامن سی) بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے سیب کا چھلکا ضائع کر دینا ایک سنگین غلطی ہوگی، اس طرح چھلکے کو ایک قیمتی جز سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ سیب نہ صرف ایک بہترین صحت بخش غذا ہے، بلکہ اس کے استعمال سے خون صالح پیدا ہوتا ہے، چہرے کی جلد کیلئے اس سے بہتر کوئی ٹانک نہیں، اس کے استعمال سے چہرے کا رنگ، خوشنما، جلد ملائم اور رخسار سرخی سے بھرپور ہو جاتے ہیں، روزانہ نہار منہ دو سیب کا استعمال صحت کو دو بالا نکھار دیتا ہے جسم میں کیلشیم کی مقدار کنٹرول رہتی ہے، سیب کے گودے میں غذائی طاقت ۶۴ حرارے ہوتی ہے، پروٹین ۰.۶۳، روغنی اجزاء ۰.۶۴، کھوک ۲۹ ۰ نشاستہ ۹.۴۲۰، ریشہ ۱.۰، چونا ۰.۶۲، فاسفورس ۰.۱۰۶۔

سیب معدے میں پہنچ کر ہیضم کو تیز کرتا ہے، جس سے ہاضمہ میں مدد ملتی ہے، بھوک بڑھتی ہے، جگر کا فعل بھی تیز ہو جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں خون کی پیدائش کا عمل زیادہ ہو جاتا ہے، سیب کھانے سے جسم میں چستی اور صلاحیت عمل بڑھتی ہے، سیب فاسفورس کا تو قدرتی خزانہ ہے، اس لئے خون کے مریضوں کے لئے تو نعمت غیر مترقبہ ہے اور ایسے حضرات کے لئے تو اس عظیم نعمت خداوندی سے مستفید نہ ہونا کفران نعمت کے مترادف ہے۔

سیب کی ایک بڑی خصوصیت اسکا تریاق اثر ہے اور اس کی یہ تریاقیت قلب کے لئے تو خاص ہے، اسی وجہ سے سیب کو قلب کے تمام امراض میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، طب میں مرکبات قلب میں عبارضہ قلب میں مشہور دوا دوالمسک میں سیب کے رس کو اہم لازمی جز متصور کیا جاتا ہے، انگریزی کا مشہور مقولہ ہے، جس کا مفہوم یوں ہے۔

روزانہ ایک سیب کا استعمال خود کو معالج سے دور رکھتا ہے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو شخص روزانہ ایک سیب کا استعمال کرے وہ اس کی صحت افراط غذائی طاقت بخشی کی وجہ سے بیمار نہ ہوگا اور صحت اس حد تک معیاری ہوگی کہ ہمیشہ معالج کی ضرورت نہ رہے گی۔ ایسے مؤثر غذائی اجزا کے حامل کو تمام عمر کے لوگ یکساں استعمال کر سکتے ہیں۔ گردوں کو صاف کرنے کے لئے بھی سیب کے فائدے مسلم ہیں، دماغی کام کرنے والوں کے لئے بھی ایک مؤثر غذائی ٹانک ہے، کیونکہ دماغ کو قوت ملتی ہے، قوت حافظہ بڑھتی ہے، اس لئے طلبہ اور دماغی کام کرنیوالوں کے لئے اس کا استعمال لاجواب تحفہ ہے۔

سیب کے چھلکے کو ہمارے ہاں عام طور پر ضائع کیا جاتا ہے حالانکہ سیب کے چھلکے میں حیاتین ج (وٹامن سی) بکثرت پایا جاتا ہے، سیب کے چھلکے سے نہایت خوش ذائقہ لذیذ چائے تیار ہوتی ہے، جو عام استعمال ہونیوالی چائے، کافی، قہوہ کی طرح مضر رساں نہیں، بلکہ صحت و قوت بخش ہے اور اسمیں لیموں کا رس اور شہد کا اضافہ کر لیا جائے تو اس کے فوائد دو چند ہو جاتے ہیں، یہ چائے بخش اور بخار محرقہ کی کمزوریوں کو دور کرنیکے لئے مشہور عالم مقوی مشروب اوولٹین کا کام دیتی ہے۔

سیب ایک اعلیٰ النفس، خوش ذائقہ غذا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دوائی شفا بخش اثرات کے اعتبار سے دوسرے پھلوں سے ممتاز ہے، سالہا سال سے آزمودہ چند ایک طبی اوصاف درج ذیل ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

سرمی دسترخوان

گاجر کا لذیذ حلوہ

سامان :- گاجر - ۱ کلو - شکر ۲۵۰ گرام - دودھ ۵۰۰ گرام گھی ۱۰۰ گرام - کھویا ۱۰۰ گرام کاجو ۵۰ گرام - اخروٹ کی گری ۵۰ گرام عرق کیوڑہ ۵ گرام - لونگ الائچی ۵، ۵ گرام زعفران ½ ماشہ

متوسط سائز کی گاجروں کی سطح کو ہلکا ہلکا کھرچ کر کدوکش سے باریک کرکے دھوڈالیں۔ پانی خشک ہو جانے پر ۵۰۰ گرام دودھ میں انھیں اتنا جوش دیں کہ دودھ گاجروں میں ہضم ہو جائے۔ شکر کا قوام بنائیں لیکن بہت سخت قسم کا نہ ہو صرف چار کی دو پیالی پانی ملا کر پکائیں - دودھ کا چھینٹا [illegible] کر قوام کو صاف کرلیں گھی کو کسی پتیلی میں لونگ الائچی ڈال کر کڑکڑائیں اور گاجروں کو اسی میں بھون لیں جب گھی چھوٹنے لگے تو قوام ڈال دیں۔ جب سمٹنے لگے تو اتار کر کسی ایسے برتن میں جس میں شاہی ٹکڑے پکائے جاتے ہیں، ڈال کر۔ زعفران کو کیوڑے میں پیس کر چھڑک دیں اور انڈیل کر دبائیں۔ پھر کھوئے میں اخروٹ اور کاجو خشک پیس کر ملائیں اور اوپر سے پھیلا دیں چاندی کے ورق لگا دیں حلوہ تیار ہے۔

(مرسلہ صفیہ سعید ہاشمی - لکھنؤ)

آلو کے پھوڑے

آلو، ایک ایسی ترکاری ہے جس سے پچاسوں طرح کے کھانے تیار کئے جاتے ہیں۔

سامان :- آلو ۵۰۰ گرام - ہری مرچ - ہرا دھنیا۔ انداز سے۔ لیموں کاغذی بڑے ۲ عدد - ساگے دار پیاز کی دو گانٹھیں کالی مرچ پسی ہوئی چار کا ایک چمچہ۔ سفید زیرہ بھی اسی قدر۔ نمک حسب ضرورت۔ بیسن چار کی آدھی پیالی - کھانے والا سوڈا - چائے کا آدھا چمچہ۔ تلنے کے لئے گھی ڈالڈا یا تیل حسب ضرورت

ترکیب :- پہلے آلوؤں کو ابال کر چھیلیں اور سل پہ باریک پیس لیں پسے ہوئے آلوؤں میں لیموں کا عرق نچوڑ دیں ہرا دھنیا ہری مرچ - ساگے دار پیاز باریک باریک کاٹ کر آلوؤں میں ملائیں۔ سفید زیرہ موٹا موٹا کوٹ کر بریاں کرلیں پھر اسے نمک اور کالی مرچ کے ساتھ آمیزے میں ملا کر چھوٹے کوفتوں کی شکل میں یا بیضاوی بنالیں۔

بیسن، تھوڑا نمک سوڈا اور تھوڑا پانی ڈال کر پھینٹیں آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اس میں آلوؤں کے کوفتوں کو لت پت کرکے ہر طرف سے سرخ کرلیں۔ پھوڑے تیار ہیں انھیں املی کی میٹھی چٹنی سے کھائیں۔ بہت لذیذ معلوم ہوں گے۔ گرم گرم ہی نوش فرمائیں۔ پہلے کوفتے بنا کر رکھ لیں۔ کھانے کے وقت تلیں۔

مرسلہ :- فاخرہ منہاج - دہلی

(بقیہ سیب)

مربہ سیب - - موٹے، موٹے سیب لے کر ان کے اندر سے بیج نکالدیں اور چاقو سے چھیل کر پانی میں ہلکا جوش دیں، نیم پختہ ہونے پر چینی کی چاشنی ڈال کر تھوڑی دیر آگ پر رہنے دیں، قوام پکنے پر اتار کر محفوظ کرلیں اور بوقت صبح بطور ناشتہ سیب ورق نقرہ میں لپیٹ کر استعمال کرنا مقوی قلب اور مقوی دماغ ہے۔

تقویت معدہ اور بھوک کی زیادتی کے لئے۔ - تازہ سیب کے اس میں قدرے سیاہ مرچ (پسی ہوئی) زیرہ اور نمک ملا کر کھائیں۔ اس سے بھوک میں اضافہ ہوگا، غذا اجزاء بدن بننے میں مدد ملے گی اور معدہ طاقتور ہوگا۔

بے خوابی کا شافی علاج۔ ہر روز صبح کے وقت بہدانہ ۳ ماشے پوٹلی باندھ کر تین چھٹانک پختہ سیب کے رس میں جوش دیں اور ٹھنڈا کر کے پلائیں، چند یوم کے استعمال سے بے خوابی کا مرض ختم ہو جائے گا۔

شربت سیب - - سیب شیریں کا پانی پانچ سیر ایک قلعی دار دیگچی میں ڈال کر جوش دیں، جب آدھا رہ جائے تو ایک سیر مصری ملائیں، قوام پکنے پر اسے اتار کر کے محفوظ رکھیں، دو سے چار تولے تک بدرقہ دل و دماغ اور معدہ کو قوت بخشتا ہے، قے اور متلی روکتا ہے، صفراوی دستوں کو بند کرتا اور پیاس کو تسکین دیتا ہے۔

مسکراہٹ

- مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
- محبوبہ تمہاری مسکراہٹ سے [illegible] زنجیریں نظر آرہی ہیں۔
- خندہ روئی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔

HAREEM
حریم
Jun.85
Rs. 100
ایڈیٹر
نسیم انہونوی

رمضان المبارک کی فضیلت

(سید امجاد علی)

رمضان المبارک وہ مبارک مہینہ ہے جس کی فضیلت و اہمیت قرآن و احادیث سے ثابت ہے۔ اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو خصوصی انعام واکرام سے نوازتا ہے۔ عبد و معبود ایک دوسرے سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ فاصلے قربتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عبادات کے درجات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نوافل عبادت کا ثواب فرض عبادات کے برابر ہو جاتا ہے۔ ماہ مقدس میں ایک فرض عبادت کا ثواب ستر فرض عبادت کے مساوی ہو جاتا ہے۔ خداوند کریم کی یہ خصوصی نظر التفات اور نوازشات اپنے فرمانبردار نیک سیرت اور صالح بندوں پر محض اس ماہ صیام کی برکت سے ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

(ترجمہ)

"اے ایمان والو تم پر روزے اسی
طرح فرض کئے گئے ہیں جیسے کہ تم
سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے ہیں
تاکہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ"

گویا کہ اس آیت کریمہ میں اس ماہ کی غرض و غایت کو صریحاً واضح فرما دیا گیا ہے کہ روزے تمام مسلمان مرد و عورت پر فرض ہیں اور اس کی فرضیت کی غایت یہ ہے کہ بندگان خدا تقویٰ کی شاہراہ پر گامزن ہو کر سچے دیندار اور متقی بن سکیں۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہ اسی ماہ صیام کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن حکیم
نازل کیا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ یہ
لوگوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ہے اور واضح
الدلالت ہے منجملہ ان کتب کے جو ذریعہ
ہدایت بھی ہے اور حق و باطل میں فیصلہ
کرنے والی بھی ہے"

گویا رمضان مبارک کی فضیلت اس وجہ سے اور بھی ہو جاتی ہے کہ اس ماہ مبارک میں قرآن [illegible] دو عالم نے ایک ایسے نسخہ کیمیا (قرآن حکیم) سے سرفراز فرمایا جو سراسر اس کے پیروکاروں کے لئے ایک نعمت بھی ہے اور سامان رحمت و مغفرت بھی ہے۔ اس کتاب لاریب پر عمل کرنے والے دنیا میں بھی کامران ہیں اور آخرت میں بھی سرخرو ہیں۔

ثواب میں اضافہ

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے کہ شعبان المعظم کی آخری تاریخ کو سرکار دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "تمہارے لئے ایک مہینہ آرہا ہے بہت عظیم اور مبارک مہینہ ہے اس متبرک رات میں ایک شب لیلۃ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کے روزوں کو فرض قرار دیا ہے اور اس کے رات کے قیام (تراویح) کو ثواب کا عمل قرار دیا ہے۔ اس مہینہ میں نفل کا ثواب ایک فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرض ادا کرنے کے برابر ملتا ہے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا اجر جنت ہے اس ماہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے وہ اس کے لئے گناہوں کے معاف ہونے اور آتش دوزخ سے خلاصی کا سبب ہوگا اور روزہ دار کے ثواب کے مانند اس کو بھی ثواب عطا ہوگا"

اس ماہ مکرم کی برکت سے روزہ دار کے گذشتہ گناہوں کی خداوند کریم مغفرت کرتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ خاتم النبیینؐ نے ارشاد فرمایا جس مومن نے رمضان کا روزہ عقیدت اور ایمان کے ساتھ رکھا تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہ بخش دے گا"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔ لہٰذا روزہ کی صحیح روح اور مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے روزہ رکھنا باعث خیر و برکت ہے"

روزہ کی فرضیت کی اصل غایت بندوں کی اخلاقی تطہیر و تربیت کرنا ہے اور ان کو نیک کاموں کی طرف راغب کرتا ہے جو شخص روزہ رکھ کر [illegible] میں مبتلا ہو تو [illegible] حاجت ہے اور نہ کہ اس کے روزہ کی کوئی [illegible] ہریرہؓ کی روایت ہے کہ [illegible]

پھر کوئی شخص جھوٹ بولے اور روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اللہ تبارک تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزہ خصوصاً میرے واسطے ہے کیونکہ اس میں میرا بندہ اپنی تمام خواہشات کو محض میرے واسطے ترک کر دیتا ہے اور میرے لئے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اس لئے میں بھی اپنے بندے کو اپنی شان کے مطابق اس کا اجر عطا کرتا ہوں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نیک عمل جو آدمی کرتا ہے تو اس کے لئے عام اصول یہ ہے کہ نیکی دس سے سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مگر روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ثواب اس پیمانے سے نہیں عطا کیا جاتا کیونکہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔" (بخاری مسلم مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "روزہ اور قرآن حکیم بندے کی شفاعت کرتے ہیں یعنی روز حشر روزہ کہے گا اے باری تعالیٰ میں نے اس کو دن بھر کھانے پینے سے اور دیگر خواہشات سے روکے رکھا لہٰذا اس کے حق میں میری شفاعت کو قبول فرما اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو رات کی نیند سے محروم رکھا کیونکہ وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتا تھا۔ لہٰذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ چنانچہ دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔"

سحری کا اہتمام

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ محبوب خدا نے فرمایا "سحری کھایا کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔" دوسری حدیث میں حضرت عمرو ابن عاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری کھانے کا فرق ہے کہ اہل کتاب کو سو جانے کے بعد کھانا پینا ممنوع تھا اور ہمیں صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے اس کی اجازت ہے۔"

خاتم الانبیاء فرماتے ہیں "جس شخص کا رمضان سلامتی سے گزر جائے اس کا سارا سال سلامتی سے گزرے گا یعنی جو شخص رمضان میں گناہوں سے بچ گیا تو باقی گیارہ ماہ بھی اس کے لئے گناہوں سے بچنا آسان ہو جائے گا۔"

افطار کا اہتمام

حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا "لوگ ہمیشہ خیر سے رہیں گے جب تک غروب کے بعد افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔"

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا "دین غالب رہے گا جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ یہود و نصاریٰ تاخیر کرتے ہیں۔"

کس سے روزہ افطار کیا جائے

حضرت سلمان عامرؓ کی روایت ہے کہ رسول مقبولؐ کا ارشاد ہے "جب تم میں سے کوئی شخص روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے کیونکہ وہ برکت ہے اگر وہ میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔"

دوسری حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالمؐ نماز مغرب سے قبل افطار فرماتے تازہ کھجوروں سے اور وہ نہ ہوتے تو پھر خشک چھوہاروں کے چند دانوں سے اور اگر وہ بھی میسر نہ ہو تو پھر پانی کے چند گھونٹ نوش فرماتے۔

افطار کی دعا

حضرت معاذ بن زہرہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلوٰۃ و تسلیمؐ افطار فرماتے تو یہ دعا کرتے "اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا۔"

حضرت عبداللہ ابی ملیکہ، حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا "روزے دار کی دعا افطار کے وقت رد نہیں ہوتی اور حضرت عبداللہ افطار کے وقت یہ دعا کرتے تھے۔ ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیری اس رحمت کے طفیل جو ہر شے پر حاوی ہے کہ میری بخشش فرما دے۔"

ام ہانی (لکھنؤ)

عید پھر آئی ہے اسلام کی شوکت لے کر
عید پھر آئی ہے اللہ کی رحمت لے کر
عید پھر آئی ہے یکتائی وحدت لے کر
عید پھر آئی ہے خالق کی عبادت لے کر
عید پھر آئی ہے پیغام اخوت لے کر
عید پھر آئی ہے یک جہتی ملت لے کر

رمضان المبارک میں مومنین بہترین عبادت سخت آزمائشوں، بے مثل ضبط نفس و تقویٰ اور صبر و استقامت کے لاجواب انداز کے بعد آج پھر عید کی پرسعادت گھڑیاں شکر و مسرت کے احساس سے مخمور ہر عاشق رب کے در پر جبہ سائی کر رہی ہیں آج ہم کیونکر ان کا استقبال کریں کہ ان شادکام لمحات کا حق ادا ہو جائے۔ ہماری فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی اس قومی و ملی خصوصیات کے حامل اس مبارک دن کی یاد نہایت لطیف انداز میں خوشی منائے اور مسرت کے اظہار کی خواہش کی تکمیل بھی ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ تخلیق انسانی کے مقصد کا شعور اور اس کی بیداری بھی نصیب ہو غیر مفید غیر سنجیدہ افعال و حرکات کے ارتکاب کے بجائے ہماری مسرتوں کی وابستگی رب العزت کی عظیم ترنعمتوں سے ہی رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ میں رقم طراز ہیں۔

"ہر قوم کے لئے ایک دن مقرر ہوتا ہے کہ اس میں تجمل کرتے ہیں اور خوب زینت کے ساتھ اپنے شہروں سے نکلتے ہیں یہ ایک ایسی رسم ہے کہ اس سے عرب و عجم کی کوئی قوم خالی نہیں ہے جب نبی کریمؐ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں کے لئے دو دن مقرر تھے جن میں وہ لوگ کھیل کود کرتے تھے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دو دن کیسے ہیں ان لوگوں نے عرض کیا ان دو دنوں میں ہم ایام جاہلیت میں ہم لوگ کھیل کود کرتے تھے

آپ نے فرمایا — خدا تعالیٰ نے تم کو ان کے بدلے میں ان سے بہتر دو روز عطا فرمائے ہیں وہ یوم عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں — بعض نے کہا وہ دو روز جن میں وہ کھیلتے تھے نوروز اور مہرجان تھے۔ اور ان دونوں کو اس لئے بدلا گیا کہ نبی کریمؐ کو اس بات کا خوف ہوا کہ اگر آپ نے ان کو اسی عادت پر چھوڑ دیا تو شعائر جاہلیت کی تعظیم یا ان کے اسلاف کے طریقے کی ترویج پا جائیں گے اس واسطے آپ ان کو دو اور دنوں کے ساتھ بدل دیا کہ اس میں ملت حنفیہ کے شعائر کی تعظیم پائی جاتی ہے اور ان دو دنوں میں تجمل کے ساتھ ذکر الٰہی اور ابواب بندگی کو بھی ملایا تا کہ مسلمانوں کا اجتماع محض کھیل کود ہی نہ ہو اور تا کہ یہ اجتماع اعلاء کلمۃ اللہ سے خالی نہ ہو ان دونوں دنوں میں سے ایک وہ دن ہے جس میں وہ اپنے روزے سے فارغ ہوتے ہیں اور ایک قسم کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے اس لئے دو فرحتیں حاصل ہوتی ہیں ایک فرحت طبعی جو ان کو روزے کی عبادت شاقہ سے فراغت پانے سے اور فقراء کو صدقہ دینے سے حاصل ہوتی ہے اور ایک فرحت عقلی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عبادت مفروضہ ادا کرنے سے اور ان کے اہل و عیال کو دوسرے سال تک سلامتی سے رکھنے کا انعام عطا فرمانے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

اگر ہم اقوام عالم کی پوری تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں کسی قوم کی عید میں یہ اچھوتی خصوصیت نظر نہیں آئے گی۔ ہر قوم کی عید میں محض خوشیاں منانے کا رواج ہے لیکن اسلام کی عید ون کی خوشیاں بھی عبادت و اظہار بندگی کی صورت میں ہیں دیگر قوموں نے اپنے ایام عید میں خوشی کے اظہار میں صرف ہوس پرستی اور مجنونانہ جذبات کا مظاہرہ کیا اور آج بھی کرتی چلی آرہی ہیں لیکن اس کے برعکس اسلام نے اپنے مقدس و پرمسرت دنوں کا تقدس ان کی تعظیم و احترام کے ساتھ قائم کیا ہے سب سے اچھل کود اور لایعنی شور و غوغا کے بجائے اپنے معبود حقیقی کی حمد و ثنا اور اس کی توحید و کبریائی کا ذکر کرنے کا ہے اس جشن کی کو آنحضرتؐ نے پہلی نفلی عبادت

اجتماعات سے منایا اور تمام مسلمین کے لئے ایک زبردست مثال قائم کی کہ وہ اسی طرح اپنے رب کے احکامات کی بجا آوری کی توفیق پر ہر سال ایک عظیم الشان اجتماع کی شکل میں اپنے لطیف احساسات و جذبات شکر کا اظہار کریں۔ ایک جانب تو مسلمین کا یہ عمل عید الفطر کے نوافل ادا کرنے کے ذریعہ سجدۂ شکر بجا لانے کا موجب بنے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ہمہ گیر اتحاد اخوت و مساوات پر شکوہ اجتماع اور رب کریم و رحیم کے عطا کردہ دین کامل کی عظمت و رفعت کا بھرپور اظہار ہو۔ اس طرح عید مسلمانوں کے اجتماعی قوت کا اظہار بھی ہے اور انعام الٰہی بھی۔

خدائے وحدہٗ لاشریک نے رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اپنے محبوب ترین پیغمبر رسول اکرمؐ پر جنہیں خدائے واحد نے جدید و قدیم مذاہب عالم اور ادیان عالم میں دین کامل اسلام کو روئے زمین پر نشر کرنے پر مبعوث فرمایا اور شب معراج عرش معلیٰ پر شرف تکلم بخشا انہیں نجات دہندہ پر لیلۃ القدر میں قرآن ناطق کا نزول ہوا پروردگار نے ہزاروں مہینے سے زیادہ اس شب کو فضیلت عطا کی یہ برکتوں اور رحمتوں والی شب رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ رب رحیم کے نیکوکار بندے فرائض صوم و صلوٰۃ کی بجا آوری کے بعد اپنے تزکیۂ نفس تقویٰ و صبر کی قبولیت کے طلبگار ہوتے ہیں خدائے تعالیٰ کی رحمت و بخشش کے رجائی بن کر نوافل عید الفطر ادا کرنے کے لئے شوال المکرم کی پہلی صبح کو مسجدوں اور عیدگاہوں میں جوق در جوق ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیاز و تفاوت سے بے نیاز صف آرا ہو کر ملت اسلامیہ کی اصل روح اخوت و مساوات کو زندہ و تابندہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی عید دنیوی تقریبات اور ملکی علاقائی رسمی و خاندانی جشنوں کے برعکس خالص اسلامی تہوار کی حیثیت رکھتی ہے احکام اسلام کا مظاہرہ اور مسلمانوں کی عظمت کا اظہار ہی عید کی اصل روح ہے ایک عربی مقولہ ہے کہ عید نئے کپڑے پہننے اور بلند و بالا سواریوں پر سوار ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہوں کو ترک کرکے خدا کے قہر و غضب سے خوف زدہ ہو کر اسلامی احکام بجا لانے والوں کی عید ہوتی ہے

یہ بڑا ہی سعادت والا اور خدائی رحمت و مغفرت والا دن ہے جس میں بندے کے لئے خدا کی رحمتوں اور عنایتوں سے فیض اٹھانے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ شریعت اسلام کا کوئی حکم [illegible] دینی و دنیاوی فائدے سے خالی نہیں اسلامی تہواروں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے کہ ان میں بھی بے شمار مقاصد و فوائد مضمر ہیں۔ عید الفطر یعنی افطار والی عید کے لفظ ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا تقرر روزوں کے بعد کیا گیا اس طرح ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ماہ رمضان کے پورے روزے صحت و ترتیب کے ساتھ رکھے ان کے لئے یہ عید الفطر ایک مسرت آگیں تقریب کی شکل میں مقرر ہوئی ہماری تمام عبادت ریاضت و افکار نیکیاں اور بھلائیاں توفیق خداوندی کا نتیجہ ہیں تو اسی رحیم و کریم رب العالمین کا شکر ادا کرنے کے لئے عید کی دو رکعت نماز کی ادائیگی سجدۂ شکر کے طور پر کی جاتی ہے:

حضور سرور عالمؐ کے دور مبارک میں عیدگاہ میں بڑے بڑے قومی امور پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ حضور اکرمؐ نے قومی امور کو سرانجام دینے اور اصلاح و تربیت کے لئے اجتماع کو بے انتہا اہمیت دی تھی مگر ذرا ہم دور حاضرہ کا موازنہ اس دور سے کریں تو یہی نتیجہ اخذ ہوگا کہ کس قدر تضاد و تفاوت آج مسلمانوں کے طرز زندگی میں پیدا ہو چکا ہے اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ان کا ملی و قومی سرمایہ تہس نہس ہو چکا ہے۔ سنتے آئے ہیں کہ رمضان شریف میں شیطان قید کر دیا جاتا ہے مگر یہ بات اس وقت بڑے ہی رنج و افسوس سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے خود بعض مسلمانوں کو رمضان المبارک جیسے مقدس ماہ میں فلم بینی کرتے، تاش کھیلتے اور فحش حرکات کرتے دیکھا ہے۔

اقوال زریں

۱۔ خیرات کرکے احسان نہ جتاؤ۔
۲۔ برائی کو بھلائی سے رفع کیا کرو۔
۳۔ عورتوں کی عزت ہی نوع انسانی کا فریضہ ہے۔
۴۔ جہاں غصہ ہے وہاں جانا اور برباد ہونا ہے۔
۵۔ خاموشی غصہ کا بہترین علاج ہے۔
۶۔ انسان کی برائی غصہ ظاہر کرنے میں نہیں ضبط کرنے میں ہے۔

مرسلہ: [illegible]

کفایت شعار

از۔ جیلانی بانو

اچانک ایسا لگا کہ جیسے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا ہو۔ پہلے تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی پھر لیٹنے کی۔ اپنے جسم سے پسینہ پوچھنا چاہا اور پھر بھی نہ کر سکتے پر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی سب اٹھ کر اس کے پلنگ کے گرد اکٹھا ہو گئے اس کی آواز پر سب جاگ پڑے وہ سب کاہل منحوس سونے والے جنھیں وہ صبح نو بجے تک چلا چلا کر جگاتی پھرتی تھی۔ رات کے دو بجے بڑی بہو جو خود اٹھ کر کبھی پانی نہ پیتی تھی دوڑ کر گلاس بھر لائی۔ مجھلی بہو جس سے بول چال اس سے مہینہ بھر سے بند تھی سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ چھوٹی والی بے چاری کی شادی کو ابھی صرف ایک مہینہ ہوا تھا اس لئے اسے کمرے سے اٹھ کر باہر آنے میں ذرا دیر لگی اس کے تینوں بیٹے گھبرا کے باری باری شہر کے مختلف ڈاکٹروں کو فون کرنے لگے۔ اس بات سے وہ اور گھبرائی۔ اتنی رات کو ڈاکٹر کو بلانے کا مطلب تھا تیس چالیس روپیہ کا خرچ بھلا ایک مرے ہوئے آدمی پر اتنے روپیئے خرچ کرنے سے کیا فائدہ ڈاکٹر آب حیات تو پلانے سے رہے۔ اس کا شوہر ابھی تک نشے میں دھت تھا اس کے باوجود آج وہ بیوی کی بیماری پہ اسے گالیاں دینے کے بجائے سنجیدہ سا ہو گیا تھا اور بار بار بیٹوں سے کہہ رہا تھا۔ کچھ نہیں تھکن ہو گئی ہے۔ ذرا سی وہسکی پلا دو۔ تم کہو تو میں ابھی لے آؤں۔ لاؤ نکالو تو بڑی بہو ایک دس کا نوٹ مگر اس کے لڑکے تو بس ڈاکٹروں کو فون پر فون کئے جا رہے تھے

نہ ڈاکٹر آئے اور نہ اس نے کوئی دوا پی مگر چند منٹ بعد خود ہی کچھ حواس آنے لگے دل میں شدید درد تھا مگر اس کے کان اب سب کی آوازوں کو سن سکتے تھے۔ آنکھیں ہر ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں دونوں ہاتھوں سے دل تھامے ہوئے تھی اور اپنے بچوں کو دل بھر کے دیکھ لینا چاہتی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ہارٹ اٹیک ہے وہ اب صرف چند منٹ کی مہمان ہے اتنی جلدی اپنے سامنے موت کو دیکھ کر خوف سے کانپ رہی تھی یا بیماری سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے منہ سے کف جاری تھا وہ بار بار ہچکیاں لے رہی تھی اور اپنے بڑے لڑکے کو بے بسی سے تک رہی تھی جو اتنی سردی میں سوئٹر بغیر پہنے آ گیا تھا۔ اللہ اسے ذرا دیر کے لئے قوت گویائی دے دے تو وہ راشد کو سوئٹر پہننے کی تاکید کر دے ورنہ وہ یوں ہی ململ کا کرتا پہنے قبرستان جائے گا۔ آنے کے بعد اسے زکام ہو جائے گا کھانسی بڑھ جائے گی کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔

اور یہ مجھلی بہو۔ اس نے آج پھر چھپ کر میاں کے ساتھ سینما دیکھا ہے جبھی تو ابھی تک نہ میک اپ اترا ہے نہ کپڑے بدلے ہیں۔ یقیناً انھوں نے آج پھر باکس کا ٹکٹ لیا ہوگا اور بیس پچیس روپیئے اجاڑ کر آئی ہوگی۔ یا اللہ ان بے نتھے بیلوں کو میں کس پر چھوڑ کر جاؤں اس گھر کا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے یہ تو اسی کا دم تھا کہ صبح سے شام تک گھن چکر بنی پھرتی تھی۔ سب کی ناکوں میں نکیل ڈالے رکھتی تھی۔ پھر بھی گھر میں ہر طرف بے ڈھنگا پن نظر آتا ہے۔ دنیا میں شاید ایسی ہی کوئی فضول خرچی اور بے وقوفی کی بات رہ گئی ہو جو اس گھر میں نہ ہوتی ہو۔ امی جان۔ امی جان۔ میری امی۔ چھوٹا بیٹا اسے جھنجھوڑنے لگا۔

میں ٹھیک ہوں منے تم مت گھبراؤ۔ اچانک اس کی قوت گویائی واپس آ گئی اور وہ رک رک کر ہانپ ہانپ کر بولی ــ۔ منے اپنے بھائی جان کا سوئٹر لا دے۔ اتنی سردی ہے..... بس اب ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں تم مت گھبراؤ امی۔ اس کی فضول بکواس پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر کو مت بلانا۔ میں تو مر ہی رہی ہوں اب ان کی فیس کا خرچہ کیوں بڑھاتے ہو ـــ اس مہینے میں ٹیلی فون کا بل بھی دینا ہے۔

پھر اس نے بڑی بہو کو اشارے سے پاس بلایا حالانکہ اسے چھوٹی بہو سب سے زیادہ پسند تھی۔ سیدھی سادی اس کے اشاروں پر ناچنے والی۔ مگر پسند سے کیا ہوتا ہے۔ گھر کا انتظام تو اب اس چالاک، عزانٹ بڑی بہو کے ہاتھ ہی میں آئے گا جو دو چار دن ہی میں اس گھر کو برباد کر دے گی۔

۔ اب ڈاکٹر کو مت بلاؤ ان سب کو منع کر دو۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی خواہ مخواہ تیس روپیئے کا خرچ۔

سلمیٰ! یاد رکھو۔ اپنے سسر کو شراب نہ پینے دینا اور راشد کو

سویٹر پہنا دو۔ درد کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اللہ کتنے اچانک اسے موت آگئی۔ ابھی تو بہت سے کام باقی تھے بہت سی باتیں کہنا تھیں۔

جب اس کا شوہر بھی بیوی کی بگڑتی حالت کو دیکھ کر قریب آ بیٹھا تو اس نے پھر اپنی قوت کو اکٹھا کیا۔ الماری کے سیف میں ایک ڈبے کے اندر بیس ہزار روپئے اور کچھ زیور ہے۔" دیکھو تمہیں اللہ کی قسم اس کی شراب نہ پینا۔

روپئے اور سونے کا نام سن کر اس کے سب بیٹے اور بہوویں اس پر جھک گئیں مگر اس نے فوراً شوہر کا ہاتھ تھام کر بات بدلدی میری قبر پکی نہ بنوانا۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔

"امی جان! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ابھی ڈاکٹر صاحب ایک انجکشن دے دیں گے آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" ان کا بڑا بیٹا ہاتھ سہلانے لگا۔

"نہیں۔ اب میں نہیں بچوں گی۔ پھر تم ڈاکٹر کو کیوں بلاتے ہو۔ تم قبرستان جانے سے پہلے سویٹر ضرور پہن لینا اور بہو کو تاکید کرنا کہ بچوں کو آیا کے سپرد کر کے باہر نہ جایا کرے۔ پھر منجھلی بہو کو دیکھ کر اسے کچھ اور ہدایتیں یاد آئیں۔

"گھی ختم ہوگیا ہے۔ صبح ارشد کو ٹفن ضرور دینا۔ چاول ذرا دیکھ کر پکانا ابھی آدھا مہینہ پڑا ہے۔"

اس کی بہکی بہکی باتیں سن کر بہویں سسکنے لگیں۔ بیٹے اپنی آنکھیں پونچھنے لگے

درد کی شدت بڑھنے لگی۔ وہ سورہ یٰسین یاد کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو ولایت تک بھیج کر پڑھایا تھا مگر اس میں کسی کو نہ نماز یاد تھی نہ قرآن اور وہ اتنے قابل بیٹوں کی موجودگی میں کسی سے مرتے وقت خدا کا کلام بھی نہ سن سکتی تھی۔ بس اب چند لمحوں کا معاملہ ہے۔ پھر اس سے اور ان بچوں سے اس کا ناطہ ٹوٹ جائے گا۔ جانے یہ کاہل بہویں مچان والا صندوق کھول کر اس کا مرنے قریب کا کفن نکالیں گی یا نہیں۔ کہیں کاہلی کے مارے بازار سے دوسرا کفن منگا لیں اس گھر میں تو یہی طور طریقے تھے۔ جو چیز نظر نہ آئی کبھی ختم ہوگئی یا گم گئی۔ فوراً نوکر کو دوڑایا دوسری لانے کے لئے۔ ایسا بات جب وہ بہوؤں کو کھاتی تھی۔ تو وہ بہت خفا ہوتی تھیں۔ کیونکہ جھوٹے الزاموں کو کوئی برداشت کرے مگر سچی بات کو سہنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

"میرا کفن، میرا کفن" وہ بے ہوشی میں چلائی۔ میرا کفن ابھی مچان والے صندوق سے نکالو۔

اس کے دماغ میں طوفان مچا ہوا تھا۔ جانے کاہے کا ایسا شور تھا کہ کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ بہت سی باتیں ڈوب ڈوب کر اس کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ آب زمزم کی شیشی الماری میں ہے۔ نہلانے والے غسالوں کو بلانے کے لئے کوئی حمید کو بھیج دے گا۔ وہ تو سڑکوں پر کھیلتا رہے گا اور میرے جنازے کی نماز ظہر میں نہ ملائی جاسکے گی۔ آج جب موت سامنے آکھڑی ہوئی تھی تو جانے کیوں وہ اتنی دلیر بن گئی تھی اسے موت کا ذرا بھی خوف نہ تھا۔ بلکہ جب بھی وہ اپنی موت یاد کرتی تو اس کے ذہن میں اس کے گھر کے بکھیڑے آجاتے اس کی موت کی خبر سن کر لوگ گھر میں اکٹھے ہو جائیں گے پھر جانے کتنی چیزیں چوری ہوں گی سارے باغ کا ستیاناس ہو جائے گا۔ اس کی بہویں تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گی کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

اب درد کو سہارنا اس کے اختیار میں نہ رہا۔ نہ وہ سن سکتی تھی نہ دیکھ سکتی تھی دماغ میں کسی نے آٹا پیسنے کی مشین لگادی تھی۔ ایسا طوفانی شور تھا اب ڈاکٹر آکر کیا کرے گا ایسی حالت میں کوئی بچ سکتا ہے پھر ڈاکٹر کو اس کی فیس کیوں دی جائے' یہ پیسے اس کے کفن دفن میں خرچ ہو جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔ پڑوس میں ڈاکٹر صاحب مرے تھے تو ان کے بیٹوں نے آنگن میں شامیانہ لگوایا تھا۔ کرسیوں کی قطاریں بچھوائی تھیں۔ کہیں اس کے بیٹے بھی ڈاکٹر صاحب کے بیٹوں کی نقل نہ کریں بھلا مرنے والے کو کیا مل جاتا ہے پانچ سو آدمیوں کے کھانے سے۔ آج کل کفن دفن پر ہی تین چار سو خرچ ہو جائیں گے بلکہ اس کی بڑی بہو جیسی شاہ خرچ تو پانچ چھ سو بھی خرچ کر دے گی اور پھر مہینے کے آخر میں ادھار چلے گا۔ پھر تینوں بھائیوں کے لڑائی جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔

یہ تو اکیلا اسی کا دم تھا کہ ان بکھرتے تنکوں کو جھاڑو بنائے ہوئے تھی۔ سارے ڈاکٹر مر گئے' کوئی نہیں آتا۔ راشد بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میرا خیال ہے اسپتال چلیں وہاں ہر قسم کی میڈیکل ایڈ فوراً مل جائے گی اس کی چھوٹی بہو نے کہا۔

"نہیں، نہیں!" اس نے ہاتھوں کے اشارے سے منع کیا اسپتال جانے کے نام سے ہی اسے ڈر لگتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کوئی نہ مرتا ہو تو انجکشن دے کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ پھر وہاں وارڈ کا کرایہ، نرسوں کو خوش کرو، ڈاکٹروں کی فیس دو۔ اوہ مرنے میں کتنا خرچ ہے۔ آج معلوم ہوا ہے حالانکہ وہ بہوؤں کے طعنے سن سن کر بھی کبھی روٹی کھانے میں بھی سوچا کرتی تھی کہ بڑھاپے میں آخر اس کا مصرف ہی کیا ہے۔ سوائے دواؤں کے خرچ کے۔ یوں تو اولاد بوڑھے ماں باپ کے علاج پر بڑی توجہ دیتی ہے چاہے مانگنے پر ایک روپیہ بھی دینے پر تکرار کریں۔ مگر وہ ذرا بھی بیمار ہو جائے تو بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھانے پر تیار ہو جائیں گے۔

"امی آپ اچھی ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر زیدی کا فون آیا ہے وہ ابھی آ رہے ہیں ــ" ڈاکٹر زیدی کا نام سن کر اس کے دل کا درد ختم ہو گیا۔ مینائی واپس آ گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا ــ

"میں بالکل ٹھیک ہوں اب درد تھم گیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کو نہ بلاؤ ــ"

"اچھا نہیں بلائیں گے۔ میری امی آپ اچھی ہو گئیں" چھوٹا لڑکا ماں سے لپٹ کر خوشی کے مارے رونے لگا۔

بہوؤں کو اشارے سے سمجھانے لگیں "کسی ڈاکٹر کو مت بلاؤ کوئی ڈاکٹر آیا تو بغیر فیس کے نہیں ٹلے گا۔ بیٹھے بٹھائے جتنی چاہیں روپیہ کا نقصان ہو گا۔ دیکھو میں اب بالکل ٹھیک ہوں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عین اسی وقت باہر کچھ آوازیں آنے لگیں اور پھر راشد اکٹھا چھ ڈاکٹروں کو لے کر آ گیا۔

"یہ سب مجھے دیکھیں گے اتنے ڈاکٹروں کی فیس دینا پڑے گی" وہ سینے پر دوہتڑ مار کر پیچھے کو گر پڑی اور اس سے قبل کہ ڈاکٹر اپنی فیس وصول کرنے کا اہتمام کریں کہ وہ مر چکی تھی۔

شادی کے گیت

سسر موشر موری دلہنیا آج کی رات
سسر موشر موری دلہنیا آج کی رات
براتی آئے ہیں مہمان تیرے اُبٹن کا سامان
مہکو مہکو ری دلہنیا آج کی رات
شر موشر موری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

براتی آئے ہیں مہمان تیری مہندی کا سامان
رچو رچو ری دلہنیا آج کی رات
شر موری شر موری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

براتی آئے ہیں مہمان تیرے جوڑے کا سامان
پہنو پہنو ری دلہنیا آج کی رات
سسر موسسر موری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

براتی آئے ہیں مہمان تیرے زیور کا سامان
سجو سجو ری دلہنیا آج کی رات
شر موشر موری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باراتی آئے ہیں مہمان تیری سیجوں کا سامان
جھکو جھکو ری دلہنیا آج کی رات
شر موشر موری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لطیفے

• پیرس کی اعلیٰ سوسائٹی کی ایک پارٹی میں ایک عمر رسیدہ رئیس ایک نہایت خوبصورت کمسن لڑکی کے ساتھ شریک ہوا تو سب لوگ اس رئیس کے کوٹ پر لگے ہوئے بیج کو دیکھ کر حیران رہ گئے اس پر لکھا ہوا تھا۔ میں اس لڑکی کا باپ ہوں۔

• ایک پرائیویٹ سراغرساں نے اپنی مؤکلہ کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ میں آج صبح سے آپ کے شوہر کے پیچھے لگا رہا۔ وہ اپنے فاضل وقت میں چار مختلف ہوٹلوں کے بار میں اور ایک کنا اسٹیک میں تشریف لے گئے تھے۔

اہا! خوب! بیوی نے کہا۔ آگے کہو وہ وہاں کیا کرنے گئے تھا جہاں تک میں نے معلومات حاصل کی ہیں۔ سراغرساں نے کہا وہ مالک پرائیویٹ مصروفیات کی چھان بین کرتے پھر رہے ہیں۔

میری کہانی

میری ہی زبانی

ایک خاتون

اس سے پہلے کہ میری کہانی شروع ہو۔ میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ آپ نے اکثر اخباروں میں پڑھا ہوگا اور سنا بھی ہوگا کہ عورتیں مردوں کے ظلم اور زیادتی کے خلاف مظاہرے کرتی ہیں۔ اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھاتی ہیں۔ مجھے ان کی آوازیں کھوکھلی لگتی ہیں یہ نہیں کہ وہ کوئی غلط بات کہتی ہیں وہ سچ کہتی ہیں کہ مرد عورتوں کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں وہ عورتوں پر ظلم وستم کرتے ہیں لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ عورت خود بہت ظالم ہے اپنی ہم جنس پر جتنا ظلم عورت کرتی ہے شاید ہی کوئی جانور کرتا ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ عورتیں پہلے اپنی ذات کو سنوارنے کے لئے آواز اٹھائیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جو کوشش کر رہی ہیں عورت کے بننے سنورنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو عیبوں سے پاک کریں اپنی ہم جنس کے برے بھلے کے بارے میں سوچے اور کسی عورت کی بربادی کا سبب بننے سے گریز کرے۔ میری زندگی شاہد ہے کہ عورت کی بربادی کا سبب عورت ہے مرد محض ایک کھلونا ہے عورت جو چاہے مرد سے کروا سکتی ہے۔

میرا تعلق ایک اعلیٰ گھرانے سے ہے۔ اعلیٰ گھرانے کا مفہوم یہ ہے کہ دولت کی فراوانی ہو بچے ایسے اسکولوں کے تعلیم یافتہ ہوں کہ فر فر انگریزی بول سکیں جدید خیالات سے آشنا ہوں سال میں ایک چکر یورپ یا امریکہ کا لگائیں معاشرے میں آپ لڑکی کی شکل وصورت کو نظر انداز نہیں کرسکتے یہاں لڑکے کے لئے رشتہ مانگنے والوں کا پہلا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی گوری ہو۔ میں حسین وجمیل تھی اس لئے مجھے شادی میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میری شادی چودہ سال کی عمر میں ہوگئی میرے چار بچے ہوئے تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اس وقت سبھی جوان ہیں بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ بیٹی کی شادی شوہر سے علیحدگی کے تین ماہ پہلے ہوگئی تھی — مجھے طلاق لئے تین سال ہوگئے ہیں۔ میری شادی تئیس سال تک قائم رہی۔ شادی کے بیس سال آرام واطمینان سے گزرے۔ مگر بقیہ تین سال پریشانی جلن اور کڑھن میں کٹے۔

ہمارے بزرگ جو باتیں کہتے ہیں وہ برسوں کے تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں لیکن ہم جوانی کے جوش اور جذبے میں ان کی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ ضد میں — ان کی روش کے خلاف چلنے کی کوشش کرتے ہیں اصغری جان سے جب میری دوستی کی ابتدا ہوئی تو مجھے لوگوں نے بہت سمجھایا کہ مطلقہ کی دوستی خطرناک ہوتی ہے۔ مطلقہ سے ہمیشہ بچ کر رہو۔ عورت اپنا گھر برباد کر بیٹھتی ہے اسے دوسری عورت کا گھر برباد کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا لیکن میں نے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے مطلقہ ایک دکھی عورت ہوتی ہے۔ اسے صرف شوہر ہی نہیں پورا معاشرہ ٹھکرا دیتا ہے۔ یہ ایک عورت کے ساتھ ظلم وزیادتی ہے مطلقہ کو ہماری ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو برا کہتی ہیں ایسی عورتوں کو مردوں کی زیادتی کا کوئی گلہ نہیں کرنا چاہیئے۔

میں نے اصغری سے دوستی قائم رکھی میری نظر میں وہ ایک اچھی عورت تھی۔ شومئی قسمت سے اس کا گھر برباد ہوگیا تھا اسے محبت وہمدردی کی ضرورت تھی میں نے اپنائیت کے ساتھ اسے اپنے دل میں جگہ دی میرے گھر میں اس کا آنا جانا تھا میں چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہو جائے دوبارہ اس کا گھر بس جائے اس سلسلے میں کسی کے ساتھ اس کا میل جول بھی تھا اس کے بارے میں لوگ جو وسوسے میرے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے میں ہنس کر ان کو ٹال دیتی تھی میں سوچتی تھی کہ ان کو کیا معلوم کہ اصغری کے دل میں کسی کی چاہت ہے کسی مرد سے محبت کرنے والی عورت میرے شوہر پہ ڈورے کیوں کر ڈال سکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں سادہ دل تھی۔ دنیا کے مکروفریب سے ...... واقف نہیں تھی۔ مجھے اپنے شوہر کی محبت پہ کوئی شبہ نہیں تھا اس کی تمام جائداد میرے نام تھی وہ کاروبار کے سلسلے میں دہلی میں رہتا میں لکھنؤ میں رہتی تھی کچھ عرصہ گزرا تو لوگوں نے مجھے اصغری اور میرے شوہر کی ملاقاتوں کی خبریں دینا شروع کیں مجھے لوگوں کی باتوں

سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی تنگی میں نہیں رکھا تھا ایک دن اچانک میرے دل میں پریشانی نے سر اٹھایا۔ میری طبیعت گھبرائی مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے میں نے اپنے شوہر کو فون کیا۔ قسمت دیکھئے کہ لائین اس طرح ملی کہ اصغری ہی نے فون اٹھایا اور بولی، میں اصغری بول رہی ہوں، اسے کیا معلوم تھا کہ فون میں نے کیا ہوگا ــ اس کے بعد میرے شوہر کو مجھ سے صلح کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس لئے کہ میری ساری جائداد وہ فروخت کر چکا تھا۔ آخرکار میری طلاق ہوگئی۔

یہاں سے میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا مجھے ایسے حادثات پیش آئے کہ ہر قدم میرے لئے ایک سبق بن گیا۔ پہلا سبق تو یہ تھا کہ آپ کے پاس روپیہ پیسہ نہ رہے تو دوست احباب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا میرا کوئی نہ رہا تھا تنگدستی اور تنہائی کا ساتھ تھا۔ میں نے کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر میری زندگی باقی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بڑی آرام دہ زندگی گذاری تھی شوہر کے گھر اور باپ کے گھر دونوں جگہ مجھے زندگی کا ہر آرام حاصل رہا تھا میں نے خدا کو رجوع کیا میں رو رو کر خدا سے دعا مانگتی تھی کہ تم نے زندگی دی ہے تو اسے بسر کرنے کے لئے ہمت بھی دو۔

خدا نے مجھے ہمت دی۔ میں نے اپنا کاروبار کرنے کی ٹھانی۔ میں نے اپنے ایرانی قالین اور زیورات فروخت کئے اور کپڑے کی پرنٹنگ کا کام شروع کیا۔ شروع میں مجھے بے اندازہ نقصان ہوا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اب خدا کا شکر ہے میرا کاروبار جم گیا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ پہلے ہی میری بیٹی کی شادی ہوگئی تھی بیٹے میرے پاس تھے لیکن تنگدستی ہو تو اولاد بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے بڑے بیٹے بھاگ کر باپ کے پاس چلے گئے چھوٹے اب بھی میرے ساتھ ہیں اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے باپ نے بیٹے کو علیحدہ فلیٹ دے دیا۔ گاڑی بھی دی لیکن وہ نشے کا عادی ہوگیا ایسے حالات میں عموماً بچوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔

میں اپنی کہانی اس لئے سنا رہی ہوں کہ بہت سی عورتیں میری ہی طرح سادہ دل ہوں گی وہ زندگی میں احتیاط برتیں۔ آخر میں میری دعا ہے کہ خدا عورتوں کو نیکی کی ہدایت دے اور وہ اپنی ہم جنس پر ستم کرنے سے باز رہیں۔

کا یقین نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی دل میں وہم آ جاتا تھا۔ میں سوتے سے چونک کر جاگ اٹھتی تھی اذیت ناک خیالات سے بچنے کی خاطر میں نے اپنے شوہر سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ۔ جب میں نے اسے بتایا کہ لوگ اصغری اور اس کے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہیں تو اس نے قسمیں کھا کر مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ میں اس کی باتوں سے مطمئن ہوگئی میں نے سوچا کہ میرا شوہر ٹھیک کہتا ہے لوگ ہماری خوشگوار زندگی سے حسد کرتے ہیں وہ مجھے خوش حال اور مطمئن نہیں دیکھ سکتے اس لئے میرے دل میں بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ ہی دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ میرے شوہر نے اصغری سے شادی کرلی ہے وہ دونوں دبئی میں اکٹھے رہتے ہیں۔ اس خبر میں کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میری راتوں کی نیند اڑ گئی۔ میں خواب آور گولیاں کھانے لگی لیکن یہ گولیاں بھی بے اثر ثابت ہوئیں۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا۔ میں یہ صورت حالات برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہیں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر تم اس کو نہیں چھوڑ سکتے تو میں طلاق لے لوں گی۔ میرے شوہر نے میرے حق میں فیصلہ دیا۔ باقاعدہ عدالتی کارروائی کے ذریعے اس نے اصغری کو طلاق دے دی۔

مجھے اپنے شوہر اور گھر سے محبت تھی۔ اپنے گھر کی سلامتی کے لئے میں نے گذشتہ واقعات کو فراموش کر دیا اور یوں رہنے لگی جیسے کچھ نہیں ہوا تھا لیکن یہ میرے شوہر کی ایک چال تھی۔ میں اس کی چالوں سے بے خبر تھی کچھ عرصے بعد وہ کہنے لگا۔ "کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے اس سے ہمیں مکان فروخت کرنا پڑے گا۔ کاروبار میں پیسہ لگانے کے لئے ہمیں زمین بیچنی ہوگی"۔ اس طرح جو جائداد میرے نام تھی وہ آہستہ آہستہ فروخت ہونے لگی اس کی فروخت سے حاصل ہونے والا روپیہ کہاں جاتا تھا مجھے معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی میں نے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی مجھے اپنے شوہر پر اعتبار تھا۔ میں اس سے کہتی تھی کہ جس کچھ تمہارا ہے کاروبار کو بچانے کے لئے جو چاہو بیچ ڈالو۔ اس طرح میرے نام کی تمام جائداد فروخت ہوگئی۔

مجھے دوبارہ خبریں ملنے لگیں کہ میرے شوہر اور اصغری کا آپس میں میل جول ہے۔ میں نے دوبارہ اپنے شوہر سے بات کی تو وہ کہنے لگا کیا تمہیں طلاق نامے پر بھی یقین نہیں ہے میں خاموش ہوگئی مجھے اپنے شوہر

اسکے بعد پہلا کالم پڑھئے

(از۔ خالد تبسم)

ہفتہ کا دن تھا مگر آج صبح وہ بہت دیر سے اٹھی جب وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر قالین کے قریب پڑا اخبار اٹھا کر لائی تو دس بج رہے تھے ناشتے سے پہلے حسب عادت وہ اخبار پھیلا کر سرخیاں پڑھنے لگی۔

"بلدیہ کے اہلکار پر رشوت کا الزام" "پر اسرار قتل کے سلسلے میں پانچویں عورت کا بہیمانہ قتل" وغیرہ وغیرہ۔ یہ صرف ہفتے کی ہی بڑی بڑی سرخیاں نہیں تھیں بلکہ اس قسم کی شہ سرخیاں تو اخبار کا معمول تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ کچن میں چلی آئی اور کچن ٹیبل پر اخبار پھیلا کر اندرونی صفحات پر دلچسپ مضامین پڑھنے لگی جن میں ڈرامہ ریڈیو اور غیر ملکی سیاحت پر مضامین بھی شامل تھے۔ اخبار سے فارغ ہو کر وہ ناشتے کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔ اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اس بے وقت کی زحمت پر جھنجھلا گئی۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اس نے عدم توجہی کی بہت کوشش کی مگر ناچار اسے فون اٹھانا ہی پڑا دوسری طرف سے کوئی مرد بول رہا تھا۔

"کیا میں لز سے بات کر سکتا ہوں مہربانی ہوگی۔" فون کرنے والے کی آواز صاف اور نمایاں تھی۔ لز کا نام سنتے ہی اس کی پیشانی پر سوچ کی انگنت سلوٹیں ابھر آئیں کیونکہ وہ کسی لز نامی لڑکی کو نہیں جانتی تھی۔ "کون لز؟"

"کیا لز یہاں نہیں رہتی۔ فون کرنے والے نے مایوسانہ انداز میں استفسار کیا میرا خیال ہے آپ نے رانگ نمبر کیا ہے کیونکہ یہاں لز نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔" اس نے نہایت تحمل اور نرم لہجے میں جواب دیا۔

"بہت بہتر۔" فون کرنے والے نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا "جیسے اسے ایسے واقعات معمول کی بات ہوں۔ یہ آج کے دن کا اچھا شگون نہیں۔ معاف فرمایئے گا میں نے آپ کو خواہ مخواہ زحمت دی۔" نامعلوم شخص نے فون کاٹ دیا اور وہ کچن میں واپس آگئی۔

ٹھیک ایک منٹ کے بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی اس وقت وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے فون کی بار بار مداخلت پر غصہ آیا مگر پھر اسے فون اٹھانا پڑا — اوہ .... آپ .... کیوں مجھے دوبارہ رانگ نمبر تو نہیں مل گیا۔ فون کرنے والے نے اس کی آواز کو پہچان لیا۔

"اگر آپ لز سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو پھر یقیناً آپ نے رانگ نمبر ہی کیا ہے وہ ایک لمحے کے لئے سوچ کر بولی۔

عجیب بات ہے اس مرتبہ جب میں نے ۸۸۶۱۰۹۱ ڈائل کیا تو میرا خیال تھا کہ مطلوبہ نمبر مل جائے گا۔ مگر....

"یہ ۸۸۶۱۰۰۱ ہے" اس نے بات کاٹ کر وضاحت کی۔

"یہی تو مسئلہ ہے ہر بار مجھے آپ کا نمبر مل جاتا ہے کچھ میں نہیں آتا کہ چکر کیا ہے یا تو میں ہی نمبر مس ڈائل کرتا ہوں اور یا تو پھر لائن ہی گڑبڑ ہے۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہت شیریں اور دلکش ہے۔"

"کیا!" لاشعوری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔

"آپ کی آواز — معاف کیجئے گا میں پہلی مرتبہ یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ٹیلیفون پر آپ کی آواز بہت شیریں اور دلکش ہے۔

"میری آواز دلکش ہے بہت بہت شکریہ آپ کا۔" تعریف سنتے ہی بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تعریف ہر عورت کی طرح اس کی بھی فطری کمزوری تھی۔

"اگر آپ خوبصورت ہیں تو آپ کے شوہر بہت خوش قسمت انسان ہیں۔ معاف کرنا میں نے آپ کو دوبارہ تکلیف دی" یہ کہہ کر نامعلوم شخص نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ اس اجنبی شخص کی آشنا کے بابت سوچنے لگی۔

اتوار کا دن تھا سہ پہر کو وہ ٹیلی ویژن دیکھنے میں کھوئی ٹیلی فون کی تیز گھنٹی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا یکبارگی پھر اسے لیکن پر بہت غصہ آیا وہ ٹیلی ویژن بند کر کے بڑبڑاتی فون کی طرف بڑھی۔

"لز" دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"کون لز" وہ جانتے ہوئے انجان بن گئی۔

"کہیں مجھے پھر تو رانگ نمبر نہیں ملا۔" فون کرنے والے نے بلا کر

کسی تردد کے پوچھا۔ جی ہاں یہ رانگ نمبر ہی ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا۔ اس ٹیلی فون کے ذریعے ذہنی اذیت ناک پریشانی میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ جب بھی مطلوبہ نمبر ڈائل کرتا ہوں آپ کا نمبر مل جاتا ہے۔ ٹیلیفون بعض وقت ایسی ہی پریشانی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔" اس نے تائید کی اور اس سے پہلے میں کبھی ایسی پریشانی میں نہیں گرفتار ہوا جس کا سامنا اب کر رہا ہوں ہی آپ کی شیریں دلکش آواز سنی بغیر تردد کے فوراً سمجھ گیا کہ میں نے آپ کو دوبارہ پریشان کیا۔ خیر یہ بھی کچھ برا نہیں اس بہانے آپ سے ملاقات ہوگئی۔ افسوس کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔

"کوئی بات نہیں۔"

"آئندہ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو پھر زحمت نہ دوں۔ خدا حافظ۔" وہ چند سکنڈ ریسور ہاتھ میں پکڑے اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

اسی دن شام کو وہ باتھ ٹب میں نہانے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ گھنٹی برابر بجتی رہی۔ جب سات گھنٹیاں ہو چکیں تو وہ فون کے پاس پہنچی۔

"ہیلو ہیلو! آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ میں تو پریشان ہوگیا تھا کہ شاید آپ گھر پر نہیں ہیں۔" فون کرنے والے نے بغیر کسی تامل کے کہا۔ یہ وہی نامعلوم شخص تھا جو اس سے قبل تین چار مرتبہ اسے رانگ نمبر کے لئے پریشان کر چکا تھا لیکن اس کی باتوں میں ایک عجیب سا سحر تھا جس میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گم ہو جاتی۔

"معاف کرنا میں لز نہیں ہوں۔"

اس پر وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "میں جانتا ہوں۔"

"فرمایئے۔" اس نے ریسور کان سے ذرا دور ہٹایا کیونکہ وہ اس کے قہقہے کی گونج سننا نہیں چاہتی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد ...... میں نے ذاتی طور سے محسوس کیا کہ آپ مجھ ہی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر کے کہا۔

"کیا آپ گھر پر ہیں۔"

"جی ہاں میں گھر ہی پر ہوں۔" اس نے پہلی بار مسکراتے ہوئے جواب دیا اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس کی مسکراہٹ دیکھ سکتا۔ "میرے فون پر آپ ناراض تو نہیں ہوئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پہلے سے ہی آپ کو جانتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"لیکن آپ مجھ سے ناراض تو نہیں۔"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"ایک بات اور کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کیا آپ میرے ساتھ باہر گھومنے پھرنے جا سکتی ہیں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "آپ گھر پر ہی ہیں نا۔ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔"

"ہاں میں گھر پر ہی ہوں اور آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔"

"اچھا تم مجھ سے ...... وہ اپنا مقصد واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن وہ اس کا مقصد سمجھ گئی لہٰذا اس کی مدد کرتے ہوئے بولی۔

"آپ مایوس مت ہوں میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گی۔"

"سچ۔! آپ میرے ساتھ چلیں گی ...... اوہ ...... میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں۔ اس کے لئے کل کی رات کیسی رہیگی۔" وہ خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے کل رات مناسب رہے گی۔" اس نے سوچ کر جواب دیا۔

"ہم کل کچھ کھائیں پئیں گے اور سینما دیکھیں گے۔ کیسا آئیڈیا ہے۔"

"بہت عمدہ پروگرام ہے۔"

"میں کل ۷ بجے تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"یہ بھی مناسب رہے گا۔"

"آپ کی رضامندی سے مجھے بے پناہ مسرت ہو رہی ہے اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" دونوں نے فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے وہ مسکرانے لگی۔ پیر کی صبح اس کی میز پر صبح کا اخبار پڑا تھا آج کے اخبار میں تیل کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ وغیرہ نمایاں سرخیاں تھیں۔

پیر کی شام وہ چھ بجے سے پہلے ہی دفتر سے گھر واپس آگئی

وہ ابھی تک اپنے دل سے کوئی فیصلہ نہ کرسکی کہ اجنبی کے ساتھ باہر جائے یا نہ جائے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس کے ہاتھ اچانک فون پر جا گرے اس نے ریسیور اٹھایا اور "ز" کا نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں کے بعد دوسری طرف کسی نے فون اٹھایا۔

" ہلو : فرمائیے "کسی مردانہ آواز نے نہایت شفقت اور محبت سے کہا۔ لیکن اس نے غصے سے فوراً ریسیور کریڈل پر پٹک دیا۔ کیونکہ یہ شخص وہ نہیں تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی مراد بر آئی اور فون کی گھنٹی بجی اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا

" ہلو " وہ جلدی سے بولی۔

" یہ میں بول رہا ہوں ؛ کیا آپ تیار ہیں۔

" ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

ہم اپنے پروگرام کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کرسکے۔ بہرحال آپ بتلایئے کہ کہاں رہتی ہیں۔" اس نے تفصیل سے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا تاکہ اسے پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

" میں ٹھیک ساڑھے سات بجے آپ کے پاس ہوں گا۔"

" بہت بہتر" دونوں نے فون بند کردیا۔ وہ بہت بیقراری سے وقت گزارنے کے لئے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ شام ٹھیک ۷ بجے اس کے دروازے کی گھنٹی بجی۔

منگل کی صبح ۱۱ بجے کے بعد اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بجتی رہی۔ مگر کسی نے ٹیلی فون نہ اٹھایا۔ منگل کی شام اخبار والا اس کی دہلیز پر اخبار پھینک کر چلا گیا۔

بدھ کی صبح کو قالین پر تازہ اخبار پڑا تھا جو خاموشی سے چیخ رہا تھا۔ چھ عورتوں کا سنسنا کا قتل۔ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔

حریمی دسترخوان

آم کا مربہ۔ آموں کی فصل آگئی ہے، اس لئے جو بہنیں آم کا مربہ پسند فرماتی ہوں وہ مندرجہ ذیل ترکیب سے بنائیں۔

سامان: میٹھے نیم پختہ یعنی گدر قلمی آموں کی پھانکیں ۱ کلو۔ شکر ایک کلو۔ سٹرک ایسڈ ایک گرام یعنی چائے کا ایک چمچہ یا تھوڑا کم۔

ترکیب: آموں کو چھیل کر دو کلو پانی میں دو چمچے پسا ہوا نمک ڈال کر بھگودیں۔ ایک گھنٹے کے بعد نکال کر پانی خشک کرکے قاشیں تراش لیں گٹھلیاں پھینک دیں۔ ان قاشوں کا وزن ایک کلو ہونا چاہئے۔ اس کے بعد تھوڑا پانی کھولا کر قاشوں کو پانچ منٹ ابال لیں تاکہ نرم ہوجائیں۔ اس عمل کے بعد قاشوں کو کسی سینی یا طباق پر پھیلا کر خشک کرلیں۔ شکر میں ۵۰۰ گرام پانی ڈال کر پکائیں۔ سٹرک ایسڈ بھی قوام میں شامل کردیں۔ قوام کو چھننے سے صاف کرتی جائیں۔ قوام گاڑھا نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد آم کی قاشوں میں ڈال کر دو تین جوش دیں، پھر اتار کر چند گھنٹے انھیں قوام ہی میں رہنے دیں۔ بعد میں شیشے کے جار یا مرتبان میں رکھ لیں۔

مرسلہ: فیروزی تبسم اشرفی۔ لکھنؤ

میٹھے برے ایک نہایت ہی لذیذ چیز ہے۔ ناشتہ میں بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ یہ برے جلیبیوں کا بدل بھی ہوسکتے ہیں۔

سامان: چکہ یعنی جمایا ہوا تازہ دہی جو کھٹا نہ ہو ۵۰۰ گرام، روا (سوجی) ۲۵ گرام۔ میدہ حسب ضرورت۔ شکر ۵۰۰ گرام۔ کھانے میں پڑنے والا بادامی رنگ چائے کا نصف چمچہ۔ میٹھا یعنی کیوڑے کا عطر دو قطرے۔ میٹھا عطر نہ ہو تو عرق کیوڑہ ۵ گرام۔ ڈالڈا یا گھی حسب ضرورت کھانے والا سوڈا چائے کا نصف چمچہ

ترکیب: شکر کا قوام بنانے کے لئے شکر کو اندازاً چائے کی تین پیالی پانی ڈال کر تیز آنچ پر رکھ دیں۔ رنگ شامل کردیں۔ قوام جب پکنے لگے تو دودھ کا چھینٹا دے کر اسے صاف کرلیں۔ دودھ پڑتے ہی شکر کا میل کٹ کر نکل آتا ہے اسے کسی چھننے سے نکال لیں میٹھا عطر یا کیوڑہ ملا دیں۔ قوام نہ پتلا ہو نہ بہت زیادہ گاڑھا کہ جم جائے دہی کو کسی باریک کپڑے میں رکھ کر دبائیں تاکہ اسکا پانی نکل جائے۔ دہی کے پھوکس میں روا (سوجی) اور سوڈا ملائیں اس کے بعد اتنا میدہ ملائیں کہ مادہ سخت ہوجائے۔ پھر بالکل ذرا ذرا سے، جیسے گول گپے بنانے کے لئے پیڑیاں بنائی جاتی ہیں بنالیں اور انھیں بیلن سے بیل کر پتلا اور گول کرکے تلیں۔ گلابی ہوتے ہی نکال کر قوام میں ڈال کر کسی کفگیر سے ڈبوئیں اور نکال کر گرم گرم نوش فرمائیں۔ قوام بالکل ٹھنڈا نہ ہو ٹکیاں تلنے سے پہلے اگر قوام ٹھنڈا ہوگیا ہو تو ہلکا سا گرم کرلیں۔ (اسے بنانے کی ترکیب میں نے قرانت خانم سے سیکھی ہے۔ مسز نجم السحر منصور۔ باندرہ)

ندامت

ذکیہ ارشد

قیصر اپنے بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد ائرپورٹ سے واپس آرہی تھی۔ اداس اداس بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے کی خوشی بھی تھی۔ اور تنہائی کے خیال سے اداس بھی۔ آج اگر شوہر زندہ ہوتے تو شاید وہ اتنی اداس نہ ہوتی۔ انہی سوچوں کے ساتھ گاڑی آہستہ چلا رہی تھی ویسے بھی رات کا وقت تھا اسے سامنے ایک لڑکی بھاگتی چلاتی نظر آئی۔ دو مرد اسے زبردستی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے قیصر نے زور زور سے ہارن بجائے گاڑی لڑکی کے قریب روک دی اس کے ملازم نے نیچے اتر کر غنڈوں کو للکارا تو وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں فرار ہو گئے قیصر نے لڑکی کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا اور اس جگہ سے تیزی کے ساتھ نکل گئی کیونکہ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسے خود بھی ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ غنڈے اس کی کار پر ہی حملہ نہ کر دیں اور اپنا راستہ جلدی سے تبدیل کر لیا۔

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو اب بھی خوف کے مارے کانپ رہی تھی لیکن قدرے بات کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔

"بیٹی تمہیں جانا کہاں ہے؟" اپنے گھر کا پتہ بتاؤ اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ بس سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔ مجھے یونیورسٹی روڈ پر جانا ہے۔"

"تمہارے والد کا کیا نام ہے؟"

"جی ان کا نام احمد وقار ہے۔"

اس نام پر قیصر چونکی "کیا سوہنی اسٹیل مل والے؟"

جی۔" لڑکی نے قیصر کی طرف دیکھا لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نہ دیکھ سکی۔

"بیٹی تم اس وقت تنہا کہاں سے آرہی ہو اب تو رات کا ایک بج رہا ہے۔" قیصر نے اس کی تنگ جینز اور مختصر سے بلاؤز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو کہیں کہیں سے کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔

"آج میں ایک سہیلی کی سالگرہ کی دعوت میں گئی تھی وہاں دوستوں میں میوزک اور ڈانسنگ میں وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا اور بد قسمتی سے راستے میں ٹائر پنکچر ہو گیا میں تو ابھی اسے بدلنے کے لئے رکی ہی تھی کہ ایک گاڑی قریب آکر رکی میں نے ان سے مدد مانگی جیسے ہی میں گاڑی سے باہر آئی تو ان دونوں نے مجھے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی لیکن آج کچھ میری جوڈو کراٹے کی ٹریننگ کام آگئی لیکن اگر آپ وقت پر نہ پہنچ گئی ہوتیں تو وہ دونوں مجھ پر قابو پالیتے اور نہ جانے پھر میرا کیا حشر ہوتا۔"

"بیٹی حیرت ہے کہ تمہارے والدین نے تمہیں اتنی رات تک تنہا گھومنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی ملازم یا ڈرائیور بھی ساتھ نہیں۔" قیصر نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی انھوں نے مجھ پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی۔ دراصل ڈیڈی بہت اڈرن ہیں انھیں یہ مشرقیت قسم کی باتیں بالکل پسند نہیں امی اگر منع کردیں تو ڈیڈی انھیں بھی ڈانٹ دیتے ہیں کہ میری بیٹی کو کچھ مت کہا کرو۔ اسے BOLD ہونا چاہیئے۔

قیصر نے دل میں سوچا کہ درست ہے۔ یہ وقار ہی کی بیٹی ہو سکتی ہے اگر آج یہ لٹ بھی جاتی تو اس کے باپ کو شاید پھر بھی دکھ نہ ہوتا اور قیصر دور کہیں ماضی میں کھو گئی۔

بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئیں۔ کالج اور یونیورسٹی میں ایک ساتھ گزارے ہوئے لمحے یاد آگئے دونوں میں کتنی دوستی اور محبت تھی بچپن کے ساتھی بھی تھے اور خالہ زاد بھائی بہن بھی وہ دن تو اس کے لئے یادگار دن تھا جب ان کی دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی وہ دونوں کتنے خوش تھے دونوں اکٹھے گھومتے اور مستقبل کے پروگرام بناتے۔

ایک دن گھر میں کہرام مچ گیا۔ قیصر کی خالہ اور خالو دونوں کہیں جا رہے تھے کہ بس نے ٹکر ماری اور رکشہ الٹ گیا اور وہ دونوں قریب ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

وقار پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دو چھوٹی بہنوں اور ایک بھائی کا بوجھ بھی ان پر آن پڑا۔ وقار نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ نوکری ملتی تو ڈھنگ کی نہ ہوتی کہیں [illegible] ملی کچھ بیکاری اب وہ بہت اداس رہنے لگا۔ طبیعت میں چڑچڑا پن [illegible]

قیصر اسے دلاسا دیتی۔ "دیکھو وقار صبر سے کام لو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھو وقت کی گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ نہ بدلو بلکہ ایک معقول اور صحیح رویہ قائم رکھو۔ مصائب اور مشکلات میں اپنے جوہر انسانیت کو ضائع نہ کرو۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں بردباری دونوں صورتوں میں اپنے حال پر قائم رہنا چاہیئے اور تمھارا ظرف کسی چیز کی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلکنے نہ پائے۔" مگر وہ کہتا۔

"قیصر یہ سب ٹھیک ہے۔ میں تمھاری بات سمجھتا ہوں لیکن تم خود سوچو یہ سب مصائب میرے ہی لئے کیوں ہیں میں نے کیا قصور کیا۔ ابّا چھوڑ گئے خالہ تو بیوہ اور ذو نوبیہ کی ذمہ داریاں ہیں۔ ابا صرف سفید پوش تھے بینک میں صرف پانچ سو روپیئے چھوڑ گئے تھے اور چند ہزار دفتر سے ان کے بدلے بتاؤ ان سے کیا ہو سکتا ہے ایک سال ہی میں سب کچھ خرچ ہو گیا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے تمھاری نصیحتوں کی نہیں۔

قیصر کے والدین کی بھی مالی حالت بہت خراب تھی کیسے مدد کرتے پھر وقار کو ایک جاب مل گئی اور وہ جلدی جلدی باہر جانے لگا اب وہ بہت خوش نظر آتا تھا قیصر سے کہتا بس اب میرے اچھے دن آنے والے ہیں۔ کچھ دنوں میں میرے حالات بدل جائینگے قیصر بھی بہت خوش تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود بھی وقار کی ملازمت کے متعلق معلوم نہ کر سکی کہ وہ کہاں کام کرتا ہے۔

سال بھر میں ہی وقار کے حالات بدل گئے۔ نیا گھر، نیا فرنیچر اور کار، یہ سب چیزیں آگئیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی وقار کا مزاج بھی بدل گیا۔ اسے قیصر کا چھوٹا سا گھر اور ان کی تنگ گلیوں میں آنا پسند نہ رہا وہ اونچی باتیں کرتا جس سے تکبّر جھلکتا وہ سب کو چھوٹا اور حقیر جانتا تھا۔ اس میں آہستہ آہستہ سب برائیاں آتی چلی گئیں قیصر کو نہ جانے کیسے پتہ چل گیا کہ وقار اوباش لوگوں کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کرتا ہے۔ وہ وقار کو بہت سمجھاتی سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کرتی ـــــ "قیصر مجھے اس طرح کی نصیحتیں مت کیا کرو مجھے یہ سب پسند نہیں ہے مجھے ہر قیمت پر دولت کمانی ہے اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دیکھو اب میرا شمار بڑے لوگوں میں ہوتا ہے تمھیں کیا چاہیئے جو اس طرح ہر وقت مجھے ٹوکتی رہتی ہو مجھے تمھاری یہ سادگی پسند نہیں ہے دو ماہ بعد ہماری شادی ہونے والی ہے پھر تم راج کروگی تمھیں کوئی کمی نہ ہوگی۔ تم اب یہ اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دو۔ اور اپنا ہر وقت کا یہ وعظ بھی بند کر دو۔ دیکھو دنیا کتنی حسین ہے ہم دونوں مل کر دنیا کی سیر کو جائیں گے۔ تمھارے کٹے ہوئے بال کتنے خوبصورت لگیں گے اور جب تم اس دقیانوسی شلوار قمیص کے بجائے جینز اور بغیر آستین کا بلاؤز پہنو گی تو تمہارا حسن کتنا نکھر جائے گا اب آگے کی طرف دیکھو پیچھے دیکھو گی تو دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤگی ہارنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا سب جیتنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔"

"یہ فیصلہ تو اللہ ہی کرے گا کہ کون جیتنے والا ہے اور کون خسارے میں ہے۔ میں تمہارے راستے پر نہیں چل سکتی میری تعلیم جو والدین سے ملی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے مجھے تمھارے راستے پر چلنے نہیں دیں گے مجھے ایسی دولت نہیں چاہیئے جو میرا ایمان بگاڑ دے جو میری شرم و حیا چھین لے میں ایک شریف آدمی کی بیوی بننا پسند کروں گی۔ مگر ایک اسمگلر کا ساتھ نہ دوں گی۔ وقار تمھارے پاس سب کچھ ہے زیادہ لالچ میں ابھی وقت ہے تم اس دلدل سے نکل سکتے ہو اگر زیادہ دھنس گئے تو قیامت تک نہ نکل پاؤگے۔"

"بس کرو اپنی فرسودہ تقریر مجھے نہیں سننی تمھاری یہ باتیں تم اب مجھ سے حسد کرنے لگی ہو۔ تمھارا احساس کمتری ہے جو میری مخالفت کر رہی ہو تم سے کہیں خوبصورت امیر لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہیں تم کسی خوش فہمی میں نہ رہنا دوٹوک فیصلہ کرو اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو جو کچھ میں چاہوں گا وہ ہوگا میری ہاں میں ہاں ملانی ہوگی تو ہمیشہ سکھی رہو گی لیکن میرے راستے کی دیوار مت بننا میں جیسا بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں تمھارے سامنے ہوں میرے معاملات میں دخل مت دینا اگر تمہیں یہ منظور نہیں ہے تو آج اور ابھی اسی وقت سے ہمارے راستے جدا ہیں میں اب زیادہ دیر تمھیں برداشت نہیں کر سکتا۔

قیصر نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور نہایت تحمل سے کہا۔ "اچھا وقار میں تمھارے راستے سے ہٹ جاتی ہوں مجھے ایسی دولت نہیں چاہیئے۔" اور وہ آنسو پونچھتی فرط غم سے نڈھال اپنے چھوٹے سے گھر چلی آئی۔

قیصر نے ایک نظر برابر بیٹھی وقار کی بیٹی کی طرف دیکھا جو بابا کی

قصہ ہی ہوتی تھی۔

بس یہیں سیدھے ہاتھ گاڑی روک دیجئے! گاڑی کی آواز سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

"آپ کو میری وجہ سے اتنی رات گئے بہت زحمت ہوئی۔"

"نہیں بیٹا مجھے آج بہت خوشی ہوئی کہ میں تمھارے کام آئی کسی کے کام آ کر بہت خوشی ہوتی ہے ـــ" قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گاڑی رکتے ہی وقار اور ان کی بیگم باہر آگئے۔

"بیٹی تم خیریت سے تو ہو پھر کیا گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تمھیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ـــ" بیگم وقار گھبراہٹ سے بولیں۔

"ڈیڈی۔ آج مصیبت میں پھنس گئی تھی اگر انہوں نے مجھے غنڈوں سے نہ بچایا ہوتا تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

وقار قیصر کا شکریہ ادا کرنے آگے بڑھے اس کی طرف حیرت سے دیکھا لیکن ساتھ ہی بیٹی کے لباس پر نظر پڑی تو سر ندامت سے جھک گیا۔

بقیہ قید خانہ ـــ (صفحہ ۲۳)

وہ سوچنے لگی کہ جب لڑکی کے والدین کا گھر جہاں وہ بچپن سے جوانی کا دور گزارتی ہے قید خانہ بن جاتا ہے تو دنیا میں کس اور جگہ اسے قید سے کیونکر نجات مل سکتی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا سر چکرانے لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ قید خانہ لڑکی کا مقدر ہے اور اٹھ کر جیٹھ اور جیٹھانی کے بچوں کو سیر کے لئے تیار کرنے لگی۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ اور موزوں ہو۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری لکھنا کبھی نہ بھولیں۔ شعر جس ماہ میں چھپنا ہو، اس ماہ کے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک وصول ہونے والے اشعار ہی شامل کئے جاتے ہیں۔ جولائی کے لئے عنوان ہے "شکوہ یا شکستہ رنگ" کے لئے "جستجو"

بن گئی میرے لئے اک اضطراب مستقل
جس محبت کو سکون قلب جاں سمجھا تھا میں

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لال باغ۔ لکھنؤ)

تمہارے آتے ہی دنیا بدل گئی میری
جو اضطراب تھا پہلے وہ اضطراب نہیں

مرسلہ:۔ نورجبیں، دل افروز (اجیت۔ [illegible])

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکون ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطراب پیہم ہے

مرسلہ:۔ زینت بہار (کلکتہ)

اس اضطراب پہ قربان اک جہان سکون
کوئی سنبھال رہا ہے، تڑپ رہا ہوں میں

مرسلہ:۔ اقبال سلطانہ (موتی نگر محبوب نگر)

بہانہ آنکھ سے آنسو فریب قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر

مرسلہ:۔ ن آنسہ ابراہیم (بنگلور)

ان دنوں اضطراب کا اپنے کچھ اور حال ہے
وہ بھی ہمارے واسطے رہتے ہیں بیقرار سے

مرسلہ:۔ ثروت آرا بیگم (لکھنؤ)

اک اضطراب دل میں ہوتا ہے بار بار
شاید قریب آگئی منزل حیات کی

مرسلہ:۔ روبی، دیبا (آگرہ)

اور سپیڈال وی

آفرین حامد (گلگت)

رات کے بارہ بجے ممی و پاپا فلم دیکھ کر لوٹے تو ان کے چہرے بہت اداس تھے۔ ممی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ دادی اماں نے بہو اور بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا اور بولیں "خیریت تو ہے نا، کہیں راستے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی کیا؟"

پاپا نے جواب دیا "کونسا ایسا دن ہوتا ہے جس دن گڑبڑ نہیں ہوتی جھگڑے، فساد راستے کی دھول بن گئے ہیں۔"

دادی اماں نے بیقرار ہو کر پوچھا "بات کیا ہے جو تم لوگ اس قدر اداس ہو رہے ہو؟"

ممی نے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا اور بولیں "فلم کی کہانی بہت دردناک تھی۔"

دادی اماں نے فوراً کہا "لاحول ولا قوۃ! میں سمجھی کہ خدا نہ کرے کہیں کوئی حادثہ ہو گیا یا پھر غنڈوں نے کہیں دو چار بم چھینکے ہوں گے۔"

پاپا نے جواب دیا "آج کل بم اور حادثے اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنی فلم کی کہانیاں تاثر پیدا کرتی ہیں۔ بیچارہ ہیرو ماں باپ کے ظلم کا شکار ہو گیا۔ ہیروئن دوسرے مذہب کی تھی لیکن اسے اپنایا تو جا سکتا تھا۔"

ممی نے کہا "وہ بیچاری اپنے محبوب کی خاطر اپنا مذہب بھی چھوڑنے پر تیار تھی لیکن ہیرو کے والدین اپنی ضد پر قائم رہے اور انھوں نے اسے بہو بنانے سے صاف انکار کر دیا وہ کتنے بے رحم تھے بیٹے پر ان کو ذرا بھی ترس نہ آیا۔"

انجم بھیا نے کتاب سے منہ نکال کر ممی کو دیکھا اور زیر لب مسکرائے

پاپا نے دادی اماں سے کہا "آپ یہ فلم ضرور دیکھئے۔"

دادی اماں، جنھوں نے کبھی فلم نہ دیکھی تھی فوراً بولیں "جھوٹی کہانی کی فلم تم ہی لوگوں کو دیکھنا مبارک ہو میں تو روزانہ جیتی جاگتی تصویریں دیکھتی ہوں۔"

پاپا اور ممی مسکرا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

انجم بھیا نے جب ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر لی تو ان کی شادی کے لئے پیغام آنا شروع ہو گئے زیادہ تر پیغام اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے ہی آئے تھے ممی نے ہر ایک لڑکی کو دیکھا مگر انھیں کوئی پسند نہ آئی ہر ایک میں وہ کچھ نہ کچھ عیب نکال دیتی تھیں۔ ایک روز پاپا نے ممی سے کہا "میرے ایک دوست کی لڑکی ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی اس وقت میں نے اسے دیکھا تھا وہ بہت خوبصورت تھی پتہ نہیں اب تو وہ اور حسین ہو گئی ہوگی۔"

ممی نے پوچھا "کس دوست کی لڑکی؟"

پاپا نے جواب دیا "وہی اپنے مرزا صاحب کی صاحبزادی۔"

ممی نے بیساختہ کہا "اچھا شازیہ کے بارے میں کہہ رہے ہیں آپ وہ تو بہت موٹی ہے"

پاپا نے کہا "کوئی بات نہیں۔ شادی کے بعد وہ خود بخود دبلی ہو جائیگی۔"

ممی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیسے؟"

پاپا نے جواب دیا "ساس کے پاس رہ کر کوئی بہو موٹی نہیں رہ سکتی۔ اگر تم پہلے ہی دبلی دلہن لاؤ گی تو شادی کے بعد وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے گی کیونکہ ساس کا ظلم مشہور ہے ہر ایک کو تمہاری جیسی ساس تو ملنا مشکل ہی ہے۔"

ممی نے برہم ہو کر پاپا کو دیکھا اور بولیں "گویا میں ظالم ساس ہوں یہی آپ کہنا چاہتے ہیں۔"

پاپا نے ممی کو مسکرا کر دیکھا اور بولے "یہ تم اپنی ساس سے پوچھو، اور ہاں اسی وقت تم میرے ساتھ مرزا صاحب کے یہاں چلوگی۔"

ممی پاپا کے ساتھ مرزا صاحب کے یہاں جانے ہی والی تھیں کہ عین اسی وقت دادی اماں آ گئیں اور ممی سے کہنے لگیں "دلہن تم قریب چھ ماہ سے بہو لانے کی فکر میں ہو لیکن کبھی تم نے انجم سے بھی رائے لی ہے کہ اسے کیسی دلہن چاہیئے۔"

ممی نے جواب دیا "میں جو پسند کروں گی وہی انجم بھی پسند کرے گا۔"

دادی اماں نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ تمھاری پسند اس کی بھی پسند ہوگی۔ وہ نئی تہذیب، نئی روشنی میں پلا ہے اس کی رائے ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کہیں نسبت طے کراؤ اور وہ انکار کر دے۔"

پاپا نے کہا "امی آپ اطمینان رکھیئے انجم ایسا لڑکا نہیں ہے۔"

دادی اماں نے کہا "اللہ کرے وہ ایسا ہی ہو۔"

مرزا صاحب کی لڑکی بہت حسین جمیل تھی مگر کچھ موٹی تھی۔ پاپا کے سمجھانے سے ممی راضی ہوگئیں اور منگنی کے لئے دن تاریخ بھی مقرر کر آئیں۔ وہ بے حد خوش تھیں اور منگنی کی تیاریاں کرنے لگیں۔ انجم بھیا جو زیادہ تر اسپتال میں رہتے تھے گھر کی باتوں سے لاعلم رہا کرتے لیکن ایک دن ممی نے مسکرا کر انجم بھیا سے کہا۔ "انجم بیٹے کل ہم لوگ منگنی کرنے جا رہے ہیں۔"

انجم بھیا نے یہ سنا تو بہت خوش ہوگئے اور مسکرا کر کہا۔ "ممی آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ روحی کی نسبت کہاں طے کی ہے۔"

ممی نے مسکرا کر کہا۔ "ارے بیٹا منگنی روحی کی نہیں تمھاری ہونے جا رہی ہے وہ جو اپنے مرزا صاحب ہیں نا انھیں کی صاحب زادی سے۔"

انجم بھیا یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور کچھ سوچ کر بولے "لیکن میں نے تو مینکا سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے ممی۔ میں کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔"

ممی یہ سن کر چونک پڑیں اور ان پر لرزہ سا طاری ہوگیا وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔ "یہ تو کہہ رہا ہے انجم۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔" انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ آنکھوں کے سامنے دھواں دھواں سا نظر آیا اور غش کھا کر گر پڑیں۔

مینکا انجم بھیا کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اکثر انجم بھیا کے ساتھ ہمارے گھر بھی آیا جایا کرتی تھی ممی اس پر بہت مہربان تھیں۔ کبھی کبھی وہ انجم بھیا سے کہتی بھی تھیں۔ "دیکھو رات کافی ہوگئی ہے بیٹا اسے تنہا نہ جانے دو اسے اس کے گھر تک پہنچا آؤ۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ بھیا خوشی خوشی مینکا کو اپنے ہمراہ لے کر گھر سے باہر نکل جاتے۔ ممی کی موٹی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا وہ مینکا کو صرف انجم بھیا کی کلاس فیلو اور دوست ہی سمجھتی تھیں۔ انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی صرف دوستی ہی کی حد تک قائم نہیں رہ سکتی اور اسی لئے ہمارے معاشرے میں اسے بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کئی بار دادی اماں نے اس پر اعتراض بھی کیا۔ مگر ممی مسکرا کر رہ جاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ امی آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ انسان چاند تک جا پہنچا اور آپ وہی لکیر کی فقیر بنی بیٹھی ہیں۔ مینکا اور انجم ساتھ ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں تو اس میں حرج کیا ہے۔

ممی گریجویٹ تھیں اور دادی اماں کم تعلیم یافتہ خاتون تھیں وہ باتوں میں ممی کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں اس لئے خاموش ہو جاتیں۔ ممی کا دور دورہ تھا۔ دادی اماں کا زمانہ گزر چکا تھا ان کا عروج اور ان کی حکومت کا جنازہ دادا ابا کے جنازے کے ساتھ ساتھ حویلی کے بڑے دروازے سے نکل گیا تھا اور اب نئی تہذیب اور نئی روشنی کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ حویلی کے در و دیوار کو منور کر رہا تھا۔

انجم بھیا کے الفاظ سے یکایک گھر میں ایک ہنگامہ مچ گیا ممی پاپا غضبناک ہوگئے مگر بھیا اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ پاپا نے انھیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ الفاظ سے تدارک نہ ہوسکا تو پاپا نے پہلے تو سخت سست کہا اور پھر غصے سے بے قابو ہو کر دو چار ہاتھ بھی مار دیئے حالانکہ کبھی وہ خود یہ گنگنایا کرتے تھے۔

جتنے بھی ہوں گے ظلم و ستم
اور بڑھے گی ان کی محبت

انجم بھیا درد سے کراہ اٹھے مگر وہ اپنے عہد پر قائم رہے اور ایک دن وہ چپکے سے گھر سے چلے گئے اور بعد میں کسی سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مینکا سے نکاح کرلیا ہے۔ انجم بھیا کے چلے جانے سے حویلی کی ساری رونق ختم ہوگئی اور در و دیوار سونے سونے لگے تھے اس حویلی میں ممی اور پاپا چلتی پھرتی لاش بن کر رہ گئے۔ دادی اماں خاموشی سے یہ سب تماشہ دیکھتی رہیں اور ایک دن انھوں نے بہو اور بیٹے سے کہا۔ "فلم کے نقلی ہیرو کی بے بسی پر بہت جان دیتے تھے اور آج جب اصلی ہیرو تمھارے سامنے آیا تو اسے مار کر در بدر کیا۔ کیوں؟"

پاپا اور ممی کو وہ فلم یاد آگیا جس کے متعلق انھوں نے دادی اماں سے اپنا تاثر بیان کیا تھا۔

دادی اماں نے پھر کہا کیا تمھاری ہمدردیاں دوسروں ہی کے لئے ہوتی ہیں اپنے لخت جگر سے دینے کا جرم یہ ہمدردی

ختم شد:

پاپا امی کی دادی کے الفاظ سن کر آبدیدہ ہو گئے۔
ممی نے کہا۔۔ میں تو کتنی بار ان سے کہہ چکی ہوں کہ اسے معاف
کر دو لیکن ان کا دل نہیں مانتا۔ پتھر ہو گیا ہے۔"
"نہیں بیگم" پاپا نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "آج وہ پتھر
موم ہو گیا ہے میں اسی وقت جاکر اپنے گھر کا چراغ اپنے ساتھ
لے آؤں گا۔

(بقیہ عید)

اور اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر ان کی نعمتوں اور کرم فرمائیوں کا شکریہ
ادا کریں۔

یقیناً نئے اور اچھے لباس، پاکیزہ، ماکولات و مشروبات، آرائش و
خوشبویات سیر و تفریح میلے ٹھیلے یہ سب بھی عید کا ایک حصہ ہیں لیکن
اگر اس عید کو لباسوں کی عید بنا لیا جائے مگر روح کی عید نہ بنایا جائے تو
اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس دن ہر مسلمان کے لئے اچھے سے
اچھا لباس اپنی استطاعت کے مطابق پہننا ضروری ہے لیکن یہ بات
ہرگز پسندیدہ نہیں ہوگی کہ ہم عید کے نام پر فضول خرچی اور بے جا
اسراف کو اپنا شعار بنالیں قرض لے لے کر جھوٹی مسرتیں حاصل کریں
اپنی بڑائی جتانے کے لئے خواہ مخواہ کی آن بان اور شان کا مظاہرہ کریں
یہ تمام چیزیں عید کی مسرتیں نہیں دے سکتیں البتہ روح و ذہن کو بیمار و
افسردہ کر دیتی ہیں یہ عید ہم کو ایک اور اہم بات بھی یاد دلاتی ہے وہ
یہ کہ صرف خود اپنی ذات کے لئے ہی خوشیاں حاصل کرنا چاہئیں بلکہ
دوسروں کی خوشیوں کا سامان بھی پیدا کرنا آپ کے فرائض میں شامل

---

۹۹ فیصدی شوہر
کھانوں کے شوقین ہوتے ہیں
اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے شوہر آپ سے خوش رہیں تو ان
کو اچھے اچھے اور لذیذ کھانے پکا کر کھلائیں۔
اسکے لئے حریمی دستر خوان آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کی
ایک کاپی نسیم بکڈپو لکھنؤ سے منگا کر آزمائیں۔
قیمت اٹھارہ روپیہ

عید
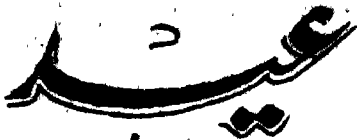
مہینے بھر کے روزوں کا انعام ہوتی ہے

(صالح محمد قریشی)

عید کا دن ان لوگوں کے لئے نوید انبساط ہے جنھوں نے تیس
دن تک تزکیہ نفس کا وہ مظاہرہ کیا جو اہل ایمان کے شایان شان
تھا۔ جنھوں نے روزے رکھے نمازیں پڑھیں صدقہ دیا اور زکوٰۃ ادا کی،
نادار رشتہ داروں، محتاج پڑوسیوں یتیم بچوں بیوہ عورتوں نادار
مسافروں لاچار غریب الوطنوں مساکین اور حاجت مندوں کی امداد
و اعانت کی اور عید کا فطرہ عید کا چاند ہونے سے پہلے یا نماز عید سے
پہلے دے دیا تاکہ غربا اور مساکین بھی عید کی تیاری کر سکیں۔ رمضان
المبارک کے روزوں کو یہ سمجھئے صرف کھانے پینے اور ترک لذت
کا نام روزہ نہ تھا مکمل روزہ اس کا تھا جس نے ہمسایوں دوستوں
عزیزوں اور رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے حقوق ادا کئے
جس نے روزے کے احترام میں کسی کو گالی نہیں دی کسی پر بری
نگاہ نہ ڈالی چیزوں میں ملاوٹ نہ کی ناپ تول صحیح رکھا اور عید بھی
اصل ان ہی لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنے عمل سے آج کے دن ثابت
کیا کہ خالق کائنات اللہ ہے افضل الخلائق سرکار دو عالم صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں۔ تمام مذاہب میں سب سے افضل دین فطرت
یعنی ہمارا دین اسلام ہے۔ جس عید الفطر کی آج ہم تقریب منا رہے
ہیں یہ تمام تقریبات میں سب سے افضل اور بہتر یہ ہے ہم عید کی
نماز ادا کرتے ہیں۔

عید کا تہوار ہر قوم کی زندگی میں ہے لیکن مسلمانوں کی عید
اپنی کچھ خصوصیات بھی رکھتی ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ عید کا منانا
ایک طرف چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل کرنے کا ذریعہ ہے دوسری
جانب اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی ایک کوشش بھی ہے
ہماری عید دوسروں کی طرح ناچ رنگ، لہو و لعب اور ناشائستہ
افعال و اعمال کی عید نہیں اس خوشی کا تعلق نہ شراب کے جام لنڈھانے
سے ہے نہ جوئے کی بازیاں لگانے سے ہماری عید تو صرف یہ ہے کہ
ہم عید گاہ پہنچیں، مسلمانوں کی اجتماعی شان و شوکت کا مظاہرہ کریں

(بقیہ پہلے کالم پر)

قید خانہ

نکہت ظہیر

شمو کمرے میں خاموش اور اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج گھر میں وہی واقعہ پیش آیا جو ہر چار یا پانچ دن کے بعد آتا ہے۔ آج پھر بھیا اور بھابی اس کی خوشیوں کا خیال کئے بغیر کہیں گھومنے پھرنے چلے گئے ہیں آج اس نے کتنے ارمانوں سے کتنی چاہ سے کپڑے استری کئے تھے۔ تمام تیاری اس نے صبح سویرے ہی خالہ جان کے یہاں جانے کے لئے کرتی تھی مگر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے امّاں نے اسے خالہ جان کے گھر جانے سے روک دیا کیونکہ اگر وہ خالہ کے یہاں چلی جاتی تو کھانا کون پکاتا۔ یہ دنیا جہان کے برتن کون دھوتا۔ گھر کون صاف کرتا۔

وہ انھیں خیالوں میں گم تھی کہ اماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ بھاگ کر اماں کے پاس گئی۔ اماں نے کہا ثمر بیٹیا کھانا وغیرہ پکا لو۔ خالہ کے یہاں کبھی اور چلی جانا۔ یہ سن کر وہ خاموشی سے باورچی خانے میں چلی گئی اور کھانے وغیرہ پکانے میں مشغول ہو گئی تمام کام سے فارغ ہوئی تو وہ تھک چکی تھی۔ ثمر بڑے ارمانوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ جسے ماں باپ نے پھولوں کی سیج میں رکھا نازبرداری سے پالا مگر وہی ثمر آج حالات سے مجبور ہو کر کس قدر بے بس اور کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا تھی۔ دن رات کام کرنا گھر میں پڑے رہنا نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا نہ کسی سے ملنا جلنا۔ بس ایک کالج وہ جگہ تھی جہاں وہ تھوڑی دیر وقت گزار کر اپنے جینے کا سامان کر رہی تھی ورنہ وہ تو اس قید خانے میں کب کی مر چکی ہوتی۔

ثمر ابھی کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اس کی ماں پڑوس سے آگئیں جہاں وہ کسی کام سے گئی تھیں اس نے ماں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا برتن وغیرہ دھو کر اس نے سوچا کہ آج دو پہر میں ضرور سوؤں گی آج میں بہت تھک گئی ہوں وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی ابھی اس کی آنکھ لگی بھی نہ تھی کہ اسے ماں کی آواز سنائی دی وہ جلدی سے اٹھ / اماں کے پاس گئی ماں نے کہا بیٹی ذرا جلدی سے چائے بنا دو۔ تمہاری خالہ آئی ہیں تم نے ان کو چائے وغیرہ بنا کر دی اس طرح چار بج گئے۔ اس نے سوچا کہ اب سونے سے کوئی فائدہ نہیں شام ہو رہی ہے۔ بھابی بھیا بھی آنے والے ہیں اب رات کا کھانا تیار کر لوں وہ یہ سوچ کر باورچی خانے میں جا کر جلدی جلدی کام کرنے لگی۔ اتنے میں اس کے بھیا بھابی اور بچے سب آگئے وہ سب کو کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں آگئی کہ چلو اب آرام کرے گی لیکن ابھی وہ کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ اس کو اماں اور بھیا کی گفتگو سنائی دی۔ بھیا اماں سے کہہ رہے تھے۔ ثمر ہمارے لئے ایک بوجھ ہے اس بوجھ سے جلد سبکدوش ہو جانا چاہیئے۔ کل ثمر کے رشتے کے لئے کچھ لوگ آ رہے ہیں آپ ثمر کو چار بجے تیار رکھئے گا۔

ثمر بھیا کی بات سن کر بے حد اداس ہو گئی کہ بھیا مجھے بوجھ سمجھتے ہیں لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ اب تو اسے اس گھر کی قید سے نجات ملے گی۔

دوسرے دن وہ کالج سے جلدی گھر آگئی اور ماں کی ہدایت کے مطابق شام کو مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہو گئی وہ لوگ ثمر کو دیکھنے آگئے اور خوشی سے پسند بھی کر لیا پھر شہنائیاں بجیں اور اس کی شادی ہو گئی۔

ثمر اپنے نئے گھر جا کر بہت خوش ہوئی۔ روزانہ کہیں نہ کہیں گھومنا۔ دعوت، شادیاں غرض کہ ثمر کے دامن میں جہان بھر کی خوشیاں سمٹ کر آگئیں۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے کہ ثمر کو احساس بھی نہیں ہوا لیکن اس کی زندگی پھر معمول پر آنے لگی جیسے کہ اماں کے گھر میں تھی وہی باورچی خانہ وہی دن رات کھانا پکانا کھلانا۔ برتن مانجھنا اور تھک تھک کر نڈھال ہو جانا۔ جیٹھ اور ان کے بچوں کی ایک فوج کو سنبھالنا پھر بھی ثمر کبھی ناراض یا ناخوش نہ ہوتی اس لئے کہ اسے یہاں آزادی میسر تھی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی۔

ایک دن اس کے شوہر جلدی گھر آگئے اس نے سوچا کیوں نہ آج کہیں گھومنے چلا جائے شادی کے دو مہینے کے علاوہ وہ کہیں گھومنے نہیں گئی تھی اس نے اپنے خیال کا اظہار شوہر سے کیا لیکن اس کے شوہر نے اسے ڈانٹ دیا کہ میں تم کو یہاں روز روز گھمانے کے لئے نہیں لایا ہوں ابھی بڑی بھابی بھیا کے ساتھ کہیں گھومنے جا رہی ہیں تم ان کے بچوں کو سنبھالو۔ یہ سن کر ثمر کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اب تک وہ جسے قید خانہ [illegible] کرتی تھی وہ بھی قید خانہ نکلا۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ریشم

قمر سلطانہ سیتاپوری

نجمہ بیگم کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا جب انھیں بھتیجی کے پیدا ہونے کی اطلاع ملی۔ ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ فوراً بھاگتی ہوئی گئیں ٹھیکرے میں ٹکا ڈالنے کے لئے۔ آج کے زمانے میں بھلا ٹھیکرا اور ٹکا کہاں؟ یہ تو سب پرانی باتیں تھیں۔

جس برتن میں بچی کو نہلایا جا رہا تھا۔ دس کا سکّہ ڈال کر اعلان کر دیا کہ یہ لڑکی میری ہے۔ جب ان کے بھائی گھر میں آئے تو نجمہ نے کہا۔ "بھائی صاحب۔ اب یہ لڑکی میری ہو گئی اسے میں نے اپنے جنید کے لئے پسند کر لیا ہے"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمھاری تو ہے ہی۔ خدا زندگی دے بھلا جنید سے زیادہ مجھے کون عزیز ہے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

شرافت صاحب اچھے عہدے پر فائز تھے انہوں نے بہن کو حسب خواہش نیگ دے کر رخصت کیا۔ بچی سچ مچ بڑی پیاری پیاری تھی بالکل ریشم کا لچھا جیسی نرم و نازک۔ بچپن سے اسے ریشم پکارا گیا اور اس کا نام ریشم ہی پڑ گیا۔ ریشم سے بڑا ایک بھائی عامر بھی تھا مگر نجمہ تو ریشم پر جان چھڑکتی تھیں۔ ریشم جوں جوں بڑھتی جاتی گویا اس کے حسن و نزاکت میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اس کے خالو اپنی بیوی سے کبھی کبھی کہتے۔ "اختر کی ماں! میرا دل چاہتا ہے ریشم کو بہو بناؤں کبھی تم اپنی بہن طلعت سے ذکر تو کرتیں"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو اختر کے ابو۔" تو نجمہ بیگم کے گھر منگی ہے اور پھر ہمارے اختر کا اس کا کیا جوڑ ہے۔ میں اتنی خود غرض نہیں وہ کس قدر پیاری لڑکی ہے اختر کے ساتھ تو چاند میں گہن معلوم ہو گا"

نزہت جہاں نے جواب دیا اور وہ خاموش ہو رہے۔

نزہت جہاں اور اختر دونوں کی دبی دبی خواہش یہی تھی مگر وہ احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ ایک تو حیثیت میں ان کی برابری نہ تھی۔ دوسرے اختر کو خدا نے شکل و صورت بھی کچھ اچھی نہ دی تھی۔ کالی رنگت بھدا سا نقشہ۔ ویسے وہ بے حد شریف و نیک طبیعت کا تھا۔

ایل ایل بی کر چکا تھا۔ اب پریکٹس شروع کرنے والا تھا۔

ریشم کا بھائی پڑھ لکھ کر نوکری کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تھا جنید ڈاکٹر بن چکا تھا۔ ریشم بی اے۔ فائنل کا کورس کر رہی تھی۔ نجمہ بیگم نے بھائی کو یاد دلایا تو انھوں نے کہا جلدی کیا ہے ریشم کو بی اے تو کر لینے دو۔

وہ خاموش ہو گئیں۔ اچانک ایک دن شرافت صاحب کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ گھر میں کہرام تھا۔ ماں بیٹی تو پاگل ہو رہی تھیں۔ عامر بھی بہت متاثر تھا لیکن ماں بہن کی وجہ سے وہ اپنا غم ظاہر نہ کرتا تھا۔ نجمہ بھائی کے مرنے جما کر پھر پلٹ کر نہ آئیں۔ دھیرے دھیرے سوگواروں کو صبر آ گیا اور وقت کے ساتھ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ جو کچھ اثاثہ تھا صرف ہوتا رہا ان لوگوں کی تبدیلی نجمہ بیگم سے پوشیدہ نہ تھی اب انھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

باپ کے مرنے کے تقریباً چھ ماہ بعد ایک دن عامر پھوپھی کے گھر پہنچا۔ باتوں باتوں میں شادی کا ذکر چھڑا۔ نجمہ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا مجھے یاد ہے تم جب بھی تیار ہو میں نکاح کر لوں آ کر۔ اب تو دھوم دھام کرنا نہیں ہے وہ تو سب بھائی صاحب کے ساتھ ختم ہو گیا" کہہ کر وہ آب دیدہ ہو گئیں۔ پھر شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ایک دن نجمہ بیگم نے عامر کو بلا کر ایک لسٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ "بیٹا دیکھو یہ سامان ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ میرا بھی تو ایک ہی بیٹا ہے نا۔ مجھے کیا ارمان نہیں کہ میری بہو یہ سب کچھ لائے۔" فہرست دیکھ کر عامر کو چکر سا آنے لگا اس نے کہا۔ "پھوپھی جان یہ تو ہماری بساط سے باہر ہے آپ سوچیئے تو سہی"

"میں مجبور ہوں عامر بغیر اس کے کام نہ چلے گا" نجمہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا"

کئی روز سے عامر بے حد پریشان تھا۔ ماں نے سبب پوچھا۔ تو اس نے ٹال دیا۔ البتہ ریشم سے گھنٹوں مشورے ہوتے رہتے۔ ماں کے آ جانے پر دونوں خاموش ہو جاتے۔ ان جھنجھلا جاتی۔ عامر نے مکان کا آدھا حصہ فروخت کر دیا تھا۔ نجمہ بیگم خوشی خوشی بارات لے کر آئیں سارا گھر مہمانوں سے بھرا تھا پہلے عامر نے اپنی خالہ اور اختر کو بلا کر بند کمرے میں کافی دیر مشورے کئے۔ ہر ایک کو ٹوہ لگی تھی کہ آخر بات کیا ہے مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ ان کی ماں بھی نہ جان سکیں۔ پھر عامر نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں لایا جہاں جہیز رکھا تھا۔ گوٹے کی لالی

قارون

افتخار عزیز

قارون کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ دولت مندی کے لئے قارون کا نام بطور محاورہ استعمال ہونے لگا۔ دولت کی فراوانی کو ظاہر کرنے کے لئے قارون استعمال ہونے لگا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کیا میرے پاس قارون کا خزانہ ہے یا یہ کہ ان کی شاہ خرچی ہے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے۔

قارون کون تھا اس نے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے اور اس کا آخر میں کیا انجام ہوا قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں اس کا ذکر قارئین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کے دور میں بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا دولت مند شخص تھا اس کا نام قارون تھا ایک روایت کے مطابق وہ مصر میں دربار شاہی سے منسلک تھا اس لئے ہر جائز و ناجائز طریقے سے بے اندازہ دولت اکٹھا کی تھی اور بعض روایات کے مطابق وہ علم کیمیا کا ماہر تھا اور اس کی بدولت اس نے دولت جمع کی تھی اس کی دولت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ زر و جواہر سے بھرے ہوئے اس کے خزانوں کی چابیاں تندرست و توانا مزدوروں کی جماعت اٹھایا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں بینک و لاکر تو تھے نہیں کہ وہ اپنی دولت کو بحفاظت رکھ دیتا اس لئے وہ خود ہی اپنے خزانوں کی نگرانی کرتا تھا اور ان پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا اور اس میں سے غریبوں اور محتاجوں کو کبھی نہیں دیتا تھا۔

ایک بار حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں نے قارون کو نصیحت کی کہ اللہ نے تمہیں اتنی دولت سے نوازا ہے آخر تم اس بے شمار دولت کا کیا کروگے بہتر ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرو اس میں سے کچھ غریبوں اور ضرورت مندوں کو بھی دو۔ اس سے تمہارے بھرے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی پھر یہ بھی تو کہ تمہاری یہ دولت خدا ہی کی عطا کردہ ہے اس لئے اس میں اس کے بندوں کا بھی حق ہے لیکن قارون نے حضرت موسیٰ کی نصیحت کا مذاق اڑایا اور کہا کہ وہ میں نے اپنے علم سے حاصل کی ہے اسے میں غریبوں اور محتاجوں کو کیوں دوں، میں ان غریبوں کی مدد کرکے اپنی دولت کیوں ضائع کروں وہ غریب ہیں تو میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔

حضرت موسیٰ بہرحال فرض تبلیغ انجام دیتے رہے۔ قارون کو یہ بات بری لگتی تھی چنانچہ اس نے ایک دن اپنی دولت و ثروت کا مظاہرہ کرکے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے بڑے شان و شوکت سے ایک جلوس نکالا جس میں اپنے ساز و سامان کے ساتھ نمود و نمائش کی اس کا مقصد حضرت موسیٰ کو بے بضاعت ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ موسیٰ جیسے بے حیثیت لوگ بھلا میرا کیا کر سکتے ہیں قارون کے اس کروفر سے بنی اسرائیل کے کچھ لوگ متاثر ہوئے اور دعا کرنے لگے کہ کاش ہمیں بھی ایسی دولت و ثروت میسر ہو مگر حضرت موسیٰ کے ساتھیوں میں بعض بزرگوں نے ایسے لوگوں کو ٹوکا اور کہا کہ خدا کی خوشنودی کے آگے مال و زر کا لالچ نہ کرو۔ یہ دولت تو ختم ہو جانے والی ہے اس کی ہوس میں کیوں جان گھلاتے ہو؟

جب قارون کا غرور و تکبر حد سے بڑھ گیا اور غریبوں اور ناداروں کی تذلیل و حقارت میں اس نے اپنا سارا زور صرف کر دیا تو قدرت نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے قارون اور اس کا سارا خزانہ زمین کے اندر دھنسا دیا گیا اور اسے دنیا کے سامنے ایک درس عبرت بنا دیا گیا۔

قرآن مجید میں ان واقعات کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

ترجمہ :۔ بے شک قارون موسیٰ کی قوم ہی میں سے تھا پھر اس نے ان پر سرکشی کی ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیوں کے بوجھ سے طاقتور آدمی تھک جاتے تھے جب اس کی قوم نے کہا تو شیخی نہ مار اللہ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور تجھ کو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس میں آخرت کو تلاش کر اس کو نہ بھول کہ دنیا میں اس نے تجھ کو کیا کچھ دے رکھا ہے اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے تو بھی اس طرح بھلائی کر اور فساد کے درپے نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ قارون کہنے لگا یہ مال دولت تو مجھ کو میرے ایک ہنر سے ملا ہے جو مجھ کو ہے کیا وہ اس سے بے خبر ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ مالدار اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا اور نہ سوال کیا جائے مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں (یعنی ان کا حال معلوم ہے تب ہی تو گناہ میں مبتلا ہیں) پھر نکلا ایک روز قوم کے سامنے بن سنور کر خدم و حشم کے ساتھ تو جو لوگ دنیا کے طالب تھے انھوں نے اس کو دیکھ کر کہا۔ اے کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ ملتا

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور مختصر ترین الفاظ میں لکھی جائے اور پچاس پیسے کے ٹکٹ بطور خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ر تاریخ تک وصول ہو جائے، ورنہ ایک ماہ کی تاخیر سے چھپے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• بہن شاہ تاج بیگم صاحبہ (مئو گڑھ) مئی ۱۹۸۴ء میں میری بچی کی شادی عزیزی شاہد سلمہ سے ہوئی تھی۔ اللہ پاک نے ۲ر فروری ۱۹۸۵ء کو، بجکر ۴۰ منٹ پر انھیں ایک فرزند عطا فرما کر مجھے نانی بننے کا شرف بخشا۔ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ نومولود کو صحت و سلامتی کے ساتھ عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• اردو کے مشہور ناول نگار جناب مجاہد لکھنوی (کراچی) کی صاحبزادی عزیزہ فاطمہ سلمہا کو اللہ پاک نے ۱۲ر ربیع الاول ۱۴۰۵ھ کو ایک فرزند عطا فرمایا نام محمد ثاقب رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ محمد ثاقب کو عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔

(نسیم انہونوی)

• راحیلہ اسعد (آمبور) "میری آنٹی رضیہ سلطانہ اور انکل صلاح الدین صاحب کو اللہ پاک نے ۲۰ر اپریل ۱۹۸۵ء بروز جمعرات، بجے شام ایک دختر عطا فرمائی نام ثمرینہ تبریز رکھا گیا۔ اللہ مبارک کرے۔

پیامات نشاط

• الیاس خورشید اور محمد یوسف انصاری (مالیگاؤں) نے اطلاع دی ہے کہ انصاری شاہد محمود سلمہ ڈی۔ سی۔ ای (بمبئی) اور انصاری طاہرہ اکرم سلمہا بی۔ ایس۔ سی کی شادیاں بالترتیب انصاری نجم السحر سلمہا ایس۔ وائی۔ بی۔ اے اور خواجہ نصیر عابد سلمہ (بی۔ ایس سی۔ بی۔ ایڈ) کے ہمراہ ۱۵ر مئی ۱۹۸۵ء کو بمقام بدر مالیگاؤں بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سید جمیل الحسن صاحب ردولوی مقیم نسیم بلڈپو کی صاحبزادی سلمہا (محترمہ جعفر رضا سلمہ) کی دختر اور شکری رضا شعاع صاحب مرحوم کی صاحبزادی زہرہ بانو سلمہا کی شادی الیس حسن عباس سلمہ فرزند جناب امیر حسن صاحب) کے ہمراہ، ار مئی ۱۹۸۵ء کی شب میں بمقام پاٹریے ڈالہ۔ لکھنؤ میں بحسن و خوبی سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• خرم خانم (کلمبا) میرے جیٹھ سید عبدالحسیب شاہ جہانگیر صاحب کی سب سے بڑی بچی عارفہ اقبال سلمہا کا عقد سید نیاض جاگیردار صاحب بی۔ اے (ابن سید یٰسین صاحب ناندگاؤں) سے ۸ر مئی ۱۹۸۵ء بروز بدھ بوقت ۹ بجے بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ پاک ان دونوں کی جوڑی کو سلامت رکھے۔

انتقال پر ملال کی خبریں

• مس سارا رمزی خاں (ملیح آباد۔ لکھنؤ) افسوس کہ ہمارے ابا محترم عزیز رمزی خاں صاحب ۱۲ر مارچ ۱۹۸۵ء جمعرات کی شام کو چھ بجکر ۵۵ منٹ ایکسی ڈنٹ ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے رحمدل، ہر دل عزیز اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

• ہندوستان ہی نہیں، دنیا بھر کے اردو داں طبقے میں یہ خبر بڑے غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ رسالہ شمع کے بانی جناب یوسف دہلوی کا ۲۲ر مئی ۱۹۸۵ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔

یوسف صاحب مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے اور ہم دونوں میں یہ مماثلت تھی کہ ہم دونوں نے بلا کسی سرمائے کے اپنے کاروبار کی بنیاد ڈالی اور ہمیں اللہ کے فضل و کرم سے ترقی ہوئی۔ یوسف صاحب بڑے ذہین انسان تھے اور انکی ترقی کا راز صرف ان کی ذہانت ہی میں مضمر تھا۔ اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم سے انھیں ایسی ترقی بخشی جیسی کسی بھی اردو کے ادارے کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

یوسف صاحب سے میرے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ وہ نینی تال تشریف لیجاتے تو میرے ہی ساتھ سیر و تفریح کے لئے جایا کرتے۔ ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ ہم دونوں بھیم تال کی سیر کو گئے۔ وہاں سے سات تال اور نوکچیا تال وغیرہ دیکھ کر بس کے ذریعہ واپس ہوئے تو بھیم تال میں رکے۔ یہاں اس موسم کے

پھل یہاں دہلی کے مقابلہ پر ارزاں ہیں۔ مجھے دوسرے روز واپس ہونا تھا، اس لئے میں نے ایک ٹوکری میں پھل لئے تو یوسف صاحب نے بھی پھل خرید لئے۔ ہماری بس نینی تال پہنچی تو ہم دونوں بس سے اترے۔ میں نے قلی کو بلایا تو یوسف صاحب نے فرمایا قلی کیا ہوگا۔ میں نے کہا پھلوں کی ٹوکریاں۔ فرمایا "ارے اس کے لئے قلی کی کیا ضرورت، ایک آپ اٹھالیں، دوسری میں"۔

یوسف صاحب عمر ہی میں، مجھ سے بڑے نہ تھے کاروباری اعتبار سے بھی وہ مجھ سے بہت بلند تھے۔ کیسے کہتا کہ میں نے کبھی سامان خود نہیں اٹھایا خاموشی کے ساتھ بس پر چڑھا، ٹوکریاں اٹھا کر یوسف صاحب کو دیں۔ بس سے اترا، پھر ایک ایک ٹوکری اٹھا کر ہم دونوں مال روڈ پر چلنے لگے۔ اس وقت میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے ٹوکری اٹھا کر چلنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی، حالانکہ دنیاوی اعتبار سے میرا یوسف صاحب سے کوئی مقابلہ نہ تھا، لیکن یوسف صاحب کو کوئی احساس نہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یوسف صاحب کروڑ پتی ہو چکے تھے، لیکن ان کی سادگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ غرور و تمکنت کا کوئی شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اور مرحوم کی یہ خوبیاں ان میں آخر دم تک قائم رہیں۔

چودہ سال بعد مارچ ۸۳ء میں، میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے اردو پینل کی میٹنگ میں دہلی گیا تو یوسف صاحب کی علالت کا علم ہوا۔ میں نے کوشش کی دہلی آیا ہوں تو ملتا چلوں۔ میرے میزبان حاجی شفیع صاحب کی کار کا ڈرائیور بنا تھا، اس لئے ایک گھنٹے تک مختلف راستوں پر گذرتا اور معلوم کرتا ہوا بمشکل تمام یوسف صاحب کی کوٹھی تک پہنچا۔ اپنا کارڈ بھیجا۔ کافی دیر بعد اندر بلایا گیا۔ یوسف صاحب نے مجھے پہچانا نہیں، فرمایا دفتر آئے ہوں گے۔ میں نے مختلف انداز میں اپنا تعارف کرایا تو فرمایا "ہاں پہچان گیا" کوئی گفتگو نہ ہو سکی اور میں حسرت بھری نظروں سے انھیں دیکھتا ہوا باہر آ گیا۔ مرحوم یوسف دہلوی سے میری آخری ملاقات تھی۔ مارچ ۸۵ء میں پھر میں بک ٹرسٹ کے ایک سیمینار میں گیا تو وہیں یوسف کے فرزند یونس دہلوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے یوسف صاحب کی مزاجی کیفیت معلوم کی تو انھوں نے اطمینان بخش بتائی۔ میرے پاس وقت نہ تھا کہ پھر ایک بار ان کے دیدار کر لیتا۔ بہرحال یوسف دہلوی کے انتقال کی خبر پڑھ کر مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ (نسیم انہونوی)

● وارث روڈ لکھنؤ کے ایک بہت ہی نیک اور شریف انسان اور میرے دوست محمد کاظم خاں صاحب جو عرف عام میں منشی جی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے جمعہ ۲۴ مئی ۸۵ء کی شب میں ۱۰ بجے انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی صحت ایک عرصے سے خراب تھی لیکن اس کے باوجود اپنی دوکان برابر آتے تھے۔ انتقال کے روز بھی آئے۔ روزے سے تھے اور افطار کے لئے تنہا رکشے پر بیٹھ کر اپنے گھر گئے لیکن گھر پہنچتے پہنچتے حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ پھر بھی روزہ نہیں توڑا وقت آنے پر ہی کھولا اور ۲۔یا ۲½ گھنٹے بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

مرحوم نے پہلے بچہ گاڑیاں مینوفیکچر کرنے کا کام شروع کیا تھا لیکن بعد میں یہ کام ختم کر کے کسان پائپ کمپنی قائم کی جس کے وہ پارٹنر تھے، ان کا یہ فرم کافی ترقی پر ہے۔ مرحوم کے ۵ بیٹے اور ۵ بیٹیاں ہیں۔ میں انھیں ہمیشہ منشی جی ہی کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ بڑے نیک، پارسا، اور خوش مزاج انسان تھے۔ ہر ایک سے میل محبت رکھنے کی وجہ سے تمام کاروباریوں میں بے حد مقبول تھے۔ اللہ پاک انھیں غریقِ رحمت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

▫ نئی پاکٹ بکس

ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین کا نیا ناول	[illegible]
راگ بھوپالی	صغرا مہدی	[illegible]
گھر	رابعہ تبسم	[illegible]
دھوپ	ماریہ رحمٰن	[illegible]

اس سال اب تک سب سے زیادہ بکنے والے ناول

نمود سحر	واجدہ تازلی	[illegible]
ہار جیت	عفت موہانی	[illegible]
شہابی	شہناز کنول	[illegible]
پھول	مشرف تمیز	[illegible]
اجنبی	سلمیٰ کنول	[illegible]
چارہ گر	بشریٰ رحمٰن	[illegible]

کنجوسوں کے لطیفے

• ایک کنجوس اونچی چھت سے گر کر زخمی ہوگیا۔ لوگوں نے دوڑ کر اٹھایا اور وجہ پوچھی کہ کیسے گر پڑے۔

اس نے کہا میں چنے کھا رہا تھا۔ ایک چنا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اسے پکڑنے کے لئے میں نے چھلانگ لگا دی۔

• ایک کنجوس کے لڑکے کی شادی تھی۔ وہ بینڈ بجانے والوں کے پاس گیا اور ان کے نرخ دریافت کئے۔ بینڈ ماسٹر نے کہا۔ اچھی وردی میں سو روپیہ۔ پرانی وردی میں پچاس۔ بلا وردی میں پچیس۔

کنجوس کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے کہا" اگر آپ لوگ صرف انڈرویر پہن کر آجائیں تو امید ہے اور کم لیں گے۔

• ایک یہودی ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔ ایک ڈھلان پر اترتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے گھبرا کر کہا" موٹر کا بریک خراب ہوگیا ہے

یہودی نے کہا۔ تم میٹر فوراً بند کر دو ایکسی ڈنٹ ہوگیا تو میں اس فاصلہ کا کرایہ ادا نہ کروں گا۔

• ایک اسکاٹ کی بیوی سخت بیمار تھی۔ اچانک ایک رات اس کی حالت تشویشناک ہوگئی۔ اسکاٹ بڑا پریشان ہوا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ صبح ہوتے ہی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے ملازم کے پاس گیا اور بولا" جاؤ جلدی سے ڈیری فارم چلے جاؤ۔ کہنا بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ آج سے صرف ایک بوتل دودھ آیا کرے گا"

• بیوی نے اپنے سست اور کاہل شوہر سے کہا، اب مجھے تمہارے لئے کوئی ایسا انتظام کرنا پڑے گا کہ تم بٹن دباؤ تو ہر چیز تمہارے سامنے حاضر ہو جائے، جیسے ہی بٹن دباؤ کھانا آجائے۔ بٹن دباتے ہی کپڑے آجائیں۔ یہاں تک کہ جس کی تجھے تمنا ہو بٹن دباتے ہی آجائے۔

لیکن بیگم۔ شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا کیا یہ کام آپ آٹومیٹک نہیں کرسکتیں۔ تاکہ میں بار بار بٹن دبانے کی کوفت سے بچا رہوں۔

• ایک کنجوس آدھی گھنٹہ بھر سے سڑک پر خالی رکشے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر اس کی مراد پوری ہوئی اور ایک خالی رکشا آ کر رکا۔ کنجوس نے پوچھا ارے بھائی جھنگ بازار جانے کے کتنے پیسے لوگے؛

رکشے والا بولا آپ [illegible] دے دیں۔ یہ جواب سن کر کنجوس چپ چاپ آگے چل پڑا۔ رکشے والے نے رکشا اس کے قریب لے جا کر کہا، جناب پھر آپ ہی بتادیں جھنگ بازار کے کتنے پیسے دیں گے۔

کنجوس نے پلٹ کر جواب دیا بس تم جاؤ گے تو یہی معلوم کرنا تھا کہ اگر میں جھنگ بازار پیدل چل کر جاؤں تو کتنی بچت ہوگی۔

• ایک کنجوس اپنے بیٹے کی کامیابی پر خوش ہو کر کہنے لگا بیٹا جو مانگنا ہے مانگو۔ بیٹا باپ سے بولا ابا جان ایک منٹ سوچنے کے لئے دیں۔

باپ۔ ٹھیک ہے بیٹا سوچ لو۔

بیٹا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ابا جان ایک کار مجھے لے دیں۔

کنجوس نے کہا۔ بیٹا تم نے سوچنے کے لئے ایک منٹ مانگا تھا وہ میں نے دے دیا جاؤ اب عیش کرو۔

• اے میرے محبوب! میری آنکھوں میں آجا اور میں اپنی آنکھیں بند کرلوں تاکہ نہ تجھے کسی غیر کو دیکھنے دوں اور نہ میں کسی اور کو دیکھوں۔

(کبیر داس)

• عورت کی اچھائیوں کی تعریف کرو اور اس کی معمولی غلطیوں اور کوتاہیوں پر تھوڑے سے اندھے اور بہرے بن جاؤ، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

• یہ احساس عورت کو تکمیل بخشتا ہے کہ کسی سے محبت کی جا رہی ہے اور کوئی اس سے محبت کرتا ہے۔

• یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب تمام لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں تو پھر "یہ خراب بیویاں" کہاں سے آتی ہیں!

• عورت ہی سے دنیا آباد ہے اور اسی کے دم سے رونق ہے اور اسی کی وجہ سے دنیا میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ (احسان سہگل)

[illegible]ل	مشہاب	۲۵/-
	بادل کا سایہ	۲۰/-
[illegible]ناز	سنگ و ساز	۱۵/-
	۱۲/- نگاہِ شیریں	۲۰/-

[illegible]ن سیتاپوری کا ناول

نہ کوئلہ نہ راکھ ۲۴/-

ظہیر الحق علوی کا نیا ناول

اهرام

۳۲/-

قدیم مصر کی رومان پرور کہانی
محبت کی عظیم داستان

دوسرے اداروں کی کتب

بشریٰ رحمٰن	پیاسی	۶۰/-
خوبصورت		۵۰/-
زوال		۸۰/-
رضیہ بٹ	آگ	۵۰/-
[illegible]	۱۸/- نورینہ	۲۰/-
[illegible]	۲۰/- زندگی	۳۲/-
[illegible]	۳۵/- ناجیہ	۲۵/-
[illegible]	۲۵/- فاصلے	۴۰/-
سلمیٰ کنول	مروج	۳۵/-
[illegible]	۵۰/- پناہ گاہ	۳۵/-
[illegible]	۳۵/- بے حد	۲۵/-
[illegible]	علیم پروین	۳۰/-
[illegible]	"	۵/-
[illegible]	"	۵/-
[illegible]	مسرور جہاں	۱۶/-
[illegible]	" "	۲۰/-
	" "	۱۵/-

پھول	نزہت ثمینہ	۴۰/-
سرابِ زندگی	ذکیہ بگرامی	۳۰/-
ایک خلش سی	حامدہ واسطی	۲۴/-
آئینہ	فیاض نیازی	۳۵/-
شارینہ	محسنہ حبیب	۲۸/-
لوفر	آمنہ اقبال	۳۰/-
بہار آنے تک	نسیمہ مظہر	۲۰/-
آہ	شہلا نرگس	۲۵/-
بے نشان رستے	بلقیس ظفر	۳۰/-
گوری	روحی سلیم	۳۰/-
ذرے ذات	عفت قریشی	۴۰/-
جب یاد تری آئی	ماہ ناز مہر ثنا	۲۳/-
چلمن چلمن تیری گلی	دیبا خانم	۲۴/-
بھیگے ہوئے رخسار	ناظم طالب	۴۵/-
تعبیر	شمیم ترنا لک	۲۰/-
یادوں کا سورج	سراج اللہ	۲۲/-
انگارے	شبنم سحر	۲۵/-
زخمِ بہاراں	طاہرہ سعید	۲۳/-
گرہن	اسما اعجاز	۳۵/-
پیاسا	"	۲۵/-
سدابہار	دیبا خانم	۳۵/-
پیاسے کو شبنم	"	۱۵/-
تصویر	اے آر خاتون	۲۵/-
فرحانہ	"	۱۵/-
پیار کا ساگر	فردوس حیدر	۴۰/-
کالے کنول	سلمیٰ رعنا	۲۵/-
گرفتارِ وفا	پروین شریف	۲۵/-
رفاقت یہ فداسی	رضیہ فرحت	۲۲/-
اختلاف کا موسم	دیبا خانم	۱۵/-
کنول	نادرہ خاتون	۲۰/-
سورج نگر کی رانی	رضیہ جمیل	۳۲/-

عالم پناہ	رضیہ منظور الامین	۳۰/-
ایک ہی ڈگر	زلیخا حسین	۱۶/-
نصیب اجنب کی بات	"	۲۰/-
ہم سفر	شمیم عندلیب	۲۵/-
دل وحشی	مینا ناز	۲۰/-
لیلیٰ تری گلی میں	"	۲۳/-
سیپ	بلقیس کنول	۲۰/-
شہنیلا	بدر انجم خاتون	۲۳/-
دل آویز	نگار زریں	۲۵/-
راز داں	فردوس حیدر	۲۵/-
نقش قدم	"	۱۶/-
شاید کہ بہار آئی	شمع قاضی	۱۵/-
رشتے ہیں پیار کے	رضیہ فرحت	۳۰/-
صبرین	ایم سلطانہ فخر	۳۰/-
آنگن	خدیجہ مستور	۲۰/-
منزل وفا کی	بلقیس کنول	۳۲/-
یادوں کے نقوش	سعیدہ ناز	۲۵/-
پت جھڑ کے مسافر	مصور وارثی	۳۲/-
ڈھلکتے آنسو	مسافر	۲۳/-
دریچے	وقار ناصری	۲۰/-
کچے راستے	ارشاد امروہوی	۲۴/-
بے باک	عظمت رضا	۳۰/-
کھلاڑی	"	۲۲/-

جاسوسی مہماتی ناول

زمرد	سلامت علی مہدی	۲۴/-
ہمزاد	شمیم نوید	۲۰/-
ٹائیگر	ایم اے قریشی (دو حصے)	۳۰/-
آخری شعلہ	ابن صفی	۲۵/-
غبار	سراج انور	۲۴/-
خوفناک قبیلہ	ایم جے عالم	۲۳/-
آتشِ انتقام	ایم جے عالم	۲۳/۵۰

"اچھا۔"

وہ چلی گئی۔ کہیں سے گھڑی نے دو بجائے۔ اور ایک آدمی کندھے پر جھاڑن ڈالے وہاں آیا۔

"تمہیں ایاز ہو؟"

وہ بے چارہ مؤدب ہو گیا: "جی ہاں۔"

"کھانے کے لیے چلو۔"

اسے شرم لگی۔ کیسے کھائے گا کھانا سب کے سامنے۔ کھانا اور پیسہ بے حد ذلیل کرنے والی چیزیں ہیں۔ کھانا مانگیے چاہے پیسہ۔ ہاتھ پہلے پھیلانا پڑتا ہے۔ آدمی اپنے مرتبہ سے نیچے گر پڑتا ہے۔ دوسروں کی نگاہوں میں بعد کو اپنی نگاہوں میں پہلے۔

کچن میں سب ملازم کھا رہے تھے ان کے سامنے بھی ایسے کھانے رکھے تھے جو ایاز نے کبھی عمر بھر بھی نہ دیکھے تھے۔ چکھنا تو دور کی بات۔ اس نے شکم سیر ہو کر کھایا پھر اسے چائے دی گئی جس میں خوب سی بالائی پڑی تھی۔ اور چائے کے بعد بھوبھر کے بڑی زوردار نیند آئی۔ ایک رکابی میں اپنی انگلیاں گیلی کر کے اس نے قمیص سے ہاتھ پونچھا! اور آستین ہونٹوں پر رگڑی اب تک یہی کرتا آیا تھا۔ پھر کونے میں پڑی چوکی پر ترچھا لیٹ کر دنیا مافیہا سے بے خبر سو گیا۔

نجانے کون سا وقت تھا جب کسی نے اسے جگایا۔ یہاں وہاں چمکدار ٹیوب لائٹ آن تھے۔ اس نے سوچا کہ دن نکل آیا ہے مگر وہ مغرب تھا کتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ دودھیا روشنی، خوشبوئیں، چہل پہل۔ یہ بڑا سا گھر ہنستے ہوئے لوگ۔ صنوبیہ اور سال بھر کا خوب صورت ننھا۔
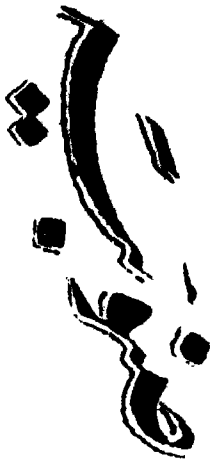
([illegible])

صنوبیہ

عفت موہانی

ناشر

نسیم بک ڈپو ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

فون { ۲۲۵۵۹
۲۵۳۳۲

[illegible]

سادھاریدار پاجامہ، اور بادامی رنگ کا قمیص۔ جھولتی ہوئی آستین گریبان کا اوپر کا بٹن ندارد۔ واہیات سی بدرنگ جوتیاں ، انگوٹھوں میں اٹکی ہوئی اسے بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ یہ کپڑے پچھلی عید پر خالہ نے جوڑ دیے تھے۔ دھوتے پہنتے اتنے مہینے گزر گئے، کپڑے گھس نہ جاتے تو کیا کرتے!

اب وہ منوبیہ کے ساتھ کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھئے کھانے کو کیا ٹھہرتی ہے۔ پیٹ میں کچھ کچھ تراقر شروع ہو چکی تھی۔ اسے ڈر رہتا، یہ نامانوس آواز کہیں منوبیہ نہ سن لے!۔

"تم نے ہمارا گھر دیکھا۔ ایاز؟"

ابھی نہیں!۔

چلو پھر دیکھیں! تمہیں پھول اچھے لگتے ہیں!

"جی ہاں۔!"

ارے کیا جی ہاں جی ہاں۔ میں تمہیں اتنی بڑی دکھائی دیتی ہوں کیا پچھلے دنوں میری آٹھویں سالگرہ ہوئی ہے۔ تم کتنے برس کے ہو؟

"خالہ کہہ رہی تھیں کہ میں بارہ برس کا ہوں" اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

ایک لڑکی سے عمر میں بڑا ہونا کتنی شاندار بات تھی۔

کسی نے لڑکی کو آواز دی۔ وہ مسکرائی "لو۔ بھائی آواز دے رہی ہیں۔ آؤ چلیں۔ تم نے بھابی کے ننھے کو دیکھا!۔

ابھی نہیں دیکھا!" رفتہ رفتہ وہ کھل گیا تھا۔ سال بھر کے لیے بیکس ہو گیا تھا۔ کہاں تک آپ داپ کا تکلف۔

سال بھر کا ہے۔ بہت پیارا پیارا سا۔ آؤ دیکھو!۔

آپ جائیے۔ میں باہر ٹھہرتا ہوں۔

وہ اچانک بت بن گیا۔ لیکن انہونی سی بات اس نے پوچھ لی تھی۔ وہ تو بھول ہی گیا تھا۔ کیا چیز ہوتا ہے ابا اور کسے کہتے ہیں امی؟۔

پتہ نہیں: پھر وہ جھینپے سے شرمندہ لہجے میں بولا: میں بہت دنوں سے خالہ کے پاس رہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میرے ابا اور امی کہاں ہیں۔

ارے! تم کتنے احمق ہو۔ کیا تم نے خالہ سے بھی نہیں پوچھا؟

نہیں!۔

سنو!:

جی۔ سن رہا ہوں۔

ہماری الن کے ماں باپ سانپ کے کاٹنے سے مر گئے تھے۔ کہیں تمھارے ماں باپ بھی اسی طرح نہ مر گئے ہوں۔

مر گئے ہوں گے۔ ایاز نے سوچا۔ اگر جیتے ہوتے کم بخت کہیں کے۔ تو اسے مڑ کر نہ پوچھتے؟۔ اب اتنے پتھر تو نہیں ہوں گے۔ اسے اپنے ماں باپ سے بے حد نفرت سی لگی۔

آپ کے ابا اور امی کہاں ہیں؟: اس نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"تم سے جو باتیں کر رہے تھے نا۔ وہی تو میرے ابا جی ہیں۔ اور یہ جو میرے ساتھ تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی جان ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کی شادی ہوئی تھی تو ہم نے خوب ہی مٹھائی کھائی تھی۔ مجھے گلاب جامن اتنے اچھے لگتے ہیں۔ اور میں نے لال لال چمکتے ہوئے کپڑے پہنے تھے۔ تمھارے کپڑے کیسے عجیب ہیں!:

ہاں!: اس نے بڑے دکھ سے سر ہلایا۔ پر نظریں [illegible]

نیلے رنگ کے مضبوط گیٹ کے سامنے پہونچ کر وہ ٹھٹکا۔ خالہ اسے نجانے کہاں لے آئی تھیں۔ اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا بس ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ ویسے وہ بڑی دیر سے ضبط کر رہا تھا ورنہ جی میں آئی تھی کہ یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک خالہ ہی کا در تو تھا آج وہ بھی چھوٹ جائے گا۔ تقدیر اس کے ساتھ چوہے بلی کا سا کھیل کیوں کھیل رہی تھی کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اتنی سی عمر میں اسے خاصی سمجھ آ گئی تھی۔ یوں بھی مصیبتیں اور پریشانیاں بڑی عمدہ استانیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی بہت کچھ جان گیا تھا مگر اپنی قسمت پر شاکر تھا۔ کبھی اس نے حالات کا شکوہ نہ کیا۔ کبھی مصیبتوں کا رونا نہیں رویا۔ اسے ہمیشہ کسی غیبی مدد اور انوکھے معجزے کا انتظار رہا تھا۔ اچانک کوئی بات ایسی ہو جائے گی کہ وہ جھٹ پٹ کچھ سے کچھ بن جائے گا۔ آخر بہت دنوں پہلے کا وہ الہ دین جسے جادو کا چراغ مل گیا تھا اسکی عمر کا لڑکا تو تھا۔ تو پھر۔ اب خدانخواستہ ایسا تو نہیں ہوا تھا کہ اللہ میاں مجبور ہو گئے ہوں ویسا چراغ پیدا ہی نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ فرض کیا کہ وہ کسی سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ دفعتاً اسے ایک انگوٹھی پڑی ملتی ہے وہ اسے اٹھا لیتا ہے۔ اور اکیلے میں جا کے کہیں اسے رگڑتا ہے پھر بس ایک دم سے الہ دین کا جن سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اب وہ جو چاہے [illegible] بالکل [illegible]

جن صاحب سے کون کون سی فرمائشیں کرے ؟ کھانا مانگے کہ اچھے اچھے
کپڑے طلب کرے یا پھر بہت سے نوٹ ۔ پتہ نہیں ۔ جناب ۔ ایسے وقتوں پر
حواس درست رہنے چاہئیں ۔ تب تو کچھ بات بنتی ہے ۔ اگر ذرہ برابر بھی بدحواس
ہوئے تو سنا ہے کہ جن خفا ہو کر سر پر آجاتے ہیں ۔

اکیلے میں پڑا وہ چپ چاپ سوچا کرتا ۔ اگر سچ مچ ایسا ہوگیا تو اسے اپنا دل
مضبوط کرنا پڑے گا ۔ سنا ہے کہ بعضے بھیانک ہوتے ہیں بڑی بڑی لال لال
آنکھیں ۔ سر پر ایک سینگ ، گرجدار آواز ڈراونے قہقہے ۔ اگر ان سے آدمی ڈر
جائے تو وہ اسے مار بھی ڈالتے ہیں ۔ اور وہ بڑی عقیدت سے آیتہ الکرسی پڑھنے
لگا ۔ یہ خالہ نے کہہ رکھا تھا ۔ ہزار دواؤں کی ایک دوا ہے آیتہ الکرسی ۔ اب
وہ فر فر پڑھنے لگا تھا ۔ اسے خاصہ اطمینان بھی تھا ۔ جن کبھی اس پر مہربان ہو
گیا تو پہلے آیتہ الکرسی پڑھی اور اسے مطیع و فرمانبردار بنالیا ۔

خالہ جو خدا جانے اس کی سگی خالہ تھیں بھی کہ نہیں ۔ اس کے اس طرح گم صم
رہنے پر بڑے افسوس سے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیا کرتیں ۔ ارے ابھی سے
الٹے سیدھے خوابوں میں کھویا رہتا ہے نامراد ۔ خواب نہ دیکھا کر بچے ۔ یہ بہت
دکھ پہنچاتے ہیں ۔ ان کی تعبیر کبھی نہیں ملتی ۔ مگر اس نے ان کی بات کبھی نہ
مانی ۔ خالہ بےچاری بڑھی ہوئیں ۔ ان کی ساری زندگی ادھر ادھر کام کرتے
گزر گئی ۔ ہمیشہ اپنی بھیتوں پر سر پٹا کیں ۔ انھوں نے خواب دیکھے ہوتے تو ان
کی قدر بھی جانتیں ، خواب کتنا دکھ پہنچاتے ہیں ۔ جاگتے کے خواب تو آدمی
اپنی مرضی سے بھی دیکھ سکتا ہے ۔ بھلا کون ہے جو ان پر پہرے بٹھا سکے ۔ جو جو
کچھ تقدیر میں ہیں [illegible]
[illegible]

ستی کر ایاز کی پلکیں جھپک گئیں ۔ وہ سہما سہما سا ان صاحب کو تکنے لگا ۔
کون ہو تم ؟ انھوں نے پوچھا : ہمسائے کے اللہ نے بھیجا ہے [illegible]
جی ۔ جی نہیں ۔ میں ۔ میں ایاز ہوں : منھ بھرے ہاتھ ملتا ہوا وہ ڈرتا
ڈرتا بولا : آج ہی ۔ یہاں نوکر ہوا ہوں ۔

نوکر ؟ وہ بےحد شفقت سے مسکرائے : نہیں میاں ۔ تم نوکر نہیں
ہو ۔ مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو تم ۔ اچھا اب ہاتھ دھو لو ۔ میرے ساتھ
چلو ۔ یہ گھورہ کچرہ ملازم باہر پھینک آئے گا ۔

ہاتھ کہاں دھوؤں صاحب ؟

ارے بھئی صنوبیہ انھیں غسلخانہ دکھا دو ۔ میں باہر بیٹھتا ہوں انھیں
وہیں لے آنا ۔! یہ کہہ کر وہ چلے گئے ۔

وہ بچی جو اسے بہت اچھی لگی تھی ۔ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی
چلو ۔

وہ اس سے بےحد مرعوب ہوا جا رہا تھا ۔ کیا بات تھی اس بچی میں
اتنی سی تو تھی ۔ پھر کیا وجہ تھی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس لڑکی
سے خوف زدہ کیوں تھا ۔ کیا یہ بھی بخشی صاحب کی لڑکی کی طرح منھ چڑھا
کر بھاگے گی ۔ اس پر پتھر پھینکے گی ؟

میری خالہ کے ساتھ تم ہی آئے تھے ؟ وہ اسے لے کر غسلخانہ میں پہونچی
اور نل کی طرف اشارہ کیا ۔

جی ہاں ۔

تمھارے ابا اور امی کہاں ہیں ؟

ابا اور امی ۔؟ پانی کی [illegible]

آسمان جو سر پہ تھا پاؤں تلے زمین۔ ہوا میں معلّق ہے۔ بڑی وحشت ہوئی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خالہ نے اسے سال بھر کی پیشگی تنخواہ میں جکڑ دیا تھا۔ سوائے کسی نہ کسی طرح نقصان بھرنا تھا۔ انہیں خدا حافظ کر کے وہ پھر اندر آ گیا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ چھٹنے کی دیر تھی، سمندر پلکوں پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ضبط کی کوشش میں حلق دکھنے لگی تھی۔

اب برآمدہ خالی تھا۔ وہ حیران سا صحن میں کھڑا تھا۔ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ کیا کسی کو اس انسان نما جانور کی پرواہ نہ تھی۔ جسے ساڑھے تین سو میں انہوں نے خریدا تھا۔

جانے کہاں سے ہنسی مذاق کی اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں غالباً باورچی خانے میں برتن بج رہے تھے۔

وہ نروس ہونے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر سامنے اُٹھ گئی اور دل کے لگنے کا سامان ہوتا دکھائی دیا۔ کتنے بہت سے گملے وہاں ایک لمبی قطار میں دور تک رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں اسے کئی سوکھی کلیاں، پژمردہ پھول اور خزاں شدہ زرد زرد پتے نظر آ رہے تھے۔ وہ پاس گیا۔ اور پھر ایک سرے سے سب کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہو گیا۔ جانے کتنا وقت گزر رہا تھا۔ اب جو اس نے سب پر نگاہ دوڑائی تو سارے گملوں کو نئے سرے سے جاندار دیکھا۔ اپنی کامیاب محنت پر وہ مسکرایا۔

"واہ واہ بہت خوب!" ایک پرکشش مردانہ آواز اس نے اپنے پیچھے سنی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

[illegible] اور تعریفی نظروں سے اس کے کارنامے کو دیکھ رہے تھے۔ [illegible] تھا۔ [illegible] لباس میں ملبوس، کتنی پیاری سی

مطلق العنان فرمانروا کی طرح گھومنے پھرنے لگتا۔ چھوٹی سی عمر کے خواب بہت بڑے بڑے تھے۔

پھر یہ ہوا۔ جیسے کہ نصیب نے کروٹ بدلی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ خالہ کو ان کے بیٹے نے گاؤں بلا لیا تھا۔ کچھ زمینوں کے جھگڑے تھے۔ بٹوارے کا قصہ تھا۔ جن سے وہ بھی متعلق تھیں۔ پکے کا غذر پر خالہ کا انگوٹھا لگنا تھا۔ وہ بے حد جلدی میں تھیں۔ راتوں رات اپنا ٹوٹا ہوا بکسا نواڑ سے کس کے ٹھیک کر لیا اور اس میں کپڑے ٹھونس کے بند کر دیا۔ ایک بڑا سا گٹھر بھی باندھ لیا تھا اور تبھی دوسری شام کو نکلنے والی تھیں۔ اس وقت انہیں اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اور وہ بڑی حسرت سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ کیا وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی۔ گاؤں کے ہرے بھرے کھیت، گہرے گہرے کنویں، اور بھرے بھرے کھلیان دیکھنے کا اسے کتنا شوق تھا۔ وہ بھی مخملی گھاس پر ننگے پاؤں دوڑنا چاہتا تھا۔ اسے بھی تازہ گڑ اور لال لال گاجر کھانے کا ارمان تھا۔ مگر اب اس کے یہ سارے ارمان خالہ نے اٹھا کر ایک طرف دھر دیے تھے۔ پوچھا تک نہ تھا کہ وہ بھی آخر چلے گا کہ نہیں۔ وہ خود اتنا سا بڑا تھا بڑا خوددار تھا کہ اپنے منہ سے ان کی رفاقت کا طلبگار ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ خالہ نے اس کی تقدیر تو اپنے سامان میں نہیں باندھ لی تھی۔ وہ اکیلا ہی کچھ کر کے روٹی پیدا کرے گا۔ ایسی بے مروّت خالہ سے رحم و کرم کی بھیک نہیں مانگے گا۔

ساری رات وہ سوتا جاگتا رہا۔ اور صبح کو حسبِ معمول جوار کی روٹی اور گھی میں سوندی ہوئی لال مرچ کی چٹنی کھا کے اس نے گردن تک بھر جانے پر پھر خالہ نے خلافِ توقع کہا۔

"اچھا بیٹے۔ اب چل، اٹھ۔ میں تجھے [illegible]

بہت اچھا آدمی ہیں۔!"

بڑے صاحب؟" وہ ان کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں۔ تیرے خالو انہی کے ہاں کے چوکیدار تھے۔ اتنے فرشتہ آدمی ہیں یہ بڑے صاحب کہ تیرے خالو کے مرنے کے بعد بھی میری پن چین باندھ رکھی ہے۔ آج کل اتنی مروت کون کرتا ہے؟۔ میں نے تیرا تذکرہ کیا تھا ان سے۔ بولے تھے کہ ہاں بہن جی اگر وہ آپ کا بھانجہ ہے تو ضرور لے آئیے۔ ہمیں بھی چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک بچے کی ضرورت ہے۔ وہ اگر ایماندار اور سعادت مند ہوا تو ہم زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھ لیں گے۔ سو بیٹا تمہیں بھی ایک ایسے گھر کی ضرورت ہے جہاں سر چھپا سکو۔ اور پیٹ بھر کھا سکو۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ نہیں تو میرے جانے کے بعد کہاں سر ٹکراتے پھرتے!"

خالہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا" وہ جی کڑا کرکے بولا۔

سر پلکوں پر لے کے چلتی" وہ آبدیدہ ہو گئیں" مگر تم بگوڑے سکندر کو نہیں جانتے پہلے درجے کا اکھڑ کھرا اور بے مروت ہے تمہیں کبھی کچھ کہہ دے تو دل برا ہو۔ اور یہ بھی تو ہے بیٹا کہ گاؤں کی جگہ سنسان ویران۔ چار ہی روز میں تم گھبرا جاؤ گے۔ مرد عورتیں۔ بچے تین ہی بجے رات سے اٹھ کر کھیتوں پر چلے جاتے ہیں دن کے نکلتے نکلتے تک سارا گاؤں ہُو ہو جاتا ہے۔ تم اس جگہ کھپ نہ سکو گے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ شہر کے پلے بڑھے بچے کو شہر ہی میں چھوڑ جاؤں۔ ارے تم گھبراؤ نہیں۔ بڑے صاحب کے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ تمہیں اپنا بچہ سمجھ کے رکھیں گے۔ میں بھی آخر ایک دن آؤں گی کہ کیسا ہے کہ ہم [illegible] نہیں رہا ہوں"

[illegible] اس جگہ آ گئی تھیں۔ جہاں بڑ[illegible]

میں آپ کے بھانجے کو نکالوں گا نہیں۔ ایک خلش مجھے یہ ہے بہن جی کہ آخر سکندر اپنے چھوٹے خالہ زاد بھائی کو اپنے پاس رکھنا کیوں گوارا نہیں کرتا؟"

اب میں کیا بتاؤں سرکار" انھوں نے جواب دیا۔

ایاز منتظر تھا کہ وہ کوئی تفصیل سنائیں گی۔ مگر وہ خاموش ہو گئیں۔ اور سرکار نے بھی اپنے سوال کا جواب نہیں مانگا۔ بڑی خاموشی سے خالہ کو دو تین بڑے نوٹ پکڑا دیے جنھیں خالہ نے اپنے کھدر کے کرتے کی جیب میں رکھ لیے۔ اور پھر زمین دوز سلام کرکے اٹھنے لگیں۔

اجازت دیجیے حضور!"

اچھا۔ وعلیکم السلام، خدا حافظ" بڑے سرکار کے اخلاق کا کیا کہنا مسکرا کر قدرے سر جھکایا تھا۔ اور بولے تھے" لیکن آپ ادھر ہی کی ہو کے نہ رہ جائیے گا۔ ایک آدھ چکر ضرور لگا دیجئے گا!۔

برو بر سرکار" وہ ہنس دیں" موت نہ آ گئی تو میں بھلا یہاں کیسے نہ آؤں گی"! پھر وہ ایاز سے بولیں" اچھا۔ سن بیٹا۔ اب یہاں اپنا گھر سمجھ کے رہیو۔ جی لگا کے کام کیجیو۔ سنا؟"

"ہاں" اس کا دل بھر آ رہا تھا۔ جانے ان کے جانے کے بعد کیسی گزرے کیسی نہ گزرے!۔ وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔ جب خالہ نے از راہ مہربانی اسے تیس روپے دیے اور حاتم طائی بن کر بولیں۔

"کچھ کھانے پینے کا دل چاہے تو جی نہ مارئیو۔ کھا لیجیو" اور پھر اس کی پیشانی کو چوم کر اس کی ہمت بڑھا کر وہ [illegible] میں چل دیں۔

[illegible] لگا جیسے وہ ایک [illegible]

لگاتے ہوئے پوچھا: "نام کیا بتایا آپ نے ان کا؟"

"ایاز۔"

"اچھا" وہ اس کی طرف دیکھ کر کھنکارے: "آپ مطمئن رہئے۔ میں اسے رکھے لیتا ہوں۔ اب آپ ماہانہ کے بارے میں۔"

"صاحب وہ کیا؟" خالہ زیر لب بڑبڑائیں: "روز کا ایک روپیہ ہی رکھ لیجئے۔ کیا میں آپ سے تنخواہ طلب طے کروں گی سرکار۔!" پھر وہ روہانسی ہو گئیں: "سچ کہوں آپ سے حضور۔ اسے اب تک جو پالا پوسا ہے تو مجھ غریب بیوہ پر فاقے گزر گئے۔ دو جانوں ہی کا کھانا پینا میرے لیے بہت تھا۔ سچ جانئے بڑے صاحب میں ہی بھائی ہی کے دوسرے اوپر قرضدار ہوں وہ الگ چڑھیا نوچن بچاتی ہیں۔ مطلب یہ سرکار کہ تنخواہ اس بڑے در سے یکمشت مل جاتی تو بھائی کا ادھار چکا کر میں باقی سے کرایہ لگا لیتی۔ پھوٹی کوڑی اگر میرے پلے ہو تو سرکار جیسی چاہیں قسم لے لیں۔"

ایک مرتبہ ایاز پھر حیران رہ گیا۔ اسے خالہ سے سخت گھن لگی۔ کیونکہ خر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھیں۔ ابھی پچھلے کل ہی تو انھوں نے ڈیڑھ لیکھ سے پورے سوا سو کا منی آرڈر وصول کیا تھا۔ اور گھر کا پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ بیچ کر بیس پچیس روپیہ کھرے کیے تھے۔ وہ سب رقم ان کی تھیلی میں رکھی گریبان میں بند تھیں۔ مگر وہ بے چارہ چپ رہا۔ خالہ نے ہیشتا کید کی تھی۔ جب دو بڑے آدمی بولتے ہوں تو خبردار بیچ میں ٹپک ٹپاک کی ... مت بول پڑنا۔ سو وہ چپ چاپ بیٹھا اپنی مول بھاؤ ہوتے سنا کیا۔ بڑے صاحب نے [illegible] ... سے کہا تھا: "اچھا بات ہے۔ میں آپ کو یکمشت اس کا سا[illegible] ... دے رہا ہوں۔ آپ کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔"

سے نیلے رنگ کے پھاٹک پر رک کر چل بھرتے ہیے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے سارے خواب جاندار ہو کر اس کے سامنے آ گئے ہوں۔ ایک اطمینان بھری سانس اس کے دل سے نکلی اور لبوں پر سرسرا کر دم توڑ گئی۔

واہ۔ اس نے سوچا ایسا ہی بلند و عریض پھاٹک اس محل کا بھی تھا۔ جس کی گہری بنیادیں اس کے دماغ میں گڑی ہوئی تھیں۔ پھر وہ منہ اٹھا کر خالہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے طباق سے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ کہ جیسے سر سے بھاری بوجھ اتار پھینکنے کا خیال انھیں مسرور کر رہا ہو۔

"کتنا اچھا گھر ہے" وہ لہرائیں۔ جالیوں سے اندر جھانکو: انھوں نے اسے گردن سے پکڑ کر جالیوں پر جھکا دیا۔

"ہاں ہاں" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی لکڑی کی ہی کوٹھری سے نکل کر ادھر آ رہا تھا۔

"نیا چوکیدار۔!" خالہ نے کہا۔

پھر اس آدمی کی نظر خالہ پر پڑی ہی تھی کہ کچھ کہے بغیر اس نے گیٹ کھول دیا۔ اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب گھر پر ہیں؟" خالہ نے پوچھا۔

"ہیں!"

"آؤ میاں اندر چلیں" خالہ نے اس کی مدقوق سی کلائی اپنے موٹے پنجے میں جکڑی اور بکری کے بے بس بچے کی طرح اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگیں۔ بڑی حیرت سے وہ آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کیسے عجیب عجیب پیارے پیارے پھول وہاں کھلے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت تھے

دیوار میں رخنہ تھا۔ اس میں بھی ایک درخت اُگ رہا تھا۔ اسے
شروع ہی سے درختوں سے دلچسپی تھی۔ اپنے ہتھیلی بھر کے آنگن میں بھی
اس نے دھنیا گوبھی، مرچ اور پھولوں میں گیندے اور سورج مکھی اگا
رکھے تھے۔ دل میں اس نے کہا۔ چلو ٹھیک ہے۔ پودے لگانے اور پھول اگانے
کے خوب مزے رہیں گے۔ برسوں کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ ہارسنگھار
جوہی موگرا، گلاب، اس نے ایک ننھا سا پودا ہارسنگھار کا لگایا بھی تھا جسے
خالہ کی جان وجگر مرغیوں نے کرید کر رکھ دیا تھا تب وہ کس قدر رویا تھا
یہاں منحوس ماری مرغیاں تو ہرگز نہ ہوں گی۔!

وہ لوگ صاف ستھرے برآمدے میں پہونچے۔
جاڑے بھر دیاں تھیں مگر صبح کی دھوپ ابھی اتنی ناگوار نہیں ہوتی تھی۔ برآمدے
میں کئی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک جانب چھوٹا سا تخت تھا جس پر پھولدار دری
تھی۔ چھ سات آدمی یہاں وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے تبھی خالہ وہاں نمودار
ہوئیں۔

"ارے خالہ میرن:" ایک لڑکی بولی:" یہ آپ اچانک سویرے سویرے
کیسے آگئیں۔ آیئے آیئے۔ بیٹھ جایئے!"
"صاحب جی۔ سلام:" وہ ایک بزرگ کے سامنے جھک گئیں۔
"وعلیکم السلام میرن بی۔!" وہ مسکرائے:" تشریف رکھیئے۔ تب اچانک وہ
بزرگ اسے بے حد اچھے لگے۔ ان کی نرم آواز کتنی پرمحبت تھی۔! وہ خود بھی
بہت اچھے لگ رہے تھے۔ گندمی رنگ، اونچی پیشانی، شفاف متبسم آنکھیں
... سفید داڑھی۔ سفید پاجامے میں ملبوس وہ بڑے بارعب و باوقار ...

اس کے بارے میں کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ وہ سکڑا سمٹا سا خالہ کے پہلو میں
بیٹھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا ان لوگوں نے اسے رکھنا پسند نہ کیا تو پھر۔
خالہ کراہتی ہوئی کہہ رہی تھیں:" دے دو بی بی ایک کپ چائے۔ آپ
کے ہاں کی چائے تو جنت سے اتری معلوم ہوتی ہے۔ میں تو نگوڑا پوٹلی کا
دھوون پیتی ہوں۔ جس میں نہ مزہ نہ سواد۔ پیسے البتہ دے دو بھر مٹھی
اے ہاں ساٹھ پیسے میں ایک کپ! خالہ کے اس سفید جھوٹ پر وہ ہکا بکا
رہ گیا۔ کیوں جھوٹ بولی تھیں۔ خوامخواہ جبکہ ابھی کچھ دیر پہلے گڑ کی خوب گاڑھی
اور میٹھی چائے جی بھر کے پی کے آئی تھیں۔

ایک لڑکی نے دو پیالیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔ اسے چائے پیتے بڑی
شرم لگی۔ مگر وہ انکار کیسے کرتا۔ اپنی عادت کے مطابق طشتری میں چائے
انڈیلی اور کنکھیوں سے آس پاس دیکھتا ہوا سُڑپ سُڑپ کرنے لگا۔
اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ ایک گوری گوری سی بچی بے حد دلچسپی
اور حیرت سے اسے اس طرح پیتے دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کرنل بخشی
صاحب کی بچی بھی اسی طرح اسے حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ اور منہ چڑھایا
کرتی تھی۔ اس لیے اس نے منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔

اور پھر دفعتاً اس کا تذکرہ درمیان میں آگیا۔ نجانے وہ کیا کہہ چکی تھیں۔ وہ
سُن نہ سکا تھا۔ خالہ کی گھگھیائی ہوئی آواز تو چونکنے پر کان میں پڑی تھی۔
"سکڑ رہی سے تو مصیبت ہے صاحب! نہیں تو بالشت بھر کا بچہ مجھے
کچھ بیچارہ نہ تھا۔ اب آپ ہی کرم کیجئے۔ رکھ لیجئے اسے۔ اس دن آپ نے
کہا تھا کر خود چلا گیا ہے اور ...

THE HAREEM

حریم

July.85

Rs. 1/60

ٹیلیفون نمبر آفس :۔ ۲۲۵۵۹

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپکی سالانہ قیمت اس پرچہ تک ختم ہوگئی۔

ٹیلیفون نمبر رہائش :۔ ۲۵۳۳۴

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۵ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار
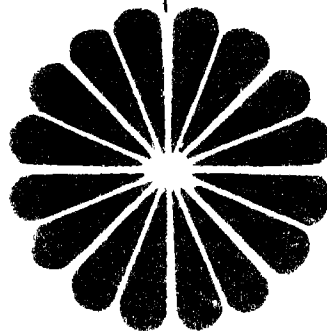
سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۵) فہرست مضامین جولائی ۸۵ء نمبر (۷)

ایڈیٹر نگراں :۔ نسیم انہونوی

معاونین :۔ شوکت جہاں بیگم غزالہ — جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	تیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	اٹھائیس روپیہ
معمولی خریداری	"	چوبیس روپیہ

وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ پیسے

غیر ممالک

اسی روپیہ یا اس کے مساوی غیر ملکی سکہ ایرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ماہ کی ۲۰ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان یا لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں پہنچ جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ [illegible] خریداری نمبر ضرور لکھیں [illegible]

ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو، [illegible] روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا
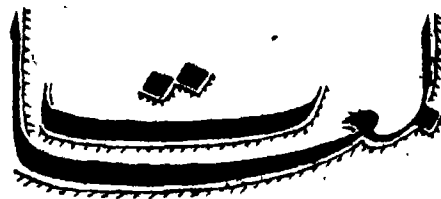
ایک بھانجی نے خط لکھا ہے، جس کا ضروری اقتباس لمعات میں دے رہا ہوں۔

—— لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں عورت بے حیائی پھیلا رہی ہے، وہی فحاشی کی بھی ذمہ دار ہے۔ قبل اس کے کہ میں آپکی رائے معلوم کرنا چاہوں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے لڑکیوں کو بوائز کالجوں کے سامنے منڈلاتے نہیں دیکھا، جبکہ لڑکوں کا یہ دلچسپ ترین مشغلہ ہے کہ گرلس کالجز کے سامنے چکر کاٹتے رہیں۔ لڑکیوں کو میں نے کبھی لڑکوں پر آوازے کرتے یا چھیڑتے نہیں دیکھا، جبکہ لڑکوں اور مردوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں، ہر جگہ نازیبا باتیں اور حرکتیں کیا کرتے ہیں۔ میں نے کسی لڑکی یا عورت کو بازاروں میں اس طرح نہیں دیکھا کہ وہ لڑکوں یا مردوں کو گنیاں مارتی ہوئی چل رہی ہو۔ میں نے لڑکیوں اور عورتوں کو کسی اجتماع یا بازار میں اس طرح نہیں دیکھا کہ وہ مردوں کو اپنی آنکھوں کو کیمرے کے لنس بنا کر گھوریں ایسی بھی لڑکیاں اور عورتیں نہیں دیکھیں جو کار روک کر مردوں کو دعوت لفٹ دیں، لیکن کار والے مردوں کو ایسا کرتے اکثر دیکھا ہے۔ میں نے ایسی کوئی لڑکی یا عورت نہیں دیکھی جو کسی دکان میں کسی حسین مرد کو دیکھکر گھس جائے اور خواہ مخواہ سیل مین کو پریشان کرنے لگے۔ میں ایک آفس میں کام کرتی ہوں۔ اب تو وہاں کے اکثر مردوں سے میری بات چیت ہوتی ہے، لیکن جب میں وہاں نئی نئی گئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ سارے ہی مرد کام کرنے والوں کی نگاہیں مجھ ہی پر جمی رہتی تھیں اور ہر ایک اسی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ کسی طرح میں اس کی احسان مند بن جاؤں۔ آپ یقین مانیں کہ میں نے کسی کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور جو رسمی تعلقات اس طویل مدت میں ہوئے وہ بھی ضرورتاً ہوئے، اس لئے کہ کسی بھی آفس میں ایسا نہیں ہوتا کہ کام کے سلسلے میں دوسروں سے بات نہ کی جائے۔ یہ تو ٹیم ورک ہوتا ہے۔ مجھے کس کس طرح سے ہوٹلوں میں لنچ وڈنر دینے کی کوششیں کی گئیں، کس کس طرح سینما دیکھنے پر راغب کیا گیا، لیکن میں نے کبھی کسی کی بھی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ میرے اس طرز عمل سے مجھے کافی دشواریاں ہوئیں۔ خواہ مخواہ جوابدہ ہونا پڑا۔ لیکن میری روش میں فرق نہیں آیا، میں نے ملازمت سے بہت زیادہ اپنے کردار کو اہمیت دی۔ ہاں کچھ عرصہ بعد میری راہ و رسم تین خواتین سے ضرور ہوئیں۔ ان میں ایک سندھی تھی دوسری پنجابی اور تیسری بنگالن۔ ہم ساتھ ہی لنچ لیتے تھے اور کبھی کبھی کسی ریسٹوران میں بھی چلے جاتے تھے ——

بارہ سال زندگی کی داستان بہت طویل ہے۔ لکھوں تو ایک طویل افسانہ نا تشنہ رہ جائے مگر اسمیں محبت کی رنگ آمیزی نہ ہوتی اس لئے مقبول بھی نہ ہوتا۔ میں نہ تو کسی کے چکر میں مبتلا ہوئی، نہ ہی کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، ورنہ اس داستان میں کافی رومانس بھی شامل ہو جاتا۔ ——

اس خط کی لکھنے والی ک۔ ج ہیں۔ مقام کا ذکر نہیں ——البتہ اتنا ضرور لکھا ہے کہ وہ حریم برابر پڑھتی ہیں۔ انھوں نے ماموں جان القاب لکھا ہے خط میں، اس لئے یقین ہے کہ وہ کسی قدیم حریمی بہن صاحبزادی ہیں۔ انھوں نے جواب مانگا ہے کہ میری نظر میں بھی فحاشی کی ذمہ دار لڑکیاں اور خواتین ہی ہیں ——

بھانجی کا درجہ بیٹی ہی جیسا ہوتا ہے، خط پڑھ کر میرے دل میں ک۔ ج صاحبہ کی ایسی محبت پیدا ہوئی، جیسی بیٹی کے ساتھ ہوتی ہے تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بھانجی صاحبہ نہ صرف کافی پڑھی لکھی

سانپ سب سے زیادہ زہریلا جانور ہے، لیکن وہ عموماً کسی کو اس وقت کاٹتا ہے جب اسے اپنے لئے خطرے کا احساس ہو یا کسی کے قدموں تلے دب جائے، لیکن انسان اشرف المخلوقات ہونے پر بھی کبھی کبھی سانپ سے زیادہ خطرناک بن کر بے قصور انسانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

—— نسیم انہونوی

بیٹے ہی اصلی کردار کی مالک بھی ہیں۔ ان کی تحریر سے میں بہت متاثر ہوا اور میرے دل میں یہ خیال کبھی نہیں پیدا ہوا کہ انھوں نے اپنی پارسائی کی جو حکایت لکھی ہے، وہ درست نہ ہوگی۔ میں پچاسوں بار لکھ چکا ہوں بے پردہ، آزاد اور ملازمت کرنے والی ساری ہی لڑکیوں یا خواتین کے قدموں کو لغزش نہیں ہوتی۔ ان میں صاحب کردار بھی ہوتی ہیں اور جیسا کہ سجا بجی صاحبہ نے لکھا ہے۔ انھیں لبھانے اور پھنسانے کے لئے جانے کیسے کیسے جال پھینکے جاتے ہیں۔ جو شکاری دانہ ڈال کر بیٹھتا ہے تو چڑیاں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ وہ جال کھینچتا ہے تو ساری ہی چڑیاں جال میں پھنس نہیں جاتیں۔ اسی طرح بے پردہ۔ آزاد، فیشن پرست اور ملازم لڑکیوں اور خواتین کو اکثر اس طرح پھانس لیا جاتا ہے کہ اس کا پہلے سے انھیں تصور بھی نہیں ہوتا۔ "جوانی دیوانی" مشہور ہے، اس لئے اگر جوانی کو لبھانے اور پھنسانے کا ارتکاب کیا جائے تو بالکل ممکن ہے کہ کچھ فیصدی پھنس جائیں۔ اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ بہر حال میں سجا بجی صاحبہ کے ان تمام الزامات کو سو فی صدی سچ سمجھتا ہوں، جو انھوں نے مردوں پر عائد کئے ہیں۔ واقعی ان کی خوکاسی بہت ہی عمدہ ہے اور انھوں نے جو نقشہ پیش کئے ہیں انھیں اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں، میں خود بھی دیکھ چکا ہوں، اس لئے ان کے سوال کا جواب یہی ہے کہ موجودہ فحاشی کی ذمہ داری سراسر مردوں پر ہی آتی ہے۔

آخر میں اتنا ضرور لکھوں گا کہ میں نے کبھی انھیں لمعات میں لکھا تھا کہ مردوں کی جنس خونخوار جانوروں سے مشابہ ہے۔ شاید ازل سے ہی وہ جنسی آسودگی کے لئے عورتوں کا شکار کرتی رہی تھی، کرتی رہتی ہے اور کرتی رہے گی۔

اسلام نے اسی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہی زنا کے ارتکاب کی ایسی عبرتناک سزا رکھی تھی کہ سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خلافت راشدہ تک اس قانون کا سختی سے نفاذ ہوتا رہا۔ حالانکہ اس وقت خواتین آج کی طرح نہ فیشن کرتی تھیں، نہ نیم عریانی والے لباس پہنتی تھیں اور نہ میک اپ اور خوشبویات سے قیامت بن کر آزادانہ باہر نکلتی تھیں۔ لیکن اختلاط مرد و زن کے امکان کے پیش نظر ہی ایسا سخت قانون بنایا گیا تھا کہ انھیں سنگسار کر دیا جائے۔

سب سے آخر میں یہ لکھوں گا کہ جنگل میں پھرنے والی ہرنیاں اور دوسرے جانور جن کا شکار شیر کرتے ہیں، لاکھ چاہنے پر بھی اگر ان کی زد میں آجاتی ہیں تو بچنا محال ہو جاتا ہے۔ میں خود بھی مرد ہوں، لیکن میں مردوں کو عورتوں کے سلسلہ میں انھیں شیروں، چیتوں اور دوسرے خونخوار جانوروں ہی کی طرح سمجھتا ہوں۔ مستثنیات بہر حال سب میں ہوتے ہیں۔

ایک عظیم المناک حادثہ

ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات سے ہر شخص کو اس المناک حادثے کی اطلاع مل چکی ہے جو انڈین ایرلائن کے بوئنگ کے سمندر میں ڈوب جانے سے ہوا جس میں ۳۲۵، انسانی جانیں اچانک فنا ہو گئیں۔

ایسے نہ سہی لیکن اس سے ملتے جلتے حادثات کی خبریں روزانہ ہی ہم تک پہنچتی رہتی ہیں یہ سب سائنس کے طفیل ہوتی ہیں۔ سائنس نے جہاں زندگی میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں اس طرح کے خطرات کو بھی جنم دیا ہے۔ کیسے اچھے تھے وہ دن جب انسان ان ترقیوں سے واقف نہ تھا اور جب سفر گھوڑوں اونٹوں، بیل گاڑیوں اور فنیسوں میں کئے جاتے تھے۔

کیا حال ہوگا ان ۳۲۵ ہلاکین کا جو اپنے اعزہ کی آمد کے منتظر تھے اور ان کا خیر مقدم کرنے والے تھے۔ کیسا کہرام مچا ہوگا ان گھرانوں میں جن کے آنے والے اس طرح بچھڑ گئے ہیں کہ کبھی نہ مل سکیں گے۔ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ سے دعا کی جائے کہ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

عید کے سلسلے میں رعایتی اعلان

نسیم بکڈپو کی جانب سے حریم جون میں جو رعایتی اعلان کتابوں کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ وہ ۱۵ رجون سے ۳۱ رجولائی تک رہے گا اس کے بعد آنے والے آرڈروں پر کوئی رعایت نہ ہوگی بہنیں نوٹ فرمالیں۔ آرڈر کے ساتھ نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ اعلان صرف حریم کی خریدار بہنوں ہی کے لئے ہے۔

- جواب چاہتی ہوں کسی بات کا تو جوابی کارڈ روانہ کریں
- مہینہ گزرنے کے بعد شکایت آنے پر حریم قیمتاً مل سکے گا

خاتونِ جنت

حضرت فاطمۃ الزہراؓ

عابدہ نرجس

ایک 'ماں' کی پہچان اس کی اولاد ہوتی ہے۔ ان کے افکار و کردار اس آغوش کا تعارف بن جاتے ہیں۔ جس میں پرورش پاکر انھوں نے افکار کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی حاصل کی ہے۔ اسلئے شیرِ مادر کی تاثیر ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں چند ایسے جگمگاتے ہوئے نام بھی نظر آتے ہیں۔ جن کے کارہائے نمایاں ان اوصاف تربیت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ جو انہیں آغوشِ مادر سے ودیعت ہوئے تھے۔

حسنؓ حسینؓ اور زینبؓ یہ تینوں نام کردار کی تمام تر عظمتوں کے ساتھ اس 'ماں' کا تعارف بن جاتے ہیں۔ جس نے صرف بیٹوں کو ہی نہیں بیٹیوں کو بھی یہ سبق دیا تھا کہ جب خاندان کے مرد فرض پر قربان ہو جائیں تو ان کے مقصد کی حفاظت کی ذمہ داری خواتین پر آجاتی ہے اور خواتین کو اپنے نسوانی وقار کو سربلند رکھتے ہوئے کس طرح اس مقصد کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو جانا چاہیئے۔

سید الشہداء امام حسینؓ جب میدان جنگ میں دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے تو اپنے رجز میں انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ کا تذکرہ خاص طور پر فخر و مباہات سے کیا۔ کہ میں ہوں فاطمہؓ کا بیٹا حسینؓ۔ میں نے بنت رسول اللہ کا دودھ پیا ہے۔ گویا فاطمۃ الزہراؓ ایک ایسی خاتون تھیں۔ جن کے ساتھ نسبت حسینؓ عالی مقام کے لئے باعث فخر تھی۔

زینبؓ نے دربار یزید میں جس شان اور وقار کے ساتھ خطبات دیئے اور جس جرأت کے ساتھ مردوں کی غیر موجودگی میں اپنے قافلے کی قیادت اور اپنے موقف کی ترجمانی کی وہ ظاہر کرتی ہے کہ خطیبہ نے اپنی پردہ نشین بیٹی کی تربیت بھی اس طرح کی تھی کہ وقت پڑنے پر اس کے دلائل اور خطابات نے یزید جیسے حاکم کا منہ بھی بند کر دیا تھا۔

علامہ اقبال نے اپنی مشہور فارسی نظم میں جناب سیدہؓ کی انہی خصوصیات کا ذکر کیا ہے کہ جناب فاطمہؓ حسینؓ جیسے فرزند کی ماں، علیؓ مرتضیٰ کی شریک حیات اور رسول کائنات کی صاحبزادی ہیں۔

جناب خاتونِ جنت وہ واحد خاتون ہیں۔ جن کی کنیت اپنے عظیم المرتبت والد ماجد کا حوالہ ہے۔ انہیں ام ابیہا کی کنیت سے بھی پکارا جاتا ہے جس کا مطلب ہے۔ اپنے باپ کی ماں، لیکن مراد اس سے یہ کہ ایسی خاتون جو اپنے باپ کے نام کو زندہ جاوید رکھنے والی ہے۔ کیونکہ جناب رسالتمآبؐ نے حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادوں کو اپنی اولاد قرار دیا تھا۔

سبھی مورخین نے جناب عائشہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جناب فاطمۃ الزہراؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں تو وہ اٹھ کر تعظیم دیتے تھے۔ اپنی عبا بچھا کر بٹھاتے تھے اور اکثر فرماتے تھے میری بیٹی فاطمہؓ میرا ٹکڑا ہے۔ اس کی خوشنودی میری خوشنودی ہے۔

یہ عورت کی عظمت کی انتہا ہے کہ انبیا کا سردار بھی اسے اٹھ کر تعظیم دیتا ہے۔ مگر اس کے لئے فاطمہؓ جیسی عظمت کردار کی ضرورت ہے انھوں نے رسول اللہ صلعم کی آغوش مبارک میں تربیت پائی تھی اور فخر کائنات کی محبت اور شفقت سے جو کچھ سیکھا وہ اپنے بیٹوں میں اسطرح منتقل کر دیا کہ وہ بجا طور پر رسول اللہ صلعم کے بیٹے کہلانے گئے۔

جناب سیدہ کا ایک قول ہے کہ عورت کا میدان جہاد اس کا گھر ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ایک جہاد سمجھ کر ہی گزاری۔ مرد تو جہاد میں ایک ہی دن جاتا ہے۔ جب میدان جنگ سے مبارز طلبی ہوتی ہے۔ لیکن عورت ہر دم اس کے اندر جذبہ جہاد کو پرورش کرتی اور تقویت دیتی ہے۔ جب اس کا فرض اسے صدا دیتا ہے تو مسکراتے ہوئے خود اسے ہتھیار سجا کر رخصت کرتی ہے۔

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے شوہر علیؓ مرتضیٰ ایک ایسے مجاہد تھے۔ جو میدان جنگ میں بڑھ چڑھ کر حملہ کرنے والے اور دشمن کی صفوں میں دور تک جاکر لڑنے والے تھے۔ لیکن جب گھر لوٹتے تھے تو ان کے دونوں ہاتھ خالی ہوتے تھے۔ مال غنیمت سے ملنے والا حصہ ان کی داد و دہش کے سبب سے گھر تک کبھی نہیں پہونچ پاتا تھا۔

جناب سیدہؓ کی شادی ہجرت کے دوسرے برس مدینے میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد بدر، احد خندق اور خیبر جیسے مشہور غزوات لڑے گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد تمام مجاہدین مال غنیمت سے لدے پھندے گھروں کو لوٹے تھے لیکن علی مرتضیٰ کے ہاتھ اس فتح پر بھی خالی تھے۔ حالانکہ فاتح خیبر ہونے کی حیثیت میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا انھیں خالی ہاتھ دیکھ کر سیدہ کا چہرہ

پر بل نہیں آیا۔ نہ ہی انہوں نے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا انہوں نے فخر سے علیؓ کی تلوار صاف کر کے دکھی۔ جسے ذوالفقار کا لقب عطا ہوا تھا اور خود سجدہ شکر میں جھک گئیں۔

خود جناب فاطمہؓ بھی جہاد میں وہ تمام کام کرتی تھیں۔ جو باعزت گھرانوں کی خواتین کے شایانِ شان ہیں۔ جو باپردہ رہ کر کرنے ممکن ہیں۔ ان کا عملی جہاد میں شریک ہونا روایات سے ثابت نہیں۔ البتہ جنگ اُحد میں فاطمہؓ کا تذکرہ خاص طور پر ملتا ہے۔ جب فتح شکست میں بدل گئی اور رسول اکرمؐ کی شہادت کی جھوٹی خبر پھیل گئی تو جنابِ فاطمہؓ بے تابانہ دوڑتی ہوئی میدانِ جنگ میں چلی آئی تھیں اور رسول خدا کو اپنے شوہر علی مرتضیٰ کے ساتھ تلاش کر کے ان کی مرہم پٹی کی تھی۔

یہ بیتابی اور تڑپ ویسی ہی تھی۔ جس کا ظہور فاطمہؓ کی ذات والاصفات سے بچپن ہی سے ہوتا رہا تھا۔ تبلیغِ رسالت کے ابتدائی ایام میں جب مکہ کے سب کفار کے انتقامی رویے کا ہدف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ تو فاطمہؓ اس کڑے وقت میں نبی اکرمؐ کی ڈھارس اور سہارا تھیں۔ حضور سرورِ کائنات پتھر دل کے ظلم کھا کر نڈھال ہو جاتے تو فاطمہ ان زخموں پر مرہم رکھتی تھیں اور جب حالت سجدہ میں گندگی سے ان کے کپڑوں کو ناپاک کر دیا جاتا تو جناب فاطمہؓ آنکھوں میں آنسو لئے صفائی میں مصروف ہو جاتیں۔ لیکن انہوں نے باپ کی محبت سے مجبور ہو کر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ تبلیغ رسالتؐ سے ہاتھ روک لیں اور خود کو آلام و مصائب کے حوالے نہ کریں۔

فاطمہ مکمل طور پر ایک گھریلو خاتون تھیں وہ صبر و رضا کا پیکر، اخلاق و تواضع کا مکمل نمونہ اور محبت کا سرچشمہ تھیں وہ اپنی گھریلو ملازمہ سے بھی بہنوں کا سا سلوک کرتی تھیں ان کی کنیز جو فضہ کے نام سے معروف ہے۔ ایک روز گھر کا کام کرتی تھی اور دوسرے روز جناب سیدہ خود تمام گھریلو امور انجام دیتی تھیں۔ بچے فضہ کو ماں کہہ کر پکارتے تھے اور ماں کی طرح ہی ان کی عزت کرتے تھے۔

انہوں نے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن کو بڑی خوبصورتی سے برقرار رکھا تھا۔ وہ انسانوں کے لئے محبت ہی محبت تھیں اور عبادت خداوندی میں ہمہ وقت عاجزی اور انکساری فرماتی تھیں۔ جناب علی مرتضیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ہر ایک سے محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ کبھی عزیز رشتہ داروں کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ وہ ہمسایوں سے بہترین سلوک کرتیں اور ان کے دکھ درد میں ہمہ وقت شریک رہتی تھیں۔ خواتین ان سے صلاح مشورہ لیا کرتی تھیں اور وہ ان کی ضروریات خاموشی سے پوری کر دیا کرتی تھیں۔

جناب علیؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک روز فاطمہؓ کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن وہ رات بھر عبادت میں مصروف رہیں اور نوافل پڑھتی رہیں جیسے ہی صبح ہوئی انہوں نے معمول کے کام انجام دینے شروع کر دیئے جس پر میں نے کہا کہ بنت رسول اللہ آپ رات بھر کی عبادت سے تھک گئی ہوں گی کچھ دیر آرام کر لیا ہوتا تو فاطمہؓ نے فرمایا کہ عبادت اللہ کی خوشنودی کے لئے اور گھریلو کام آپکی خوشنودی اور آسائش کی خاطر کرنا میرا فرض ہے۔

جناب فاطمہ نے ایک ایسی زندگی گذاری جس میں ان کی ذات سب کے لئے فیض کا ذریعہ تھی اور کسی فرض سے کبھی پہلو تہی نہیں برتی جاتی تھی۔ جہاں انہوں نے اپنے قرابت داروں کے لئے اپنی تمام تر محبت اور صلاحیت وقف کر دی تھی۔ وہیں انسانیت کے لئے بھی ان کا در دمند دل کشادہ اور مہربان تھا اکثر ایسا ہوا کہ حضور اکرم نے کسی نومسلم کو آپ کو دروازے پر امداد کے لئے بھیجا۔ آپ کے پاس اسے دینے کے لئے کچھ نہ ہوا تو آپ نے اپنی چادر ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اس کی حاجت کو پورا کیا۔ یا کبھی کھانے یا افطار کے وقت کسی سائل نے دروازے پر صدا دی تو آپ نے ایک لقمہ لئے بغیر اپنے سامنے سے کھانا اٹھوا کر اسے بھجوا دیا اور خود پانی سے روزہ افطار کر لینے پر اکتفا کیا۔

جناب سیدہ ۲۰ جمادی الثانی بعثت کے پانچویں سال پیدا ہوئیں اور ۳ جمادی الآخر ۱۱ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

ٹوٹی کہاں کمند

(لئیق اختر۔ فیض آبادی)

انوآپی کے آنے سے کتنی بہاریں، کتنی چہل پہل اور کتنی رونقیں گھر میں سمٹ آئی تھیں۔ شوہران کے کناڈا میں تھے اور انوآپی کے دونوں بچے انوآپی کے ساتھ رہتے تھے وہ تیس کے پیٹے میں تھیں بالوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں دو چار کوندے لپک رہے تھے۔ وہ ان کا مسکراتا ہوا سرخ و سفید چہرہ۔ وہ ان کے لبوں پر ہمہ وقتی نیم تبسم کی جمی ہوئی پتّی۔ موتی جیسے دانت اور کھوئی کھوئی غزال صفت آنکھیں۔ جامہ زیب اس غضب کی تھیں کہ اگر وہ ٹاٹ بھی پہن لیتیں تو دیکھنے والوں کی آنکھیں صدقے ہونے لگتیں۔

وہ گرمیوں کی ایک حسین رات تھی۔ دن میں پانی نے برس کر جھلسی زمین کے سینے میں امرت گھول دیا تھا۔ ہمارے گھر کے کشادہ آنگن میں چودھویں کی چاندنی چھٹکی پڑی تھی اور گھر کے سب بچے انوآپی کے ارد گرد پرا جمائے بیٹھے تھے — وہ کہانی سنا رہی تھیں ایک شہزادے اور سات پریوں کی۔ جیسے ہی کہانی ختم ہوئی، بچوں نے شور مچایا۔

"ایک اور — اللہ ایک اور۔"

انھوں نے جواب دیا۔ "بھئی اب کچھ کل کے لئے اٹھا رکھو۔"

پھر شور اٹھا — "جی نہیں۔ آج۔ آج۔ آج —"

میں نے کہا۔ "انوآپی ان معصوم دلوں کو نہ توڑیے۔ سنا دیجئے نا۔ چلئے اسی بات پر میں کل آپ کو حاجی کی برفی کھلاؤں گا۔"

میں نے بیساختہ محسوس کیا۔ جیسے ان کے بدن کو بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو ان کے چاند ایسے چہرے پر آندھی کا غبار سا چھا گیا۔ کھوئی کھوئی آنکھوں میں گرد اڑنے لگی اور نیم تبسم آشنا لبوں کی دہلیز پر جیسے کسی نے کفن میں لپٹی ہوئی میت رکھ دی۔

پھر میں نے دیکھا۔ جیسے کوئی پھسل کر سنبھلتا ہے۔ انوآپی کے لبوں کے افق پر نیم تبسم کا ڈوبا ہوا چاند ابھر رہا تھا۔ وہ سنبھل چکی تھیں — ایک دوسری کہانی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن بے ترتیب کہانی — نہ جملوں میں ربط نہ لفظوں میں تسلسل۔ وہ کہانی یوں سنا رہی تھیں جیسے کوئی غنودگی میں چل رہا ہو۔

دوسرے دن صبح جب میں ان کے کمرے میں گیا تو دیکھا — وہ اپنے صاف و شفاف بستر پر لیٹی تھیں اور نرم و گداز تکیہ اپنے منھ پر رکھے تھیں — میں نے آواز دی — "انوآپی"

تکیہ ہٹا — لبوں پر ٹوٹا پھوٹا تبسم، آنکھوں کے دامن میں آنسوؤں کا خزانہ۔

"یہ کیا؟ آپ رو رہی ہیں؟"

"نہیں تو —"

"پھر یہ آنسو کیسے؟"

"گرمی سے پریشان تھیں میں نے کہا لاؤ انھیں نہلا دوں۔"

"انوآپی! بی اے کا طالب علم ہوں۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسیں اور پھر اپنا بستر انھوں نے چھوڑ دیا۔

شام کو جب میں گھوم پھر کر گھر آیا تو حاجی کے یہاں کی برفی بھی ساتھ لایا۔ برفی کا پیکٹ جب ان کو دیا تو انھوں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایفائے عہد۔"

انوآپی نے پیکٹ کھولا — دیکھا — اور پھر ان کے ہاتھوں سے پیکٹ چھوٹا۔ زمین پر برفی کی ڈلیاں بکھر گئیں۔

انوآپی کے لب کانپ رہے تھے۔ جسم تھر تھرا رہا تھا۔ آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب اور چاروں طرف موت کا سناٹا — میں نے پریشان ہو کر آواز دی — "انوآپی۔"

شاید اس وقت ان کی قوت سماعت جواب دے گئی تھی۔ میں چیخ پڑا

"میری انوآپی؟"

وہ چونک پڑیں — "ہم سے کچھ کہا۔"

"یہ آخر آپ کو کیا ہو گیا؟"

انھوں نے اپنے سر کو جھٹکا — "کچھ نہیں اچھے میاں! کچھ نہیں، کچھ نہیں"

میں نے ان کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

"نہیں نہیں میری پیاری انوآپی۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"باتیں بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تڑپ گئیں۔ میرے چہرے کو اپنے

ہنڈولا پھرے میرے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر اپنے دوپٹے کے آنچل سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں "تم تو بڑے بودے نکلے۔"

میں نے کہا "میرے آنسو اس وقت تک نہ رکیں گے جب تک آپ بتا نہ دیں گی۔"

"میرے بیرن اچھے۔ مجھے مہلت دو۔ مجھے سنبھلنے دو۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے آواز دی میں جب ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بہت کچھ سنبھل چکی تھیں۔ اور باغیچے کی طرف کھلنے والے دریچے کے قریب کھڑی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ اچھے میاں۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا ——— وہ دریچے سے ہٹ کر میرے قریب آئیں اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"تم نے اپنے انور ماموں کو دیکھا تھا؟"

"جی نہیں۔ نام سنا ہے۔"

"تو سنو اچھے میاں! ایسی ہی ایک گرمی کی ایک شام تھی ——— آنگن میں چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ سب کے بستر قرینے سے لگا دیئے گئے تھے اتنے میں انور حسب دستور سیدھے گھر آئے۔ اور دادی جان کے تخت پہ بیٹھ گئے۔ سفید ململ کا کرتا، سفید پائجامہ، ماتھے پر بکھرے ہوئے بال۔ باتیں ہونے لگیں۔ لطیفے، قہقہے ——— دوسرے تخت پر دو بچے کیرم کھیل رہے تھے۔

انور نے مجھ سے کہا ——— "اٹھو ہو جائے ایک ایک سٹ۔"

کیرم شروع ہوا۔ انور دونوں سٹ ہار گئے۔ بچوں نے ہپ ہپ ہُرّے کے نعرے لگائے ——— وہ مسکرا کر مجھ سے کہنے لگے۔ "آؤ ایک سٹ اور، لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

"کون سی شرط ———"

"جو جیتے وہ برفی کھائے ——— حاجی کی برفی ———"

"چلئے منظور۔"

میں سٹ ہار گئی ——— "برفی کھلواؤ۔"

"کل۔"

دوسرے دن وہ نہیں آئے ——— تیسرے دن آئے ——— اور آتے ہی کہنے لگے۔

"بی ہارنی۔ ! ہماری برفی؟"

"منگانا بھول گئی۔ کل ضرور ———"

ہنستے بولے ——— کچھ دیر سب سے چھیڑ چھاڑ کی ——— اور چلے گئے۔

دوسرے دن آئے ———

"اجی انو صاحبہ! ہماری ہیکٹی، نازک بدن۔ کل نام بنی آئی؟"

"اللہ آج آپ اور غم کھا لیجئے۔ کل برفی ضرور کھلاؤں گی۔"

کہنے لگے۔ "ایم اے کرنے کے بعد کیا کرو گی؟"

"بی ایڈ ———"

"میری ایک رائے مانو گی ———"

"ضرور ———"

"تم کنجوسیت پر ریسرچ کر ڈالو ———"

"اللہ قسم کل ضرور کھلاؤں گی۔"

"اجی۔ تم کھلا چکیں اور ہم کھا چکے۔"

ہنستے رہے اور گھر بھر کو ہنساتے رہے ———

دوسرے دن میں نے برفی منگوائی۔ چاندی کے ورق سے بڑی سجی ہوئی تھی۔

"شام آئی وہ نہیں آئے ——— رات آئی وہ نہیں آئے ——— میں انتظار کرتی رہی۔ دوسرے دن صبح ——— ۸ بجے ——— جانتے ہو اچھے کیا ہوا۔ ؟ ——— کیا ہوا اچھے جانتے ہو؟ انور بھائی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

خود غرض

رضیہ بٹ

بیکار بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی۔ جب سے شادی ہوئی تھی وہ یوں ہی بیٹھی رہتی تھی۔ بس صبح صبح اٹھ کر زرق برق کپڑے پہنے۔ میک اپ کیا زیور لادا اور سجی سجائی مسہری پر آ بیٹھی۔ کبھی کوئی دلہن دیکھنے آ رہا ہے کبھی نندیں لاڈ پیار کر رہی ہیں۔ کبھی ساس بلائیں لے رہی۔ زید نے تو پوری چھٹیاں اس کے سنگ گزاری تھیں ایک لمحہ کو اسے ادھر اُدھر ہونے نہیں دیا تھا۔ شادی کے رنگین و حسین دن اس نے شوق کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے گزارے تھے۔ اب چھٹی ختم ہو گئی تھی بادل ناخواستہ وہ دفتر جاتا تھا۔ واپسی میں سیدھا اپنے کمرے میں گھس آتا۔ آٹھ نو گھنٹے جو وہ میرے بغیر گزارتا تھا۔ واپسی پر ایک ایک لمحہ کا حساب بیباق کرتا تھا۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش تھی سسرال میں اسے اتنا پیار اور اتنی اہمیت مل رہی تھی۔ اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ساس صدقے واری جاتی کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

"اسے ہے بیٹی عمر پڑی ہے کام کرنے کو یہی چار دن تو ہوتے ہیں چاؤ چونچلوں کے۔ بس بجی بنی بیٹھی رہا کرو کام کرنے کو اور لوگ تھوڑے ہیں۔"

نندیں بھی لاڈ پیار میں پیچھے نہ تھیں۔ "بس بھابی آپ نہا دھو کر تیار ہو جایا کریں اتنے پیارے پیارے کاموں والے کپڑے ہیں سارے پہنا کریں۔"

رابعہ اپنے آپ کو فضاؤں میں اڑتا محسوس کرتی۔ تین ماہ پہلے جب اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو وہ گم صم سی رہنے لگی تھی ماں باپ نے دیکھ بھال کر اس کا رشتہ یہاں طے کیا تھا۔ اتنا اچھا خاندان اور خوبرو نیک شریف لڑکا جس کی تنخواہ انتہائی معقول تھی۔ سب ہار وہ پھولے نہ سماتے تھے لیکن رابعہ کو قطعاً خوشی نہ ہوئی تھی الغرض وہ [illegible] تھی۔

یاسر جو اس کی چھوٹی خالہ کا شوخ و شریر سا دیور تھا جب تب چھوٹی خالہ کے ساتھ ان کے گھر آ جایا کرتا تھا۔

رابعہ کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہاں لڑکیوں کو بے جا آزادی حاصل نہ تھی۔ غیروں سے ملنے ملانے کا آزادانہ رویہ نہیں تھا۔ رشتے داروں میں بھی جوان لڑکے لڑکیاں بے محابا نہیں ملتے جلتے تھے۔ لیکن جوانی شوریدہ سری ہوتی ہے۔ بہاؤ میں زور ہوتا ہے راستے خود ہی بنتے جاتے ہیں۔ چھوٹی خالہ رابعہ کی امی کی لاڈلی تھیں۔ اور یاسر!

چھوٹی خالہ کا لاڈلا دیور۔ اس لئے اس گھر میں آنے جانے پر پابندی نہ تھی۔ بھولی بھالی امی نے شاید کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی ذات میں اتنی دلچسپی ظاہر کرنے والا یاسر دراصل رابعہ کی ذات میں دلچسپی لے رہا تھا رابعہ نے کبھی اس کے ساتھ کھل کر بات نہ کی تھی لیکن اشاروں کنایوں میں مفہوم سمجھے اور سمجھائے جا سکتے ہیں

نگاہیں بولتی ہیں۔ سنتی ہیں، سمجھتی ہیں۔ دونوں کی نگاہوں میں پیغام رسانی کے سلسلے تھے۔

"بھابی" وہ چھوٹی خالہ سے اکثر کہتا۔ لاابالی سی نظریں رابعہ پر ڈالتا اور مچل کر کہتا۔ "کچھ ہمارا بھی خیال کریں۔ ایسی لڑکی ہمارے لئے بھی تلاش کر لیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ رابعہ پر شوخ نگاہ ڈالتا۔ چھوٹی خالہ جھٹ سے پوچھتیں۔

"کیسی؟"

وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرائے جاتا اور پھر کہتا۔ "آپ جیسی۔"

چھوٹی خالہ خوش ہو جاتیں۔ لیکن آپ کہتے ہوئے وہ عجب انداز میں رابعہ کو تکتا۔ رابعہ کا چہرہ گلگوں ہو جاتا وہ شرما کر اٹھ جاتی۔

امی سے بھی وہ بے تکلف تھا اور امی بھی اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے شاید اسے ہی موزوں پاتیں اور چھوٹے موٹے کام جو امی بے تکلفی سے کہتیں وہ بڑی سعادت مندی سے کر دیتا۔

اس دن امی نے اسے دوبارہ درزی کے ہاں بھیجا۔ درزی کی دکان خاصی دور تھی وہ اپنے بڑے بھائی کا اسکوٹر لے آیا تھا امی نے یونہی کہہ دیا۔

"تکلیف دے رہی ہوں تمہیں بار بار درزی کے [illegible] ہوں برا تو نہیں لگے گا۔"

وہ امی کی بغل پر کھڑی تھی یاسر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور امی سے بولا ۔ "مدر کرتی ہیں۔ آپ کی خاطر تو میں آسمان سے تارے توڑ کر لانے کو تیار ہوں۔"

امی ہنس پڑیں اور وہ بھی مسکرا اٹھی۔

"بڑا باتونی ہے" امی نے اس کے گال پر پیار سے تھپڑ لگایا۔

"جیو بیٹے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"خوش تو آپ ہی مجھے رکھ سکتی ہیں" وہ رابعہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔ امی کچھ نہیں سمجھیں دعائیں دیئے گئیں۔

بات آنکھوں کی زبانی چل نکلی اور بڑھتی جا رہی تھی۔ رابعہ اس شوخ سے کھلنڈرے لڑکے کی ذات میں محو ہوتی جا رہی تھی اس کے آنے کا انتظار رابعہ کے لئے بڑا مسحور کن اور سرور کن تھا۔ جس دن وہ نہ آتا عجیب سی بے کلی رہتی۔

براہ راست اس نے کبھی یاسر سے بات نہ کی تھی نہ ہی یاسر نے کبھی حدود کو پھلانگنے کی کوشش کی تھی۔ ہاں ایک بار صرف ایک بار۔

جب چھوٹی خالہ کے بیٹے کی سالگرہ تھی اور وہ گلابی ریشمی کپڑوں ایسے پھیلے بدن پر خوبصورت لباس سجائے ہلکا سا میک اپ کئے کھانے کی میز پر چائے کے لوازمات سجا رہی تھی یاسر اسے دیکھنے کا دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

"تم ..... تم کتنی حسین ہو رابعہ ..." یاسر نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

رابعہ نے یہ الفاظ سن لئے تھے چہرہ سرخ ہو گیا تھا سارا بدن کانپ گیا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی کہ یاسر سامنے آ کر راستہ روکتے ہوئے بولا تھا۔ "رابعہ پلیز۔ تھوڑی دیر رک جاؤ۔"

"کیوں ؟" وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔ لیکن کہوں کہتے ہیں ناز و ادا کی جھلک بھی تھی۔

"دل چاہتا ہے" وہ بے اختیار کہہ اٹھا تھا۔

"کیا چاہتا ہے" وہ لجا کر بولی۔

"یہ چاہتا ہے تمہیں ..... تمہیں سینے میں چھپا لوں" وہ عالم بیخودی میں کہہ گیا۔

رابعہ کمرے سے نکل بھاگی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا سانس رکھ گیا تھا سارے بدن میں پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

کچھ پا لینے کا احساس ہمیشہ ہی جانفزا ہوتا ہے۔ رابعہ نے تو شاید بساط سے کچھ زیادہ ہی پا لیا تھا۔ بہک بہک جاتی تھی جھوم جھوم اٹھتی تھی لیکن یہ کیفیت کچھ زیادہ دن نہ رہی۔ اس کی تربیت جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے گھر کے جو اصول و ضوابط تھے۔ اس کے خاندان کی جو روایات تھیں ان میں ایسی سوچیں کہاں پنپ سکتی تھیں۔

اس کے بعد یاسر نے بھی تو کئی دن اس گھر کا رخ نہیں کیا تھا رابعہ کو سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا اس کی ذات کے اندر جو تربیت شدہ اپنا آپ تھا خوف اور ڈر کی کہر میں لپٹا ہوا تھا وہ اس خوف سے نہ نکل سکتی تھی نہ ہی اصول و ضوابط اور روایات کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا اس میں حوصلہ تھا۔

یاسر بھی تو ابھی پڑھ رہا تھا اس کے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں ابھی دو تین سال تھے۔ دل لگی کرنے کی عمر تو تھی لیکن اس دل لگی کو حقیقت آشنا کرنے میں شاید ابھی وقت تھا۔ پسند اور چیز ہے۔ پسند کو نبھانا اور ضروری تقاضوں کی کسوٹی پر پورا اتارنا اور چیز ہے۔

شاید یاسر نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔ اس لئے بات بڑھانے کے بجائے کٹ گیا تھا۔

رابعہ کے لئے رشتے آنے لگے تھے۔ یاسر جب بھی ان رشتوں کے بارے میں سنتا کچھ پریشان ہو جاتا لیکن اس نے کہا کبھی کچھ نہیں تھا۔

پھر رابعہ کا رشتہ زبید سے طے پا گیا۔ وہ کچھ دن بوکھلایا بوکھلایا پھرا چہرے پر اداسیاں مسلط رہیں۔ گم صم بھی ہوا لیکن احتجاج کیا نہ کچھ کہا

اس کے اس رویے ہی سے تو رابعہ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا مایوسی ضرور ہوئی۔ شادی کے نام سے چڑ بھی لگی۔ خوشی کا فقدان بھی تھا لیکن چپ چاپ والدین کی رضا پر سر جھکا دیا۔ دھوم دھام سے شادی اور ...

وہ زبید کی دلہن بن کر نئے گھر میں آ گئی۔

جہاں اس کا استقبال اتنے پیار سے اتنے وقار سے ہوا کہ الھڑپنے کی شوخیاں اور دلچسپیاں نادانیاں محسوس ہونے لگیں۔

زبید نے، ساس نے، نندوں نے اتنا پیار دیا اتنی اہمیت دی کہ فخر و انبساط سے اس کی ذات غبارے کی طرح پھول گئی۔

محبتوں کا بھرپور اظہار، چاہتوں کے مستحکم وعدے کتنی خوبصورتیاں سموئی تھیں ان میں۔

زبید کا بڑا ساتھ تھا اس کا گھر تھا [illegible]

سے شادی ہوگیا تھا۔ شب عروسی کا تحفہ ڈائمنڈ کی رنگ کی صورت میں دیا تھا لیکن مدہوش کن سرگوشی جو اس نے رابعہ کے کانوں میں کی تھی اس نے اسے سرشار کر دیا تھا۔

"رابعہ یہ تحفہ کچھ نہیں .... اصل تحفہ تو میری محبت ہے۔"

پھر اس نے بڑی پیاری پیاری بڑی سہانی باتیں کی تھیں میں جیسا بھی ہوں تمہارا ہوں۔ میں اپنی وفاؤں کا تمہیں یقین دلانا نہیں چاہتا کہ یہ وقت کا کام ہے۔ وقت ثابت کرے گا وقت دکھائے گا۔ پھر اس نے یہ بھی کہا تھا۔ ہمارے درمیان غیریت کی کوئی دیوار نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے آئینہ ہیں تم مجھ میں اپنا عکس دیکھو۔ میں تم میں دیکھوں گا کوئی پردہ کوئی غیریت، کوئی اجنبیت نہیں رہے گی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے اپنی کوئی بات کبھی نہیں چھپاؤں گا۔ تم سے بھی یہی توقع رکھوں گا کہ اب ہم دو نہیں ایک ہیں۔

دن گزرتے چلے گئے۔ خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور دن مہینے کی چھٹی زبید اور رابعہ نے گھوم پھر کر گزاری۔

چند دنوں کے لئے وہ مری بھی گئے جہاں کی پربہار فضاؤں میں دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ البیلے انداز میں آزاد پرندوں کی طرح گھومتے پھرتے رہے۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ محبت توانا ہوتی جا رہی تھی۔ زبید دفتر جاتا تو رابعہ کو سونے پن کا احساس ڈسنے لگتا۔ ایسے میں ساس اور نندیں اس کا دل بہلاتیں۔

وقت گزاری کے لئے رابعہ چاہتی کہ گھر کے کاموں میں ساس نندوں کا ہاتھ بٹائے لیکن وہ تو اسے نازک سے آبگینے کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھیں۔ اس کے اصرار کے باوجود کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

لیکن بے وقت لیٹنے کو جی نہ چاہا۔ رسالہ اٹھا لیا ایک آدھ کہانی پڑھی۔ پھر رسالہ بھی پھینک دیا۔ زبید کے آنے میں ابھی خاصا وقت تھا بیکار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا گئی تو الماری ٹھیک کرنے کا خیال آیا اس کے سب کپڑے بھی الٹ پلٹ پڑے تھے زبید کی شیلف بھی الٹی سیدھی چیزوں سے اٹے ہوئے تھے۔

اپنے جوڑے نکالے دوپٹے تہہ کئے۔ قمیصیں ہینگروں میں ڈالیں جوتے ترتیب سے رکھے۔ لپ اسٹک ہینڈ لوشن نیل پالش بے ترتیبی سے پڑی تھیں سب اٹھا کر میک اپ بکس میں ڈالیں۔

اپنا حصہ صاف کرنے کے بعد وہ زبید کے کپڑے ٹھیک کرنے لگی بنیانیں موزے سب الٹ پلٹ تھے۔ قمیص بھی کوئی تہہ شدہ تھی کوئی گولہ سا بنی پڑی تھی۔ ہینگروں میں سوٹ لٹک رہے تھے لیکن گھر کے پہننے کے شلوار قمیص بے ترتیب تھے انہیں تہہ کر کے شیلف میں رکھا بنیانیں موزے اور رومال بھی ٹھیک کر کے رکھے ٹائیاں الماری کے پٹ سے لگی ہینگر پر لٹکائیں شلوار قمیص بھی تہہ کر کے رکھے فالتو اور الم غلم چیزیں نکال کر ایک لفافے میں ڈالیں۔ اوپر والے شیلف میں بھی جانے کیا کچھ رکھا تھا۔ کچھ کتابیں، ڈائریاں اور کاغذات تھے رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول اٹھا لائی اس پر کھڑے ہو کر اس نے اوپر والا شیلف صاف کرنا شروع کیا۔

ڈائریاں دیکھ کر تجسس سے پڑھا اس کا خیال تھا کہ ان ڈائریوں میں زبید نے اپنی سرگزشت لکھی ہوگی۔ لیکن دونوں ڈائریاں دیکھیں اس میں ہر تنخواہ کا حساب کتاب تھا دوسری تقریباً خالی تھی۔ کسی صفحے پر کوئی فلمی گیت تھا۔ کسی پر کسی بڑے مفکر کا قول نقل تھا۔ ڈائریاں رکھ کر اس نے کتابیں سیٹ کیں کاغذات اکٹھے کئے، وہ ان کاغذات کو دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظر آخری کونے میں رکھے ایک چھوٹے پیکٹ نما بنڈل پر پڑی اس نے وہ پیکٹ ہاتھ بڑھا کر نکال لیا موٹی لفافے میں پڑے یہ نیلے اور گلابی رنگ کے لفافے تھے۔ غالباً یہ خطوط تھے بساری چیزیں چھوڑ چھاڑ وہ بنڈل لے بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ واقعی خطوط تھے

اس نے موٹی لفافہ کھولا شیشے کی دبی دبی مہک اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ مہک گو تازہ نہیں تھی پھر بھی مہک تھی۔ جو سیکنڈوں میں بھی اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ رابعہ کا دل جیسے تھم گیا آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی جیسے امڈ آئی۔ خطوط، مہک اور تحریر سبھی پکار پکار کر اپنا اظہار کر رہے تھے۔ اظہار جو رابعہ کو سوائے پریشانی کے اور کچھ نہ دے سکتا تھا۔

اس نے ایک لفافہ نکالا اسے کھولا اور کاغذ پر لکھی تحریر کو تیزی سے پڑھنے لگی۔ کسی آبگینہ جمال کا بے انتہا رومانی خط تھا۔

رابعہ کی ساری ہستی لرز گئی۔

محبتوں کے جو حصار اس نے اپنی ذات کے گرد تعمیر کر لئے تھے

پھر بھری مٹی بن کر بکھرنے لگے۔ سپنوں کی رنگت ماند پڑ گئی۔ قوس و قزح کے رنگ اڑ گئے۔ حسین و رنگین شب و روز یوں لگا جیسے سپاٹ اور بے رنگ ہو گئے ہیں۔ نوید اور انیسہ جمال! رابعہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا پھر اس نے کئی خط کھولے اور پڑھے۔ بڑے جذباتی خط تھے۔ بڑے رومانی قصے تھے اور بڑے حسین انداز میں لکھی گئی جذبوں کی کہانیاں تھیں۔

رابعہ کا دماغ گھومنے لگا۔

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اسے لگتا تھا اس گھر میں اس کی حیثیت محور کی سی ہے — محور۔ جس کے گرد سب گھومتے ہیں جس کے بغیر گھماؤ کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ گھر ڈیرے کے لئے جس کے ساتھ سب جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اتنا پیار، اتنی محبت اور اعتماد تھا اسے۔ سب کرچی کرچی ہو گیا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ نوید کسی اور کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ کسی اور کا دیوانہ تھا۔ کسی اور سے پیار کے مراسم تھے۔ کسی اور سے محبت کے وعدے تھے۔

ایک لفافے میں سے انیسہ جمال کی تصویر بھی نکلی۔ قبول صورت سی لڑکی تھی۔ نوید اس لڑکی پر مفتون تھا۔ حسد و رقابت کی آگ سے رابعہ کا سینہ جلنے لگا اس نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ دو ایک خط بھی مروڑ ڈالے لیکن ان خطوط کو پڑھ کر جو ذہنی کیفیت تھی اسے سکون نہ مل سکا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا اسے تو احساس بھی نہ ہوا۔ بیڈ پر نیلے گلابی پیڈوں پر لکھے خطوط بکھرائے وہ مجسم غم بنی بیٹھی تھی کہ نوید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ملائمت سے اسے پکارا۔

"رابی!" وہ ابھی ابھی دفتر سے آیا اور حسب معمول آتے ہی سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا اسے ترقی ملی تھی۔ یہ مژدہ جانفزا وہ سب سے پہلے رابعہ ہی کو سنانا چاہتا تھا۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی نگاہ ان خطوط پر پڑی تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔

چند لمحے اسے کچھ بھی نہیں سوجھا۔ بس بت بنا کھڑا رہا۔ اسے واقعہ کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔

رابعہ اپنے آپ میں اس طرح ڈوبی کہ اسے نوید کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ نوید کے لئے یہ بات بھی انتہائی پریشان کن تھی۔ وہ چند لمحہ کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور رابی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ اسے یہی توقع تھی کہ رابی شیرنی کی طرح بپھر جائے گی یہ انکشاف معمولی اہمیت کا حامل تو نہیں تھا نا۔

رابعہ پھوٹ پڑی۔ وہ چپ رہا۔ نادم تاسف، سر جھکائے کھڑا رہا — پھر رابعہ بے اختیارانہ رونے لگی تو وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اسے اپنے بازو کی لپیٹ میں لینا چاہا لیکن رابعہ غصے سے پرے ہٹ گئی۔ وہ نادم تاسف اور پریشان سا بیٹھا رابعہ کا غصہ سہتا رہا۔

"رابعہ" بڑی ہی دیر کے بعد وہ بولا۔ "تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں اس کے لئے شرمندہ ہوں۔"

رابعہ رونے لگی۔ نوید نے اسے زبردستی بازوؤں میں بھر لیا پیار کیا دلاسہ دیا۔ اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اپنی بھول پر پچھتاوا ظاہر کیا۔

رابعہ مضطرب و پریشان ہی رہی۔

شام وہ اسے زبردستی باہر گھمانے لے گیا پکچر دکھائی۔ ہوٹل میں کھانا کھلایا مگر رابعہ کی پژمردگی دور نہ ہوئی۔

رات جب وہ بیڈ پر سونے کے لئے لیٹا تو محبتوں کی ساری شدتوں سے اس نے رابعہ کو سینے میں سمو لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے رابعہ کہ یہ خط تم نے خود ہی پڑھ لئے۔ میں نے یہ تمہیں پڑھانے کے لئے ہی رکھے تھے۔ انیسہ سے میرا جذباتی واسطہ رہا ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ میں نے اس کے ساتھ عشق کی گھڑیاں بھی گزاری ہیں۔ محبت کے سہانے سپنے بھی اسے دکھائے تھے۔ شادی کے وعدے بھی کئے تھے لیکن۔ لیکن اب میرا اس سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں۔ وہ میری زندگی سے نکل چکی ہے۔"

رابعہ سسکیاں بھرنے لگی۔

نوید نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ "تم میری محبت ہو۔ میری زندگی ہو۔ میری روح — ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں رابعہ۔ میں پہلے دن ہی تم سے کہا تھا نا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے آئینہ بن جائیں گے۔ میں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا تھا نا۔"

رابعہ نے آنسو پونچھتے ہوئے شاکی انداز میں اسے دیکھا۔

وہ تڑپ گیا۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔ "میں نے خود ہی تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا رابی یہ خط اسی لئے سنبھال کر رکھے تھے کہ کسی موقع پر تمہارے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے تمہیں پڑھا دوں گا۔ میں نادم ہوں کہ میرے کسی قدم اٹھانے سے پہلے ہی تم نے یہ خط پڑھ لئے۔"

رابعہ نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ سسکیاں اس کے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔

"رابعہ میں پورے خلوص اور سنجیدگی سے یہ سب کچھ تمہیں بتانے والا تھا

میں یہ حقیقت تلخ بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں کسی سے اس واقعہ کا پتہ چلے۔ کوئی تمہیں انیسہ اور میرے متعلق بتائے۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ "پھر۔ پھر اب تک مجھے بتایا کیوں نہیں تھا؟"

"اس لئے۔ اس لئے کہ جرأت نہ پڑتی تھی۔" وہ چند لمحے رکا۔ "تم کو جب سے پایا ہے زندگی اتنی حسین اور ایسی مسرت آشنا ہو گئی ہے کہ حوصلہ ہی نہ پڑتا تھا ان خوبصورت لمحوں کو داغدار کرنے کا۔"

رابعہ نے روتی آنکھوں سے پھر اسے گھورا

"یقین مانو رابی۔" وہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "میں اپنی خوبصورت زندگی کو۔ جو تم نے مجھے دی ہے کسی الجھاؤ سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا سوچا تھا کچھ وقت اور گزر جائے پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

نوید نے ایک ایک بات رابعہ کو بتا دی۔

رابعہ سب کچھ سنتی رہی۔ دل کو پوری طرح قابو میں رکھ کر سنتی رہی

نوید نے سب کچھ کہہ کر جیسے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ اس نے رابعہ کو ٹوٹ کر پیار کیا اپنے خلوص و محبت کا احساس دلایا۔

"شادی سے پہلے ایسی غلطیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں رابعہ۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ کھلے دل سے مجھے معاف کر دو کہ میں نے اپنے آپ کو آئینے کی طرح تمہارے سامنے رکھ دیا۔"

جذباتی ریلے گزر گئے۔ نوید نے رابعہ کو ہر ممکن طریق سے منایا۔ خلوص سے چاہا، پیار کیا۔ بندہ بے دام بن گیا۔ چاہتوں اور محبتوں کے دائرے اور پھیل گئے۔ رابعہ سنبھل گئی۔ نوید کی سچائی اور حق گوئی نے اسے بے حد متاثر کیا۔

وہ سوچتی۔ اتنا صاف گو اور ایسا نیک نیت انسان اس کی زندگی کا شریک ہے یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ نوید نے سچ سچ اپنا آپ آئینے کی طرح اس کے سامنے رکھ دیا ہے..... لیکن..... وہ سوچوں میں ڈوب جاتی کھوئی کھوئی رہتی۔ کوئی الجھاؤ اسے پریشان کرتا رہتا۔ نوید نے انیسہ کے متعلق اسے ہر بات بتا دی تھی۔ تو کیا محبت و شرافت کا تقاضا نہیں تھا کہ وہ بھی یاسر کے متعلق نوید کو سب کچھ بتا دے۔

یاسر سے اس کے تعلقات بے شک ایسے نہیں تھے جتنے نوید کے انیسہ کے ساتھ تھے وہ کبھی یاسر کے ساتھ کہیں گئی آئی نہیں تھی کوئی نامہ و پیغام نہیں لئے دیئے تھے۔ اس نے تو کبھی کھل کر اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔۔۔ پھر بھی دونوں میں دلچسپیوں کے بندھن پیدا ہو گئے تھے تاہم نے بولنا تو سیکھ لیا تھا۔ پسند کے جذبے بیدار تو ہوئے تھے۔

کئی دنوں سے رابعہ یہی سوچ رہی تھی۔ مفاداری یا مذاق کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بھی نوید کو یاسر کے بارے میں بتا دے۔ خدشہ اسے بھی تو تھا زندگی کے کسی موڑ پر یاسر یا اس کی دلچسپیاں نوید کے علم میں آ سکتی ہیں لیکن وہ کشمکش و تذبذب میں تھی، تذبذب کا شکار تھی کچھ کہنے کی ہمت ہوتی بھی تھی اور نہیں بھی ہوتی تھی۔

دن گزر رہے تھے۔ نوید اس پر جان نچھاور کر رہا تھا۔ رابعہ کو الجھا ہوا دیکھتا تو یہی سوچتا کہ اس نے انیسہ کی وجہ سے اتنا اثر لیا ہے وہ دل ہی دل میں نادم و متاسف ہوتا رہتا۔

اس رات دونوں بیڈ پر قریب قریب لیٹے تھے لیکن سوچوں کی لہریں دونوں کو بہت دور لے جا چکی تھیں۔ نیند دونوں ہی کو نہ آ رہی تھی بے چینی سے کروٹیں بدلی جا رہی تھیں۔

"رابی" نوید نے چت لیٹے لیٹے اسے پکارا۔ وہ اس کی طرف پشت کئے پڑی تھی۔

"جی" وہ اسی انداز میں لیٹے لیٹے بولی۔

"لگتا ہے..." وہ رک گیا۔

"کیا؟" وہ ہولے سے بولی۔

"تم نے..... تم نے اس بات کا بہت اثر لیا ہے۔ میری تمام کوششیں بھی تمہیں نارمل نہیں کر سکیں۔"

رابعہ نے سر نفی میں ہلایا۔ آہستگی سے بولی۔ "نہیں یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا ہے؟" نوید نے کروٹ بدل کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چند لمحے چپ رہی۔ نوید نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "پھر تم الجھی الجھی کیوں رہتی ہو۔"

رابعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے یاسر کے متعلق نوید کو بتا دینے کے فیصلے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا اپنے ضمیر کا بوجھ اسے بھی تو اتار پھینکنا تھا

نوید پھر چت لیٹ گیا۔ رابعہ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس پر جھک کر کہا۔ "نوید... میرے ذہن پر بھی ایک بوجھ ہے میں بھی اسے اتارنا چاہتی ہوں۔"

"کیا ۔۔۔؟" نوید نے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولی ... تم نے انیسہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے میں بھی چاہتی ہوں کہ تمہیں۔"

"کیا ـــ ؟" نوید کے دل و دماغ پر جیسے کوئی کاری ضرب پڑی۔ وہ بوکھلا گیا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

رابعہ سر جھکا کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "ہاں نوید۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کے لئے آئینہ بن جانا چاہئے تم نے جس سچائی اور خلوص سے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اسی سے مجبور ہو کر میں بھی چاہتی ہوں کہ تم سے کوئی بات نہ چھپاؤں۔"

"کیا ـــ کیا کہہ رہی ہو؟" نوید نے جلدی سے اس کا کندھا جھنجھوڑا اس کے ہاتھ کی سختی سے رابعہ تھرا اٹھی۔ گھبرا کر اس نے نوید کی طرف دیکھا۔ نوید کے چہرے پر وحشت اور سختی تھی۔

"کون تھا وہ ـــ" اس کی بات سننے سے پہلے ہی وہ غرایا۔ لگتا تھا اس کے پیکر میں کوئی درندہ گھس آیا ہے جسے موقع کا احساس ہے نہ رابعہ کے جذبات کا۔

وہ ششدر سی رہ گئی۔ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا ـــ نوید کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات! وہ گھبرا گئی۔

"بتاتی کیوں نہیں ہو ... کون تھا وہ ..." وہ اس پر جیسے جھپٹ کر بولا۔

رابعہ نے پھر اسے دیکھا۔ غصے سے وہ لال پیلا ہو رہا تھا۔ رابعہ کھول گئی۔ کتنا بے رحم بن گیا تھا وہ ٹوٹ کر پیار کرنے والا بندۂ بے دام۔ چاہتوں اور محبتوں کا علمبردار ... اپنی جذباتی لغزشوں کی داستان سنانے والا۔ انیسہ کے ساتھ بیتے ایک ایک لمحے کو اس پر واضح کرنے والا مرد اس کی کوئی بات سنے بغیر ہی اتنا مشتعل ہو گیا تھا قصہ سنتا تو در کنار وہ تو تمہید ہی برداشت نہ کر سکا تھا۔ کیا یہ اس کی محبت تھی۔ خلوص تھا۔ پیار تھا کہ خود تو جو چاہے کہہ دے لیکن اس کی بات سننے سے پہلے ہی آپے سے باہر ہو جائے۔ مرد کی ذات بالکل اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی۔ دکھ کی تیز دھار اس کے اندر کاٹ کا احساس دلاتی اتر گئی۔

محبتیں جن پر وہ یقین کر چکی تھیں۔ چاہتیں جن پر وہ اتراتی تھی پیار جس پر پورا ایمان لے آئی تھی۔ سب تصنع اور بناوٹ کے روپ لگے۔ رابعہ ... نوید اس کی خاموشی سے جھلا کر دہاڑا۔ تو رابعہ کو ایک دم سامنے کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر وہ ہنستی چلی گئی۔

نوید کچھ نہ سمجھ سکا۔

اس کی ہنسی نہیں رکی تو نوید نے جھٹکے سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھا۔ "کیوں ہنسی آ رہی ہے۔ کیوں ہنس رہی ہو؟"

"آپ پر۔ آپ پر ہنسی آ رہی ہے۔" اس نے نوید کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔

نوید جھلایا ... گھور کر اسے دیکھا

وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

"کیوں ہنس رہی ہو ـ ؟" وہ غرایا

"توبہ توبہ ...؟" رابعہ نے کانوں کو چھوا۔ "میں تو آپ کا حوصلہ آزما رہی تھی۔"

"کیا ... ؟" نوید کچھ کھسیانا ہو گیا تھا۔ رابعہ بات بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"میں تو آپ کا حوصلہ، آپ کی قوتِ برداشت، آپ کا ظرف آزما رہی تھی۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی "آپ نے تو اپنی محبت کی داستان کس بخل سے کام لئے بغیر من وعن سنا دی تھی۔ میں نے سب کچھ کتنے حوصلے اور صبر سے برداشت کر لیا تھا۔ لیکن آپ، آپ ... تو مذاق بھی برداشت نہیں کر پائے۔"

نوید کی جان میں جان آئی۔ مسکراتے ہوئے اسے اپنی طرف گھسیٹا اور خفت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سینے سے لگا کر سرگوشی کی۔ "بہت شریر ہو تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

پھر اس نے پوری قوت سے رابعہ کو سینے میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میری جان تم نہیں جانتیں میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔ ایسی کوئی بات سننا میری برداشت سے باہر ہے جانی۔"

رابعہ کچھ نہیں بولی۔ خوشی کے بجائے ایک گمبھیر دکھ اس کی ہستی پر پھیل گیا۔ نوید کے بازوؤں کے شکنجے میں آج پہلی بار اس نے گھٹن محسوس کی۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہے "تم خود غرض ہو۔ تم مجھ سے نہیں اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ اپنے آپ سے ـــ مجھ سے نہیں ... اپنے آپ سے ... اپنے آپ سے"

لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔

ہاں اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور تکیے کے غلاف میں پھیل کر اپنا وجود فنا کر گئے۔

ــــــــــــــ

اپنے بھی پرائے

عطیہ ہدایت

پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے ایک لمحہ کو میرے ہاتھ رک گئے نیچے سے بیک وقت دو تین چیختی ہوئی آوازیں اور بچے کی ریں ریں سن کر میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ روٹی ڈال کر چمچ سے گھی ڈالا۔

"لو صبح صبح پھر بے چارے بچے کی شامت آگئی۔ نہ جانے کیا گناہ سرزد ہوا پھر اس سے۔" نوید نے گرم گرم نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو دن رات کا یہی تماشہ بنا رہتا ہے۔ بے چاری عظمیٰ اور بچے کی زندگی عذاب میں ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی کا بنے گا کیا۔" چائے پیالی میں انڈیل کر میں نے نوید کے سامنے رکھ دی۔

"کیا بنے گا — بس اس طرح بہن بھائیوں اور بھابیوں کی باتیں سن سن کر بے چاری کی زندگی آخر کار ختم ہو جائے گی۔" نوید نے بڑا سا چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

بے چاری کی قسمت خراب نہ ہوتی تو تین سال میں اجڑ کر میکے کیوں آبیٹھتی۔ توبہ توبہ آج کل اپنوں کے بھی خون سفید ہو گئے ہیں۔ بہنیں اور ماں بھی یتیم بچے کو بات بے بات بھکاریوں کی طرح جھڑکتے رہتے ہیں۔

ہم لوگ ان دنوں نئے نئے اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے تھے۔ جو عظمیٰ کے والد کی ملکیت تھا۔ نوید مقامی دفتر میں اسٹینو تھے اور میں ایک نزدیکی اسکول میں سیکنڈ مسٹرس تھی۔ ہمارے دو بچے تھے۔ منیرا بڑی اور ریاض چھوٹا تھا۔ دونوں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ ہم دونوں [illegible] مالی ذمہ داریاں مل جل کر بانٹتے — لگا بندھا خرچ چلاتے۔ [illegible] محنت کرتے اور حرص و ہوس سے پاک پرامن زندگی گزار رہے تھے۔ [illegible] ملنسار طبیعت کی منکسر المزاج، شرافت اور ملنساری کی وجہ سے اس کی قدر بھی تھی۔ میں بھی محلے کے اکثر بچوں کی امتحانوں کے دنوں میں پڑھنے میں مدد کرتی تھی۔ اس لئے سب ہماری عزت کرتے تھے۔ ہمارا گھر دو چھوٹے کمروں، باورچی خانے اور غسل خانے پر مشتمل تھا۔ ہمارے مالک مکان کا گھر فرشی تھا۔ ہمارے باورچی خانے کی کھڑکی ادھر کھلتی تو نیچے سے ان کا آنگن پورا سامنے آتا [illegible] اور [illegible] نظر آتی تھی۔ اخلاص صاحب کی [illegible]

دکان تھی۔ وہ اب کافی بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ بس برائے نام دکان پر بیٹھتے۔ بڑا بیٹا [illegible] کر کے دکان سنبھال رہا تھا۔ چھوٹا [illegible] ابھی تعلیم [illegible] سے اگر بھائی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ بڑے بیٹے کی [illegible] دو بچے تھے ہمارے بچوں کے ہم عمر۔ اکثر ان کے بچے ادھر آ جاتے [illegible] دو بہنیں کنواری تھیں۔ ماں بوڑھی تھیں۔ گھر میں [illegible] ایک زبان دراز عورت تھی۔ بات بات پر لڑتی جھگڑتی ویسے پورا گھر ہماری عزت کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے گھریلو مسائل میں ہم سے صلاح مشورہ بھی کر لیتا تھا۔

عظمیٰ بے چاری کا کچھ عرصہ تو بڑی گرمجوشی سے پذیرائی ہوئی لیکن آہستہ آہستہ سب کا رویہ بدلتا گیا۔ عظمیٰ اور اس کا بچہ پلک سے اترے، سر سے اترے، دل سے اترے اور پھر اچھوت بن کر رہ گئے۔

"عظمیٰ میری بہنا اٹھ آج ناشتہ تو بنا لے، آج ساری رات سر درد سے سو نہ سکی۔" "عظمیٰ دیکھ تیرے بھیا کی شلوار کا کپڑا پڑا ہے جلدی سے اسے سی ڈال۔" "بیٹا عظمیٰ تیری بہن ہانڈی پکا رہی ہے تو یہ چند میلے کپڑے دھو لے اور اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے آہستہ آہستہ گھر کے سارے کام۔ ہر کسی کی ڈیوٹی اسی کے ذمے پڑ گئی اور آخر کار وہ خادمہ بن کر رہ گئی۔ ناشتہ، ہانڈی، روٹی، کپڑے، برتن، جھاڑو، سینا پرونا، اس کے ساتھ ساتھ بھابی اور بہنوں کے ذاتی کام۔ کسی کے دوپٹے پر فیتہ لگا رہی ہے۔ کسی کی قمیص پر بوٹیاں کاڑھ رہی ہے۔ کبھی مشین کی ہتھی گھما رہی ہے۔ اس کے کپڑے میلے ہو جاتے، خوبصورت بال دھول مٹی سے اٹے رہتے لیکن اسے کپڑے بدلنے کی فرصت کہاں تھی۔ بیٹا بھی ماں کے ساتھ چپکا رہتا اس کے ذہن میں تحفظ کا احساس نہیں تھا۔ ایسے میں اس سے کوئی چیز گر جاتی یا وہ اپنے ماموں زاد بھائی بہن کے کھلونے لینے کی ضد کر بیٹھتا تو خالہ، نانی اسے اس طرح گھر دیتیں کہ عظمیٰ کا دل تڑپ اٹھتا۔ اگر عظمیٰ ذرا سی بھی زبان کھولتی تو اس کی شامت آ جاتی۔ کیا سمجھتی ساتھ [illegible]۔ خواہ مخواہ باپ کی کمائی اب کی جان کو مصیبت بنی ہوئی ہے۔ آ گئی دامن پھیلائے بچے کو لے کر یہاں کیوں اٹھا لائی۔ اس پر [illegible] کر آ [illegible] [illegible] اور عظمیٰ کے دل کا دکھ [illegible]

چاپ چپ ٹپ [illegible] ہوتی۔ اب آنسو بہانے لگیں بیگم صاحبہ۔ ارے صبر کرو تو ہضم کر لیں اب بھائیوں کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ بھابی چمک کر کہتیں۔ اور وہ بے چاری سر جھکائے بچے کو لیے سے لگائے سارے تیر سارے جملے خاموشی سے برداشت کرتی رہتی۔

میں اکثر اوپر سے اس کو دی جانے والی ڈانٹ پھٹکار سنتی کبھی ان سے عظمی کے بارے میں بات ہوتی تو ان کے ہونٹ سکڑ جاتے ماتھے پر بل آجاتے۔

جب کبھی موقع ملتا عظمی میرے پاس آجاتی میری ہمدردانہ اور نرم گفتگو اسے بڑا دلاسہ دیتی۔ باجی آپ کا گھر واحد جگہ ہے جہاں میں تھوڑی دیر کے لئے سکون اور اپنائیت محسوس کرنے لگتی ہوں۔ میں کہتی عظمی اپنا گھر ہے روز آیا کرو۔

دل تو بڑا چاہتا ہے پر کیسے وقت نکالوں۔ سارے گھر کا کام جو میرے ذمے ہے ایک منٹ کو ادھر ادھر ہو جاؤں تو واویلا مچ جاتا ہے سچ پوچھ باجی اتنا کام تو مجھے سسرال میں کبھی نہیں کرنا پڑا تھا جتنا اپنے ہی ماں باپ کے گھر کرنا پڑ رہا ہے۔

"ہاں عظمی تمہارے گھر والوں کا سلوک میں برابر دیکھ رہی ہوں انھیں تمہارے یتیم بچے پر بھی ترس نہیں آتا۔"

میں افسوس سے کہتی ہوں باجی بدقسمت نہ ہوتی تو اپنا گھر کیوں اجڑتا۔ عظمی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھا گئی۔

نہیں تم بدقسمت نہیں ہو۔ دکھ سکھ انسان کے ساتھی ہوتے ہیں آزمائشیں انسانوں پر آتی ہی رہتی ہیں۔ بیوہ ہونا اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ معاشرہ عورت کو ٹھوکروں پر رکھ دے۔ ورنہ عورت کو اپنے آپ کو اتنا لاچار بے بس سمجھنا چاہیئے کہ جیسے شوہر کا ساتھ چھوٹ گیا تو پھر خوشی کا ہر دروازہ بند ہوگیا۔ یہ منفی سوچ ہی معاشرہ کو عورت کے استحصال پر اکساتا ہے تم اپنی عزت کروانا جان جاؤ تو سارا دنیا تمہاری عزت کرے گی۔

لیکن میں کیا کر سکتی ہوں باجی ان لوگوں کی خدمت نہ کروں تو کھاؤں گی کہاں سے عظمی نے بے بسی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو عظمی تم میٹرک پاس ہو تمہارے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے اور پھر سب سے بڑی ذمہ داری تمہارا بیٹا ہے اسے احساس کمتری و پھٹکار سننے سے بچاؤ کہیں نوکری کر لو۔ سلائی کڑھائی کرو۔ ہاتھ میں دو چار پیسے آئیں گے تو کم از کم اپنے بچے کی چھوٹی موٹی خواہشات تو پوری کر سکو گی یوں تو نہ ترسے گا ناچھوٹی موٹی باتوں کے لئے۔

"ارے باجی آپ بھی کیسی بھولی ہیں میں نے خود کتنی بار اماں سے کہا ہے کہ میں اپنے بچے کا خرچ اٹھانا خود چاہتی ہوں پر وہ اور بھائی ایسا شور مچا دیتے ہیں کہ میں دوبارہ بات کر نہیں سکتی کہتے ہیں ہماری ناک کٹوائے گی۔ بدنام کرے گی۔ ہمیں طعنے دیں گے لوگ کہ بہن اور بچے کو روٹی نہیں کھلا سکتے۔ کمائی تو لیتی ہوا اور کیا چاہیئے۔ زبان تالوے کھینچ لینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ بھلا ایسے میں میں کیا کروں۔

لیکن میری بہن کھانا ہی تو نہیں ہوتا زندگی میں تمہاری اور بھی تو ضروریات ہوں گی پھر کیا تعلیم کے بغیر رہے گا کیا ساری عمر ذرا ذرا بات کے کے لئے بھائیوں کی محتاج رہو گی۔

باجی پھر بتائیے نا میں کیا کروں ـــــ وہ زچ ہو کر کہتی میں سوچونگی تمہارے لئے۔

ایک دن اس کے بیٹے سے ممانی کے جہیز کی پیالی ٹوٹ گئی۔ معصوم بچے کے گالوں پر پانچوں انگلیوں کے نشان بن گئے۔ باری باری سب نے ہاتھ جھاڑے عظمی کی تو جیسے شامت آگئی۔ تمام دن طعنے اور گھڑکیاں سنتی رہی اور روتی رہی۔ اس دن میری چھٹی تھی۔ شام تک ایک ایک ہی بات وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہتی۔ پتہ نہیں ان ماں بیٹے سے کب پیچھا چھوٹے گا۔ کب تک انھیں کھلاتے رہیں گے۔ کب تک یہ منحوس ہمارے سینے پر مونگ دلتا رہیگا شام کو عظمی کو میں نے بلا بھیجا۔ سوجی آنکھیں اور سرخ چہرے کے ساتھ وہ بچے کا ہاتھ پکڑے آئی۔

"باجی آپ نے بلایا تھا۔ کیا بات ہے۔"

"کوئی بات نہیں .... بس دل گھبرا رہا تھا۔ تمہارے بھائی ماں سے ملنے گاؤں گئے ہیں۔ اکیلی تھی سوچا تم سے گپ شپ کرلونگی۔ دیکھو میرے ساتھ یہ گرم گرم چائے پی لو۔ اور آج تمہیں میرے ہاتھ کے بنے ہوئے شامی کباب بھی کھانے ہوں گے۔ اس کے نانا کرتے ہوئے بھی ماں بیٹے کو چائے پلائی۔ مجھے معلوم تھا کہ عظمی اور بچہ دوپہر سے بھوکے ہوں گے۔ دیکھو عظمی آج میں تمہیں سنجیدگی سے مشورہ دے رہی ہوں کہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے میں مت بہنے دو۔ تم خس و خاشاک نہیں ایک نوجوان لڑکی ہو تم بیوہ ضرور ہو لیکن راستے میں پڑا پتھر نہیں جس کو ہر کوئی ٹھوکر لگا کر گزر جائے

لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دو خود دار بن جاؤ۔ صرف اپنے اور بیٹے کی بہتری کا سوچو۔ باجی میں خود اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ آپ ہی میری مدد کریں عظمیٰ نے بے تابی سے میرا دامن پکڑ کر کہا۔

"سر دست فی الحال ہمارے اسکول کی ایک ٹیچر میٹرنٹی چھٹی پر چلی گئی ہے میں نے تمہارے لئے بات کی ہے اس کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں تمہارے لئے کوشش کروں گی۔ تین چار سو مل جایا کریں گے۔ تم چھوٹے بچوں کو پڑھا بھی سکتی ہو۔ بس ہمت کرو۔ بھائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ عورت کی عظمت کو پہچانو اس طرح مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر گھٹ گھٹ کر تو زندگی گزارنا کوئی بڑا کام نہیں۔ تم انسان ہو فرشتہ نہیں ان فرسودہ روایات سے بغاوت کرو" میں بڑے جوش سے اسے دیر تک سمجھاتی رہی۔ عظمیٰ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتی ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔

"عظمیٰ اسکول میں نوکری کرے گی۔" یہ آواز نہ تھی۔ بم کا دھماکا تھا جو سارے گھر میں پھیل گیا تھا۔

بھائیوں نے آنکھیں نکالیں، دھمکیاں دیں۔ پھر گالیوں پر اتر آئے لیکن میں نے پہلی بار عظمیٰ کے سہمے وجود میں سے اٹھتی بغاوت سے لبریز آواز سنی۔ میں آپ لوگوں کی رنڈی نہیں ہوں۔ میں بیوہ ہوں کوئی مجرم نہیں کیا اس جرم کی پاداش میں ساری عمر آپ لوگوں کی خدمت کروں۔ جھوٹا کھاؤں۔ اترن پہنوں۔ بیٹا گلیوں میں آوارہ پھرے۔ آپ سب کے جانے کھائے۔ آخر کیوں؟ میں اپنے بیٹے کو ترسا ترسا کر زندہ کیوں رکھوں میں یہ نوکری کر کے رہوں گی۔ ورنہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ خدا کی دنیا بڑی وسیع ہے کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔

عظمیٰ کا یہ روپ دیکھ کر بھائیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ماں نے اٹھ کر ایک زوردار چانٹا رسید کیا۔ بھائی اس کی شکل کبھی نہ دیکھنے کا کہہ کر پیر پٹختے باہر چلے گئے۔ بہنیں اور بھابی طنز سے اونہہ کہہ کر کمروں میں گھس گئیں۔ چند ہی دن میں عظمیٰ اسکول جانے لگی اسے جاتے دیکھ کر ماں نفرت سے منہ پھیر لیتی۔ بھابی طنزیہ انداز میں ہنستی۔ لو اب خاندان کا نام اونچا کرے گی۔ تھو تھو کریں گے لوگ۔ پتہ نہیں کیا گل کھلاتی پھرتی ہوگی باہر۔ عظمیٰ بس ایک لمحہ کو رک کر دیکھتی اور پھر سر جھٹک کر بچے کی انگلی تھامے نکل جاتی۔ شروع شروع میں بھائیوں نے بڑا ادھم مچایا ڈرایا۔ دھمکایا لیکن عظمیٰ پتھر بن چکی تھی۔ آہستہ آہستہ محلے کے چند بچے اس سے شام کو پڑھنے آنے لگے اس کے بچے کے کپڑے اچھے ہو گئے وہ اسکول جانے لگا اس کے ہاتھ میں ایک آدھ کھلونا ہوتا۔ خوبصورت لمبے لمبے بال سلیقے سے گندھے ہوتے۔ کپڑے بھی صاف ستھرے رہنے لگے۔ پہلی تنخواہ لے کر اس نے اپنی ماں اور بھابی کے لئے ان کا ایک ایک سوٹ خریدا۔ بھتیجے بھتیجی کے لئے چھوٹے چھوٹے کھلونے لئے۔ بہنوں کے لئے پرنٹیڈ دوپٹے لئے انھوں نے ناک بھنوں چڑھائیں۔ سارا دن چیزیں پلنگ پر پڑی رہیں پھر ہچکچاتے ہوئے اٹھالی گئیں۔ اب وہ کبھی فروٹ لے آتی کبھی بچوں کے لئے کچھ لے آتی صورت حال کچھ کچھ بدلنے لگی تھی اب عظمیٰ لونڈیوں کی طرح بھاگ بھاگ کر کام نہ کرتی۔ کسی نہ کسی بات میں اس سے مشورہ بھی لیا جانے لگا۔ میں سوچتی واقعی معاشی طور پر محتاج انسان کبھی سر اٹھا کر نہیں چل سکتا۔

ایک دن زور زور سے ہنسنے بولنے کی آواز سن کر میں نے آہستہ سے کھڑکی کھولی۔ سامنے پلنگ پر عظمیٰ کی ماں، بھابی اور خود وہ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ بھابی کوئی قصہ سنا رہی تھیں اور وہ سب ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ عظمیٰ کا بیٹا ماموں زاد بہن بھائی کے ساتھ صحن میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ عظمیٰ کا چہرہ محنت اور خود اعتمادی کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ عظمیٰ کے حالات کیسے اچھے ہو گئے میں اس کی عزت و منزلت دیکھ کر پھولے نہ سماتی۔

شام کو وہ اوپر آئی۔ باجی یہ کھیر خاص آپ کے لئے لائی ہوں۔

کیوں کوئی خاص بات ہے آج۔

نہیں بڑے بھیا کو پسند ہے نا آج انھوں نے بطور خاص مجھ سے فرمائش کر کے پکوائی تھی۔ بس آپ کو کھلائے بغیر رہ نہ سکی سو لے آئی۔

بڑے مزے کی ہے عظمیٰ۔

"باجی یہ سب آپ کا صدقہ ہے۔ آپ نے مجھ میں زندگی کی روح پھونکی۔ ورنہ میں اس زندگی کے تصور سے بھی کانپ جاتی ہوں جو میں نے گزاری تھی۔"

"یہ تمہاری اپنی ہمت تھی عظمیٰ میرا کام سمجھانا ہی تھا" یہ تو ابتدا ہے میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اب میں ایک اور ہی نہج پر سوچنے لگی ہوں مجھے امید ہے میں اس کے لئے بھی راستہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

"کیا بات ہے۔ مجھے نہیں بتائے گا؟" عظمیٰ نے بے تابی سے کہا۔ "آخر یہ پہاڑ جیسی زندگی ایسے تو نہیں گزر سکتی نا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "عظمیٰ یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارو گی تمہیں ایک سہارے کی ضرورت ہے۔"

"میرا بچہ میرا سہارا بنے گا باجی! میں اپنی زندگی اسی کے لئے وقف رکھنا چاہتی ہوں" عظمیٰ نے کہا۔

"نہیں عظمیٰ تمہیں اس سہارے کی بھی ضرورت ہے جسے شوہر کہتے ہیں۔ اس کے بغیر عورت کو اس سماج میں زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ کتنی ہی پاکدامن کیوں نہ رہے لیکن لوگ اس پر الزام لگاتے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ فطرت کا بھی تقاضہ ہے عظمیٰ۔"

"لیکن مجھ سے شادی کون کرے گا۔ آج کل کنواریوں کو بھی بر نہیں ملتے۔ پھر میں بیوہ ہی نہیں ایک بچے کی ماں بھی ہوں۔" عظمیٰ نے نگاہیں نیچی کئے کئے کہا۔

"میری بہنا۔ میں نے تمہارے لئے رشتہ طے کر لیا ہے۔ میرے اسکول کی ایک ٹیچر کو اپنے بھائی کے لئے رشتے کی تلاش ہے اور وہ ایسی ہی عورت کو بھابی بنانا چاہتی ہیں جو بیوہ ہو اور کسی بچے کی ماں بھی ہو۔ انھوں نے تمھیں پسند کر لیا ہے۔"

میری باتیں سن کر عظمیٰ پر حیا کی سرخی چھا گئی اس نے سر جھکائے سر جھکائے آہستہ سے کہا۔ "آپ میری باجی ہی نہیں ماں بھی ہیں۔ آپ کو مجھ پر ہر طرح کا اختیار ہے۔"

عورت

مسلہ۔ پی عقیلہ انجم

میں عورت ہوں عورت۔ حوا کی بیٹی جو آسمان سے بھیجی گئی نور کی وہ پاک اور مقدس بوند جو صدیوں سے اس سرزمین کو سینچتی چلی آئی ہے۔

میں نے ہی پیار کے رنگ برنگے پھول کھلا کر اس دنیا کو جنت بنایا میں نے اپنی کوکھ سے مرد کو جنم دیا۔ ماں بنکر اسے پیروں پر چلنا سکھایا بہن بنکر اس نے چلبلی کہانیاں سنائیں۔ محبوبہ بنکر اس کی زندگی کو ریشمی نغموں میں ڈھالا تو شریک حیات بنکر اپنی جوانی کے انمول موتی لٹا کر اس کے رات اور دن سجائے۔

میں نے ہی وقت پڑنے پر کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا کر پتھریلی راہوں پر دوست بنکر ساتھ ساتھ چلی اور یہ سب کرتے ہوئے ایثار جو دیکھ کر میں عورت نور کی وہ بوند بنکر مرد میں پوری کی پوری سما گئی۔

میری اس بے مثال قربانیوں کو ہر مذہب نے سنہرے الفاظ میں لکھا۔ مجھے ان بلندیوں پر بٹھا دیا جہاں پہنچکر انسان فرشتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں محض وہم تھا۔ آج صدیاں بیت جانے تک ہر لمحہ مجھے ڈر ستائے رہتا ہے کہ نہ جانے کب اپنی بلندیوں سے میں گرا دی جاؤں۔ کب کسی کوٹھے پر ڈھکیل دی جاؤں کب جوئے میں داؤں پر لگا دی جاؤں۔ کب اپنی پاکیزگی کا ثبوت دینے کے لئے مجھے شعلوں پر سے گزرنا پڑے۔

کب میں جان سے ہی مار ڈالی جاؤں۔ نکاح کرکے اپنائی جاؤں تو طلاق دے کر ٹھکرا دی جاؤں۔

اور کب میری عزت اور میری عصمت کا رکھوالا مرد اپنے ہاتھوں مجھے بے آبرو کر ڈالے۔

افسانہ

پرگدہ

عشرت جہاں

ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو احمد بھائی نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں الوداع کہا اور بولے "موقع ملا تو میں جلد ہی حیدر آباد آؤں گا۔ مگر بھئی دیکھو اگر تمہیں کوئی چانس ملے تو تم بھی ضرور آجانا"

پھر ٹیکسی چل پڑی۔

ہم دونوں میاں بیوی نے مڑکر دیکھا۔ احمد بھائی ابھی تک سڑک پر کھڑے ہاتھ ہلائے جا رہے تھے۔ ہم دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ مگر دمیں نے کچھ کہا نہ انھوں نے۔ ویسے ہماری خاموشی بڑی بامعنی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ہی طرح حامد بھی بہت ساری باتوں کو ہونٹوں کے اندر ہی روکے ہوئے ہیں۔

یہ سناٹا ایک طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

احمد بھائی سے ہمارا کوئی رشتہ ناتہ نہ تھا۔ میرے میاں حامد سے ان کی بڑی پرانی دوستی تھی۔ کسی زمانے میں دونوں ایک ہی محکمے میں ساتھ ساتھ نوکری کرتے تھے اس وقت نہ احمد کی شادی ہوئی تھی نہ حامد کی۔ بڑی گہری چھنتی تھی دونوں میں۔ پھر ہماری اور حامد کی شادی ہوئی۔ تو احمد میاں سب سے آگے آگے تھے۔ کوئی گھر والا بھی کیا اتنا کرتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سب کے بڑے قریبی عزیز ہیں۔

البتہ جب خود ان کی شادی کی اطلاع ملی تو ہم لوگ نہ جاسکے۔ ہوا یوں کہ حامد کا تبادلہ انہی دنوں کر دیا گیا۔ جوائن کرنے کا معاملہ ایسا تھا کہ رکتے تو اور دل سے جونیئر ہو جاتے۔ بڑی مجبوری تھی۔ فون پر احمد بھائی کو بتایا تو وہ بالکل ناراض نہیں ہوئے بلکہ بولے "اماں اس میں اس قدر کھسیانے کی کیا بات ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ فیوچر کا معاملہ ہے تم لوگ جاؤ۔ آخر بعد میں بھی ملا جا سکتا ہے۔ رہا شادی کا معاملہ تو وہ تو ہو ہی جائے گی"

حامد کو ان کی باتوں سے تسلی ہو گئی۔

پھر ہم لوگ اس شہر سے کئی سو میل دور چلے گئے اور ایسے گئے کہ وہاں سے نکلنا ہی مشکل ہو گیا۔ بچے ہوئے۔ ان کو اسکول میں داخل کرایا گیا اور پھر جب بھی نکلنے کے لئے سوچتے کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا آڑے آتا کہ معاملہ پھر جوں کا توں رہ جاتا۔

احمد بھائی البتہ اس عرصے میں اکثر آتے رہے۔ سالے کوسوں کا سفر طے کر کے یہ شخص محض ہم سے ملنے آتا تھا۔ بڑا خلوص تھا ان میں۔ آتے تو بس ایک آدھ دن رکتے حالانکہ ہم لوگ چاہتے تھے زیادہ رہیں۔ مگر وہ کبھی نہیں رکتے تھے۔

"دیکھو میاں۔ ہمارے ہاں کوئی نہیں ہے۔ بس تمہاری بھابی ہیں۔ بچے اللہ نے ابھی تک نہیں دیئے۔ اب تم ہی سوچو انھیں کئی دنوں تک کیسے اکیلے چھوڑیں"

"تو پھر انھیں کبھی لے آتے نا۔ ہم لوگ آج تک ان سے نہیں ملے"۔ میں نے کہا۔ جب وہ پہلی بار آئے تھے۔

"یہ بہت مشکل ہے۔ گھر میں تالا نہیں لگ سکتا۔ چوریاں ہو جاتی ہیں" احمد بھائی نے جواز پیش کیا۔

وہ جب پہلی بار آئے تو اپنے ساتھ آم کا بڑا سا جھابا بھی لائے تھے۔ آتے ہی بولے "دیکھنا یہ جھابا۔ تمہاری بھابی نے بھجوایا ہے"

"بڑے اچھے آم ہیں" میں نے ایک آم تولتے ہوئے کہا۔

"خود جاکر لائی تھیں" احمد بھائی نے پھر بتایا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ بھابی بھی ہیں آپ ہی جیسی ملی ہیں" میں نے کہا تو خوش ہو کر بولے۔

"بھئی میں نے ان سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔ شام کو جب دفتر سے آتا ہوں تو بس تمہارا ہی ذکر ہم لوگوں کے درمیان رہتا ہے"

"اور ہم... ہم کو تو کوئی پوچھتا ہی نہ ہوگا" حامد نے ٹکڑا لگایا۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے" احمد بھائی بولے۔ "تمہارا فوٹو ہمارے فوٹو کے ساتھ انھوں نے دیوار پر لٹکا کر رکھا ہے۔ آنے جانے والوں سے بڑے فخر سے بتاتی ہیں یہ ہمارا دیور، بڑا افسر ہے"

"احمد بھائی اب ہوائیاں مت چھوڑیے" حامد نے انھیں چھیڑا۔

"سچ۔ میں غلط نہیں کہتا۔ دیکھو نا۔ اتفاق سے ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میری اور تمہاری دوستی کا سن کر انھوں نے غائبانہ طور پر تمہیں اپنا ماں جایا بنا لیا ہے۔ دراصل عورتوں کے اندر محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور تمہاری بھابی میں یہ صفت ذرا زیادہ ہی ملتی ہے"

ہم لوگ وہاں آئیں تو وہ بور تو نہیں ہوں گی ؟" میں نے یوں ہی کہا۔

" بور ؟ کیا کہہ رہی ہو۔ وہ تو اکثر ناخوش بھی ہوتی ہیں کہ تم لوگ اتنی دور کیوں چلے گئے اور آتے کیوں نہیں۔ بے حد مہمان نواز ہیں تمہاری بھابی ۔ مجال ہے کوئی آ جائے اور کھانا کھائے بغیر جانے دیں۔ میں خود کبھی کبھی ان کی اس بڑھی ہوئی مہمان نوازی سے اکتا نے لگتا ہوں۔ مگر کبھی دیکھونا۔ یہ عادت بری تو ہے نہیں کہ ٹوک سکوں۔"

ہم لوگ تصور ہی تصور میں بھابی کا نقشہ بنانے لگتے۔ ایک بھولا سا ہمارے ذہن میں ابھرتا، مناسب قد و قامت کا، ہنستا مسکراتا ہوا سا چہرہ، ہونٹوں پر ان کی جھلک، لہجے میں خنک، انداز میں بے ساختگی، صورت یا تصویر ہم نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ بس اسی قدر سوچ سکتے تھے۔

احمد بھائی جب دوسری بار ہمیں ملنے آئے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنے ساتھ بچوں کے لئے کپڑوں کے چند پیکٹ بھی لائے تھے۔

" یہ لو بھئی ۔ یہ تمہارے دونوں بچوں کے لئے ہیں ۔ تمہاری بھابی نے بھیجے ہیں۔ بڑے عمدہ کپڑے تھے۔

عمدہ انتخاب تھا رنگوں کا۔

" اللہ بھابی کتنی سمجھدار لگتی ہیں۔ بالکل وہی رنگ بھیجے ہیں جو میں پسند کرتی ہوں۔"

احمد بھائی فخر سے مسکرائے کہنے لگے۔

" ارے وہ تو کہو ان کی جیب میں مال زیادہ نہ تھا ورنہ ان کا بس چلتا تو پوری دکان ہی خرید لیتیں۔" احمد بھائی نے چٹخارہ لیتے ہوئے بتایا۔

دیکھو نا ہمارے ہاں بچے نہیں ہیں نا ؟ تمہارے بچوں کے فوٹو جو تم نے بھیجے تھے انھوں نے بڑی احتیاط سے البم میں سجا رکھے ہیں۔ فرمائش ہے کہ میں انھیں انلارج کرا کے فریم کرا دوں۔ اب مجھے وقت ہی نہیں ملتا کہ یہ کام کر سکوں۔"

" ہاں احمد بھائی یہ بات تو ہے۔" میں نے ان کے یہاں بچوں کے نہ ہونے پر تاسف کا اظہار کیا۔ " احمد بھائی آپ ڈاکٹروں سے ملے ہوں گے ؟"

" ہاں ہاں سب کر چکا ہوں۔ دوا نہیں دعا کی ضرورت ہے۔"

" واقعی بھابی کو بچوں سے بہت پیار ہو گا۔" حامد نے کہا۔

" ارے ایسا ویسا۔" احمد بھائی نے پھر بیوی کے بارے میں بولنا شروع کر دیا۔ " سارے محلے کے بچے وہیں جمع رہتے ہیں۔"

پھر احمد بھائی ایک بار اور آئے تھے۔ اس بار وہ اپنے ساتھ کباب پکوا کر لائے تھے۔

" یہ کباب تمہاری بھابی نے خود بنا کر بھیجے ہیں۔ تم لوگ تو آتے نہیں۔ بڑی خواہش ہے ان کی تم سب کو کھانا کھلائیں۔"

بڑے عمدہ کباب تھے۔ گھر پر ایسے کباب بنانا آسان کام نہ تھا۔ احمد بھائی کے جانے کے بعد ہم دونوں جہاں بھابی کا ذکر کرتے رہے وہاں یہ بھی کہا ہم نے کہ انھوں نے تو اپنی محبت سے ہمیں احمد بھائی سے زیادہ مرعوب کر دیا ہے۔ کیا اچھی طبیعت کا یہ جوڑا ہے۔

" خدا سب کو ایسی ہی محبتیں دے۔" حامد نے کہا تھا۔ اور پھر یہی اشتیاق تھا کہ ہم دونوں بے چین ہو گئے کہ کسی نہ کسی طرح چل کر بھابی سے ملیں۔ ویسے بھی حامد وہاں اب تک نہ گئے تھے۔ احمد بھائی متعدد بار آ چکے تھے اور نئی زمانہ کوئی اتنا بھی نہیں کرتا ہے کسی کے لئے۔

ہمارے لئے تو اب احمد بھائی کے گھر جانے کا معاملہ ایک خوفناک ادھار کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بالآخر حامد نے کانی بھاگ دوڑ کر کے تھوڑی سی رخصت لی۔ ان کے بھائی کے ہاں ولادت ہوئی تھی اور عقیقے کی رسم میں وہاں سے بلاوا بھی آیا تھا۔ یہ جگہ احمد بھائی کے گھر سے کوئی سو میل دور تھی۔ ہم نے سوچا ایک دن کے لئے بھائی کے ہاں بھی چلے چلیں گے۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔

ہم لوگ عقیقے کی رسم سے ایک دن پہلے ہی چل پڑے اور طے کیا کہ پہلے احمد بھائی اور بھابی سے ملتے ہیں۔ پھر وہاں سے پلٹ کر حامد کے بھائی کے ہاں چلے جائیں گے۔

احمد بھائی کا گھر تین چار کمروں کا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ ہماری دستک پر حامد بھائی نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر بے تحاشا جھ سے لپٹ گئے۔ ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھایا اور خیریت وغیرہ پوچھتے ہوئے بولے۔ ارے تم لوگ کس طرح آ گئے ؟"

دس پندرہ منٹ تک وہ محو گفتگو رہے تو ہمیں بھابی کی فکر ہوئی۔ میں نے دریافت کیا تو بولے۔" گھر دو میں بتاتا ہوں انھیں ۔" ہمیں اٹھتے اٹھتے

رک گئی۔ وہ اندر چلے گئے۔ کوئی دس منٹ تک اندر رہے۔ بالآخر وہ اکیلے ہی لوٹے۔ بولے "بس آ ہی رہی ہیں"۔ ہم ہمہ تن انتظار ہو گئے۔ کوئی دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد ایک خاتون کمرے میں آئیں۔ دبلی پتلی اور بیمار سی، چہرہ بے حد خشک، بھنویں ناگواری سے سکڑی ہوئیں، بیزار بیزار سی۔ آکر سلام کیا اور دور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"یہ حامد ہے۔ یہ ان کی بیوی رضیہ ہے۔ یہ بچے ہیں"۔ احمد بھائی نے جھک کر تعارف کرایا۔ جواب میں بھابی جامد انداز میں بیٹھی رہیں۔ کچھ کہا نہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی نے محسوس کیا کہ وہ بولنا ہی نہیں چاہتیں۔ سخت حیرت تھی ہمیں۔

"بھابی کچھ ناراض ہیں کیا؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"نہیں نہیں، بس شاید سر میں درد ہے کچھ"۔ جواب میں احمد بھائی بولے۔ وہ خاتون بیٹھی رہیں۔ پھر یکایک اٹھیں اور واپس چلی گئیں۔ ہمیں بڑا عجیب سا لگا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حامد سے اٹھنے کو کہا۔ "اچھا احمد بھائی ہمیں اب جانے دو۔ ٹرین پکڑنا ہے"۔ حامد نے کہا

"کمال کرتے ہو۔ یار تم نے تو چائے وائے بھی نہیں پی۔ تم ٹھہرو میں سامنے کے نکڑ سے چائے لاتا ہوں"۔ احمد بھائی نے جلدی سے کہا: "دراصل تمہاری بھابی کے سر میں درد ہے شاید..."

"چائے کی ضرورت نہیں احمد بھائی"۔ حامد نے انھیں روک دیا۔

احمد بھائی بے بسی سے ٹھہر گئے۔

ہم اور حامد اٹھ گئے۔

ٹیکسی اسٹینڈ تک احمد بھائی ساتھ آئے۔ وہ مسلسل بول رہے تھے۔

"یار تم لوگوں نے ہمارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے اس طرح جا رہے ہو۔ تمہاری بھابی تو میرا ناطقہ بند کر دیں گی۔ دیکھو نا وہ یقیناً تمہارے لئے کچھ پکا رہی ہوں گی مگر خیر... اب کے آنا تو رکنا ضرور...."

ٹیکسی میں سفر کے دوران حامد اور میں دونوں ہی چپ تھے۔ ہمارے لبوں میں ایک ہی بات تھی مگر نہ وہ بول رہے تھے اور نہ میں۔ اور پھر بولتے بھی کیا۔ بس نہ جانے کیوں دل کڑھ رہا تھا۔ کیسے اچھے آدمی تھے احمد بھائی.... اور

پردہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو جائے اور احمد بھائی خوب جانتے تھے کہ پردہ پوشی کیسے کی جاتی ہے مگر....

دل اتنا کڑھ رہا تھا کہ بولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

▫ نئی ناولیں

ناول	مصنفہ	قیمت
ارجیت	عفت موہانی	۱۸/-
صاعقہ	رضیہ بٹ	۳۰/-
خوبصورت	بشریٰ رحمٰن	۴۰/-
سراب زندگی	ذکیہ بلگرامی	۴۴/-
اک خلش سی	حامدہ واسطی	۲۴/-
انیسہ	فیاض نیازی	۳۵/-
لوفر	آمنہ اقبال	۳۰/-
زخم بہاروں کے	طاہرہ سعید	۴۴/-
شاربینہ	محسنہ حبیب	۲۸/-
یادوں کا سورج	سراج النور	۴۲/-
اجنبی	سلمیٰ کنول	۵۰/-
ایک خلش سی	حامدہ واسطی	۲۲/-
انیسہ	فیاض نیازی	۳۵/-
زخم بہاراں	طاہرہ سعید	۲۳/-
ذرے سے ذات	عفت قریشی	۴۰/-
چلمن چلمن تیری تجلی	رہانا خانم	۳۳/-
جب یاد تیری آئی	ماہ ناز صبریا	۳۳/-
حسینہ	نسیم انہونوی	۳۳/-
کہکشاں	" "	۳۵/-
افشاں	اے آر خاتون	۳۶/-
عروج	سلمیٰ کنول	۳۵/-
اس دلیں لگی ہیں	" "	۳۰/-
ببول	مشرف تمیز	۴۰/-
انتظار سحر	واجدہ نازلی	۳۳/-
نمود سحر	" "	۳۳/-
شہابی	شہناز کنول	۳۵/-
تیری آنکھوں کے دیئے	عطیہ پروین	۱۹/۵۰

بدلتا ہے رنگ

امتیاز فاطمی ۔ ایم ۔ اے مظفرپور

موسم سرما کی ایک یخ بستہ شام ہے، میں ابھی ابھی آفس سے واپس آیا ہوں ۔ جاڑے کی شام مجھے یوں بھی اداس کر دیا کرتی ہے میں اپنے مخصوص دریچے کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سے رحمٰن نیر صاحب کی نئی کوٹھی صاف نظر آتی ہے ۔ کوٹھی سے چند نسوانی قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں —— میں اکثر اس کوٹھی سے یہ قہقہے سنا کرتا ہوں اور ان آوازوں کے ساتھ میرے سوئے ہوئے جذبے بیدار ہو جاتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ بیتے دلوں کی یادیں برف کے تودے کی طرح میرے ذہن سے پھسلتی جا رہی ہیں ۔ سرمئی شام کا اداس دھندلکا فضا پر مسلط ہے ۔ آسمان پر ہیبت برس رہی ہے ۔ آہستہ آہستہ زردی چھانے لگی ہے ۔ آسمان، زمین، چاند، ستارے ہر چیز ہر وقت اپنا رنگ بدلتی ہے ۔ اگر چاند کا رنگ زرد ہو گیا تو تعجب نہیں ۔ اگر فضا اداس ہو گئی تو حیرت نہیں ۔ شام کی خونیں پری دف بجا رہی ہے اور رات کی ہلکی سیاہی مغرب کی سمت رینگتی جا رہی ہے ۔ دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب نیلگوں سمندر میں غرقاب ہو رہا ہے ۔

زندگی شروع ہوتی ہے اور انسان بیدار ہوتا ہے تمنائیں جگاتی ہیں اور ناکامی سُلاتی ہے، نہ اپنی صبح ہوتی ہے اور نہ اپنی شام ۔ انسان ہر روز ایک قدم آگے بڑھتا ہے وہ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، کرنا کچھ چاہتا ہے اور کرتا کچھ ہے ۔ انسان کی حقیقت اس بحرِ بے کراں میں ایک حقیر تنکے کی مانند ہے ۔ حادثات کی لہریں جدھر چاہتی ہیں اس کا رُخ پھیر دیتی ہیں ۔ امیدیں آرزوئیں، تمنائیں مرادیں اگر مزید خوشیاں پا جانے کے لئے مل جائیں تو خوشیاں، مسرتیں اور شادمانیاں کسی ہستی کی ذات کا ایک جزو بن جاتی ہیں لیکن پھر کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے جب امیدیں ختم ہو جاتی ہیں، آرزوئیں دم توڑ دیتی ہیں، تمنائیں مردہ ہو جاتی ہیں ۔ تمام خوشیاں حسرتوں میں تمام مسرتیں سسکیوں میں اور تمام شادمانیاں آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں ۔ کاش زندگی ایک خواب ہوتی اور بس ۔

میری نظریں رحمٰن صاحب کی کوٹھی پر ٹکی ہیں اور ایک بار پھر کتاب زندگی کے اوراق ذہن میں اٹھتی آندھی سے پھڑپھڑا رہے ہیں اور ورق ورق زندگی میری نظروں کے سامنے بکھرتی جا رہی ہے ۔ میں سوچ رہا ہوں رحمٰن صاحب کی ان راہوں کے متعلق جہاں منزلیں آگے بڑھ کر مسافر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہیں ۔ مسافر ابھی قدم بڑھا بھی نہیں پاتا کہ منزل سامنے ہوتی ہے ۔ نگاہوں میں اُبھر رہا ہے ان کی کوٹھی کا شاندار بیڈ روم، بیحد قیمتی پلنگ، کھڑکیوں پر جھولتے نفیس ریشمی پردے، دبیز قالین ہر چیز بدل گئی ہے بلکہ اپنا اعلیٰ ترین روپ حاصل کر چکی ہے ۔ دولت و امارت کی ایک خلیج ہے جو ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی ۔ وہ ایک لمحہ جو میں اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا تھا کیوں وقت کی خلیج میں بدل گیا ۔ میری زندگی کے وہ لمحے کہاں اڑ گئے جنھیں وقت سے مانگ کر میں نے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا ۔ یہ مٹھی ابھی کھلی بھی نہیں کہ لمحے ہوا ہو گئے، نازک احساسات کے وہ لمحے کیا کبھی لوٹ کر آئیں گے ۔

انھیں سوچوں کے سہارے کئی پیکر ذہن میں ابھرے اور ڈوب رہے ہیں اور انھیں ابھرتے ڈوبتے پیکروں کے درمیان ایک سراپا نگاہوں کے سامنے آکر منجمد ہو جاتا ہے ساکت رہ جاتا ہے ۔ یہ سراپا شبانہ کا ہے جو میری زندگی کی آرزو تھی میری چاہت کا حاصل تھی اسکی شبنمی آنکھوں کی تازگی میری روح کی ٹھنڈک تھی اس کی ہستی کے بغیر میرا وجود محض ایک سایہ بن کر رہ گیا، ایک ہیولیٰ، ایک ٹوٹا پھوٹا بت ۔

یادوں کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں ۔ وقت کی گردش گویا ٹھہر گئی ہے اور ماضی کی وادیوں میں وہ چھوٹا سا کچا مکان نظر آ رہا ہے ۔ جس کے آنگن میں میرے بچپن کی پہلواری تھی اور جس میں کئی پرخلوص ہستیاں تھیں، جن کے دامن میں میرے لئے چاہت تھی، اپنائیت تھی، محبت تھی اور پرخلوص جذبے تھے، شفقت اور ممتا کے سنہرے موتی تھے، حسن سلیقے کی شیرینی تھی اور مشرقیت کے پاکیزہ پھولوں کی کلیاں تھیں ۔ میں کیا تھا آوارہ بادل کا ایک ٹکڑا جس کا نہ کوئی ماضی تھا اور نہ مستقبل، کوئی اپنا تھا نہ پرایا وقت کے تھپیڑوں اور ضروریات زندگی کی خلش نے ایک اوسط درجے کا کلرک بنا دیا تھا ۔ ہوش سنبھالا تو خود کو سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کے شکنجے میں جکڑا پایا ۔

ظلم کی گرفت جب زندگی کا آخری قطرہ نچوڑ لینے کے قریب تھی تو ایک رات بھوک کی شدت سے بلبلاتے ہوئے وجود کو لے کر اس گھر کی چوکھٹ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ سڑکوں پر بوٹ پالش کرتے ہوئے اور پیٹ کی آگ کو روٹی کے چند ٹکڑوں سے بجھاتے ہوئے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا۔

ایک مخلص انسان کی قربت ملی اس کی انسانیت مجھے پیڑ کی چھاؤں سے اٹھا کر گھر کی چھاؤں میں لے گئی۔ اسکی شرافت نے ماضی کے زخم مندمل کر دیئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور اس نیک شخصیت کی بدولت ایک آفس میں کلرکی کی نوکری مل گئی لیکن بدنصیبی نے یہاں بھی میرا پیچھا کیا، اچانک کچھ دنوں کی رفاقت کے بعد اس ہستی نے، میرا ہی نہیں بلکہ دنیا کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن میں سماج میں ایک باعزت فرد کی زندگی گذارنے کے قابل ہوگیا تھا۔ اسی محلہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا، وقت اپنے انداز پر رفتہ رفتہ گذرنے لگا۔ وقت کا کارواں آگے بڑھ رہا تھا کہ میری معمولی علیک سلیک صفدر سے ہوگئی۔ صفدر شہر کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اسکے والد رحمن صاحب انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے ایک مکان خرید لیا تھا۔ ان کی پنشن کی قلیل رقم اور صفدر کی تنخواہ پر گھر کی گذر بسر ہوتی تھی۔ صفدر سے میری پہلی ملاقات ایک بس اسٹینڈ پر ہوئی پہلی ہی ملاقات میں اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مردانہ حسن و وجاہت کا ایک نمونہ تھا۔ اس پر نرم گفتاری اور رہن سہن کی نفاست و سلیقے نے اس کی ذات کو ایک خاص کشش اور خوبصورتی بخشی تھی۔ میں رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہوتا گیا اور خوشی اپنائیت کی حد کو چھونے لگی۔ میرا زیادہ تر وقت اب صفدر کے ساتھ گذرنے لگا۔ میرے کمرے اور صفدر کے گھر کے درمیان بہت ہی کم فاصلہ تھا۔ آفس سے واپسی پر میں صفدر کے گھر چلا جاتا جہاں مجھے رحمن صاحب کی پروقار شخصیت میں باپ جیسی شفقت، اور صفدر کی والدہ میں ماں جیسی ممتا کی مٹھاس کا احساس ہوا۔ میرا وقت اب صفدر اور اس کے گھر والوں کی قربت میں گذرنے لگا تھا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں اب اس گھر کا ایک فرد بن چکا تھا۔ صفدر کی تین بہنیں تھیں، ریحانہ، رخسانہ اور شبانہ۔ تینوں لڑکیاں شادی کے قابل تھیں۔ صفدر کا گھر خالص مشرقی ماحول اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ تینوں لڑکیاں سادگی اور معصوم حسن کا جیتا جاگتا پیکر تھیں، سرو قد، متناسب اعضاء لمبے لمبے بال جن کے چہروں پر فرشتوں جیسا معصوم تقدس تھا۔ چھوٹا سا گھر جہاں پیسے کی فراوانی تو نہ تھی لیکن سلیقہ سادگی اور صفائی کی اپنی مثال آپ تھا۔ کوئی ریاکاری، کوئی بناوٹ نہیں، ہر شے تصنع سے پاک اور ہر جذبہ خلوص اور فریب سے بے نیاز۔ اس گھر کا ہر فرد محبت اور انسانیت سے بھرپور وجود کا حامل تھا۔

اس خاندان کی شرافت نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کاش انسان میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ وقت کے ان لمحوں کو پکڑ کر قید کر سکتا جو اس کی زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں تو میں اپنی زندگی کے ان لمحوں کو جو میں نے صفدر کے خاندان کے ساتھ گذارے تھے قیمتی موتی کی طرح بند کر لیتا، لیکن ایسا نہیں ہوتا، وقت بدل جاتا ہے اور انسان کو یہ احساس تک ہونے نہیں دیتا کہ وہ کل کیا تھا اور آج کیا ہوگیا۔ شبانہ کا معصوم حسن اسکی بھولی صورت اور پاکیزہ وجود میرے دل کی گہرائیوں میں بس گیا تھا۔ وہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتی تھی لیکن اس کا اظہار نہ میں کر سکا تھا نہ شبانہ لیکن ایک ان دیکھا جذبہ تھا ایک نامعلوم خلش تھی جو ان جانے میں ایک کو دوسرے سے قریب کرتی جا رہی تھی میں اس کے مشرقی حسن و حیا کے سحر میں مسحور ہوتا جا رہا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جہاں مجھے زندگی کی ہر وہ خوشی حاصل ہوئی جس نے وہ تلخ حقیقت بھولنے پر آمادہ کر دیا کہ میں ایک زخم خوردہ انسان ہوں۔ شاید مجھے وہ سب کچھ حاصل ہو جاتا جسے پا کر میں بھی اس خود غرض اور مطلب پرست دنیا میں خوش رہنے کا حقدار بن جاتا۔ لیکن قدرت نے محرومیاں شاید میرا مقدر بنا دیا۔

صفدر کی شریف، ایماندار اور باکردار شخصیت نے اس کی فیکٹری کے مالک کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ صفدر جس فیکٹری میں کام کرتا تھا اس کے مالک کا شمار شہر کے بہت بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کی کئی فیکٹریاں تھیں کئی ٹرک اور بسیں چلتی تھیں لاکھوں کا بینک بیلنس تھا۔ ان تمام آسائشوں کے درمیان صرف ایک لڑکی صبا تھی۔ جس کے لیے انھیں صفدر کا انتخاب سب سے مناسب معلوم ہوا۔ صفدر ان کے معیار پر پورا اترتا

تھا۔ دولت کی ان کے پاس کوئی کمی نہ تھی انھیں داماد کے ساتھ ایک ذمہ دار اور ہونہار وارث کی بھی جستجو تھی جو دیانت داری سے ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹا سکے۔ انھوں نے صفدر کو ہر طرح سے جانچا پرکھا اور اپنے معیار کی کسوٹی پر پورا پایا۔ سوائے دولت کی کمی کے انھیں اس میں اور کوئی کمی نظر نہ آئی۔ انھوں نے رحمٰن صاحب کے یہاں صبا کا پیغام بھیجا جو فوراً ہی منظور کر لیا گیا۔ قدرت اچانک ہی اس گھر پر اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ مہربان ہو چکی تھی۔

کچھ دنوں تک شادی کی ہما ہمی رہی میں نے اس شادی میں صفدر بھائی کی حیثیت سے حصہ لیا اور اس خوشی کو اپنی بالکل اپنی خوشی تصور کیا۔ شادی کے بعد صبا اپنی شاندار کوٹھی سے اس چھوٹے سے متوسط گھرانے کی بہو بن کر آ گئی تقریب کے ہنگاموں سے جب فراغت ہوئی تو میں صبا سے ملنے کے لیے گیا۔ سجے سجائے پلنگ پر صبا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ میری نگاہیں اس ملکوتی حسن پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ آسائشوں کی گود میں پلنے والی وہ لڑکی کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کے حسین سراپا میں کھو کر رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی آسمانی حور ہے جو زمین پر اتر آئی ہے۔ نرم و نازک سرخ و سفید ہاتھ جن میں حنا کی خوشبو رچی بسی تھی مخروطی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگ کر رہی تھیں۔ چہرے پر جھولتی ہوئی سہرے کی لڑیاں جن کے اندر سے اس کا چاند سا چہرہ جھانک رہا تھا۔ مرمریں ہاتھوں میں سلام کے لیے ایک جنبش ہوئی پلکوں کی گھنی جھالریں آہستہ سے اوپر اٹھیں دو کالی اور بڑی بڑی آنکھوں نے جن میں شہابی رنگوں کی آمیزش سے ایک خمار سا پیدا ہو گیا تھا مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور جھک گئیں۔ میں دل ہی دل میں صفدر کی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگا اور اس کی آئندہ زندگی کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہ تھی لیکن صبا کے بعد سے مجھے اپنے لیے اس گھر میں اجنبیت کا احساس ہونے لگا۔ میں معمول کے مطابق وہاں جاتا لیکن گھر کے تمام افراد کو صبا کے ارد گرد جمع پاتا اور وہ ان کے درمیان کوئی شہزادی معلوم ہوتی۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرتا اور پھول پر ایک انجانا بوجھ ایک گھٹن کی سی کیفیت لے کر اپنے کمرے میں واپس چلا آتا۔ جب بھی اب وہاں جاتا میری نگاہیں اُن گم شدہ جذبوں کی تلاش میں بھٹکتی جو میری زندگی کا سرمایہ تھے۔ لیکن اب وہاں ان کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ نہ صفدر کی ذات میں وہ اپنائیت تھی نہ اس کے والد کی باتوں میں وہ شفقت و محبت کا لگاؤ نہ اس کی والدہ میں ممتا کے جذبے کی وہ بھرپور شیرینی۔ سب سے بڑھ کر شبانہ کی نگاہوں میں اس چاہت کے نشان کا شائبہ تک نہ تھا جو جذبات میں اتھل پتھل مچا دیا کرتے تھے۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ قدرت کی اس مہربانی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا، میں ایک مرتبہ پھر تہی دست ہو گیا تھا۔ اب اس گھر میں میرا وجود زمین پر پڑے ایک ٹوٹے پھوٹے کھلونے کے مانند تھا۔ بڑی تیزی کے ساتھ سب کچھ بدلتا جا رہا تھا۔ دولت کی دیوی نے جس کے اندر بہت بڑی کشش ہے چشم زدن میں سب کچھ اپنی طرف کھینچ لیا۔ گھر ایک صبا کا تھا اور یہاں اس کی دولت کی حکمرانی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہاں معمولی مکان کی جگہ شاندار کوٹھی نے لے لی اور کچھ ہی دنوں کے بعد مشرقی ماحول کا گہوارہ مغربیت کے تیز رنگوں میں رنگ گیا، اور میں وقت کی گردش سے بدلتے ہوئے دولت کے اس تیز و تند دھارے میں ایک بے حقیقت تنکے کی طرح بہہ گیا۔

میں اپنی جگہ آج بھی تنہا ہی ہوں زندگی کی محرومیاں بھی وہی ہیں جس میں اب ایک تیز درد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اکثر صفدر کی کوٹھی سے جلنے بجانے قہقہوں کی آوازیں میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترتی محسوس ہوتی ہیں۔ میں پکڑنا چاہتا ہوں اپنے ان انمول لمحوں کو جو کبھی میرے دکھے دل کا مرہم تھے لیکن دولت و امارت کی دیوی جو کبھی کبھی ہی کسی پر مہربان ہوتی ہے، ہاتھ بڑھا کر اپنی خون آشام انگلیوں سے اس مرہم کو پونچھ دیتی ہے۔ میں درد سے کراہ اٹھتا ہوں۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو اپنے بستر پر گر کر گئی۔ رات تک سسکتا رہتا ہوں ——

جھوما

نسیم امبہٹوی

میرے گھر کے سامنے کئی بنگالی خاندان آباد ہیں۔ غزالہ اسلامی ضوابط کے تحت پڑوسیوں سے ایسا میل ملاپ رکھتی ہیں کہ سب ایک دوسرے کے درد دکھ اور خوشی ومسرت میں شریک رہتے ہیں ـــ انھیں بنگالی خاندانوں میں سے ایک کی ایک بچی جھوما تھی۔ اندازاً ۲۲ر۲۳ سال کی بات ہے کہ لڑکیاں اسے گود میں لے کر آیا کرتی تھیں، پھر وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تو خود ہی کھیلنے کے لئے نجم السحر کے پاس آجایا کرتی تھی۔ یہ بچی اتنی حسین اور پیاری تھی کہ جب میں اسے دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ واقعی وہ کسی مصور کا شاہکار معلوم ہوتی تھی ـــ پھر دن گذرتے گئے، وہ سیانی ہوگئی اور اس نے بے تکلفی کے ساتھ گھر سے نکلنا اور آنا جانا بند کر دیا۔ برسوں گذر گئے۔ میں نے جھوما کو نہیں دیکھا پھر اچانک ہی ایک روز غزالہ نے کہا آج جھوما کی شادی ہے۔ سب کی دعوت ہے۔ میں نے پوچھا کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کوئی اسسٹنٹ انجنیر ہے۔ اور پھر اسی روز جھوما کی ماں جھوما کو لیکر میرے گھر آئیں۔ جھوما دلہن بنی ہوئی تھی۔ اور دلہن بنی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ میں کئی لمحے نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔ اسی وقت مجھے نجم السحر یاد آگئی۔ وہ بھی جب دلہن بنی تھی تو اس کا حسن بھی ملکوتی ہوگیا تھا۔ سنا ہے کہ لڑکیاں جب دلہن بنتی ہیں تو ان پر نور برسنے لگتا ہے۔ جھوما کے باپ کا انتقال ہوچکا تھا۔ ماں کا وہی حال تھا جو لڑکیوں کو رخصت کرتے وقت عموماً ہوا کرتا ہے وہ خوش بھی تھیں کہ انھیں ایک اچھا داماد مل گیا تھا جو برسرروزگار تھا، تندرست اور خوبرو دکھائی دیتا تھا اور ملنسار تھا۔ اس کا گھر بھی بالکل قریب تھا۔ اس کے باوجود انھیں غم بھی تھا کہ بہر حال ان کی بیٹی اب دوسرے کی ہوگئی تھی۔ ان کے چہرے پر خوشی اور غم کا امتزاج تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خوش ہیں یا مغموم۔

یہ بات نومبر ۸۳ء کی ہے۔ پھر اچانک ہی چند روز قبل یہ خبر ملی کہ جھوما کا شوہر مر گیا۔ سب لوگ جھوما کے شوہر کے گھر گئے ہوئے تھے۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد ہی تفصیل مل گئی۔

جھوما کو لے کر اس کا شوہر اپنی سسرال آیا تھا۔ جھوما کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ اس نے کہا "آج میں یہیں ماں کے پاس رہ جاؤں۔" شوہر نے کہا "اچھا ہے، مجھے پڑھنے کا موقع مل جائے گا" وہ کوئی امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

صبح ہی گھر میں کام کرنے والی نے آکر خبر دی کہ اس کے پکارنے اور چیخنے چلانے پر بھی دروازہ نہیں کھلا۔ سب حواس باختہ بھاگے۔ اور کسی پڑوسی کی چھت سے پھاند کر اندر اترے تو چھ ماہ پہلے کا دولہا مردہ پڑا تھا۔ ایک قیامت آگئی۔ ایک شور محشر سا اٹھا۔ کوئی سر پیٹ رہا تھا۔ کوئی سینہ کوبی کر رہا تھا کوئی کسی کو سنبھال رہا تھا، کوئی صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ جھوما اس وقت کس حال میں ہوگی، جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی ماند نہ پڑی تھی، جس کا سہاگ لٹ گیا تھا، جو بیوہ ہوگئی تھی اور جھوما کی ماں کا کیا حال ہوگا، جس کی بیٹی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، جس کی ساری خوشیاں چھن گئی تھیں۔ جس کے سارے ارمان چور چور ہوگئے تھے ایک ہی روز بعد مرنے والے کی سالگرہ تھی۔ جھوما نے اس کے لئے بڑے انتظامات کئے تھے۔ نہ جانے کیا کیا خود خرید کر لائی تھی۔ کتنی دھوم دھام سے وہ شوہر کی سالگرہ منانے والی تھی لیکن اب سالگرہ کا جشن نہ ہو سکتا تھا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

کیا حال ہوا ہوگا جھوما کا اس وقت۔ الفاظ میں اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ میں تعزیت کے لئے گیا تو جھوما اپنی ماں اور چند عزیز عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لیکن یہ وہ جھوما نہ تھی، جسے میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا، اور جسے میں نے دلہن بنا دیکھا تھا۔ وہ ایک ایسے بت کی طرح بیٹھی تھی جسے کسی سنگ تراش نے غم والم کا پیکر بنا کر رکھ دیا ہو۔ میں اس حادثہ کے متعلق دیر تک سوچتا رہا۔ جھوما نے اس غم کو کیسے برداشت کیا ہوگا کیسے وہ ایسا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے کے بعد بھی چور چور نہیں ہوئی۔ لیکن ایک جھوما ہی پر ایسا پہاڑ نہیں ٹوٹا تھا اس دنیا میں روز ہی ایسے سانحے ہوتے رہتے ہیں اور انسان انھیں برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ رفتہ رفتہ انھیں بھولنے بھی لگتا ہے۔ وقت کا مرہم بڑے سے بڑے زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ جھوما بھی ایک روز بدل جائے گی غم والم کا یہ بوجھ کم سے کم تر ہوتا جائے گا۔ ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ دنیا ایک ماتم کدہ نظر آتی۔ یہاں نہ مسکراہٹیں ہوتیں، نہ قہقہے

حریمی دسترخوان

آم کی لذیذ چٹنی

سامان :- کچے قلمی آم - ڈیڑھ کلو - شکر ایک کلو - سرخ مرچ مسلم ۵۰ گرام - نمک پسا ہوا حسب خواہش - پیاز - ایک بڑی گٹھی - ادرک ایک گرہ - لہسن ایک آنڈی - سرکہ - چار کی ایک پیالی - بادام کی گری ۵۰ گرام - کشمش - ۱۰۰ گرام - کالی مرچ ۱۰ گرام - تیل سرسوں یا جو آپ کو پسند ہو ۱۰۰ گرام

ترکیب :- آموں کو چھیل کر لمبی لمبی قاشیں کر لیں گٹھلی پھینک دیں - بادام کو گرم کر کے چھیلیں اور ہوائیاں تراش لیں - ادرک کو چھیل کر باریک تراش لیں - کشمش کو دھو کر خشک کر لیں - پیاز کے لچھے بنا لیں۔

تھوڑے پانی کو کھولا کر آم کی قاشوں کو چند جوش دے کر کسی چھلنی میں ڈال دیں تاکہ پانی نکل جائے - اس کے بعد تیل کو گرم کر کے لہسن کے جوئے اور پیاز کے لچھوں کو سنہرا کر کے نکال لیں اور اسی تیل میں آم کی قاشوں کو ڈال کر تلیں، یہاں تک کہ رنگت سنہری ہو جائے - انھیں بھی نکال لیں اور جو تیل بچا ہو اس میں پیاز، کشمش، بادام کی ہوائیاں کالی مرچیں مسلم، نمک آم کی قاشیں اور شکر ڈال کر ہلکی آنچ پر چار کی ایک پیالی پانی ڈال کر پکائیں جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو سرکہ ڈال کر چمچہ سے ہلا لیں - ٹھنڈا ہو جانے پر کسی صاف مرتبان میں رکھ لیں - کافی دنوں تک استعمال کر سکتی ہیں۔

مرسلہ :- زاہدہ خاتون (ہردوئی)

ڈبل روٹی کے دہی بڑے

سامان :- ڈبل روٹی کے تندے ہوئے سلائس - پانچ - بیسن ۱۰۰ گرام تازہ دہی ½ کلو - کھانے والا سوڈا چار کا ½ چمچہ - شکر - چار کا ایک چمچہ تیل حسب ضرورت - سرخ مرچ پسی ہوئی - حسب خواہش نمک انداز سے ہری مرچ - ہرا دھنیا - حسب خواہش - پیاز، دو آنڈی - املی کی چٹنی بڑوں کا مسالہ

پہلے املی کی چٹنی کی ترکیب ملاحظہ فرمائیے
پکی املی ‍ ے کر اس کے بیج نکال کر بھگو دیں - بعد میں اسے پیس کر رکھ لیں۔

دہی بڑے کا مسالہ

زیرہ اور دھنیا چار کا ایک ایک چمچہ - کلونجی اور میتھی چار کا آدھا آدھا چمچہ - ان چاروں چیزوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ بھون کر بالکل ذرا سا کالا نمک ملا کر باریک پیس کر علیٰحدہ رکھ لیں - یہ مسالہ دہی بڑے کھاتے وقت چھڑک کر کھایا جاتا ہے -

بڑے کیسے بنائیں۔

سلائسوں کے کنارے تیز چھری یا بلیڈ سے چھیل لیں - بیسن میں سرخ مرچ، سوڈا، ہری مرچ باریک باریک کاٹ کر تھوڑا نمک اور تھوڑا پانی ملا کر آمیزہ تیار کریں - آمیزہ نہ زیادہ گاڑھا ہو نہ زیادہ پتلا - اس کے بعد ۵۰۰ گرام پانی میں ذرا سا نمک ملا کر رکھ لیں - تیل فرائی پین میں کڑکڑائیں اور سلائسوں کو تل کر گلابی کر کے نمک ملے پانی میں ڈال دیں -

دہی میں شکر ڈال کر پھینٹیں - سلائس جب پھول جائیں تو انھیں دبا کر ان کا پانی نکال لیں اور دہی میں ڈال دیں - پیاز کو لچھوں کی شکل میں کاٹ کر بڑوں پر پھیلا دیں - ہرا دھنیا بھی باریک باریک تراش کر ڈال دیں ساتھ ہی املی کی چٹنی چھڑک دیں خیال رہے کہ چٹنی زیادہ نہ ڈالیں ورنہ بڑے کھٹے ہو جائیں گے۔

کھاتے وقت بڑوں کا مسالہ چھڑک لیں - نمک کم محسوس ہو تو اوپر سے ڈال لیں - اسی طرح زیادہ مرچ پسند ہو تو پسی مرچ چھڑک لیں۔

مرسلہ :- مسز نجم السحر منصور (باندہ)

• حریم کے لئے مضامین یا افسانے وغیرہ بھیجئے تو اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے - صرف مضامین پر غور کیا جاتا ہے جو حریم کی سالانہ خریدار بہنوں یا بھانجیوں کے لکھے ہوتے ہیں۔

جسمانی صحت اور غذا

ـــــ فیروزی ہتیم اشرفی

تندرستی ذہنی اور معاشرتی خوشحالی کا نام ہے نہ کہ بیماری یا کمزوری کی غیر موجودگی کا۔

ایک صحت مند دماغ۔ صحت مند جسم میں ہی ہوتا ہے۔ اچھی صحت کا دارومدار اچھی غذا پر منحصر ہوتا ہے لیکن اچھی غذا سے مطلب قیمتی کھانوں سے نہیں ہے بلکہ اچھی غذا وہ ہوتی ہے جس کی آپ کے جسم کو ضرورت ہوتی ہے جسے متوازن غذا کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ مرغن اور قیمتی غذائیں بھی مفید ہوتی ہیں لیکن اسی حالت میں جب کہ آپ کو ان کی ضرورت ہو اور آپ انھیں اپنے لئے حاصل بھی کر سکیں۔

غذا کے سلسلے میں مختلف نظریات ہیں۔ بہت سے لوگ گوشت (انڈا اور مچھلی کو اچھی غذا کہتے ہیں۔ بعض پھلوں اور سبزیوں کو بہترین غذا سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی بھی کھانے والی چیزیں دنیا میں پیدا ہوتی ہیں سب ہی میں ایسے اجزا موجود ہیں جو ہماری شکم پری ہی نہیں کرتے بلکہ ہماری صحت کے لئے مفید بھی ہوتے ہیں لیکن ہر جسم کو ایک ہی طرح کی غذا فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس جسم میں کس چیز کی کمی ہے اور وہ کس غذا سے اسے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور کتنی کھانے سے۔ اپنے معالج سے آپ اپنا معائنہ کرا کے معلومات حاصل کریں اور پھر ایسی چیزوں کا استعمال کریں کہ آپ کے جسم کو وہ وٹامن مل سکیں جن کی اسے ضرورت ہو۔ ڈاکٹر ہی آپ کو یہ بھی بتا سکے گا کہ مطلوبہ وٹامن کن کن چیزوں میں ہوتا ہے اور آپ ان میں سے جنھیں پسند کریں انھیں اپنی غذا میں شامل کریں۔

کھانا ہر گھر میں پکتا ہے لیکن کچھ ایسی باتیں ہیں جنھیں ہر خاتون خانہ نہیں جانتی۔ میں اس سلسلہ میں بھی کچھ لکھوں گی تاکہ ان کا علم ہر خاتون کو ہو جائے جو کھانا پکانے میں دلچسپی رکھتی ہو۔ یہ باتیں جو میں لکھ رہی ہوں۔ مختلف انگریزی کتب وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوئی ہیں ان پر آپ کس حد تک عمل کر سکیں گی یہ میں نہیں جانتا لیکن آپ ان پر عمل کریں گی تو یقیناً آپ کو فائدہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان کی بیشتر باتیں سائنسی تجربات کی رہین منت ہیں۔

کھانا پکانے کے لئے برتنوں کا رواج بہت قدیم ہے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ مٹی کی ہانڈیوں کا استعمال ہوتا تھا یا تانبے اور پیتل کے برتن استعمال کئے جاتے تھے اور اس کے بعد المونیم کے برتنوں کی ایجاد ہوئی یہ برتن بہت زیادہ ہلکے اور سستے ہوتے تھے اس لئے ان کا استعمال عام ہو گیا اور اب تک المونیم سے زیادہ کسی بھی دھات کے برتن استعمال نہیں ہوتے۔ المونیم کے بعد اسٹیل (اسٹین لیس) کی ایجاد ہوئی یہ سب سے قیمتی دھات ہے برتنوں کے لئے۔ اس کے باوجود ان کا رواج بڑھتا جا رہا ہے خصوصیت سے پیچھے تو اب زیادہ تر اسی دھات کے ہر گھر میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ گراں ہونے کے باوجود اس کی مقبولیت اس لئے ہے کہ ان پر قلعی کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ کافی مضبوط بھی ہوتے ہیں۔ ان کے مفید یا مضرت رساں ہونے کے متعلق ابھی تک کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہرحال مٹی کے برتنوں کا رواج تو اب ختم ہی ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ جلد ٹوٹتے ہیں۔ حالانکہ دال جتنی لذیذ مٹی کی ہانڈی میں پکتی ہے اور کسی دھات کے برتن میں نہیں پکتی اسی طرح دودھ جوش کرنے کے لئے بھی مٹی کے برتن مفید ہوتے ہیں۔

تانبے اور پیتل کے برتنوں پر سیسے کی قلعی ہوتی ہے جو اب بہت گراں ہو گئی ہے۔ بغیر قلعی کے ان برتنوں میں کھانا پکانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ لیکن قلعی دار ہوں تو ان میں پکا کھانا نقصان دہ نہیں ہوتا ہے۔ اسیلئے کہ قلعی کی ایک معمولی مقدار پکتے وقت غذاؤں میں شامل ہوتی رہتی ہے جو صحت کے لئے فائدہ مند ہے۔

کھانا سب سے زیادہ لذیذ لکڑی اور کنڈے (اپلے) کی آنچ میں پکتا ہے اس کے بعد ڈھاک کے کوئلے پر۔ اس کے بعد اسٹوو، بجلی کے چولھے اور گیس پر لیکن اس ترقی یافتہ دور میں شہری تو زیادہ تر اسٹوو اور گیس ہی پر کھانا پکاتے ہیں لکڑی کنڈے کا استعمال برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ دیہاتوں میں البتہ ابھی تک لکڑی اور اپلوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

کھانے والی اشیاء میں آٹا چاول دال تو ہر گھر میں خرید کر حسب مقدرت رکھ لیا جاتا ہے لیکن سبزیاں۔ گوشت اور مچھلی وغیرہ کا خریدنا تقریباً روزانہ ہی ہوتی ہے۔ صرف آلو ایک ایسی ترکاری ہے جو خریدنے کے بعد ہفتوں رکھی جا سکتی ہے۔ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سبزیاں اور پھل کھیتوں اور باغوں سے ٹرکوں یا گاڑیوں کے ذریعے جتنی دیر میں منڈی پہنچتے ہیں اتنی دیر میں ان کے وٹامن، درمنرلس کسی حد تک ضائع ہو جاتے ہیں خصوصیت کے ساتھ وٹامن سی بہت کم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ شہر میں رہتی ہیں تو

کوشش کریں کہ صحن یا اگر بالا خانے پر ڈرس وغیرہ میں سبزیاں اگاکر انھیں استعمال کریں تو بہت مفید ہوں گی۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ سبزیوں کو جلد سے جلد استعمال میں لایا جائے تاکہ ان کی افادیت کم نہ ہو سکے۔

انڈے بھی کافی دنوں تک رکھ کر استعمال کئے جا سکتے ہیں جاڑوں میں یہ جلد خراب نہیں ہوتے۔ اگر فرج ہو تو گرمی میں بھی ان کے خراب ہونے کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے۔ انڈے نہ صرف صحت انسانی کے لئے مفید ہوتے ہیں بلکہ وقت بے وقت ان کی موجودگی سے خاطر مدارات آسان ہو جاتی ہے۔ رات برات کوئی مہمان آجاتے تو انڈوں کا سالن خاگینہ اور آملیٹ بہت ہی کم وقت میں تیار کر کے دسترخوان پر رکھا جا سکتا ہے۔

تازہ اور گرم کھانا جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ باسی کھانا بھی اگر گرم کر کے استعمال کیا جائے تو مضر نہیں ہوتا۔

کھانوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہیئے تاکہ گرد غبار مکھیوں اور کاکروچوں سے محفوظ رہیں۔ کھانے کے ساتھ فصلی پھلوں کا استعمال ضرور کریں۔ پھل قدرت کے بیش بہا عطیے ہیں اور ان میں بڑے فوائد ہوتے ہیں۔ افسوس کہ گرانی کے باعث کم ہی گھروں میں پھلوں کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن امرود، کھیرے، کیلے اور کھیرے وغیرہ اتنے گراں نہیں ہوتے کہ انھیں عام لوگ نہ کھا سکیں۔ ان سب میں بھی بڑے فوائد ہیں۔

تبصرات

ٹھنڈی گواہی:۔ اسلم واحدی صاحب کے چھ ڈراموں کا مجموعہ ہے جو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے اردو سماج پبلی کیشن ۷۵، موتی لال بوس روڈ لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۲۰ کتابت و طباعت اوسط۔ قیمت دس روپیہ جو موجودہ گرانی کے لحاظ سے کم ہے۔

ٹھنڈی گواہی اور تین دوسرے ڈراموں "وہ ہوا کے رخ جو بدل گئے"، "اور کارواں بنتا گیا"، "دو چار تھپیڑے ان کو بھی" میں مصنف نے جہیز کے مسئلوں کو مختلف انداز سے پیش وقت کی ایک اہم ضرورت سے تعاون کیا ہے۔ یہ ڈرامے اگر تعلیمی اداروں اور سماجی کارکنوں کی جانب سے اسٹیج کئے جائیں تو ان کا کافی اثر ہو سکتا ہے۔

لمحوں کی حرکت:۔ طفیل سیماب کے ۲۵ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۸۰ صفحات پر شائع کیا گیا ہے ابتدا کے ۱۰ صفحات پیش لفظ اور تعارف وغیرہ سے متعلق ہیں۔ بقیہ میں افسانے ہیں جن میں سے کچھ افسانوں کی صنف میں لائے جا سکتے ہیں باقی یا تو مضامین ہیں یا انشائیے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ طفیل سیماب صاحب نے سماج کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے تمام ۲۵ مضامین یا افسانوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں نصیحت موجود نہ ہو اور میرے نقطہ نظر سے یہی سب سے بڑا وصف ہے کہ مصنف یا شاعر پڑھنے والوں کو چونکا دے ہم سب کچھ ہوتے ہوئے اس دنیا میں دیکھتے ہیں لیکن انھیں کچھ نہیں پاتے شاعر اور مصنف کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ سننے اور پڑھنے والوں کو حقیقت سے دوچار کر دیتا ہے۔ طفیل سیماب کے یہ تمام مضامین اور افسانے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب بہار اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے چھپی ہے قیمت صرف سات روپیے۔ ملنے کا پتہ:۔ طفیل سیماب۔ کھام گاؤں ضلع بلڈانہ۔ مہاراشٹر۔

• خط لکھنے کے بعد ایک بار غور سے دیکھ لیں کہ اس پر آپ نے اپنا نام و پتہ لکھا ہے یا نہیں۔ ہر ماہ چند ایسے بھی خطوط آتے ہیں جن میں نام و پتہ نہیں ہوتا اس لئے تعمیل نہیں ہو پاتی۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے۔ شعر ہمارے عنوان کے تحت ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو اور سنجیدہ و موزوں ہو۔ جس ماہ میں شعر چھپنا ہو اس سے قبل ماہ کی ۲۰ تاریخ تک وصول ہونے والے اشعار ہی شائع کیے جاتے ہیں۔

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

مرسلہ: قرۃ العین حیدر (نندیال)

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

مرسلہ: نجمہ ظہیر (بمبئی)

شکوہ درد و غم نہ کر تجھکو نہیں ہے کیا خبر
درد جو کم ہوا تو پھر لذتِ زندگی نہیں

مرسلہ: یاسمین رضوی (سیتاپور)

رکھی ہم میں کشش اتنی کہ تم کو یاد رہ جاتے
نہیں شکوہ کوئی تم سے ہمارے بھول جانے کا

مرسلہ: سہیلہ بانو (ہاسن)

ظالم کا نہ کر شکوہ ظلموں کی نہ کر پروا
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا۔

مرسلہ: پروین نذر (مدراس)

سچ ہے یہی کہ آپ کے شکوے بجا نہ تھے
سنگِ ستم عتاب کے سب دوستانہ تھے

مرسلہ: نور جبیں دل افروز (رحمت نوادہ)

ہے تم سے محبت تو شکایت بھی ہے تم سے
غیروں سے نہ شکوہ نہ شکایت نہ گلہ ہے

مرسلہ: کے سمیعہ صبا (آمبور)

درد اٹھتا ہے اشک بہتے ہیں، یوں محبت مجھے عطا کی ہے
تجھ سے شکوہ تو کچھ نہیں لیکن اے خدا میں نے کیا خطا کی ہے

مرسلہ: زاہدہ خاتون۔ بلواٹال۔ موتیہاری

مجھ کو تو شکوہ نہیں کاتب تقدیر مگر
ہو جو پڑے تو کبھی اگر میرا مقدر دیکھیے

مرسلہ: نجمہ انصار (کٹیکل)

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مرسلہ: امتیاز کاظمی ایم۔اے (مظفرپور)

مرسلہ: ارجمند شاہین (بھاگلپور)

وہ شکوے مجھکو رلاتے ہیں خون کے آنسو
جو لب پہ آ نہ سکے حالِ دل سنا نہ سکے

مرسلہ: شہناز یوسف احمد (ترچی)

ظالم کا نہ کر شکوہ ظلموں کی نہ کر پروا
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا

مرسلہ: ب۔ ان آنسہ ابراہیم (بنگلور)

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

مرسلہ: شاہین (آرہ)

میری زباں پہ شکوۂ رنج و الم نہیں
ماں کی دعائیں ساتھ ہیں اب کوئی غم نہیں

مرسلہ: صادقہ تبسم (میسور)

شکوہ کسی سے دل کے نہ ملنے کا کیا کریں
دو حرف لفظ دل میں ہیں وہ بھی جدا ملے

مرسلہ: ناہید تبسم۔ میسور (کرناٹک)

نصیحت کی باتیں

- شرک کے بعد والدین کی نافرمانی سب سے بڑا گناہ ہے
- کام شروع کرنا انسان کا کام ہے اس کی تکمیل خدا کرتا ہے۔
- جوانی پر ناز نہ کر۔ یہ بہت جلد ڈھل جاتی ہے۔
- بدگمانی بہت سے گناہوں کا سبب بن جاتی ہے۔

مرسلہ: تنصیرہ تبسم (آمبور)

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا ہونا ضروری ہے۔ خبریں مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائیں۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔

(ادارہ)

ولادت اطفال کی خبریں

• بہن رضیہ محسن صاحبہ (بھوپال) کے فرزند نام سلمہٗ کو اللہ پاک نے ۱۰ رمئی ۱۹۸۶ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام صفیہ سلطان قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔ (نسیم انہونوی)

• نجمہ ظہیر (بمبئی) میرے اکلوتے بھائی حافظ محمد یونس اور بھابی روبینہ کوثر کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۰ راپریل ۱۹۸۶ء بروز جمعرات بوقت ۲ بجے شب ایک دختر عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

• شیریں قدیر (لکھیم پور کھیری) میری پھوپھی صاحبہ کو اللہ پاک نے ۱۵ رمئی ۱۹۸۶ء بروز بدھ بوقت صبح ۶ بج کر ۲۰ منٹ پر میرے لئے ایک بچے کو بھیج دیا جو مجھے اپی کہے گا۔ اللہ پاک اسے جلدی سے بڑا کر دے اور وہ بولنے لگے۔

• راحیلہ اسد (آجوہ) میرے ماما محمود صاحب اور مامی نازنین آرا صاحبہ کو اللہ پاک نے پہلی بار بتاریخ ۲۰ رجون ۱۹۸۶ء بروز جمعرات بوقت ۷ بجے ایک دختر عطا فرمائی نام صفوبیہ عنبرین قرار پایا۔ پروردگار سے دعا ہے کہ بچی کو والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغاماتِ نشاط

• میرے مخلص دوست مختار احمد صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل آفس یوپی (پھولسرودے نگر۔ لکھنؤ) کی صاحبزادی رضوانہ سلمہا کی شادی امتیاز سلمہٗ (فرزند جناب عطا حسین صدیقی مرحوم) کے ہمراہ ۲۰ رجون ۱۹۸۶ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ جس میں مختار صاحب کے اعزہ، اقربا اور مخلصین نے شرکت کی۔ اللہ پاک رضوانہ سلمہا اور امتیاز سلمہٗ کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ (نسیم انہونوی)

• رابعہ قادر (موتی پور سلطان پور) میری بیٹی نفیسہ کوثر سلمہا کی شادی ارشاد احمد سلمہٗ (فرزند جناب محمد سبحان قاسم سیٹھ) ۲۱ راپریل کو بمقام بھیونڈی سیمن یونین بنگلور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• ممتاز رشید ثروت تابانہ نازلی (رپہ نام بٹ) ہمارے بھائی ریاض الرحمٰن (فرزند جناب خلیل الرحمٰن مرحوم) کی شادی شکیلہ بانو کے ساتھ ۱۹ راپریل ۱۹۸۶ء بروز ہفتہ بمقام شادی محل دیلور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• امتیاز فاطمی ایم اے (مظفر پور) ہماری نند کی اکلوتی بیٹی نشاط فاطمہ ایم۔ اے کی شادی ہمارے خالہ زاد بھائی سید سکندر حسین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایڈلٹ ایجوکیشن (پٹنہ) کے ساتھ ۱۰ رمئی ۱۹۸۶ء کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ بمقام رانچی بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ زندگی کے اس نئے سفر میں اس جوڑی کے قدم ہمیشہ کامیابی و کامرانی کی جانب بڑھتے رہیں۔

• زاہدہ خاتون (بلواٹال۔ موتی ہاری) میرے بھانجے محمد عاصم پرویز خاں (فرزند محمد قاسم خاں صاحب۔ فرہیاں۔ ساون) کی شادی زبیدہ خانم (بنت محمد ابراہیم خاں۔ سنجواڈہ۔ ساون) کے ہمراہ ۱۵ راپریل ۱۹۸۶ء بروز سوموار بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• شمس النساء بیگم (کلکتہ) میرے بھائی محمد ذکی شمسی کی شادی نازنین شاداب (دختر جناب غلام سبحانی صاحب) کے ہمراہ ۱۳ راپریل ۱۹۸۶ء بروز سنیچر بمقام کلکتہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• نور محمد حاجی صالح محمد سیٹھ کے فرزند ارجمند محمد نشاط سلمہٗ کا

شادی خانہ آبادی۔ نور چشمی مریم سلمہا بی اے دختر نیک اختر (جناب عثمان غنی گنادیہ) کے ساتھ ۲۰ جون ۸۵ء کو کیونٹی سروس سنٹر سینٹ تھامس کیتھیڈرل بیسیلیکا چرچ سیلا پور مدراس میں بعد مغرب بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ بہن خدیجہ نور محمد صاحب کو خصوصیت سے مبارک باد پیش کر رہا ہوں۔ (نسیم الہو نوی)

• عزیزی ڈاکٹر ہادی عابدی سلمہٗ (امام باڑہ - فیض آباد کے فرزند دل بند حسن ضمیر سلمہٗ کی شادی کے سلسلے میں ایک شاندار عشائیہ ۸ جولائی کی شب میں بمقام امام باڑہ فیض آباد میں دیا گیا شادی نشاط فاطمہ سلمہا دختر نیک اختر ڈاکٹر علی نقی رضوی صاحب لکچرر حسین پور۔ فیض آباد) کے ہمراہ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم الہو نوی)

• شیخ اعظم علی قدوائی کی پوتی شگفتہ پروین سلمہا (دختر زبیر اعظم قدوائی مرحوم) بنکی، بارہ بنکی، کی شادی زبیر احمد سلمہٗ (فرزند طفیل احمد صدیقی صاحب لکھنؤ) کے ہمراہ ۲۹ جون ۸۵ء کو بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔

(نسیم الہو نوی)

انتقال پر ملال کی خبریں

• مس سارہ رمزی خاں (ملیح آباد) میری اچھی خالہ انیسہ بیگم صاحبہ ۱۲ اپریل ۸۵ء بروز اتوار بوقت ۲ بجے شب ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہی عدم ہو گئیں۔ مرحومہ پابند صوم و صلوٰۃ اور خوش اخلاق تھیں اللہ پاک انھیں بخشے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

• صبیحہ یاسمین۔ (کلب) ہمارے سابق صدر مدرس جناب عبدالقادر ۲۲ اپریل ۸۵ء بروز پیر انتقال فرما گئے۔ پسماندگان میں تین لڑکے اور چار بیٹیاں ہیں۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ورسلا تنصیرہ تبسم عطیہ سلطانہ (آصود) افسوس کہ ہمارے نانا ایم عبدالرزاق صاحب ۱۳ مئی ۸۵ء بروز پیر بوقت ۱۱ بجے شب قلبی دورہ پڑنے سے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے مرحوم بڑے ملنسار اور خلیق انسان تھے اس لئے غیروں نے بھی ان کے انتقال کا غم منایا۔

• بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ جناب رؤف احمد صاحب رئیس مصفیٰ پور ایک طویل علالت کے بعد ۲۶ مئی کو کانپور کے ہیلٹ اسپتال میں انتقال فرما گئے۔ ۱۴ مارچ کو انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا جہاں ان کے گردے کا آپریشن ہوا تھا۔ مرحوم بڑے نیک نفس اور قدیم تہذیب کا مرقع تھے۔ اللہ پاک مغفرت کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (نسیم الہو نوی)

• حریم کی ایک قدیم پرستار قیصر جہاں بیگم رئیس ملیح آباد جو عرصہ سے لکھنؤ میں مقیم تھیں ۲ جون ۸۵ء بروز اتوار بوقت ۶ بجے شام کو رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ عرصہ سے ضیق النفس میں مبتلا تھیں۔ ضعف کے باعث عرصے سے صحت بہت خراب رہتی تھی بڑی پرہیزگار، عبادت گزار اور محبت کرنے والی بی بی تھیں حریم کی توسیع اشاعت کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ مرحومہ کی یادگار ان کی اکلوتی بیٹی قمر عزیز ہیں۔ مرحومہ کو شاعری سے بھی شغف تھا اکثر ان کا کلام حریم میں شائع ہوا ہے۔ (نسیم الہو نوی)

• نجمہ حافظ (ٹمکور) افسوس میرے جواں سال بھائی کے عبدالعلیم عرف بابو۔ عمر کے اٹھائیسویں سال میں ۲۰ مئی ۸۵ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال فرما گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ایس بشیر احمد (بنگلور) افسوس ہماری والدہ محترمہ مہر النساء صاحبہ ۱۱ جولائی ۸۵ء کی شب میں ۸ بج کر ۳۰ منٹ پر قلبی دورہ پڑ جانے سے اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں مرحومہ بڑی رحم دل خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھیں دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(مرحومہ حریم کی قدیم خریدار تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر سے مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میں بھی شریک غم ہوں) (نسیم الہو نوی)

• ڈاک کی بدنظمی کے باعث آپ کے خطوط بھی کافی تاخیر سے وصول ہوتے ہیں۔ آپ کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔

- **عید** ۔ ایک ماہ کی عبادت و ریاضت کا انعام ہے
- **عید** ۔ قومی یک جہتی کا پیغام ہے۔
- **عید** ۔ مساوات کا ہمیں درس دیتی ہے۔
- **عید** ۔ غریب و امیر کا فرق مٹا کر بلا تفریق مذہب و ملت سب کو گلے ملاتی ہے۔
  دوست دشمن محبت ہی کے دھارے میں بہنے لگتے ہیں۔
- **عید** ۔ سارے بھارت واسیوں کو ایک ہی رنگ دیتی ہے اور وہ رنگ ہے
  میل ملاپ کا بھائی چارے کا۔

آیئے! عید کی ان پرمسرت ساعتوں میں یہ عہد
کریں کہ ہم تمام طبقوں اور فرقوں کے درمیان
ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنے اور ملک کو ترقی و خوشحالی
کی منزل تک لے جانے کے لئے اپنی بہترین
صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے۔

یاد رکھیئے

- جمہوریت کی بقا اور ملک کی ترقی کا راز قومی یک جہتی کے سچے جذبے ہی میں مضمر ہے۔

جاری کردہ:۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

کو دیا ۔

"صنوبریہ ۔ کیا مطلب ؟" وہ سیدھے ہو بیٹھے ۔

مم ۔ مطلب " اس نے سر اٹھایا ۔ بے حد خلوص و ثوق اور ناقابل فہم سے انداز میں جواب دیا " صاحب ۔ ہم نے آپس میں کہا ہے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست بنے رہیں گے ۔ صنوبریہ بی بی نے مجھے اپنا دوست بنا لیا ہے ۔ وہ بھی کسی کو اپنی سہیلی نہیں بناتیں ۔ صاحب ان سے بھی تو ان کی سہیلیاں خفا ہیں ! "

اور ابھی ایک خونیں مستقبل ان کے سامنے آ گیا ۔ دو تنو مند مرد ۔ ایک کمزور سی لڑکی ۔ مردوں کی خونخوار سرخ آنکھیں ۔ لڑکی کی پر نم آنکھیں ۔ اور پھر یہ سرخ دھند یکبارگی صاف ہو گئی لیکن بڑے صاحب کو بڑے کرب میں چھوڑ گئی ۔

انھوں نے کہا " اچھا ایاز ۔ تم اسی اسکول میں پڑھنا چاہتے ہو نا تو میں تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچائے دیتا ہوں ۔ اس طرح بہت آسانی ہو جائے گی ۔ اور تم پھر تمھیں ستا نہ سکے گا ۔ سمجھے ! ۔ میں وہاں آ کر تم سے مل جایا کروں گا ! "

ایاز کا چہرہ سست ہو گیا ۔ بولا " بڑے سرکار ۔ میں چاہے پڑھوں چاہے نہ پڑھوں ۔ مگر میں آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گا ۔ "

" بیٹے تم ابھی چھوٹے ہو ۔ تم سمجھتے نہیں " انھوں نے اس کا سر سہلا کر کہا " مگر میاں سوچو کر مسلمان گھروں میں لڑکے لڑکی کی دوستی ابھی نہیں نبھی جاتی ! ۔ تم بے شک بہت اچھے بچے ہو ۔

وہ تو جہاں پہونچ گیا وہ جگہ جنت تھی !

پھر اسے بڑے صاحب نے اپنے پاس بلایا ۔ اور اس سے جانے کیا پوچھتے رہے ۔ اسے کیا معلوم تھا ۔ کیا بتاتا ۔ ! وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تک وہ خالہ کے ہاں کیا کرتا رہا تھا ۔ جواب دیتے اسے نہایت شرم آئی ۔ گھسیٹتا کرکھاتا اور کھیلتا رہا تھا ۔ اگر وہ کہیں کہہ دیتا کہ کبڈی اور گلی ڈنڈہ کھیلنے میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ یا یہ کہ گولیاں کھیلنے میں وہ ماہر ہو چکا تھا ۔ اس طرح کھٹاک سے گولی پر گولی مارتا تھا کہ وہ اڑ کر دس گز دور چلی جاتی تھیں !

کچھ پڑھے لکھے ہو " بڑے بھائی جان نے پوچھا ۔

منھ ہی منھ میں بڑبڑا کر اس نے سر جھکا لیا ۔

کون پڑھواتا غریب کو ۔ ! " ایک خاتون نے کہا ۔ تمہارے ماں باپ تب اس پر خجالت کا دورہ پھر پڑا یہ تھی بے وقوفی ۔ اس نے کبھی خالہ سے پوچھا ہی نہ تھا کہ اس کے ماں باپ کہاں تھے ۔ تھے بھی کہ نہیں ۔ وہ یونہی آسمان سے ٹپک پڑا تھا ۔ یہ تو اسے بخوبی علم تھا کہ ہر لڑکے کے ماں باپ ضرور ہوتے ہیں کئی مثالیں اس کے سامنے تھیں ۔ اب جیسے کہ روشن کا باپ بھی تھا ۔ ماں بھی ۔ اس کی سہیلی زاہدہ کے بھی ماں باپ تھے ۔ جب وہ گھومتے ہوئے بغیچے میں یہ بات ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ یونہی زمین سے برآمد نہیں ہوا ہے تو ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا ۔

" تو پھر میاں تم آخر آئے کہاں سے ہو ؟ ضرور تمھارے بھی ماں باپ ہوں گے ۔ "

اس نے بھائی جان کی آواز سنی: خالہ نے کوئی خاص بات چھپائی ضرور ہے۔ وہ اسے یہاں جھونک گئی ہیں۔ ہر کام میں وہ اپنا فائدہ دیکھتی ہیں خدا جانے اب کون سا فائدہ ان کے پیشِ نظر ہے؟"

ہوگا: بڑے صاحب کی بیگم جو بے حد محبت والی لگ رہی تھیں بولیں "کسی کے نفع نقصان سے ہمیں کیا واسطہ۔ یہ بے چارہ بچہ ہم پر کون سا بوجھ ہے۔ اگر یہ بھاگ نہیں تو عمر بھر گھر کا ایک فرد بن کر رہے گا۔ مجھے تو غریب کی شکل دیکھ کر رحم آرہا ہے۔ جانے کون موئے گنہگار ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کو یوں ایرے غیرے کے حوالے کرکے پاپ سر سے اتارتے ہیں۔ خدا کا خوف نہیں کرتے۔ مزے میں نگوڑے دندناتے ہیں۔!"

دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ بڑے مزے میں گزرا۔ رات آئی سر پر بلا آگئی۔ اسے ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ جس میں دیوار سے لگی مسہری بچھی تھی ایک طرف جو حصہ فرش کا کھلا تھا وہاں قالین کا ٹکڑا بچھا تھا۔ بڑے دروازے کو کھولنے سے سامنے باغ نظر آتا تھا اور دروازے کے سامنے گھومتا ہوا برآمدہ تھا! اس نے دیکھا کہ چھت میں پنکھا بھی اٹکا ہوا تھا یہ دیکھ دیکھ کر اس کے حواس گم ہوئے جارہے تھے۔ کیا یہ سچ مچ اس کا کمرہ تھا اب تک تو وہ ایک کچے سے کمرے میں خالہ سے لپٹ کر سو جاتا تھا اور کیا نام کہ چھوڑ گئے۔ لیکن یہاں۔ جب وہ کمرے میں آیا تب لرز رہا تھا۔ کیسے کٹے گی یہ رات۔ ایسے سوتے کلیجہ تھرا رہا تھا۔

دس بجتے بجتے سب اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے۔ اور اسے ایک ملازم یہاں چھوڑ گیا۔ اس کا دن جتنا خوبصورت تھا۔ رات

آدمی نہیں تھے۔ میرے اترے ہوئے کپڑے پہنتا ہے۔ میرا ۔۔۔ کھاکے۔ ہا ہا ہا۔!"

• ارقم۔! چھوٹی بھابی نے اسے ڈانٹا۔

"جلن۔ یہ ان کے خیالات کیسے عجیب ہیں؟" بڑے صاحب نے تعجب سے کہا۔

"کن لونڈوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو؟" بڑے بھیا نے پوچھا۔

ارقم پر لعن طعن کی بوچھار شروع ہو گئی۔ وہ منہ پھلا کے بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔

"آؤ۔ تم میرے ساتھ چلو!" بڑے صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لائے۔

"اب بتاؤ! کیا ہوا!" انھوں نے دروازہ بند کرکے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے اسے اپنے پاس قالین پر بٹھا لیا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے بےکم وکاست سب کچھ کہہ دیا۔

انھوں نے طویل سانس لی: "اچھا۔ میاں۔ تم اطمینان رکھو میں تمھیں دوسرے مدرسہ میں شریک کرادوں گا!"

"نہیں۔ صاحب۔!" وہ ان کی پنڈلیوں سے چمٹ کر گڑگڑایا۔

"کیوں۔؟" وہ بڑے حیران ہوئے۔

"دوسرے اسکول میں میرا دل نہیں لگے گا!" وہ جھینپ کر الگ ہو بیٹھا۔

"مگر میں پوچھتا ہوں۔ آخر کیوں؟"

"وہاں۔ وہاں۔ میں اکیلا ہوں گا صاحب۔ صنوبیہ بی بی تو نہ ہوں گی

اتنی بھاڑ را ڈنی۔ باغ میں ہوائیں سنسنا رہی تھیں۔ اونچے اونچے درخت جھوم رہے تھے۔ جب ہوا لگتی تو وہ عجیب آواز سے بجو سنتے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھا بلکیاں لے رہا تھا۔ کیا کرے کہاں جائے۔ بڑا دل مضبوط کرکے اس نے سونے کی کوشش کی۔ کمبل سے خود کو ڈھانپ کر لیٹا اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔ مگر خالہ کے نرم گرم ڈھرکتے سینے کی بات کہاں۔ اچانک درخت پھڑ پھڑا کر جھکے اور سیدھے ہوئے وہ بھی چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ اب تھر تھر کانپ رہا تھا!

اس سے سویا نہ گیا وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہاں وہاں سب سناٹا تھا۔ صحن میں پیاری سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دالان میں نیم تاریکی اور سب دروازے بند۔

سہ پہر کو صنوبر نے اسے اپنا گھر دکھا دیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کس کا کمرہ کون سا ہے۔ اس نے بیگم صاحبہ کے کمرے کے دروازے سے لگ کر سسکیاں ہچکیاں لینی شروع کر دیں!۔

تھوڑی ہی منٹ بعد دروازہ کھلا۔ بیگم صاحبہ باہر نکلیں۔ اور اسے بیٹھا دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

"اے تم ہو ایاز۔ کیا ہوا کیا بات ہے؟ ڈر گئے کسی چیز سے؟" وہ بے حد ہمدردی اور محبت سے پوچھ رہی تھیں۔ اس کی شکل پہ عجیب لگا تھا۔ پر موٹے موٹے قطرے ڈھلک رہے تھے ہونٹ ٹیڑھے ترچھے ہو رہے تھے۔ ان کے پوچھنے پر بڑی مشکل سے بول سکا۔

"آپ نے۔ باغ سے۔ ڈراؤنی آوازیں، آوازیں آ رہی ہیں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ڈر لگ رہا ہے!"

"تمھاری خالہ کون سے گاؤں گئی ہیں۔ میں انھیں خط لکھے دیتا ہوں آکے تمھیں لے جائیں۔" چھوٹے میاں نے کہا۔

اور بس۔ چھالا پھوٹ گیا۔ وہ خود بھی پھوٹ پڑا۔ دکھ کے ہجوم میں اتنا خیال اور ادراک تو تھا ہی کہ بھائی کے بھائی کی شکایت کرنا اس کے حق میں ٹھیک نہیں۔ اگر تعلیمی کمزوری گاؤں جانے کا بہانہ نہیں بنی تو ان کی شکایت دربدری کا سبب ضرور بن جائے گی!

"چھوٹے صاحب۔" اس نے ہچکی لی۔ "میں۔ مجھے۔ اسکول کے بچے بہت چڑاتے ہیں۔ مجھے خود رو درخت کہتے ہیں۔ بڑے صاحب، میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ مجھے سب ہی چڑھائیں گے۔ ماریں گے۔ میں اب اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے گاؤں نہ بھجوائیے۔ میں گھر میں کام کاج کر لیا کروں گا۔" خالہ نے کہا تھا کہ آپ کو گھر میں کام کرنے والے لڑکے کی ضرورت ہے" یہ کہہ کر اس نے بوسیدہ سی آستین آنکھوں پر رکھ لی اور اس بری طرح رو دیا ہے کہ بڑی بیگم کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں دوسرے لوگ بھی کچھ سکتہ زدہ سے تھے۔ بالآخر اسے ماں باپ کی عدم موجودگی کا خیال آ ہی گیا۔ بڑی بیگم نے اس کا بازو تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا اور پاس بٹھا لیا۔ پھر آواز سنبھال کر بولیں: "نہ بیٹا۔ رونے سے کیا۔ میں تمھارے صدر مدرس کے ہاں لکھوا بھجوا دوں گی کہ لڑکوں کو قابو میں رکھیں۔ پریشان مت ہو۔ تم جی لگا کے پڑھو لکھو۔ بڑا آدمی بن جاؤ گے!"

"بڑا آدمی!" یکایک ارقم ہنس پڑا: "معافی اماں۔ کیا یہ بڑے

"سچ تو ہے"۔ انھوں نے کہا۔ "وہ پرانا دیوان خانہ اس چھوٹے سے
لڑکے کے رہنے کی جگہ تھوڑی ہے۔ ڈر ہے نہیں تو بے چارہ کیا کرے" انھوں
نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھا لیا۔ "آؤ۔ تم میرے کمرے میں سونا ہوا۔ کل
میں دوسرا کمرہ صاف کروا دوں گی!"

وہ اندر گیا۔ کمرہ خوابناک نیلی نیلی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کمرے میں
پھیلی تھی۔ ایک بڑی سی مسہری پر صنوبیہ آرام سے سو رہی تھی۔ اس کا
سفید چہرہ نیلی روشنی میں چمکتا ہوا الگ رہا تھا!۔

"لے بیٹا۔ لیٹ کے سو رہو یہاں"۔ بیگم نے مسکرا کر کہا اور اپنی نماز کی
چوکی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر جانماز اور دری لپیٹ کر ایک طرف
رکھ دی۔ جب وہ آرام سے چوکی پر لیٹ گیا تب انھوں نے کوئی
شال اسے اڑھا دی اور خود اپنی مسہری کی طرف بڑھ گئیں۔

یہاں سکون و اطمینان تھا۔ آج دن بھر کے انقلاب کے بارے میں
سوچتے سوچتے اس کی پلکیں جھپکنے لگیں اور تھوڑی دیر بعد وہ بے خبر
سو گیا۔!!

اگر چھوٹے سے ذہن کی کوئی قیمت تھی تو یہیں تھی! چند ہی دنوں
میں ایاز کی کایا پلٹ گئی۔ بڑے سرکار نے اسے کپڑے بنوا دیے تھے
کوئی بھی اس سے تھکا دینے والے کام نہیں لیتا تھا۔ اسے باغبانی
سے بے حد دلچسپی تھی۔ صبح سے شام تک وہ مختصر سے باغ کی چمن بندی

کا نام ——!"
ایاز ——!" کئی آوازیں ایک نعرہ بن کر ابھریں۔ اور پھر ساری
آوازیں ایک قہقہہ میں بدل گئیں جیسے بجلیاں سی اس کے دل پر گرا دیتیں۔
اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ جدھر سے ایاز گزرتا اس کے کانوں میں
دبی دبی ہنسی کی آواز آتی کبھی کوئی دل آزار سا فقرہ دل کو چھیدتا چلا
گزر جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ نروس ہوتا گیا اور تعلیم سے اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔
ایک ٹیچر نے اس کی کمزور رپورٹ گھر بھجوا دی۔

رپورٹ ابّا جی پڑھ رہے تھے اور وہ سر جھکائے کھڑا اپنے آنسوؤں
کے ریلے کو واپس دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا!

اس وقت بھی سب موجود تھے۔ اور اسی کو گھور رہے تھے۔ چھوٹے میا
کی تیر کی سی نظریں اسے چہرے پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ انھوں
نے اس کا شوق دیکھتے ہوئے اسے پڑھوانے کی کوشش کی تھی۔ کتابیں
بھیا کی تھیں نہیں دی تھی۔ ان کے چہرے سے دکھ اور تاسف اور غصہ
عیاں تھا۔ اور ان کی نگاہوں سے نگاہیں ملانا اس کے بس کی
بات نہ تھی۔

بڑے صاحب نے سفید بالوں سے ڈھکا سر اٹھایا۔ آج ان کی [illegible]
آنکھوں ... کچھ بے مہری سی جھانک رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر
انھوں نے رپورٹ میز پر رکھ دی اور بولے: "افسوس ہے۔ ہر مضمون
میں نمبر کم، حساب میں صفر، کیوں بیٹا، کیا پڑھنے کا جی نہیں چاہتا؟
ہم نے اسی لیے تمھیں گھر کے کاموں سے بچائے رکھا تھا کہ تم اگر تعلیم
حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں!"

آتا تھا۔ بظاہر وہ معصوم اور ناسمجھ بچہ تھا۔ اس کی خاموشی اور افسردگی
کو کسی نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا۔ یہ بھی اور کسی کو نہ تھا کہ وہ اندر اندر
سلگ رہا تھا۔ صنوبیہ اور ایاز کی بڑھتی ہوئی دوستی اسے خاک
کر دیتی تھی۔ انہیں زک دینے اور اپنا پہلو بچائے رکھنے کے طریقوں پر
غور کرنے لگا تھا۔ ایاز سے اسے سخت ترین نفرت تھی۔ اسے منہ لگانا پسند
نہ کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ارقم کے سلوک کا اندازہ ایاز کو بھی ہو گیا۔ خواہ مخواہ
وہ اس پر پھبتیاں کستا رہتا۔ دل شکستہ اور رنجیدہ سادہ زیادہ سے
زیادہ صنوبیہ کی توجہ اور ہمدردی کا مستحق بنتا گیا۔ ارقم نے اب دوسرا
رخ اختیار کیا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ اس گھر کی قدیم خادمہ کے ساتھ آیا
تھا اور خود اسی کے ماں باپ بہن بھائی اور خاندان کا کوئی پتہ نہیں
اب اس نے دوسری طرح نیش زنی شروع کر دی۔ نجانے اپنے بدمعاش
دوستوں سے کیا کہا تھا کہ اب جدھر سے ایاز گزرتا۔ اسے اس قسم کی
دل شکن جملے بازی سننی پڑتی!۔

"ارے تمہیں معلوم ہے کہ پہلے زمانے میں آسمان سے کھانا اترتا
تھا۔ اب آج کل کے زمانے میں آدمی بھی آسمان سے اتر رہے ہیں"
"سچ سچ؟" شریر لڑکوں میں استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھرتی۔
"ہاں۔ چاہے ان کے ابا آئی نہ بھی ہوں!" ارقم کنکھیوں سے اسے
دیکھتا کہ چہرہ لال پیلا ہو رہا ہے کہ نہیں؟ مگر وہ بے بس چہرہ نہ غم
سے صرف سفید پڑتا نظر آتا تھا۔

خود رو درخت ابھی اگ آئے ہیں۔ کسی کی دلکش آواز ابھرتی۔
"خدا جانے خود رو درخت ہمارے اس بھی آگا ہے" ارقم کہتا ہاس

میں لگا رہتا۔ یا پھر بھابی کے بچے کو لادے لادے پھرا کرتا۔ وہ اپنے خوابوں
کی تعبیر میں چلا آیا تھا۔ اور اب نہ اسے اپنے لاپتہ ماں باپ کی فکر تھی
نہ خالہ یاد تھیں۔ وہ ہر طرح مگن تھا۔ خالہ نے پھر اس کی خیر خبر ہی
نہ لی اسے ان کی پروا بھی نہ تھی!۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ سب سے واقف ہو گیا۔ بڑے صاحب
کے پانچ بچے تھے۔ تین لڑکے دو لڑکیاں۔ ایک لڑکا باقی تھا باقی سب کی
شادیاں ہو چکی تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے اور ان کی بیوی
بھی یہیں رہتے تھے۔ کچھ اداس، مغموم، اور ہر دم گم صم رہتے تھے۔
پتہ چلا کہ ان کی شادی کو دس بارہ سال گزر چکے تھے لیکن ان کے ہاں کوئی
بچہ نہ ہوا تھا۔ اور میاں بیوی میں کچھ کھٹ پٹ بھی ہوا کرتی تھی۔
دوسرے جو بھائی جان کہلاتے تھے۔ ان کا ایک ننھا تھا۔ صنوبیہ دراصل
بڑے سرکار کی نواسی تھی۔ مگر سب کے ساتھ انہیں ابی جی کہتی تھی
اس کے دو بڑے بھائی اور تھے۔ مگر وہ کہیں اور پڑھتے تھے۔ کبھی لمبی
چھٹیاں ہوتیں تو گھر آتے اور پھر طویل عرصے کے لیے واپس چلے جاتے۔ تیسرے
صاحبزادے ابھی پڑھ رہے تھے۔ نجانے کیا ہے ہیں۔ ایاز کو وہ الجھا ہوا نام
کبھی یاد نہ ہو سکا۔ حالانکہ بارہا اس نے سنا تھا اور حسرت سے سوچا بھی تھا
کہ کاش وہ بھی انہی کی طرح پڑھا کرتا۔ ایک دن اس نے ان سے پوچھا تھا
"چھوٹے بھیا آپ کون سے مدرسے میں پڑھتے ہیں؟"
وہ ایک بڑی ضخیم کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ بولے: "مدرسہ میں
نہیں۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔!"
اوہ نہ! وہ پھر الجھ گیا۔ بھی پتہ نالنے کی عادت اچھی نہیں۔ اس

نے نقطہ؛ وعدہ نام سُن رکھے تھے۔ بمبئی سٹی، کلکتہ سٹی۔ یہ بھیا کون سی سٹی
میں جاتے ہیں؟ صبح گئے لیکن بے چلے آتے۔ اب کون سی ٹھہ اتنے قریب ہے؟
ان سے پوچھنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک دن وہ ان کی موٹی موٹی
کتابیں دامن سے صاف کر کر کے ڈیسک میں سجا رکھا تھا کبھی کوئی اچھی
سی کتاب کھول کر دیکھ بھی لیتا شاید کوئی تصویر ہو۔ اسے ہاتھی اور شیر
بہت پسند تھے۔ مگر وہ لرز کر رہ گیا کیونکہ شیر اور ہاتھی کی بجائے اس میں
انسانی پنجروں کی بھیانک بھیانک تصویریں تھیں۔ اپنا جھیا لگرے میں
آگئے تھے۔ اور اس کے بے ذوق سے چہرے پر حسرت کا سایہ منڈلاتے دیکھ
کر پوچھا تھا۔

"تھوڑا سا پڑھے لکھے ہو کہ نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کچھ دل بھر آیا تھا۔

"پڑھنا چاہتے ہو؟"

اگلی سر اثبات میں ہلا۔ پھر وہ چپکے سے کھانس کر شرمائے ہوئے لہجے
میں بولا۔

"ارے۔ میں کیا چھوٹے بھیا!"

"جاہل رہنا پسند ہے۔ کیوں؟" وہ پیار سے غرائے پھر کرسی پر ٹکا کر
غور سے اسے دیکھا۔ ایاز نظریں چرانے لگا۔

"میں ابی جی سے کہوں گا۔ صنوبیہ اور ارقم کے اسکول میں تمہیں بھی
شریک کرا دیں۔"

"نن۔ نہیں چھوٹے بھیا!" وہ گھبرا گیا۔

"کیوں؟"

ساتھ لگا لگا پھرتا۔ ان کی کلاسیں مختلف تھیں۔ اسے بچے اور ...
ملتا تھا مگر وہ وقفوں میں مل بیٹھتے اور اپنی اپنی کلاسوں میں ہونے
والے واقعات سناتے۔ ان کی دوستی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اسی اسکول میں صنوبیہ کی منجھلی بہن کا چھوٹا بھائی ارقم بھی پڑھتا
تھا۔ اسے بڑی بہن نے مدرسہ کے قریب کی بنا پر اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔
وہ ایاز سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ لیکن فطرت و سرشت میں اس سے کہیں مختلف۔
طبیعت میں رشک، بدگمانی اور کچھ حسد تھا وہ خود سے کسی کو بڑھتے
ترقی کرتے مشکل سے دیکھتا۔ چونکہ اسے اسی گھر میں سب بچوں کے ساتھ
اس کی بڑی بہنیں تھیں۔ خاص کر وہ صنوبیہ سے زیادہ قریب تھا اور
وہ بھی اسی کے ساتھ رہتی۔ کھیلوں میں اس کی ساتھی تھی۔ اب
اس نے ارقم کا ساتھ چھوڑ دیا اور غیر ارادی طور پر ایاز کی طرف
آ گئی۔ چند روز تو ارقم یہی سمجھتا رہا کہ خود اسی کو غلط فہمی اور
مغالطہ ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح صنوبیہ کی رفاقت کی تلاش میں اس
کے ارد گرد پھرتا رہا تھا۔ صنوبیہ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اب تب
اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا اور پڑھتا بھی تھا آٹھویں
کلاس میں۔ اس کے دوست احباب بھی خاصے ہوشیار تھے۔ انھوں نے
اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ارقم کو ہر فن مولا بنا دیا تھا۔ فلم
بینی نے اسے اور بھی بہت سے جذبوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ لہٰذا
وہ رقابت، محبت، مفارقت اور انتقام دیکھ کے جذبات سے بخوبی
واقف تھا۔ اپنے دل کے محسوسات کے چھپانے کا ... اسے ... آگئی
تھی۔ خود پر جبر کرنا اور موقعہ محل دیکھ کر کاری ضرب لگانا بھی اسے

دوست تو ہو۔ مگر یہ آپ کرکے کیوں بولتے ہو۔ تم مجھ سے بڑے ہو
نا۔ اس طرح تو مجھے چاہیئے کہ تمھیں آپ کہا کروں! ابی جی کہتے ہیں کہ
اپنے سے جو ایک دن بھی بڑا ہو اسے ادب سے پکارا کرو۔!
نہیں آپ مجھے ادب سے نہ پکاریے گا۔ مجھے شرم آئے گی! یہ آپ
کیا بنا رہی ہیں؟ بہت خوبصورت ہے!
یہ؟ کنول اور سورج مکھی کے پھولوں کی تصویریں ہیں۔ اچھی ہیں!
بے حد! مگر مجھے تصویر سے زیادہ اصلی پھول پسند ہیں!۔
دونوں جو گہرے دوست بن گئے تھے۔ نجانے کتنی دیر تک آپس
میں باتیں کرتے رہے۔
پھر اس ہفتے سے وہ مدرسہ جانے لگا۔ بھابی نے اپنے چھوٹے بھائی
ارقم کا فل یونیفارم اسے دے دیا تھا۔ جب وہ یونیفارم پہنے اور
نیا بستہ کندھے سے لٹکائے بڑی اماں کو سلام کرنے آیا اور بتایا کہ وہ بھی
سب کے ساتھ اسکول جا رہا ہے تو فرط مسرت سے اس کا رواں رواں
کھلا پڑ رہا تھا۔
صنوبیہ کے ساتھ وہ اسکول گیا۔
یہ اس کی زندگی کا بڑا دل خوش کن انقلاب تھا۔ اسے سکینڈ اسٹینڈرڈ
میں داخلہ ملا تھا۔ جب وہ سب کے ساتھ کلاس میں بیٹھا تو یوں لگ رہا
تھا کہ مارے خوشی کے دل اب رکا کہ تب رکا۔!
اپنے عہد کی پابندی کرتے ہوئے اس نے کسی کو اپنا دوست نہیں
بنایا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں چھوٹی بی بی خفا ہو جائیں۔ اگرچہ کہ اس کی
دوستی کے خواہشمند بہت سے تھے لیکن وہ بس اپنی منی مالکن ہی کے

اب میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ لڑکے مجھے چڑھائیں گے!
"کچھ پرواہ نہیں۔ تم یہ بتاؤ کچھ پڑھنا آتا ہے۔؟ خالہ نے کسی سے
پڑھوایا یا نہیں تم کو۔؟"
"نہیں پڑھوایا" بڑی تیزی سے وہ بولا "مگر میں کرنل صاحب کے
بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا سیکھ گیا ہوں۔
اچھا؟ واہ واہ۔ شاباش۔ سناؤ تو ذرا کیا سیکھ گئے ہو؟" ملا کی
حوصلہ افزائی سے اس کا دل پھول کر غبارہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس
نے کسی جھجک اور تکلف کے بغیر فرفر انھیں چوہے بلی، گدھے اور آدمی
کی انگریزی سنا دیں۔ پھر بابا بلیک شیپ اور ٹوئنکل ٹوئنکل اسٹار سنایا
وہ برابر ہنستے رہے اور پھر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔
"اچھا میں تمھیں پڑھاؤں گا۔ تم مجھے نہ جانے کیوں بہت اچھے
لگتے ہو۔ تم سے محبت معلوم ہوتی ہے"
ایک بار اور بتا دیجئے آپ کیا پڑھتے ہیں آپ کی کتابوں میں مردوں کی اتنی
تصویریں ہیں۔ آپ کو ڈر لگتا ہو گا؟
میاں میں میڈیسن کر رہا ہوں" وہ ہنسے، ہمیشہ ہی وہ ہنستے مسکراتے رہتے تھے
تصویروں کو دیکھ کر کیا ڈروں گا۔ میں تو مردے چیر چکا بھی ہوں"!
"او۔ اللہ!" اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا: میں اگر ایڈیشن کروں گا
تو کیا مجھے بھی مردے چیرنے پڑیں گے۔
میڈیسن، میڈیسن۔ ایڈیسن نہیں" انھوں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر
جھنجھوڑ دیے "اب تم چلو۔ کل سے اسکول جاؤ گے۔ سمجھے!"
ان کی پیار بھری جھنجھوڑی نے اس کی رگ رگ میں ان کی محبت

۔ چٹکیے جاری کردے۔ خوشی کے مارے زور زور سے سر ہلاتا ہوا بولا
اچھا۔ مگر کتابیں۔!"
"دلادیں گے!"
اچھا۔ چھوٹے بھیا!" ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا وہ برآمدے
میں نکلا۔ منوبیہ شفاف فرش پر بیٹھی اپنی کاپی میں ڈرائنگ کر رہی
تھی۔ وہ اس کے پاس جا بیٹھا اور تازہ خبر سنائی!۔ فرطِ مسرت سے
اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ منوبیہ نے رنگین پنسل ہاتھ سے رکھ دیا اور
حیرت و مسرت سے بولی: "سچ؟"
"سچ چھوٹی بی بی۔ آپ ہی کے اسکول میں بھیا شریک کرا دیں گے!"
دونوں میں مستقبل کی باتیں ہونے لگیں۔
"ہم ساتھ ساتھ اسکول جائیں گے اور ساتھ ہی واپس آئیں گے"
منوبیہ نے کہا: "وہ جو میری سہیلی الماس ہے نا کبھی مجھ سے خفا ہو جاتی
ہے تو مجھے اکیلے آتے ڈر لگتا ہے۔ مگر تم کہیں اپنے دوست تو نہیں
بنالو گے؟"
نہیں نہیں کبھی نہیں" اس نے بے حد وثوق سے جواب دیا "کیا
کوئی دوست آپ سے اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ میں ہمیشہ آپ ہی کا
دوست رہوں گا۔ مگر نہیں" اداسی اس کے چہرے پر محیط ہو گئی
"میں آپ کا دوست نہیں ہو سکتا!" اس نے رنجیدہ ہو کر سر
جھکا لیا۔
"کیوں۔؟" منوبیہ نے حیرت سے پوچھا "کیوں نہیں ہو سکتے؟" "چھوٹی
بی بی۔" گلوگیر لہجے میں اس نے جواب دیا: "میں تو آپ کا نوکر ہوں غلام

مجھے سال بھر کی تنخواہ پر نوکر رکھا گیا ہے۔ ایک سال وہ آئیں گی
اور مجھے پھر اپنے ساتھ لے کے چلی جائیں گی۔"
نہیں۔ ایاز۔ تم ان کے ساتھ مت جانا۔!" منوبیہ نے کہا: "تم
ہمارے پاس رہو۔ پڑھو لکھو۔ اور ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ۔
پھر تو ہم تم دوست بن جائیں گے!۔
بڑا آدمی۔؟
ہاں۔!
میں تو ابھی اتنا چھوٹا ہوں۔ بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟۔
ارے۔ تم کتنے بدھو ہو" منوبیہ ہنسنے لگی۔ اس کے ننھے سے دل میں
یہ خیال آگیا تھا کہ اس کا دل رکھنا چاہیے۔ تسلی آمیز پیرایہ میں بولی
"یہ سارے بڑے آدمی کیا یکبارگی بڑے بن گئے تھے۔ وہ کبھی ایک دن
تمہارے اتنے ہی ہوں گے۔ آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ اچھا۔ تم
چاہو تو آپا جی سے پوچھ لو۔!"
نہیں آپ کی بات سچ ہے" وہ مسکرایا: "میں ایک دن ضرور بڑا
آدمی بنوں گا۔ پھر تو آپ مجھ سے دوستی کریں گی نا۔!"
منوبیہ نے سر ہلایا: "ہاں۔ میں تو اب بھی تمہاری دوست ہوں
اور تم بھی میرے دوست ہو جاؤ گے تو میں اپنی سب سہیلیوں سے
کٹی کر لوں گی!"
"کیوں؟ انہیں بھی رہنے دیجئے۔ پھر وہ آپ سے بگڑ نہ جائیں گی!"
نہیں۔ پھر وہ اچھی نہ لگیں گی!
تو میں آج سے دوست ہوں آپ کا؟

THE HAREEM

Aug.85

Rs. 1/60

ٹیلیفون نمبر آفس:- ۴۳۵۵۹

اس جگہ سُرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس حریم کا ختم ہو گئی۔

گذشتہ ۵۵ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ـــــ اور خواتین کا

ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۵) فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۸۵ء نمبر (۸)

ایڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ـــــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	تیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	اٹھائیس روپیہ
معمولی خریداری	"	چوبیس روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر ۵ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ساٹھ پیسے

غیر ممالک سے

اسّی روپیہ یا اس کے مساوی غیر ملکی سکہ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ / ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں سہ فس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۲۰۰ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے [illegible] پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

عید مبارک
زلف گرہ گیر
کے اسیر آپ بھی ہو جائیں گے
اگر
سندری سہاگ
لگائیں گے
چشم آہو
حیا بار آنکھیں
سُرمہ نورِ نظر
کے صدقے
مثال مہ و انجم
چمکدار صاف تندرست
دانتوں کے لئے
جگمگ منجن
طبلۂ عطار
خوشبوؤں کا بحر ذخار
دیرپا مسحور کن عطریات
عرق گلاب / کیوڑہ
شہد وغیرہ
مستقبل کا معمار
اپنے بچوں کو
بے بی گرائپ
پلائیے
پہاڑوں سے ٹکر
لینے کی طاقت پیدا کیجئے
شربت اکسیر
استعمال کیجئے
BAKHSHI
SAB
تیار کردہ
ایس، اے، بی بخشی کمپنی
۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ
(کولوٹولہ) کلکتہ ۷۳

لمعات

حقیقت ہوتے ہوئے بھی یقین نہیں آتا کہ میرے ۴۳ سالہ رفیق اور روح رواں نسیم بکڈپو جمیل صاحب کا انتقال ہوگیا اور وہ اب کبھی نسیم بکڈپو کی اس کرسی پر بیٹھے نظر نہ آئیں گے جو ان کے لئے مخصوص تھی اور جس پر بیٹھ کر انھوں نے اس ادارے کی ۴۴ سال تک آبیاری کی تھی۔

سید جمیل الحسن صاحب ضلع بارہ بنکی کی اس مقدس سرزمین اور ایک شریف خاندان میں ۱۶ رفروری ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے تھے، جو ردولی کے نام سے مشہور ہے اور جس کی خاک پاک میں مشہور بزرگ صوفی اور قلندر حضرت شیخ عبدالحق مدفون ہیں۔ اور جہاں نہ جانے کتنے ایسے افراد عالم وجود میں آئے جو فنون لطیفہ کے لئے مشہور ہیں۔ زمانۂ حال میں چودھری محمد علی صاحب نے اپنی مزاح نگاری کے لئے، مجاز نے اپنی شاعری کے لئے اور شارب ردولوی نے اپنی علمی ادبی اور تنقیدی خدمات کے لئے شہرت و ناموری حاصل کی۔ جمیل صاحب مرحوم شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، لیکن افسوس کہ انھوں نے تالیف و تصنیف کی طرف توجہ نہ کی، حالانکہ انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کے مسودات میں اصلاحات کر کے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ شاعری کے لئے عروض پر قدرت رکھنا بہت ضروری ہے، لیکن شاید ایک فی صدی شاعر ہی عروض سے واقف ہوں، جمیل صاحب علم العروض کے ماہر تھے۔ شاعری کی مشکل ترین اصناف تاریخ نکالنا اور سہرے کہنا ہیں جمیل صاحب کو ان اصناف میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ مشاعروں میں شرکت نہ کرتے تھے لیکن انھیں ہزاروں معیاری اشعار یاد تھے، جنھیں موقع محل کے اعتبار سے وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔

جمیل صاحب، جنھیں مرحوم لکھتے وقت میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ۱۹۴۸ء میں میرے دفتر آئے تھے، ابتدا میں انھیں اکاؤنٹس کا کام میں نے دیا تھا، جس میں وہ ماہر تھے، لیکن رفتہ رفتہ جب ان کی دوسری صلاحیتوں کا علم ہوا تو میں نے انھیں دفتر کا منیجر بنا دیا۔ نسیم بکڈپو سے اس وقت تک صرف ناولوں ہی کی اشاعت ہوتی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں ادبی کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا جس کی نگرانی کا کام جمیل صاحب ہی کو سونپ دیا گیا تھا جسے انھوں نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے پروان چڑھایا۔ اور ایک سو سے زائد معیاری علمی ادبی اور تنقیدی کتب بڑی صحت کے ساتھ شائع کرائیں۔

جمیل صاحب میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو کسی بھی ایک انسان میں شاید ہی یکجا ہوتی ہوں۔ ان کا نام ہی جمیل نہ تھا، واقعی وہ ایک حسین و جمیل انسان تھے۔ ان کی نفاست پسندی اور ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ وہ اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ متمول سمجھے جاتے تھے۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس درجنوں جوتے تھے جو وہ بدل بدل کر پہنا کرتے تھے۔ ان کے پاس درجنوں اعلیٰ درجے کی چھڑیاں تھیں، جنھیں وہ بدل بدل کر استعمال کیا کرتے تھے۔ انھیں اسباب سے ہر کس و ناکس کی نظریں ان پر پڑتیں اور متاثر کرتیں۔ کسی بھی مجلس یا محفل میں جاتے تو ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور معززین کی صفوں میں جگہ پاتے تھے۔

رہے نام اللہ کا

تہذیب شائستگی کا مکمل نمونہ تھے۔ ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی ہر بات میں خوش مذاقی کا پہلو ہوتا۔ مذاق کبھی کبھی ایسی سنجیدگی سے کرتے کہ مخاطب اسے مذاق نہ سمجھ پاتا، اتفاقاً ایک پڑھے لکھے ادیب قسم کے انسان ان کے بھائی کے انتقال کی خبر سن کر تعزیت کرنے آئے، انھوں نے برسبیل تذکرہ پوچھا کیا عمر تھی آپ کے بڑے بھائی کی" جمیل صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ عمر کیا بتاؤں بس یہ سمجھ لیجئے کہ مجھ سے چھ سال چھوٹے تھے۔

جواب ایسی سنجیدگی سے دیا گیا تھا کہ وہ سمجھ ہی نہ پائے اور ہم لوگوں کو ہنسی روکنا دشوار ہوگیا تھا۔

پان کا انداز گفتگو اور ان کی خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ جو ایک بار بھی مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ بقول محترم ڈاکٹر حلیم صاحب "جمیل صاحب لکھنوی تہذیب کا مکمل اور اس دور میں واحد نمونہ تھے۔"

"ہمہ صفت موصوف" کا جملہ جمیل صاحب پر مکمل طور سے صادق آتا تھا۔ کوئی بھی انسانی خوبی اور صفت ایسی نہ تھی جو ان میں موجود نہ رہی ہو۔ ایسے انسان شاذ ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔

تعلقات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، کبھی کبھی چشمک ہوتی ہی رہتی ہے لیکن جمیل صاحب کا یہ عالم تھا کہ گذشتہ ۲۴ سال میں صرف ایک بار ہی انھوں نے مجھے نامناسب جواب دیا تھا، وہ بھی روزے میں۔ وہ پان ہی کے شوقین نہ تھے، بہتر سے بہتر قوام اور شاہی گولی وغیرہ بھی کھاتے تھے، میرا مشاہدہ ہے کہ تمباکو کھانے والے روزے دار اکثر کچھ زیادہ ہی جھنجھلائے رہتے ہیں۔ روزہ افطار کے بعد جمیل صاحب نے معذرت کرلی، وہ بے حد شرمندہ تھے، یہ بھی کہا کہ "جی چاہتا ہے روزہ رکھنا چھوڑ دوں، اسی کی وجہ سے آپ کو ایسا جواب دیا جو نہ دینا چاہیئے تھا۔" پانوں سے بھری ڈبیہ ہمیشہ جمیل صاحب کے ساتھ رہتی تھی وہ خود ہی نہ کھاتے تھے، دفتر آنے والوں کو بھی ڈبیہ پیش کرتے رہتے تھے، ان کے قوام اور شاہی گولیوں کا لوگوں کو چسکا لگ گیا تھا، حکیم شکیل احمد شمسی صاحب اور لئیق اختر صاحب، جیسے بے تکلف حضرات آتے ہی خود پان کا تقاضہ کر دیتے تھے۔

جمیل صاحب کی نوجوانی کا زمانہ ردولی کے تعلقدار چودھری ارشاد حسین صاحب اور ان کے بھائی چودھری سید علی محمد زیدی صاحب کی صحبت میں گذرا تھا۔ شادی کے بعد انھیں یہ احساس ہوا کہ انھیں فکر معاش میں بدخشان (ردولی) چھوڑ کر باہر جانا چاہیئے۔ وہ لکھنؤ آئے۔ اس وقت سرفراز کے منیجر اختر صاحب جمیل صاحب کے عزیز تھے انھیں کی وساطت سے وہ مجھ تک پہنچے تھے۔

میری پہلی ملاقات جمیل صاحب سے ۵۰ء میں ہوئی تھی۔ وہ اختر صاحب کا سفارشی خط لے کر آئے تھے۔ اس وقت دفتر میں کوئی جگہ خالی نہ تھی لیکن قیافہ شناسی کے تحت میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ہمارے ادارے کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں، اس لئے میں نے انھیں پارٹ ٹائم کے لئے رکھ لیا تھا۔ پھر بہت ہی کم عرصہ میں ان کی قابلیت اور کارکردگی سے میں اتنا متاثر ہوا کہ انھیں آفس کا منیجر بنا دیا۔ رفتہ رفتہ وہ منیجر سے مالک بنتے گئے۔ میں ان پر اتنا بھروسہ اور ان کا اتنا اعتبار کرنے لگا تھا کہ انھیں سارے اختیارات سونپ کر بے فکر ہو گیا تھا۔ اور ان اختیارات سے انھوں نے کبھی غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ انھیں اس طرح استعمال کرتے تھے جیسے کہ وہ واقعی نسیم بکڈپو کے مالک ہوں۔ ادارے کا نقصان انھیں کبھی گوارہ نہ ہوتا تھا، بلکہ میں کبھی کسی کے ساتھ کوئی بلا سبب رعایت کرنا چاہتا تو مجھے بھی ٹوک دیتے تھے۔

جمیل صاحب کو منیجر بنا کر میں فخریہ کہا کرتا تھا کہ ان سے دفتر کی شان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اب تو میں یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ خدایا مجھے اٹھا لینا، لیکن جمیل صاحب کو نسیم بکڈپو کی بقا کے لئے بقید حیات رکھنا، لیکن میری یہ دعا قبول نہ ہو سکی اور وہ ۳، ۴ جولائی کی درمیانی شب میں پونے تین بجے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

۳ جولائی کو جمیل صاحب حسب معمول دفتر آئے، کام شروع کیا لیکن ایک بجے کے قریب میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ وہ آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا سو گئے ہیں، لیکن پھر مجھے تشویش ہوئی اور میں نے ذرا بلند آواز سے پوچھا "کیا آپ سو رہے ہیں۔" چونکتے ہوئے آہستہ سے بولے "انجائنا کا درد اٹھا تھا۔ میں نے دوا لے لی ہے۔ پریشان نہ ہوں، لیکن میری پریشانی یہ سن کر اور بڑھ گئی۔

تقریباً دس سال قبل جمیل صاحب پر پہلا اور زبردست قلبی دورہ پڑا تھا، لیکن بر وقت انھیں میڈیکل کالج میں انٹنسیو وارڈ میں جگہ مل گئی تھی اور ایک ماہ کالج میں رہنے کے بعد گھر آ گئے تھے، ڈاکٹر حلیم صاحب نے مشورہ دیا تھا کہ زینہ چڑھنے سے گریز کیجئے گا، لیکن چند ماہ گھر پر آرام کرنے کے بعد وہ دفتر آنے لگے تھے، حالانکہ دفتر بالا خانے پر ہے۔ گذشتہ دس سال میں کئی بار اسی طرح کے ہلکے اٹیک دفتر میں بھی ہوئے، لیکن گھر چلے جاتے، حلیم صاحب کو دکھاتے، چند روز آرام کرتے اور پھر دفتر آنے لگتے۔

اس مرتبہ میں نے بہت اصرار کیا کہ میرے گھر چلئے یا اپنے گھر چلے جائیے

لیکن وہ برابر یہی کہتے رہے کہ تشویش کی بات نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بہرحال ۳ بجے وہ گھر گئے۔ وہاں بھی سب کو اطمینان دلاتے رہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شام کو میں نے ڈاکٹر حلیم صاحب کو فون کیا، موصوف نے جاکر معائنہ کیا اور مکمل آرام کا مشورہ دیا، لیکن بجلی کے چلے جانے کے باعث گرمی سے پریشان ہوکر بالاخانے پر چلے گئے۔ زینہ چڑھنا قیامت ہوگیا۔ شدید دورہ پڑا۔ ڈاکٹر حلیم صاحب نے پھر آکر دیکھا اور ناراض ہوئے کہ زینہ کیوں چڑھے۔ حالت کی نزاکت کے پیش نظر فوراً اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا۔ سفارشی خط بھی لکھا۔ گھر میں جمیل صاحب کے بھتیجے وتن سلمہ ساتھ ہی رہتے تھے انھوں نے جمیل صاحب کے خویش باقر سلمہ کو بھی بلا لیا تھا۔ دو ایک محلے کے ہمدرد آگئے تھے۔ ایمبولنس کے لئے کوشش کی گئی، لیکن نہ ملا۔ مجبوراً کسی طرح ٹمپو پر اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں روایتی انداز میں اسپتال والوں نے کافی وقت ضائع کرایا۔ اور جب بڑی جد وجہد کے بعد بیڈ ملا تو حالت اتنی نازک ہوچکی تھی کہ آکسیجن گیس اور گلوکوز سے بھی بات نہ بنی اور ایک ایسی مرنجا مرنج شخصیت اللہ کو پیاری ہوگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

افسوس کہ اس سانحہ عظیم کی خبر مرحوم کے بھتیجے وتن سلمہ نے مجھے ۴ بجے صبح پہنچائی۔ اس خبر سے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میری کمر ٹوٹ گئی۔ میں لٹ گیا، میں برباد ہوگیا۔

جمیل صاحب کے دونوں فرزند عدیل و انجم سلمہ اللہ تعالیٰ دوبئی میں تھے میں نے انھیں ٹرنک کال کرکے بلایا، لیکن وہ اس روز نہ آسکے اور ان کی عدم موجودگی میں یہ گوہر بے بہا، یہ مکمل انسان تقریباً ۶ بجے شام کو امام باڑہ غفراں مآب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مٹی دیتے وقت میں سوچ رہا تھا جو اپنے جوتے پر گرد دیکھنا گوارہ نہ کر سکتا تھا، وہ جسم منوں مٹی میں دبایا جارہا ہے اور وہ جسم جو طہارت اور پاکیزگی کے ساتھ ہمیشہ عطر یا سینٹ کی خوشبو بکھیرتا چلتا تھا، کافور کی ناگوار بو کے ساتھ قبر میں اتار دیا گیا ہے۔ کیسی بے بسی اور بے چارگی کا سامنا ہوتا ہے موت آجانے کے بعد، اور کیسی کیسی حسین وجمیل ہستیاں اسی طرح مٹی میں دبا دی جاتی ہیں۔ قابل عبرت ہے۔

جمیل صاحب ایک روز بھی دفتر نہ آتے تھے تو دفتر سونا سونا لگتا تھا، ان کی دائمی جدائی میرے لئے بڑا ہی سخت المیہ ہے، اس لئے کہ یہ سونا پن اب دفتر میں ہمیشہ چھایا رہے گا۔ اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں مجھے کبھی کسی کے انتقال سے ایسا صدمہ نہیں پہنچا، جیسا جمیل صاحب کے مرجانے سے ہوا۔ ۳۰ سال تک وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھے نظر آتے رہے۔ اتوار یا کوئی اور تعطیل ہوتی تو میں خود ان کے گھر چلا جاتا تھا، اس طرح تقریباً ہر روز ان کا ساتھ رہتا تھا۔ ایسی ہستی کو بھلانا ممکن نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ کرسی اب بھی میرے سامنے رہتی ہے، جس پر وہ بیٹھا کرتے تھے۔

جمیل صاحب نے اپنی یادگار، دو بیٹے انجم، عدیل، تین لڑکیاں غزالہ، شہلا، راحلہ اور ایک بیوہ چھوڑی ہیں۔ انجم اور تینوں بیٹیوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے، تیسری بیٹی راحلہ کی شادی گذشتہ مارچ ہی میں کی تھی۔ اس کے بعد کہا کرتے تھے "اب مجھے کوئی فکر نہیں رہی۔ عدیل میاں کی شادی دوبئی میں طے ہوگئی ہے۔ ہو جائے گی" یہ بھی محسوس کیا گیا کہ راحلہ کی شادی کے بعد مرحوم نے کچھ بدپرہیزی بھی شروع کر دی تھی۔ بہرحال سبب کچھ بھی رہا ہو۔ موت اسی طرح آنا تھی اسو آکر رہی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے تمام پس ماندگان، اعزہ واقربا کے ساتھ ہی مجھے بھی صبر جمیل دے۔

شکستہ دل۔ نسیم انہونوی

کیا ٹھکانا ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح

سید انکسار علی

سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کا شمار ان نامور اہل طریقت و باکمال بزرگان دین میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری حیات پاک کا ہر لمحہ عبادت الٰہی و عشق رسولؐ میں صرف کیا اور اپنے عمل سے خود کو ایک سچے عاشق رسولؐ کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کیا۔

سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح نے برصغیر پاک و ہند میں اس وقت قدم رنجہ فرمایا جب ہندوستان کی سرزمین جہالت کے اندھیروں میں گھری ہوئی تھی وہاں اسلام کی شمع ٹمٹما رہی تھی کفر و الحاد اور فسق و فجور کے گھنگھور بادلوں نے پورے ہندوستان کو ڈھانپ لیا تھا ایسے پرآشوب دور میں سرزمین ہند میں حضرت معین الدین چشتی رح نے دین حنیف کے پرچم کو سربلند کیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح نجیب الطرفین سید حسینی و حسنی تھے۔ آپ کا شجرہ نسب کئی پشتوں بعد حضرت علی مرتضیٰؓ سے جا ملتا ہے خواجہ غریب نواز ۵۳۰ھ یا ۵۳۶ھ یا بعض روایات کے مطابق ۵۳۷ھ میں سنجران میں پیدا ہوئے جو کہ خراسان کا ایک حصہ تھا۔ اسی نسبت سے آپ کو سنجری بھی کہا جاتا ہے حالانکہ سنجر ایک مختلف قصبے کا نام ہے۔ آپ کے والد گرامی حضرت غیاث الدین رح خود بھی بڑے زاہد اور بزرگ تھے۔ ابھی خواجہ صاحب کی عمر مبارک صرف سات برس ہی تھی کہ والد کی شفقت سے محروم ہو گئے آپ کو ترکے میں ایک باغ ملا جس کی دیکھ بھال آپ خود ہی کیا کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے باغ سے حضرت ابراہیم قلندر نامی ایک بزرگ مجذوب کا گزر ہوا۔ خواجہ صاحب نے ان کی خدمت میں انگور کے شیریں خوشے پیش کیے لیکن انہوں نے وہ انگور نہیں کھائے بلکہ اپنے دہن مبارک میں کھل کے چند ٹکڑے چبا کر خواجہ صاحب کے منہ میں ڈال دیئے اس کھل کے کھاتے ہی آپ کی باطنی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا۔ آپ کا دل نور الٰہی اور معرفت الٰہیہ سے معمور ہو گیا اور آپ نے عشق الٰہی میں اپنی تمام تر توجہ خالق کائنات کی طرف لگا دی۔ پھر سمرقند کا رخ کیا، جہاں آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا اور علوم ظاہری و باطنی کے حصول میں مشغول ہو گئے۔

آپ نے حضرت مولانا حسام الدین بخاری اور حضرت مولانا شرف الدین شرع الاسلام جیسے مقتدر روزگار ہستیوں سے تفسیر فقہ حدیث اور علم فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے تقریباً چوبیس سال تک حصول علم میں صرف کرکے علوم معرفت کی تحصیل کے لئے سمرقند سے عراق کی طرف کوچ فرمایا جہاں آپ کی ملاقات حضرت شیخ عثمان ہارونی سے ہوئی۔ ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے ہی شرف بیعت و خلافت حاصل کیا۔ سیر العارفین کی روایت کے مطابق حضرت خواجہ غریب نوازؒ حضرت ہارونی کی خدمت میں ڈھائی سال تک رہے اور یہ تمام مدت آپ نے ریاضت و عبادات و مجاہدات میں گزاری کہ بعض اقوال کے مطابق خواجہ صاحب بیس برس تک اپنے پیر کامل و مرشد کی خدمت میں رہ کر علوم روحانی سے مستفیض ہوتے رہے۔ اس مدت میں آپ نے حضرت شیخ ہارونی کے ساتھ دس سال تک سیر و سیاحت کی اس سفر میں آپ نے اسلامی علوم و فنون کے مراکز یعنی بخارا، بدخشاں و بلخ کا دورہ بھی کیا اور حج کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے اور سرکار دو عالم کے دربار میں بھی حاضری دی۔ حضرت عثمان ہارونی آپ سے اس قدر خوش تھے کہ انہوں نے مکہ معظمہ میں حج کرنے کے بعد خواجہ صاحب کا ہاتھ پکڑا اور خداوند کریم کے سپرد کرکے باب رحمت کے نیچے کھڑے ہو کر یوں دعا کی:۔

"اے میرے مولا۔ میرے آقا۔ مجھ کو ایسا جانشین عطا فرما دے جو دین کے طریقوں کو زندہ کرنے والا ہو۔ اے پروردگار دو عالم تو ان سے راضی رہ" یہ مبارک دعا فوراً قبول ہوئی اور ہاتف غیب کی ندا آئی — "ہم نے معین الدین کو قبول کیا"۔

یہاں سے خواجہ غریب نواز نے اپنے پیر و مرشد سے رخصت ہو کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور بغداد شریف پہنچ کر [illegible] حضرت

شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی خدمت اقدس میں حاضری دی اور تقریباً ڈھائی سال حضرت کبریٰؒ کی صحبت سے فیض اٹھا کر قصبہ جیل آ گئے جہاں آپ نے اپنے وقت کے ممتاز مجدد دین محبوب سبحانی پیران پیر ولی کامل سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے شرف نیاز حاصل کیا۔ حضرت غوث الاعظمؒ کے حکم پر آپ بغداد تشریف لے آئے جہاں شیخ المشائخ پیر شہاب الدین سہروردیؒ اور ان کے پیر طریقت شیخ ضیاء الدین کی صحبت بابرکت سے فائدہ اٹھایا اور بغداد شریف میں ہی حضرت خواجہ اوحد الدین کرمانیؒ سے فیضیاب ہو کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔

ہندوستان میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے کا واقعہ بھی بڑا ہی عجیب و غریب سا ہے۔ جس وقت خواجہ غریب نواز مدینہ منورہ میں تھے تو ایک دن آپ مسجد قبا میں عبادت و ریاضت میں حسب معمول مشغول تھے کہ آخر کار وہ ساعت مبارک بھی آن ہی پہنچی جب آپ کو دربار رسالت مآب ﷺ سے یہ بشارت ملی۔

" اے معین الدین تو میرے دین کا معین ہے۔ میں نے تجھے ولایت ہند عطا کی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز حضرت شیخ اوحد کرمانی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ایک جگہ تشریف فرما تھے کہ ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً ۱۲ سال کی تھی آپ کی مجلس کے سامنے سے گزرا تو آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا۔ جب تک یہ لڑکا دلی کا بادشاہ نہ ہوگا خدا اسے دنیا سے نہ اٹھائے گا تاریخ میں یہ لڑکا سلطان شمس الدین التمش کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے جو کہ ہندوستان کے مسند شاہی پر عرصہ تک فائز رہا۔

سلطان الہند غریب نواز بغداد شریف سے ہرات (سبزوار) پہنچے تو وہاں کے حاکم کو جو صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کرتا تھا آپ نے اس کو تائب کیا اور اسے اپنے حلقہ ارادت میں لے کر شرف بیعت سے مشرف فرمایا۔ اس نے اپنا تمام مال و متاع فقرا مساکین و غربا میں تقسیم کر دیا اور پورے دل جمعی و یکسوئی سے اشاعت اور فروغ اسلام میں مصروف ہوگیا۔

حضرت خواجہ غریب نواز اپنے چالیس درویشوں کے ہمراہ ہرات، [illegible] اور غزنی ہوتے ہوئے سرزمین ہند میں داخل ہوئے۔

جس زمانے میں آپ ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کا وصال ہو چکا تھا لیکن آپ نے بزرگوں سے عقیدت کے جذبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آپ کے آستانہ مبارک پر حاضری دی اور چلہ کشی فرمائی۔ آپ نے حضرت داتا کو ان الفاظ میں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

خواجہ صاحب کا یہ شعر آج بھی داتا صاحبؒ کے روضہ پر کندہ ہے آپ نے لاہور میں داتا صاحب کے دربار میں تقریباً ۵ سال تک ریاضت و عبادت فرمائی۔ یہیں آپ نے سنسکرت اور ہندی زبان پر کامل عبور حاصل کیا اور یہاں سے آپ دہلی تشریف لے گئے۔ اور بعد میں خواجہ صاحب ۱۰ محرم ۵۶۱ھ کو اجمیر تشریف لے گئے اور آخری سانس تک وہیں قیام کیا۔

اس زمانے میں اجمیر کا حکمران مشہور راجپوت چوہان خاندان سے تعلق رکھنے والا راجہ رائے پتھورا تھا اس کے اہل کاروں نے آپ کو سرزمین اجمیر میں داخل ہونے سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن جب وہ اس میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے جادوگروں، عاملوں اور پنڈتوں سے آپ کو روکنے کے لئے مدد طلب کی لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ چونکہ آپ کو رب کائنات کی تائید و نصرت حاصل تھی آپ نے انتہائی خطرات و ناسازگار حالات میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا حتیٰ کہ اس راجہ کے کئی اہلکاروں کو دین اسلام کی دعوت دے کر حلقہ اسلام میں داخل کیا اور دین مبین کی قوت سے نوازا ان باتوں سے پریشان ہو کر راجہ نے آپ کو دھمکی دی کہ میں آپ کو اجمیر بدر کر دوں گا۔ یہ سن کر حضرت سلطان الہند نے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں اس سرزمین کا اختیار دیا ہے انشاء اللہ العزیز تو جلد ہی یہاں سے نکالا جائے گا آپ کی پیشین گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ سلطان [illegible] غوری نے راجہ رائے پتھورا کے خلاف حملہ کر کے اس کی سرکوبی کی اور اس کو گرفتار کر کے ہلاک کر دیا۔

روایات میں ہے کہ [illegible] کے [illegible] شہاب الدین [illegible] اجمیر شریف پہنچا جب وہ اجمیر [illegible] [illegible]

مغرب کے وقت اس نے اذان کی آواز سنی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک درویش کچھ عرصہ سے یہاں اقامت پذیر ہیں۔ چنانچہ شہاب الدین غوری اس طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ خواجہ صاحب امامت فرمارہے تھے۔ شہاب الدین اس جماعت میں شامل ہوگیا۔ جب نماز ختم ہوگئی تو اس کی نظر آپ پر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کو حیرت ہوئی کہ اس کے سامنے وہی بزرگ جلوہ فرما تھے جنھوں نے اس کو خواب میں فتح کی بشارت دی تھی۔ شہاب الدین آگے بڑھا اور آپ کے قدموں میں گر پڑا اور حلقہ مریدان میں شامل ہوگیا۔

حضرت سلطان الہند کی تعلیمات اپنے اندر ایک لازوال خزینہ رکھتی تھیں۔ گو آپ نے کوئی جامع و مبسوط کتاب تحریر نہیں کی ہے تاہم بعض دوسرے مستند تذکروں میں جستہ جستہ فرمودات نقل ہوئے ہیں ان کی روشنی میں آپ کی دقیق علمی نظر اور وسعت نظری کا اندازہ ہوتا ہے آپ فرماتے ہیں:۔

چار چیزیں نفس کا جوہر ہیں ان کا برابر لحاظ رکھنا۔ (۱) درویشی میں اظہار دولت مندی (۲) بھوک میں اظہار سیری (۳) غم میں اظہار مسرت (۴) دشمنی میں اظہار دوستی۔

اور ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا غریب کی فریاد سننا اور اس کی حاجت روائی کرنا اور درماندوں کی دستگیری کرنا عذاب دوزخ سے بچنے کی بہترین تدابیر ہیں لیکن گناہ کے بارے میں آپ کا قول مبارک ہے گناہ اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل و خوار کرنا۔ آپ فرمایا کرتے تھے خدا کا دوست وہ ہے جس میں یہ تین اوصاف ہوں۔ • دریا جیسی سخاوت • آفتاب جیسی شفقت • زمین جیسی عاجزی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بار آپ نے اجمیر سے دہلی تک پیدل سفر محض اس لئے اختیار کیا کہ آپ بادشاہ وقت سے ایک کسان کی سفارش کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جو اس وقت دلی کے بے تاج بادشاہ تھے یہ سنا تو آپ سے عرض کیا۔ حضرت آپ نے اس کام کے لئے اتنی زحمت کیوں اٹھائی مجھے حکم بھیج دیا ہوتا میں اس کسان کا کام کر دیتا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے سرکار دو عالم کا یہ قول اقدس نہیں سنا کہ جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لئے چالیس قدم چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے چالیس سال کی عبادت کا ثواب عطا فرماتے ہیں کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ میں اس حدیث کا مصداق بنوں۔"

"تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اسلام کی اشاعت اور تبلیغ دین میں بزرگان دین اور اولیائے کرام نے جو کردار ادا کیا ہے وہ تا قیامت اسلامی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا۔ تاہم برِ اعظم ہند میں جن اولیائے کرام کی دینی مساعی جمیلہ سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ اُن میں حضرت خواجہ غریب نواز کا اسم گرامی بڑا نمایاں و منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

آپ نے گمراہیوں وجہالت کی تاریکیوں میں اسلام کی شمع روشن کی اور اپنے بلند پایہ کردار اور حسن اخلاق سے گمراہ اور اخلاق باختہ لوگوں کے دلوں کو روحانی دولت سے معمور فرمایا اسلام کی ترویج و تبلیغ اپنی ریاضت و عبادت اور زہد و تقویٰ اور پاکیزہ اخلاق و کردار سے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں فکری و دینی انقلاب برپا کیا۔

حضرت خواجہ غریب نواز کی مساعی جمیلہ سے ہند و پاک میں اسلام کا سورج طلوع ہوا اور آفتاب کی کرنیں پورے ہندوستان کے کونے کونے میں جا پہنچیں۔ آپ کے دست مبارک پر سیکڑوں نہیں بلکہ لاکھوں گمراہ انسانوں نے دین اسلام کو قبول کیا اور اس طرح آپ نے اسلامی تعلیمات سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو حق و صداقت کی راہ پر گامزن کیا

صدیاں گزر جانے کے بعد اور فرقہ پرستی کے باوجود آج بھی اجمیر شریف میں آپ کا مزار مبارک ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے پرکشش اور تسکین کا سامان ہے ـــ آپ نے اپنے عمل سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی اور آج بھی دلوں پر آپ کی حکمرانی جاری ہے ـــ

افسانہ

قربانی

انجم جاوید

بات اتنی ہی حیران کن تھی کہ ماسی فتو بھی چیخ اٹھیں: "یہ کیا کر رہے ہو! ارے اٹھو نالائق! پاؤں چھوڑ دے میرے!" لیکن نعیم بدستور ماسی فتو کے سامنے پڑا سسکتا رہا۔

نعیم گاؤں کے چودھری کا بیٹا تھا۔ بچپن ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب کہ نعیم میٹرک میں تھا چودھری صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ اب وہ گاؤں میں اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ مقیم تھا۔ پڑھائی کا سلسلہ شہر میں جاری تھا۔ کبھی کبھی وہ گاؤں میں آجاتا تھا۔ اس کی آوارگی کے قصے گاؤں میں مشہور تھے۔ نعیم میں یہی سب سے بڑی عادت تھی۔

یہی نعیم ماسی فتو کے پاؤں میں پڑا ہوا تھا۔ ماسی فتو بھی خوب تھیں۔ گاؤں کی سب سے پرانی باسی وہی تھیں۔ ماسی فتو تجربات کی آگ میں تپ کر کندن بن چکی تھیں اور اب تو ان کے سر کے بال اور بھنویں تک سفیدی اختیار کر چکی تھیں۔

"ارے بولتا نہیں! خواہ مخواہ کے آنسو بہائے جا رہا ہے!" ماسی اکتا کر بولیں۔

"ماسی! تم جانتی ہو کہ میری ماں بچپن میں مر گئی تھی۔" نعیم نے سسکتے ہوئے بات شروع کی۔

"میں جانتی ہوں۔ بھلا رشیدہ کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، مگر بات آخر ہے کیا؟"

"ماسی! امی کا انتقال ہو گیا، میں شعور تک پہنچا تو ان کا ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں تھا، مگر ماسی، میں ہمیشہ آپ کو اپنی والدہ کی جگہ سمجھتا رہا۔"

"مجھے!" ماسی فتو حیرانی سے بولیں۔

"ہاں آپ کو! پھر میں شہر گیا تو کسی اور رنگ میں ڈھل گیا۔ ماسی! میں بہت شرمندہ ہوں ——— میں برے رستے سے ہٹا جا رہا ہوں۔ مجھ پر محبت و شفقت کا ہاتھ رکھ دیں۔ میں برے رستے سے بیزار ہوں۔ ماسی! مجھے ماں کا پیار چاہیئے۔"

وہ بول رہا تھا اور ماسی کے دل میں، سینے میں، آنکھوں میں ایک لرزش سی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا اسے اٹھا کر سینے سے لگا لو۔ ماسی فتو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ انھوں نے زمین پر پڑے نعیم کو اٹھا لیا۔

"دیکھو بیٹے، تم جانتے ہو کہ میں نے شادی نہیں کی، لیکن آج سے تم میرے بیٹے ہو اور دیکھو بیٹے برائی کا کوئی ایسا راستہ اختیار نہ کرنا کہ جس سے میں شرمندگی محسوس کروں۔" ماسی فتو کہتی رہی، وہ سنتا رہا۔

"ماسی! آپ مجھے ہمیشہ نیک پائیں گی۔" نعیم نے اتنا کہا اور اجازت لے کر گھر سے نکل گیا۔

کبھی کبھی زمین پر ماہتاب اترتا تھا اور اس دن بھی ماہتاب اترا تھا جس دن نعیم گلو کی دکان پر کھڑا سگریٹ کو شعلہ دکھا رہا تھا اور اسے دیکھ کر نعیم سکتے میں آگیا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے قیامت محوِ خرام ہو۔ ایسا ہی حسن تھا کہ نعیم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شہر میں پڑھتا تھا اور اس نے حسن کو مختلف رنگ و روپ میں دیکھا تھا۔ آج اسے محسوس ہوا کہ شہر ہی نہیں گاؤں بھی اپنا حسن رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بچی بھی انگلی پکڑے چل رہی تھی۔

"گلو!" اس نے زیرِ لب کہا۔

"کیا بات ہے نعیم!" گلو نے پان کے پتے پر کتھا لگاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ... یہ کون ہے؟"

گلو نے اس سمت دیکھا جس طرف نعیم نے اشارہ کیا تھا۔ "اچھا وہ! اس کا نام زلیخا ہے۔"

"زلیخا!" نعیم نے زیرِ لب دہرایا۔

زلیخا دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ماسی فتو کے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

"گلو!" نعیم نے اسے ٹوک کر پوچھا: "یہ کب یہاں آئی؟"

"ابھی تو بتایا ہے میں نے۔" گلو حیران ہو کر کہنے لگا۔ "اسے آئے ہفتہ بھر ہوا ہے، ماسی کی رشتے دار ہے اور بیوہ ہے بے چاری!" گلو نے دوبارہ تفصیل بتا دی۔

"بیوہ!" نعیم کو حیرت ہوئی اور اس نے سوچا، تو یہ بچی اسی کی بچی ہے۔ "کچھ بھی ہو گلو! یہ لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔ اگر میں شادی کروں گا تو اسی سے ورنہ....." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

گلو اس کا دوست تھا، پان کی دکان چلاتا تھا اور نعیم کی عادتوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے کہا: "یہ مشکل لگتا ہے شاید تم نہیں جانتے کہ اس کا تعلق ماسی سے ہے اور ماسی..."

"ہاں مجھے تم ابھی بتا چکے ہو" نعیم نے بات کاٹ کر کہا "میں جانتا ہوں کہ اس گاؤں میں ماسی کی بہت عزت ہے، لیکن پیارے! جس کی کوئیاں نہیں کھیلیں، اکثر شکست ہو جائے"

نعیم کا معمول بن گیا تھا کہ وہ روز زلیخا کو ماسی فتو کے ہاں سے نکلتے دیکھتا اور ماندر ہی اندر سلگتا رہتا۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ زلیخا شیرو کے گھر کا کام کرنے پر ملازم ہے۔ نعیم نے ایک ہفتے کے دوران میں کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح زلیخا سے گفتگو ہو جائے مگر اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ تنگ آ کر اس نے ایک دن زلیخا کو سرِ راہ روک لیا اور اسے پان دینے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پان تو کھیت میں جا پڑا اور نعیم کو انتہائی تلخ و ترش قسم کی باتیں سننا پڑیں۔ اس دن کے بعد اسے ہمت نہ ہوئی کہ زلیخا کو روکنے کی کوشش کر سکتا۔ وہ انتہائی پریشان ہو گیا تھا۔ پہلی دفعہ اسے لگا کہ وہ ناکام ہو جائے گا اور یہ خیال ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔

"یار گلو، کبھی کبھی میں دعا کرتا ہوں کہ ماسی فتو مر جائے۔ پھر اسے دیکھتا ہوں، کتنے پانی میں ہے!"

"نعیم! دعا کرنے سے بھی کوئی مرتا ہے! اگر ایسا ہو تو شاید ہی یہاں کوئی زندہ رہے" گلو نے جواب دیا۔

"کیا مطلب! کیا بکتے ہو!" نعیم کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

بات یہ ہے نعیم! جسے تم دعا کہہ رہے ہو، دعا نہیں بددعا ہے اور میری بات کا مقصد یہ ہے کہ یہاں ہر شخص نے خلوص اور محبت کی نقاب ڈال رکھی ہے۔ ہر شخص دوسرے کو بددعا دیتا ہے اور ہر دوسرا شخص پہلے شخص کی کھال اتارنے کی سوچتا رہتا ہے، ایسے میں سب کی خواہش خدا پوری کر دے تو کرۂ ارض پر کوئی انسان باقی نہ رہے"

"تم بول رہے ہو گلو! کہاں سے سیکھیں یہ باتیں" نعیم حیرت سے بولا۔

"میری دکان ہے نعیم! یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں، یہاں ہر شخص کھل کر کسی نہ کسی سے اپنے عشق کی داستان سناتا ہے اور کوئی کسی کی دولتمندی سے جلتا ہے یہ دنیا ہے پیارے یہاں انسان رہتے ہیں اور انسان، انسان کا برا نہیں سوچے گا تو پھر کون سوچے گا!"

"اس گفتگو کو ختم کرو اور یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟"

گلو نے اسے یہی رائے دی تھی کہ کسی طرح ماسی فتو کے دل میں گھر بنالو، پھر مائی کا دل جیت لو گے تو آگے کے راستے آسان ہوتے جائیں گے۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ماسی فتو کو اپنی ماں بنا لیا تھا۔

نعیم اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ یہ بڑی بات تھی۔ نعیم کو گھر میں دیکھ کر پہلے پہل تو زلیخا ٹھٹک سی گئی تھی۔ ماتھے کی سلوٹیں گہری ہونے لگی تھیں اور نعیم تو جیسے پلک جھپکنا بھول گیا تھا۔

"آؤ زلیخا بیٹی، یہ نعیم ہے، بالکل میرے بیٹے کی طرح!" ماسی فتو نے کہا۔

"مگر ماسی یہ... اس کی حرکتیں تو شریفوں کی سی نہیں ہیں۔ میں اسے جانتی..."

"بیٹی! یہ آج کے بعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ کیوں نعیم؟" وہ آخری الفاظ نعیم کو دیکھ کر بولیں

"ہاں ماسی! میں ان سے بھی شرمندہ ہوں، مگر آئندہ انہیں کوئی شکایت نہ ہوگی"

"امی! امی! یہ کون ہیں؟" ننھی بچی نعیم کی طرف اشارہ کر کے زلیخا سے پوچھنے لگی۔

یہ تمہارے ماموں ہیں کرن" ماسی فتو نے جواب دیا۔

نعیم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

"ماموں!... یہ ماموں ہیں نا!" کرن نعیم کے پاس آ گئی "ماموں مجھے ٹافی لے کر دیں گے نا؟"

نعیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور آہستہ سے بولا "ہاں لاؤں گا کرن!"

نعیم کو آتے جاتے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ زلیخا سے بھی اس کی گفتگو ہو جاتی مگر انتہائی کم۔ زلیخا بھی اس کی طرف سے محتاط تھی اور نعیم کو بھی اس کا پورا احساس تھا۔ البتہ وہ کرن کے لئے ٹافیاں لے کر جاتا تھا۔

ایک دن جب نعیم ماسی فتو کے انکار کے باوجود ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا تو کرن آ گئی "ماموں... ماموں... ماموں" وہ بولی۔

نعیم نے کڑوا گھونٹ بھرا، مجبوری تھی کیا کرتا۔ وہ کرن کو ماموں کہنے سے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"کہو بیٹے کیا بات ہے؟" نعیم اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ماموں! مجھے ایک چادر لا دو، سفید چادر!" وہ معصومیت سے بولی۔

نعیم چونک اٹھا "کیوں بھئی سفید چادر کس لئے؟"

"وہ میری سہیلی ہے نا... سیمی! وہ بھی سفید چادر اوڑھتی ہے۔ لا دیں گے نا؟"

اچھا لا دوں گا۔ اور کچھ؟" نعیم نے اسے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ساتھ میں خوشبو بھی ہونی چاہیئے، اچھی سی"

"چلو بھئی یہ بھی لا دوں گا بس!" نعیم نے کہا اور کرن نے گردن ہلا دی۔
نعیم نے کرن کی فرمائش کو کل پر ٹال دیا اور آج کی رپورٹ حسب معمول ٹلو کو سنانے چلا گیا۔

سو کر اٹھا تو بھابی نے خبر سنائی کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ماسی فتو کا انتقال ہو گیا۔ وہ اچھل پڑا۔ بھابی چلی گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر خوشی منائے کہ غم کرے! خوشی اس بات کی تھی کہ اس کی راہ سے رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ غم اس کا تھا کہ اس نے ماسی فتو کو بہر حال ماں کہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماسی فتو کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ ممتا کی چھاؤں اس سے دوبارہ چھن گئی ہے۔

حسن سوگوار ہو تو جانے کیوں نکھر آتا ہے! زلیخا سوگوار ہی نہیں تھی بلکہ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بین کر رہی تھی۔ اردگرد عارضی رشتے دار اسے سنبھالنے اور تسلی دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ نعیم ایک کونے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ پھر وہ آہستہ سے باہر نکل گیا۔

ساتویں دن نعیم ماسی فتو کے ہاں گیا۔ حسب توقع گھر کے اندر زلیخا موجود تھیں۔ زلیخا اسے دیکھ کر چونکی اور سنبھل سی گئی۔
نعیم خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اظہار ہمدردی کرے۔ "مجھے افسوس ہے زلیخا!" نعیم دھیمے لہجے میں اتنا ہی کہہ سکا۔
"میں آتا رہوں گا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیا کرنا۔" نعیم نے چند لمحے بعد بات آگے بڑھائی۔
"نعیم! میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ تم... تم یہاں نہ آیا کرنا!"
بات کیا تھی ایک دھماکا تھا۔ نعیم کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ "تم یہ کیا کہہ رہی ہو زلیخا؟"
"ٹھیک کہہ رہی ہوں نعیم! تمہارا یہاں آنا اس وقت تک تو اچھا تھا جب ہمارے درمیان ماسی تھیں، لیکن اب میں اکیلی ہوں اور عورت ذات کی مثال شیشے کی طرح ہے اور شیشہ بہت نازک ہوتا ہے۔"
نعیم کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کبھی نہ کہہ سکا تھا۔
"نہیں!... یہ ناممکن ہے نعیم! میں تمہیں اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتی!... کیا ہے میں نے اپنے مرحوم شوہر سے ایک وعدہ کیا تھا اور... اور وہ... میں نہیں توڑ سکتی!... ہرگز نہیں!"

"اور میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ ہر قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گا!"
نعیم طیش کے عالم میں بولا اور پھر پیر پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔
چاہت کے کئی رنگ روپ ہیں۔ یہ آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ نعیم بھی دیوانہ ہو گیا اور اس کی چاہت نے ٹھکرائے جانے پر انتقام کا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ کسی بھی طرح زلیخا کو اپنانا چاہتا تھا۔ اس کی ضدی فطرت کسی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ایک مجبور و بے سہارا عورت اسے ٹھکرا دے۔ یہ سوچتے سوچتے کہ کیا کیا جائے، اسے اپنا دوست جگو یاد آ گیا۔ جگو بدمعاش تھا۔ نعیم اس سے ملا اور ساری داستان بیان کر دی۔

حسب معمول زلیخا جب شیرو کے ہاں گئی تو اسے بہت حیرانی ہوئی۔ شیرو کی بیوی نے اسے بتایا کہ تمہیں نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔
"مگر میرا قصور کیا ہے؟" زلیخا تنگ دستی کا خیال کر کے کانپ سی گئی تھی۔
"قصور تو میں نہیں جانتی، مجھ سے جگو نے آ کر کہا تھا۔ اگر تمہاری نوکری بحال رہی تو میری بیٹی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ نہیں میں یہ... یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

زلیخا حیران سی لوٹ آئی۔ جگو کو اس سے کیا دشمنی تھی! وہ سمجھ گئی کہ نعیم نے چال چلی ہے۔ وہ افسردہ سی اگلے دن سو کر اٹھی تو اسے غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ وہ اسے کوئی معنی نہ دے سکی، چائے کا پانی اسٹو پر رکھا اور مرغیوں کے ڈربے کی طرف لپکی۔ دوسرے ہی لمحے حیران رہ گئی۔ اندر ساری مرغیاں مردہ پڑی تھیں۔ کمائی کا دوسرا ذریعہ بھی ختم ہوا، اس نے سوچا اور نڈھال سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔
زلیخا کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ اس کی مرغیوں کو بھی جگو نے کسی طرح ختم کرا دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ زلیخا غربت سے تنگ ہو کر جھک جائے گی۔ وہ یہ سن کر خوشی محسوس کر رہا تھا کہ زلیخا قرض لینے لگی ہے۔
زلیخا کرتی بھی تو کیا کرتی۔ نوکری اسے مل نہیں رہی تھی، کمائی کا ذریعہ مرغیوں کے انڈے تھے۔ وہ ذریعہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ مرغیاں ہی نہیں تھیں تو انڈے کہاں سے ہوتے! ماسی فتو کی جمع شدہ ساری پونجی چالیسویں تک خرچ ہو گئی۔ اس نے قرض لیا تھا، لیکن سوچ رہی تھی کہ کب تک یونہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا! وہ جھنجھلا کر سوچتی کہ زندگی کو ختم کر لے، مگر کرن کو دیکھ کر ارادہ ترک کر لیتی۔ پھر سوچتی کہ اپنے بہنوئی کے پاس دوسرے گاؤں چلی جائے، مگر اسی سے بچ کر تو وہ ماسی کے پاس آئی تھی۔ زلیخا کی نظر میں اس کا کردار مشتبہ تھا۔
آج صبح سے کرن کو بخار تھا۔ اس کی دوا کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ پڑوس...

اب قرض دینے سے بھی کتراتے تھے۔ وہ بچی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور نعیم آہستہ قدموں سے چلتا ہوا قریب آگیا۔ اسے دیکھ کر زلیخا کے من بدن میں آگ لگ گئی، لیکن بے بسی اور مجبوری انسان کو کمزور بنا دیتی ہے اور زلیخا بھی اب کمزور ہو چکی تھی۔ وہ نعیم کو ایک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

"سنا ہے کہ تمہاری بچی بیمار ہے، اس کے علاج کے لئے رقم درکار ہوگی کتنی رقم کی ضرورت ہے بولو!" نعیم کی سپاٹ آواز گونجی۔ وہ چونک اٹھی اور اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے رقص کرنے لگے۔

نعیم نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا: "دیکھو زلیخا میری ایک شرط ہے جسے تم بخوبی جانتی ہو۔ میں بہت ضدی ہوں۔ بچپن سے میری ہر ضد پوری کی گئی ہے۔ تمہیں اپنانا بھی میری ضد بن چکی ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اگر شادی کروں گا تو صرف تم سے ورنہ کسی سے نہیں۔ تم مجھ سے شادی کر کے کسی گناہ کی مرتکب نہیں ہوگی۔ مرنے والوں سے کیئے جانے والے عہد ضروری نہیں کہ پورے ہی کئے جائیں۔ مُردوں پر زندوں کو ترجیح دینا میرے نزدیک کوئی بُری بات نہیں۔ سوچ لو اب بھی وقت ہے۔"

زلیخا سسک اٹھی۔ اس کی نظروں میں اپنے مرحوم شوہر کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس وقت بچی کراہی اور بچرنے کرنے لگی۔ زلیخا گھبرا اٹھی اور اسے سنبھالنے لگی۔ اس نے ایک لمحہ دکھ سے سوچا اور گھوری۔ نعیم کے ہاتھوں میں نوٹ بدستور تھا۔ اس نے بچی کی طرف دیکھا، ہاتھ بڑھایا نوٹ لے لیا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نعیم کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا: "زلیخا! میں تم پر جبر کرنا نہیں چاہتا۔ آج رات تک سوچ لو، میں نصف شب کے بعد آؤں گا، تمہارا فیصلہ سننے!"

دروازہ بند بھی تھا اور کھلا ہوا بھی تھا۔ ایسے کہ کواڑ بند تھے مگر کنڈی بند نہ تھی، گویا آنے والے کے لئے کوئی بندش نہ تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ دور دور تک سناٹے کا راج تھا اور پورا گاؤں محو خواب تھا۔

زلیخا جاگ رہی تھی اور کونے میں پلنگ پر بچی لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سر پاس ہی رکھی ہوئی ٹیبل پر جھکا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے جیسے وہ سوگ میں ہو۔ وہ سسک رہی تھی اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج اس کی خودداری خاک میں ملنے والی ہے۔ اس نے اپنے شوہر سے جو عہد کیا تھا، وہ ٹوٹ جائے گا۔

زندگی کے شجر میں لگے ہوئے سرسبز پتوں میں سے ایک ننھا سا پتا زرد ہو گیا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی شریر جھونکا اسے زندگی سے جدا کرنے والا تھا، مگر زلیخا کو شاید ابھی اس کا احساس نہیں تھا۔ مگر اسے محسوس ہوا کہ سناٹا گہرا ہو گیا ہے۔ بچی کے تنفس کی آواز نہیں آ رہی۔ اس کے کراہنے کی آواز بھی معدوم ہو چکی تھی۔ وہ لپکی۔ بچی بے حس و حرکت تھی۔ شاید سو گئی ہے، اس نے سوچا اور پھر کچھ خیال کر کے بچی کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دل کی دھڑکن بھی مفقود تھی۔ زلیخا کا رنگ زرد ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ہزار ضبط کرنے کے باوجود ہلکی سی چیخ نکل گئی اور پھر اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

اچانک نعیم گھر میں داخل ہوا۔ اندر آ کر اس نے کمبل اتار دیا۔

"تم زمین پر بیٹھی ہو؟" وہ بولا۔

"ہاں!" زلیخا نے سسکاری بھری اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

نعیم اپنی ہی دھن میں تھا ورنہ زلیخا کی حالت دیکھ کر اس کے سر سے عشق کا بھوت اتر جاتا۔ اس نے سمجھا کہ شاید زلیخا نے اس کے حق میں فیصلہ کیا ہے اور اسی سبب اپنے مرحوم شوہر کو یاد کر کے رو رہی ہے۔ یہی سوچ کر وہ بولا۔ "کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"فیصلہ!" زلیخا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "فیصلہ ہو چکا۔"

"یہ فیصلہ میرا نہیں، قدرت کا فیصلہ ہے۔" زلیخا کی آواز نعیم کے لئے اجنبی سی تھی۔ پھر اس نے زلیخا کو اٹھتے دیکھا۔ چند ہی لمحے بعد نعیم کے سامنے سو روپے کا نوٹ پڑا تھا: "اسے اٹھا لو نعیم! اس کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی، جسے ضرورت تھی وہ ... وہ ... اس نے مجھے عہد شکنی سے روک دیا۔" زلیخا کی آواز بکھر گئی۔ "اگر ... اگر تمہیں یقین نہیں تو ... تو خود اس سے پوچھ لو۔" زلیخا نے کرن کی طرف اشارہ کیا۔

چند لمحے نعیم گم صم سا کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زلیخا کیا کہہ رہی ہے۔ مگر اسے کرن کا خیال آیا اور وہ اس کی طرف لپکا۔ وہ بستر پر بے جان پڑی تھی۔

نعیم کو زمین آسمان گردش کرتے محسوس ہوئے۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کی روح میں نشتر چبھو رہا ہو۔ زلیخا جیت گئی تھی اور وہ ہار گیا تھا۔

اس نے کرن کو دیکھا، بے نور آنکھیں جیسے اس سے کہہ رہی تھیں "ماموں میرے لئے سفید چادر اور خوشبو لے کر آنا!"

وہ سسک اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ زلیخا کے قریب گیا۔ دوسرے ہی لمحے سو سو کے کئی نوٹ اس نے زلیخا کی جھولی میں ڈال دیئے اور یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا: "زلیخا! میری بھانجی کے لئے اچھی سی سفید چادر اور خوشبو لے آنا۔"

افسانہ

اپسرا

اقبال بانو

"ٹرن.... ٹرن" ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مطالعہ میں مستغرق ایاز پاشا چونک گئے۔ کتاب رکھ کر انھوں نے عینک اتارتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو" انھوں نے پیشانی پر آئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"ایاز پاشا صاحب ہوں گے ان سے بات کرنی ہے" دوسری طرف کوئی لڑکی نہایت شہد آگیں لہجے میں بول رہی تھی پہلے تو اس کا جی چاہا ہمیشہ کی طرح رانگ نمبر کہہ دیں مگر پھر نجانے کیا سوچ کر ایک دم بولے۔

"فرمائیے بول رہا ہوں جی"

"اسئے سچ آپ ہی ہیں، آپ نے مجھے پہچانا؟" وہ بلبل کی طرح چہکی۔

اپنے حافظہ پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ محترم خاتون"

"کل رات ہی تو مسٹر سکندر کے ہاں ڈنر پر ملاقات ہوئی تھی اور میں نے آپ سے آٹوگراف بھی لیا تھا میں افشین ہوں رحمٰن شیرازی کی بیٹی" اس کے لہجے میں تحیّر تھا۔

"اوہ" ایاز پاشا کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے اور رات کا وہ منظر حسین رنگوں کی طرح آنکھوں میں اتر آیا۔ افشین رحمٰن نازک سی لچکیلی، کچنار کی کچی کلی کی مانند سولہ سال کی وہ شوخ و شریر سی لڑکی جو ایاز پاشا سے تقریباً چپکی رہی تھی۔

وہ جس کی آواز سماعتوں میں امرت گھولتی تھی۔

اس کے لہجے میں گھنگھرو بولتے تھے۔

آنکھوں میں قندیلیں روشن تھیں۔

ہنستی تو لگتا ایلورا کے غاروں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

ایاز پاشا ایک دم چونکے وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں آپ کی زبردست فین ہوں۔ سچ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں"

"تھینکس" ایاز پاشا کے لب کپکپائے وہ روز ہی ایسے جملے سنا کرتے تھے اور ان کے لبوں پر بہت خوبصورت سی مسکراہٹ بچ جاتی۔ اپنی تعریف عجیب بھی لگتی اور خوشی بھی ہوتی کسر نفسی حد سے بہت زیادہ تھی شرمندہ سے ہوجاتے تو خواہ مخواہ ہی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتے۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں" افشین بولی۔

"کیوں؟" یہ لفظ ایاز پاشا کے لبوں سے یوں ادا ہوئے جیسے سیم کی ہوگی پھلیاں بج اٹھی ہوں۔

"کیوں؟" کا کیا مطلب بس جی چاہتا ہے" وہ جلدی سے بولی۔

"بیٹے دل کو سنبھالیں غیر مردوں سے ملنا بُری بات ہے" انھوں نے سمجھانا چاہا۔

"آپ ہمارے ملک کے بہت بڑے آرٹسٹ ہیں اور میرے خیال میں ہماری سوسائٹی میں مردوں سے ملنا کوئی بُری بات نہیں" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اسلام میں اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے"

اُوہ" وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ اگر ایسی بات ہے تو آپ پروگرام بتائیے انعام پائیے" عورتوں سے سوال کیوں کرتے ہیں؟" وہ تڑ سے بولی۔

لڑکی ہے یا پٹاخہ" ایاز پاشا دل ہی دل میں بولے اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ میرا پروفیشن ہے اگر ایسا نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے؟"

"آپ کوئی اور پروفیشن اپنا سکتے تھے؟" وہ جرح کرتے ہوئے بولی۔

"ہائیں ایسا منہ کو لگا ہے کہ کافر چھٹتا ہی نہیں" ایاز پاشا کو اب اس سے بات کرتے ہوئے مزا آ رہا تھا۔ کسی زمانے میں وہ خود بھی تو ایسے ہی شوخ، چلبلے اور برجستہ گو تھے۔ اور یہ تو اب بھی تھا۔

"بس میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں"

"دیکھو بھئی" ایاز پاشا نے کہنا چاہا مگر وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔

"اگر ملنا ہو تو سیکس ناٹن ٹوون ایٹ نائن (۶۹۲۱۸۹) پر رنگ کر کے بتا دیجئے گا اور جواب ہاں میں ہی ہو۔ افشین نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

"اوہ ممّا آ رہی ہیں۔ آپ رنگ ضرور کیجئے گا میں انتظار کروں گی میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتی ہوں" اس نے نہایت عجلت سے جملہ کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ ایاز پاشا حیرت سے ریسیور کو گھورتے رہ گئے۔

"بس میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں"

ایاز پاشا کی سماعتوں سے یہ جملہ ٹکرانے لگا۔

وہی لہجہ، وہی کھنک، وہی انداز اور جھلاہٹ اور وہی جملہ۔ اتنے برس بعد بھی ان کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔

بس کہنے والی بدل گئی ہے باقی تو سب کچھ وہی ہے وہی جملہ اور وہی انداز۔ ایاز پاشا نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر پلکیں موند لیں۔

اس ایک جملے نے ذہن کے شیشے پر پڑی ہوئی دھند کو صاف کر دیا ہر چیز چمکنے لگی اور برسوں پرانی یادیں زندہ ہوگئیں۔ وہ یادیں جو قصۂ پارینہ بن چکی تھیں مگر پھر بھی ایک کسک بن کر دل کے کسی گوشے میں موجود ضرور تھیں۔

بی۔ اے کا امتحان دیتے ہی اناؤنسر بننے کے شوق میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ ان دنوں وہ بہت لاابالی سے نوجوان تھے۔ اپنے آپ میں مست اور کتابوں میں غرق اساتذہ اور نئے شعراء کا کلام انھیں ازبر تھا۔ بات بے بات اشعار کہتے ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ان میں۔ مگر خود قلندر صفت تھے حتیٰ کہ لباس پر بھی توجہ نہ دیتے۔ ان میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی کہ انھیں سلیکٹ کر لیا جاتا۔ مگر انھیں اپنی آواز پر بہت اعتماد تھا۔ کالج میں کوئی فنکشن ہوتا تو وہی اناؤنسمنٹ کے فرائض انجام دیتے۔ آواز میں ایسی گمبھیرتا تھی کہ کانوں کے راستے دل میں اُتر جاتی۔

پھر انھوں نے ریڈیو پہ آواز کا ٹسٹ دیا۔ قسمت اچھی تھی کہ کامیاب ہو گئے تنخواہ ایک سو تیس روپے تھی مگر قلندر سے ایاز پاشا کے لئے یہ بہت تھی کیونکہ گھر والوں کو ان کی تنخواہ کی ضرورت ہی کب تھی؟ زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور پھر دونوں بڑے بھائی لاہور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ہر ماہ معقول رقم گھر بھیجتے بھلا ان کے ایک سو تیس روپے کو کون اہمیت دیتا۔ پھر وہ بہت لگن سے اناؤنسمنٹ کرنے لگے۔

"سہانی یادیں" کے عنوان سے ہفتے میں ایک بار ایاز پاشا ریڈیو پروگرام کرتے جس میں خوبصورت جملے اور پرانے گیت سنائے جاتے۔ پروگرام سامعین میں بہت مقبول تھا۔ اب کی طرح پہلے پروگرام ریکارڈ نہیں ہوتے تھے براہ راست نشر کئے جاتے تھے۔ ایاز پاشا کے لہجے کی گمبھیرتا ان کے بولنے کے انداز کانوں کے راستے نس نس میں سما جاتا۔ ان کی آواز کے ساتھ ہی لڑکیوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔ جب وہ اپنی بھاری آواز میں کوئی شعر پڑھتے تو وہ روئیں روئیں میں رچ بس جاتا۔

ان کے لہجے کی ناک گمبھیرتا اور انداز نے عرفانہ جعفری کے دل کے تار مضطرب کو اس طرح چھیڑا کہ اُسے اپنا آپ بیگانہ لگنے لگا۔ اس کے دل میں ایک دم ہی ایاز پاشا کی محبت کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ زندگی کی بگیا میں ہر سمت پھول کھل اُٹھے ایک روز وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ریڈیو اسٹیشن فون کر بیٹھی۔

ایاز پاشا نے پروگرام اسی وقت ختم کیا تھا کہ انھیں اطلاع ملی کہ ان کا فون ہے وہ حیران رہ گئے بھلا کس نے فون کیا ہے؟ خدا کرے گھر میں خیریت ہو۔

انھوں نے دھڑکتے دل سے ریسیور اٹھایا اور بولے "ہیلو جی!"

"ہیلو" دوسری طرف سے لڑکی کی آواز سن کر تو ان کی دھڑکن اور بڑھ گئی۔ "میں عرفانہ بول رہی ہوں عرفانہ جعفری آپ کی فین ہوں۔ مجھے آپ کا پروگرام بیحد پسند ہے!"

"بہت شکریہ جی" وہ انکسار سے بولے۔

"اور آپ کی آواز تو ——— کیا کہنے۔ آپ گانے نہ سنایا کریں بس بولتے رہا کریں"

"جوتے کھلوائیں گی آپ؟" ایاز پاشا ہنس دیئے۔

"بس جی چاہتا ہے کہ آپ بولتے رہیں" وہ بھی ہنس دی پھر اس نے ان کی اتنی تعریفیں کیں کہ وہ مسکرا کر شکریہ کہتے رہے۔ خطوط سے تو انھیں اپنے پروگرام کی مقبولیت کا اندازہ تھا مگر آج براہ راست ایک لڑکی نے تعریف کی۔ حالانکہ پروگرام کی کم ان کی زیادہ تعریف کی گئی تھی تو ان کے دل میں شگوفے مہکنے لگے۔

پھر یوں ہونے لگا کہ جب بھی اس کا پروگرام ختم ہوتا عرفانہ جعفری انھیں کامیاب پروگرام پر مبارکباد پیش کرتی اسے تو ان کا پروگرام ہی پسند آتا اب وہ انجانے طور پر ہی اس دن کے منتظر رہتے۔ جس روز پروگرام ہوتا اور پروگرام کے دوران ہی سوچتے آج بھی عرفانہ فون کرے گی یہ خیال آتے ہی ان کے لہجے کی گمبھیرتا بڑھ جاتی۔ عرفانہ جعفری سیٹھ شہاب الدین جعفری کی اکلوتی بیٹی تھی بے حد لاڈلی اور ضدی ہٹ دھرم تھرڈ ائیر کی طالبہ تھی۔

پھر فون کا سلسلہ سات آٹھ ماہ چلتا رہا۔ فون پر ہی تکلف کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں آپ کی بجائے اب تم سے بات ہوتی۔ ایک روز اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پتہ ہے ایاز میں سمجھتی تھی تم ایرانی ہو"

"بھلا کیسے؟"

"بھئی پاشا عموماً ایرانی یا ترکی ہوتے ہیں!"

"نہیں بھئی میں نے بس شوقیہ ہی نام کے آگے پاشا کا اضافہ کر لیا۔"

"تاکہ مجھ جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں اور..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اور کیا...؟ ایاز پاشا نے حیرت سے پوچھا۔

اور آگے بڑھنے کا سوچیں بھی نا! وہ آہستہ سے بولی تو ایاز ہنس دیئے۔

پھر ایاز پاشا سے اس کا اصرار بڑھنے لگا کہ کہیں باہر ملیں۔

مگر وہ جھجکتے تھے انھیں علم تھا کہ وہ کسی صورت بھی عرفانہ جعفری کے معیار کے مطابق نہیں تنخواہ تو وہ بس کتابوں پر ہی خرچ کر دیتے تھے۔ ان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے تک نہ تھے۔ ہر بار وہ انکار کر دیتے۔ آخر روز روز کے انکار کے بعد ایک روز عرفانہ جعفری گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر بولی۔

"پہل تمہیں کرنی چاہیئے تھی ایاز مگر آگے میں بڑھی لڑکی ہو کر بھی جھک گئی ہوں۔ آخر تم کیوں ملنے سے انکاری ہو؟ کیوں نہیں ملتے؟۔ مائی گاڈ اگر خدانخواستہ تم میں کوئی جسمانی نقص بھی ہو تب بھی......"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے عرفانہ" ایاز پاشا جلدی سے بولے۔

"پھر؟" وہ بلی کی طرح غرائی "بس میں تم سے ملنا چاہتی ہوں" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"میں ملنے کو تیار ہوں" انھوں نے فوراً فیصلہ کر دیا۔

"سچ۔؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاں! میں کل تین بجے شیزان پہنچ جاؤں گا۔ گیلری میں ملوں گا تمہیں جہاں عموماً محبت کے متوالے ہی ملتے ہیں!" وہ شوخی سے بولے تو عرفانہ ہنس دی۔

اپنی کوئی پہچان تو بتا دیں"

"مزا تو تب ہے جب ہم خود ایک دوسرے کو پہچانیں" انھوں نے رائے دی۔

"تمہیں تو میں ہزاروں میں پہچان سکتی ہوں" عرفانہ نے نہایت یقین سے کہا۔

"دیکھیں آپ کے دعویٰ کتنا درست نکلتا ہے" ایاز پاشا نے کہا۔

اور پھر دوسرے روز وہ حسب وعدہ اور حسب معمول بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شیزان پہنچ گئے اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے یہ جگہ ان کے لیئے نئی نہ تھی۔ وہ عموماً شام کو یہاں آجاتے تھے۔ عرفانہ کو تین بجے آنا تھا اور ابھی صرف پونے تین ہوئے تھے انھوں نے ویٹر کو کافی لانے کا کہا اور اخبار پڑھنے لگے دس منٹ بعد ہی سیڑھیوں پر سینڈل کی ٹھک ٹھک کی آواز نے انھیں بتا دیا کہ یقیناً عرفانہ جعفری ہی اوپر آرہی ہے۔

ان کا دل جسم کی عمارت میں شدت سے دھڑکنے لگا اس کی نرم شہد آگیں آواز تو انھوں نے سنی تھی مگر اس خوبصورت آواز والی کو دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اخبار چہرے کے سامنے کر لیا اور وہ اوپر آگئی۔ ایاز پاشا نے اخبار کی اوٹ سے دیکھا تو آنکھیں اس کے وجود کا طواف کرنے لگیں وہ خوبصورت چہرہ ان کی نظروں کی طرح سینے میں کھب کر رہ گیا۔ ایاز پاشا نے اس کی جو شبیہ بنائی تھی وہ تو اس سے بھی بڑھ کے تھی۔ پوڈی کلون کی مہک اُن کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ گلابی سوٹ میں ملبوس اس کا جسم کئی قیامتیں ڈھا رہا تھا۔ سیاہ پرس اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ پھر وہ ایاز پاشا کو حقارت سے دیکھتی سیڑھیوں سے قریبی ٹیبل پر بیٹھ گئی کہ پیچھے سے کوئی آئے تو صاف دکھائی دے۔ وہ نہایت بے قراری سے اپنی کلائی میں بندھی سلور چین کی ننھی سی گھڑی میں وقت دیکھ رہی تھی، اور ایاز پاشا اس کی بے قراری سے محظوظ ہو رہے تھے گاہے گاہے وہ ایاز پر بھی نظر ڈال لیتی مگر ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات ہوتے۔ وہ پھر گھڑی دیکھنے لگتی۔ اُسے اتنا بے قرار دیکھ کر ایاز پاشا کا جی بارہا چاہا کہ اس سے کہہ دیں۔

"وہ میں ہی ہوں جس کا تم شدت سے انتظار کر رہی ہو"

مگر وہ اس کے خوابوں کے تاج محل کو اس جملے کے پھاوڑے سے مسمار نہ کرنا چاہتے تھے۔ مارے غصے کے عرفانہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے آدھا گھنٹہ انتظار کیا اور بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی نیچے چلی گئی اس کے سینڈل کی ٹھک ٹھک کافی دیر تک ایاز پاشا کے ذہن میں گونجتی رہی اور پھر وہ زور سے ہنس دیئے۔

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں عرفانہ جعفری۔" انھوں نے نہایت صدق دل سے اعتراف کیا اور میرے اور تمہارے دل میں ایک دوسرے کا ہونے کی خواہش ضدی بالک کی طرح مچلتی رہتی ہے بھلا وہ ان حالات میں پوری ہو سکتی ہے ناممکن۔ یہ سوچنے کی دیر تھی کہ ان کے اندر کوئی رونے لگا یہ ان کا اپنا چین تھا۔ ان کے دل نے تو عرفانہ کی آواز سن کر ہی اپنے اندر مقید کر لیا تھا اور آج جب دیکھا تو وہ تہہ در تہہ اترتی ہوئی دل کے نہاں خانے میں جا بیٹھی۔

"تم بلاؤ اسے ایاز پاشا کہ وہ تمہاری پسند ہے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" انھوں نے سر جھکا اور دل کی ایک دستک کہ یہ دل تو وحشی، دیوانگی بونگی باتیں کرتا ہی رہتا ہے۔ پھر وہ دل پر عجیب سا بوجھ لئے وہاں سے چلے آئے۔

تین روز بعد پروگرام "سہانی یادیں" ختم ہوا تو حسب توقع عرفانہ کا فون آ گیا۔ اس نے ان کی آواز سنتے ہی انھیں کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر بولنا شروع کر دیا۔

"تم بہت وعدہ خلاف ہو ایاز بہت برے بھی ہو۔"

"مگر کیوں بھئی؟" وہ بولے۔

"انجان مت بنو وعدہ کر کے آئے کیوں نہیں۔ مجھے کتنی پریشانی ہوئی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میری بھی تو سنو۔" ایاز نے کہنا چاہا۔

"ہاں گھڑو بہانہ؟"

"بہانہ کیوں گھڑوں جب کہ میں وہاں گیا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"مگر یہ تو سچ ہے کہ تم نے گلابی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ بال کھلے تھے اور..." پھر ایاز پاشا نے پوری تفصیل اسے بتا دی۔

"تم نے تم نے کہاں دیکھا۔؟" عرفانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں گیلری ہی میں بیٹھا تھا۔"

"پھر جھوٹ۔" وہ غرائی۔

"یار قسم لے لو میں وہیں تھا اور تمہاری بے قراری سے محظوظ ہو رہا تھا۔"

"مگر وہاں تو ایک منحنی سا بکھرے بالوں والا لڑکا بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ زین کی پینٹ پہنا ہوئی تھی جس کا رنگ تک اصلی نہ تھا۔" اس نے کہا۔

"وہی تو میں تھا۔" ایاز پاشا نے ہنس کر کہا۔

"نہیں۔" عرفانہ کی حیرت آمیز آواز ابھری اور ایاز پاشا نے صاف محسوس کیا کہ اس کے خوابوں کا گھروندہ ٹوٹ گیا ہے۔ خوابوں میں بسنے والی لڑکیوں کے خوابوں سے ہٹ کر کوئی بات ہو جائے تو ایسی ہی تڑاخ کی سے آوازیں نہیں ہیں اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کی آوازیں تھیں پھر وہ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں۔

"آپ کو بتا دیتا تھا میں پریشان تو نہ ہوتی۔" ایک دم ہی تکلف کی دیوار اس نے چن دی۔

"آپ کا اسیج جو ٹوٹ جاتا۔" ایاز پاشا نے بھی وہی لہجہ استعمال کیا۔

"اب کون سا بچ گیا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی پھر کچھ کہے بغیر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایاز پاشا کو علم تھا کہ اب وہ خوب رو رہی ہو گی۔ جب خواب ٹوٹتے ہیں تو ان کی کرچیاں روح میں دھنستی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور وہ بھی دکھ کے اسی سمندر سے گزر رہی تھی۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ فون ضرور کرتی مگر پہلے کی طرح گھنٹوں باتیں نہ ہوتیں بس پروگرام کے بارے میں بات کرتی۔ انھیں لگتا جیسے کہ وہ بڑی سطحی لڑکی ہو، محبت کو بھی امارت کے ترازو میں تولنے والی۔ مگر وہ کیا کرتی بزنس مین باپ کی بیٹی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ سیٹھ شہاب الدین جعفری کسی صورت بھی ایک کنگلے اناؤنسر کو کسی لحاظ سے بھی داماد نہیں بنائیں گے۔ اس لئے اس نے راستہ علیحدہ کر لیا۔ لگتا تھا یہ فون والا رابطہ بھی زبردستی رکھا ہوا ہو۔ بعض مرتبہ ان کا جی چاہتا کہ اسے کہیں "یہ زبردستی بند ہی مت نبھاؤ!" مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے کہ ساعتیں اس کی آواز سننا چاہتی تھیں۔ انھیں علم تھا کہ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے مگر پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ پھر آہستہ آہستہ عرفانہ نے فون کرنا کم کر دیا۔ پھر مہینے میں ایک بار فون کرتی اور یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔

ایاز پاشا آگے بڑھتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ ریڈیو سے ٹی وی تک کا فاصلہ طے کیا۔ اب وہ ٹی وی کے مانے ہوئے کمپیئر تھے۔ ان کا پروگرام "تابیے انعام پایئے" کئی سال سے ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا اور بے حد مقبول تھا۔ عمر بڑھی تو اب وہ اپنا بھی خیال رکھنے لگے۔ فن کی خدمت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ شادی کے نام سے بھی بدکنے لگے۔ تنہائیوں کو ساتھی بنا لیا۔ کتابوں سے دوستی اور بڑھ گئی۔ ماں اور بہنیں شادی کے لئے مجبور کر کر کے تھک گئیں مگر وہ نہ مانے۔ اب بھی وہ اکھڑا اکھڑا اور ضدی سی عرفانہ جعفری ان کے دل کے دالان میں کوکلے لگاتی پھرتی تھی۔ تنہا ہوتے تو آس پاس یوڈی کلون کی مہک پھیل جاتی۔ انھوں نے کتنی ہی لڑکیوں سے دوستی کی تھی مگر کوئی بھی دل کے معبد میں اس جگہ نہ پہنچ سکی جہاں عرفانہ جعفری براجمان تھی۔ کوئی دل میں ہی داخل نہ ہو سکی کہ ان سے کترا کے [illegible] گئے۔ اب تو ان کی کنپٹیوں کے بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ جنھوں نے انھیں [illegible] بنا دیا تھا

"ساس"

محمد اللہ خاں (سہاور)

ہمارے خاندانی نظام میں "ساس" ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کے خیال ہی سے نوجوان لڑکیاں ذہنی کوفت محسوس کرنے لگتی ہیں اور یہ تصور کر لیتی ہیں کہ کوئی بھی عورت کیسی ہی شریف اور نرم مزاج کیوں نہ ہو اپنی بہوؤں کے حق میں انتہائی سخت ناقابل برداشت اور ظالم ہوگی۔ اور انھیں نافرمانی۔ آزاد خیالی۔ گھر گرہستی کو تباہ کر لے اور اپنے شوہروں کی آمدنی کے اوسط سے زیادہ خرچ کرنے کا مجرم قرار دیکر جذباتی اور جسمانی سزائیں دینے اور خاندان کے ماحول میں مطعون کر کے ان کی عزت خاک میں ملا دینے کی مسلسل کوشش کرتی رہے گی۔

ایک لڑکی جس وقت ہوش سنبھالتی اور بات سمجھ لینے کی اہل ہو جاتی ہے اسی وقت سے اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں کہ ساسیں بڑی سخت گیر و بڑی بے رحم اور ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بہوؤں کو تنے نئے انداز سے پریشان کرتی ہیں۔ ان کے جذبات کو پامال کرتی ہیں۔ انکی زندگی میں زہر گھولتی ہیں۔ اُن کے شوہروں سے ان کی چغلیاں کرتی اور انھیں اپنی بیویوں سے بدظن کر دیتی ہیں۔ بہوئیں ان کا کتنا بھی خیال کریں۔ اُن کی کیسی ہی خدمت کریں، وہ ان سے خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتیں۔ یہاں تک کہ بہوؤں کے خلاف ساسوں کی سازشوں اور زیادتیوں کے بارہ میں کچھ کہانیاں بھی بچوں کو سنائی جاتی ہیں۔ اس موضوع پر ہندوستان کی تقریباً ہر زبان بالخصوص بھوجپوری میں گانے لا تعداد ہیں جو تقریباً ہر گھر میں انفرادی اور اجتماعی طور پر ڈھول بجا بجا کر گائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بے بنیاد اور فرضی نہیں ہیں۔ اس تصور کی پشت پر صدیوں کے تجربات اور روایات ہیں۔

اس کے برخلاف بہوؤں کے ذریعہ ساسوں کو پریشان کرنے اور ان پر ظلم توڑنے کے بارہ میں اس نوعیت کی نہ کہانیاں ہیں۔ نہ لوک گیت۔ یقیناً انفرادی طور پر کچھ بہوئیں بھی اپنی ساسوں کو پریشان کرتی ہیں۔ لیکن چند واقعات کوئی بڑا سماجی مسئلہ یا روایت نہیں بن سکتے۔ ماضی قریب یا ماضی بعید میں بہو کبھی اتنے منصب پر نہ تھی کہ اپنی ساسوں کو پریشان کیا ہوتا ورنہ ان کے بارہ میں بھی اسی نوعیت کی کہانیاں اور لوک گیت بن جاتے۔ یقیناً اس نوعیت کے ساسوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ لیکن اس شق سے ہمارا لٹریچر اور سماجی روایات بالکل صاف ہیں۔

در اصل ہمارے گھریلو اور خاندانی ماحول میں ساس کو ایک ایسی پوزیشن حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی بہوؤں کو آسانی سے پریشان کر سکتی اور مصیبت بنا سکتی ہے۔ وہ بہو کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے گھر کے بندوبست پر پوری طرح حاوی ہوتی ہے۔ گھر میں اس کا شوہر اور بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں۔ ان میں شوہر کے علاوہ اس سے ہر ایک کا خونی تعلق ہوتا ہے اور شوہر سے بھی اتنا پرانا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے مزاج میں پوری طرح دخیل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اس کی بہو اس گھر میں ایک اجنبی انسان کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے اور اس گھر کے افراد میں اپنے شوہر سے "عہد و پیمان" کے رشتہ کے علاوہ اور کسی سے براہ راست اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ رشتہ شوہر کے رشتہ ہی کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ پہلے سے کوئی رشتہ ہوتا بھی ہے تو وہ جدید رشتہ سے کٹ جاتا ہے اور بھانجی بھتیجی بھی بہو بن کر گھر میں آئے تو وہ ساس کی نگاہ میں صرف "بہو" ہوتی ہے اور اس رشتہ کی تندی و تیزی ہر رنگ کو دھندلا کر دیتی ہے۔

ساسیں، عموماً اپنے گھریلو اقتدار و اختیار کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتی ہیں اور بہوؤں کے گھر میں آتے ہی انھیں یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے توسط سے گھر کے معاملات پر قابض نہ ہو جائیں شادی کے ابتدائی دنوں میں بہو دلہن بنی بیٹھی رہتی ہے۔ اس دور میں شادی کی رسمیں پوری کی جاتی ہیں۔ عزیز رشتہ دار اور برابر کی لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ گھر کی عورتیں، اس کی خوب خاطر مدارات اور ناز برداری کرتی ہیں شوہر تو اس کے گرد ہالہ ہی کئے رہتا ہے۔ ساس بھی دلداری کرتی ہے۔ بہو اپنے گھر بھی جلدی جلدی جاتی آتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس گہما گہمی کے دور میں عموماً کوئی تنازعہ نہیں اٹھتا۔ کوئی کشیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ سنہرا دور گذر جاتا ہے اور بہو کو گھر کے کام کاج پر لگایا جاتا ہے، اسی وقت سے ساس بہو کی چپقلش شروع ہوتی ہے۔ ساس گھر کا ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہتی ہے اور وہ بہو کے کاموں میں اس حکمت سے عیب نکالتی ہے کہ اس کی ناتجربہ کاری کم عمری اور کم فہمی بلکہ پھوہڑپن اور اس کے مقابلہ میں اپنی پختہ کاری سلیقہ مندی اور سمجھداری ثابت کر سکے۔ اور گھر والوں کو یہ یقین دلا سکے کہ وہ اپنی ذاتی قابلیت اور امور خانہ داری میں زبردست مہارت کی وجہ سے بہو کے مقابلہ میں گھر کا نظم و نسق چلانے کی زیادہ مستحق ہے اور نظم و وقار اور گھر والوں کی عافیت کے لئے ضروری

کے لئے توشہ خانہ کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں رہنی ضروری ہیں۔ بہو کے ہاتھ میں پہنچ جائیں گی تو گھر تباہ ہوجائے گا۔ ساسوں کو وہ چابیاں اتنی عزیز ہوتی ہیں کہ ان سے وقتی طور پر دست بردار ہونے کو بھی ان کے دل آمادہ نہیں ہوتے اور وہ ان چابیوں کو ہمیشہ حرز جان بنائے رہتی ہیں۔

ہماری واقفیت کے حلقہ میں ایک معزز خاتون کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا اور وہ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے بیٹوں کو ان کی بیویوں سے بدظن رکھکر گھر کی ہر چیز اپنے قبضہ میں رکھتی تھیں۔ توشہ خانہ میں سے کوئی چیز نکالنی ہوتی تو خود ہی تالا کھول کر نکالتیں یا اپنی نگرانی میں دوسروں سے نکلواتی تھیں۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئیں اور نیم بیہوش رہنے لگیں تو غیر شعوری طور پر ان کا ہاتھ بار بار کمر بند کی طرف جاتا تھا کہ اس میں بندھی ہوئی چابیاں کوئی کھول نہ لے یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تب ہی ان کے کمر بند میں بندھی ہوئی چابیاں کھولی جاسکیں۔

گھر گرہستی کے معاملات میں ساسوں کی یہ سختی بہوؤں کو پریشان کر دیتی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ علٰحدہ گھروں میں رہ کر ہی عافیت محسوس کرتی ہیں تاکہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ اس صورت میں ساسیں یہ کہنا شروع کر دیتی ہیں کہ بہو نے ہمارے بیٹے کو ہم سے جدا کر دیا۔ ہم بڑھاپے میں تنہا کیسے رہیں۔ بیگم صاحبہ یہ نہیں چاہتیں کہ ان کے شوہر کی آمدنی کا کوئی حصّہ ہمارے خرچ میں آجائے۔ وہ ہماری خدمت بھی نہیں کرنا چاہتیں۔ بڑھاپے میں ہماری تو مٹی خراب ہوگئی۔

ساسوں کا اپنی بہوؤں سے خدمت لینے کا بھی عجیب تصور ہوتا ہے۔ بہت سی ساسیں ضرورتاً نہیں بہوؤں کو پریشان کرنے کی نیت سے خدمت لینا چاہتی ہیں۔ ایک جگہ ہمارے پڑوس میں ایک خاندان آباد تھا۔ اس گھر میں ایک ساس اور تین بہویں رہتی تھیں۔ ان میں عموماً لڑائی ہوتی رہتی تھی اور وہ ایک دوسری کی شکایت کرنے کے لئے ہمارے یہاں آتی تھیں۔ کبھی ساس اور کبھی بہویں۔ ساس چیختی ہوئی اور بہویں روتی ہوئی۔ میں ان کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتا تھا لیکن ہمارے ایک ساتھی جو ماسٹر صاحب کہلاتے تھے ہر دفعہ ان کا تصفیہ کرانے جاتے اور لڑائی ختم کرا کر ہی واپس ہوتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے میں نے ان کے گھر میں جھانکا تو یہ منظر نظر آیا کہ ساس جو بہت فربہ تھیں، چارپائی پر عزت سے بیٹھی تھیں۔ ایک بہو لوٹے سے پانی ڈال رہی تھی اور دوسری اپنے ہاتھوں سے ان کے پاؤں دھو رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا "تم تو ہر وقت یہ شکایت کرتی ہو کہ بہویں تمہاری خدمت نہیں کرتیں

بلکہ اس وقت میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔؟ اب تم ان کی شکایت کروگی تو ہم تمہاری بات غلط سمجھیں گے۔" میرے اس فقرے پر ساس شرمندہ ہوگئی اور بہویں میری طرف متشکرانہ انداز میں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

ساس اور بہو کی چپقلش میں بہوؤں کو بالکل ہی بے قصور نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں اور بہت سی بہویں اپنی ساسوں کو خوب جی لگا کر پریشان کرتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر معاملوں میں ان کا رویہ ساسوں کے ناقابل برداشت رویوں کا ردّ عمل ہوتا ہے اور اپنے موقع پر ساسیں انھیں بے جا طور پر دبانے کی جو حماقت کر چکی ہوتی ہیں وہ اس کا بدلہ لینا چاہتی ہیں۔ چنانچہ جو ساسیں اپنی بہوؤں کے ساتھ شریفانہ اور کریمانہ رویہ اختیار کرتی ہیں، ان کی بہویں بھی ان کا احترام کرتی ہیں اور ضرورت کے وقت ان کی خدمت کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتیں۔

ہر ماں کو اپنے بیٹوں کی اچھی جگہ شادی کرنے کی آرزو ہوتی ہے اور وہ ان کے لئے بہتر سے بہتر دلہنیں بیاہ کر لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور اس کے لئے تکلیفیں بھی اٹھاتی ہیں، قربانیاں بھی دیتی ہیں۔ لیکن جب ان کی دلی آرزو پوری ہوجاتی ہے تو وہ بہوؤں کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے بجائے پاؤں سے روندنا چاہتی ہیں اور اس کے لئے عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ اور وقت کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ بہو ساس کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو وہ اپنے ذاتی تجربوں کی بنیاد پر اپنی بہوؤں کی دلداری کرنے کے بجائے خود بھی وہی جابرانہ طرز عمل اختیار کرتی ہے جو اسکی ساس نے اس کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ اور جسے وہ بہو کی حیثیت سے ظلم عظیم قرار دیا کرتی تھی۔

آج کے دور میں برادران وطن کی بہت سی ساسوں کی بے رحمی اور شقاوت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ وہ اپنے مردوں کے ساتھ مل کر اپنی بہوؤں کو کم جہیز لانے کا مجرم قرار دیکر انھیں زندہ جلانے لگی ہیں۔ وہ یہ حرکت کس طرح کرپاتی ہیں اور اپنی جیسی ایک بے قصور عورت کو کس دل سے شعلوں کی نذر کر دیتی ہیں۔ عقل انسانی یہ معمہ حل کرنے سے قاصر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلم خاندانوں میں ایسا ظلم نہیں ہورہا ہے۔

اگر یہ سارے ظلم و ستم اور بے رحمیاں لفظ "ساس" سے وابستہ ہیں تو کیوں نہ اس لفظ کو لغت کے صفحات سے کھرچ دیا جائے اور اس رشتہ کے لئے کوئی دوسرا لفظ تجویز کر لیا جائے۔ جیسے "نسبتی ماں"۔ ممکن ہے کہ اس لفظ کا جذباتی تاثر ساسوں کے دلوں کو نرم کر دے اور وہ بہوؤں کے ساتھ بیٹیوں جیسا برتاؤ کرنے لگیں اور ان کی جذبات کشی کے مشغلے سے باز آجائیں۔

افسانہ

انجام

مقصود قدسی

گہری تاریک رات!

لیکن زیبا کی سوچوں سے کم تاریک۔ بہت ہی کم تاریک!!

اس کی سوچیں سدرہ کے لئے پریشان اور حیران ہیں عجیب اور آپس میں الجھتی ہوئی سوچیں۔ جنھیں کسی کروٹ چین نہیں سکون نہیں۔ یہ تیکھی یہ سوچیں۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اس کی سانسیں روک لینے کے لئے متحرک ہو۔

سدرہ۔ اس کی عزیز ترین سہیلی۔ اس کی دوست لیکن ....!

یخ بستہ تاریک رات۔ سنسان پلیٹ فارم۔ قصباتی چھوٹا سا پلیٹ فارم۔ جو ٹرین گزرنے کے بعد یوں سناٹے اور ویرانی کی جھولی میں اتر جاتا تھا جیسے یہاں صدیوں کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا ہو:

ڈاکٹر یہ ایک لڑکی ہے زیبا۔ گاڑی سے رہ گئی ہے۔ اور اس کا جاننے والا کوئی نہیں۔

میرے بیوی بچے یہاں نہیں ہیں ورنہ میں اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ یہاں چہل قدمی کرتے ہوئے تشریف لے آئے۔ آپ اسے اپنے گھر لے جائیں کیونکہ وہاں اس کی ہم عمر آپ کی بیٹی طلعت بھی موجود ہے۔ لہٰذا یہ عزت و حفاظت سے شب بسر کر سکے گی:

ڈاکٹر ظہیر نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور زیبا کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کلینک لے آیا۔ روانگی سے پہلے زیبا نے اسٹیشن ماسٹر کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جس نے خدا ترسی کر کے اس کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈ دی تھی۔

زیبا۔ اپنی والدہ کے ہمراہ پنڈی سے کراچی کے لئے جا رہی تھی۔ اس کا والد بھی مصروفیات کے باعث ساتھ نہ جا سکا۔ اس قصباتی اسٹیشن پر جب تیزگام ایک کراسنگ کے لئے رکی تو اس کی والدہ نے پانی مانگا۔ اس نے اپنے ذہن کی بساط پر پھیلے ہوئے رنگا رنگ خاکوں کو تیزی سے سمیٹا اور تھرماس ہاتھ میں پکڑے نیچے اتر آئی۔ اگلے لمحے وہ اسٹیشن پر موجود ہینڈ پمپ کے قریب ہی پہنچی تھی کہ ٹرین چل پڑی وہ تیزی سے پلٹی لیکن ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود ٹرین پر سوار نہ ہو سکی۔

ٹرین روانہ ہوتے ہی اسٹیشن سنسان ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ تھرماس ہاتھ میں پکڑے دور جاتی ہوئی ٹرین کو تکتی رہی۔ ٹرین نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی نظریں وہیں تاریک خلاؤں میں جمی رہیں۔ وہ اس وقت چونکی جب دو اوباش نوجوان ہونٹوں سے سیٹیاں بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس کا معصوم دل یکبارگی دھڑکا اور وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی مانند جلدی سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں [illegible] اسٹیشن ماسٹر نے سکون سے اس کی داستان سنی اور اب وہ ڈاکٹر ظہیر کے کلینک میں موجود تھی جو ان کے گھر کے ساتھ اٹیچ تھا۔

زیبا ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ انجانے اندیشے زرد ناگ بن کر اس کی منتشر سوچوں کو ڈس رہے تھے اور وہ کلینک سے ملحق ڈاکٹر کی آرام گاہ میں بچھے ہوئے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر اس کے لئے رات کو کھانا بھی وہیں لے آیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"انکل۔ آپ مجھے گھر پہنچا دیں۔ تاکہ میں سکون سے رات بسر کر سکوں۔ وہاں آپ کی بیٹی بھی تو ہے"

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جسے زیبا کوئی معنی نہیں پہنا سکی۔

"دیکھو۔ یہاں سکون ہی سکون ہے گھر اس وقت کوئی نہیں۔ میری بیوی تین سال پہلے مر چکی ہے۔ اور بیٹی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ گھر میں کوئی نہیں تم بے فکری سے یہاں رات بسر کرو۔ تشویش کی ضرورت نہیں۔

نہ جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ ڈاکٹر ظہیر نے اسے دلاسا دیا اور جب وہ ذرا خاموش ہوئی تو اس سے کہا

"میں ایک مریض کو چیک کرنے جا رہا ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گا تم بے فکری سے آرام کرو"

ڈاکٹر کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔ اس نے گھبرا کر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی جانب دیکھا اور بے یقینی کے انداز میں آنکھیں ملنے لگی۔

دروازے پر اس کی بہت ہی پیاری سہیلی سدرہ کھڑی تھی اور حیرت مگر شناسا نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

پشیمانی

انگریزی سے ترجمہ

مترجم۔ محمود

مجھے نیند آئی ہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"پٹنہ میڈیکل کالج ہسپتال سے ڈاکٹر محمود کا ارجنٹ کال ہے۔"

"بول رہا ہوں ۔۔"

چند منٹ بعد آواز آئی "میں ڈیوٹی آفیسر خالد بول رہا ہوں۔"

"جی ۔ فرمایئے ۔"

"معاف کیجئے اتنی رات گئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں چھ سال کا ایک بچہ ابھی بے ہوش لایا گیا ہے ۔ کار سے ایکسیڈنٹ ہوکر بڑی طرح زخمی ہے ۔ سر میں بھی چوٹ آئی ہے ۔"

"لیکن میں تو آج کال پر نہیں ہوں ۔ ڈاکٹر بنرجی آن کال ہیں انہیں بلوالو۔"

"سر وہ نہیں مل رہے ہیں ۔۔"

"تعجب ہے آن کال ہونے کے باوجود وہ گھر پر نہیں۔ ڈاکٹر رام کو فون کرو ۔۔"

"سر۔ وہ بھی نہیں ۔۔"

"پھر میجر مارٹن کو مطلع کرو۔ ساری بات بتلاؤ وہ آجائیں گے"

"سر میں نے انہیں فون کیا تھا وہ اپنے کسی دوست کے گھر ڈنر ڈانس کی شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں ۔۔"

"اچھا ۔ تم فکر مت کرو۔ میں آرہا ہوں لیکن اس وقت میں تمہارے ہسپتال سے ۴۰ میل دور ہوں مجھے پہنچنے میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہیں لگے گا ۔ موسلا دھار بارش بھی تو ہو رہی ہے ۔ آپریشن تھیٹر تیار رکھو۔ اسسٹنٹ کو بلوالو ۔ ڈرپ شروع کردو اور ایکسرے وغیرہ سب کروالو۔ میں روانہ ہو رہا ہوں۔

ڈاکٹر بنرجی سینئر ہاؤس سرجن ۔ ڈاکٹر رام ریزیڈنٹ سرجن اور میجر مارٹن سرجری کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے ۔ میں سرجیکل رجسٹرار تھا ۔

پہلے دو مہینے پر میں اپنی بوڑھی خالہ اور ان سے زیادہ بوڑھے خالو کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے ان کے پاس چلا جایا کرتا تھا جو پٹنہ سے ۴۵ میل دور تھا۔ مجھ کو تھوڑا دماغی اور جسمانی سکون مل جاتا اور ان لوگوں سے ملاقات بھی ہو جاتی ۔

آج ہی رات کو دو گھنٹے قبل بارش میں تھکا ہوا پہنچا تھا۔ میرا آپریشن ڈے تھا۔ تین چار بڑے آپریشن کئے تھے ۔ سخت تکان محسوس ہو رہی تھی لیکن میرا جانا فرض تھا ۔ فوراً اٹھا، کپڑے تبدیل کئے ۔ سردی تھی اور بارش ہو رہی تھی ۔ اپنا چمڑے کا جرکن پہنا اوپر سے لمبی برساتی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی اور میرے اٹھ کر کپڑے پہننے کی آہٹ سے میری بوڑھی خالہ کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ کمرے سے نکل آئیں ۔ مجھے کپڑے اور برساتی پہنے دیکھ کر بولیں ۔

"کہاں جا رہے ہو ۔۔؟"

"اپنے ہسپتال واپس ۔ ایمرجنسی ہے ۔۔"

"دیکھو ۔ باہر بہت سردی ہے ۔ بارش بھی زوروں پر ہو رہی ہے کچھ گرم پہنا ہے تم نے ۔۔؟ موٹر بڑی احتیاط اور آہستہ چلانا۔"

ایک ۲۸ - ۲۹ سال کے شخص کو ایسی ہدایتیں جو ایک غیر ذمہ دار بچے کو دی جانی چاہئیں سن کر میں ہنسنے لگا۔

"خالہ جان ۔ آپ فکر مند نہ ہوں ۔ میں بچہ نہیں خود اپنا خیال رکھنے کے قابل ہو گیا ہوں ۔ صبح ناشتے کے وقت تک آجاؤں گا۔ شب بخیر"

"تم میری نظر میں ہمیشہ بچہ ہی رہوگے ۔ خدا حافظ ۔۔"

جب تک گاڑی میں بیٹھ کر گیٹ سے باہر میں نکل نہ گیا ۔ وہ دروازوں کی اوٹ سے مجھ کو دیکھتی رہیں ۔۔ ان کی نظر میں، میں بچہ ہی تو تھا۔

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ۔ شہر کی ساری سڑکیں ویران تھیں دو چوراہوں کو چھوڑ کر تیسرے چوراہے کی سرخ بتی دیکھ کر مجھے گاڑی روکنی پڑی ۔ گاڑی بالکل رکی بھی نہ تھی کہ کار کا اگلا دروازہ یک لخت کھلا ۔ ایک شخص کود کر میرے سامنے والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالوں اس شخص نے اپنا پستول ہماری کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"خبردار جو شور و غل کیا ۔۔"

سرخ بتی سبز ہو گئی ۔۔

سامنے جو سڑک سیدھی جاتی ہے۔ اس پر چلتے چلو۔ چالاک بننے کی کوشش کی تو۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ پٹنہ ہسپتال جا رہا ہوں۔ ایمرجنسی ہے"
"مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کون ہو ــــ؟ اور کہاں جا رہے ہو۔ سیدھی سڑک چلو۔"
"مگر ایمرجنسی ــــ"
"بکواس بند کرو ــــ"

میں نے گاڑی تیز کی اور ٹریفک لائٹ سے گزر کر جو سڑک سیدھی جاتی تھی اس پر چلتا رہا ــــ مجھے بھی اسی سڑک پر جانا تھا۔ میرا بھی وہی راستہ تھا۔

اب میں شہر کے باہر تھا۔ بارش اور تیز ہوگئی۔ سڑک پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے مجبوراً گاڑی کی رفتار کم کر دی، بیس میل فی گھنٹہ اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اجنبی شخص سے معذرت کی کہ سخت بارش اور اندھیرے کی وجہ سے سڑک دس قدم سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی اس لئے میں گاڑی تیز نہیں چلا سکتا۔ میں نے اس سے یہ کہہ دینا مناسب سمجھا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں جان بوجھ کر گاڑی آہستہ چلا رہا ہوں۔

"ہاں ٹھیک ہے مگر چلتے رہو۔ گاڑی ہرگز مت روکنا ــــ"

میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ ڈیش بورڈ کی روشنی میں اس کا چہرہ ہلکا نظر آ رہا تھا وہ تیس پینتیس سال کا ایک خوبصورت جوان تھا۔ ٹھوڑی پر چھوٹی سی نوکدار داڑھی، مہین کتری ہوئی مونچھیں، کشادہ پیشانی، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ قیمتی سوٹ پر سرخ ونڈ کٹر جیکٹ اور جیکٹ کے اوپر ایک لمبا برساتی کوٹ ــــ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص شکل و صورت، لب و لہجہ اور لباس سے تو نہایت شریف معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ کیا معمہ ہے ــــ؟ کہ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"گاڑی روک دو۔" میں نے گاڑی روک دی۔

"گاڑی سے باہر آ جاؤ۔"

میں نے کچھ ہچکچاہٹ کی تو اس نے پستول میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"سنتے نہیں، گاڑی سے فوراً باہر آ جاؤ ــــ"

میں نیچے اتر گیا۔ وہ گاڑی کے سامنے سے چکر لگا کر میرے پاس آیا "گاڑی کی کنجی مجھے دے دو ــــ"

جب میں ایک لمحے کے لئے پھر ہچکچایا وہ تیزی سے میری طرف لپکا اور ایک جھٹکے میں میرے ہاتھ سے گاڑی کی کنجی لے لی۔ زور سے مجھ کو دھکیل کر الگ کیا اور چھلانگ لگا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

میں دھکے سے سڑک پر گر پڑا جب اٹھ کر کھڑا ہوا دیکھا میری گاڑی بہت دور جا چکی تھی۔ کھڑے ہوتے وقت میرے جوتوں سے کوئی چیز ٹکرائی جھک کر دیکھا سڑک پر اس کا پستول پڑا تھا۔ اٹھا کر اپنے برساتی کوٹ کے لمبے جیب میں رکھ لیا۔

سوچ رہا کیا کروں؟ آدھی رات، تیز بارش، بالکل اندھیرا شہر سے دور، ایسے حالات میں کسی سواری کا ملنا دشوار تو کیا ناممکن تھا۔ دس منٹ سڑک پر کھڑا بھیگتا رہا پھر ایک مال بردار ٹرک کی ہیڈ لائٹ دیکھی جس طرف سے ہم آ رہے تھے اتفاق سے ٹرک اسی طرف سے آ رہا تھا سوچا اس موسلا دھار بارش اور گھپ اندھیرے میں ٹرک کا ڈرائیور مجھے کبھی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ دوڑ کر سڑک کے بیچ آ کھڑا ہوا اور جیب سے اپنا سفید رومال نکال کر ہوا میں ہلانے لگا۔ یہ ترکیب کارآمد ثابت ہوئی ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر ٹرک روک لی۔

"کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟ بارش اور آدھی رات کے اندھیرے میں۔ شہر سے اتنی دور ــــ؟"

"میں۔ میں ــــ"

"اوپر ٹرک پر آ جائیے۔ اس طرح سے بھیگ کیوں رہے ہیں ــــ؟"

میں جب اس کے ساتھ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا۔

"آپ بہت بھیگ گئے ہیں۔ یہ برساتی کوٹ اتار دیجئے اور لیجئے یہ ایک کپ گرم چائے۔"

اپنی سیٹ کے پیچھے سے ایک بڑے تھرماس سے انڈیل کر چائے دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب بتلائیے۔ یہاں اس وقت کیوں کھڑے تھے ــــ؟"

میں نے ساری بات بتائی ــــ

قطعۂ تاریخ وفات

ڈاکٹر مسعود صاحب ردولوی

آنجہانی سید جمیل الحسن ردولوی ولد سید فضل علی مرحوم

ولادت:- ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء • وفات:- ۴ جولائی ۱۹۸۵ء

درس دیتے ہیں روز لیل و نہار
کہ جہاں میں نہیں کسی کو قرار

جب رسولِ خدا ہی رہ نہ سکے
کون پھر بقا کا دعوے دار

بس کہ جولائی کی چہارم تھی
چھن گیا ہم سے ایک دُرِ شہوار

میرے ماموں جمیع جملہ صفات
مثل اب جس کا ملنا ہے دشوار

لی وہ انگڑائی اک قیامت خیز
جس سے ماحول ہو گیا خوں بار

خوبیاں ان کی یاد آتی ہیں جو
میں گناؤں کریں جو آپ شمار

خوش رقم خوش مزاج خوش اطوار
خوش چلن خوش ادا و خوش گفتار

نیک دل نیک ذات نیک صفات
نیک خو نیک فکر نیک شعار

نوکری ایسی کی کہ مالک نے
کر دیا کُل کا مالک و مختار

شانِ دفتر کی زینتِ محفل
نازشِ خاندان گھر کی بہار

بات کرنے کا لہجہ ایسا لطیف
غم زدہ بھی نہ ہنس دے تھا دشوار

سر کی ٹوپی سے لے کے تا نعلین
وہ نفاست کہ لکھنؤ بھی نثار

نکتہ رس ایسے تھے کہ نکتہ شناس
کرتے تھے ناقدوں میں اُن کا شمار

حافظہ ایسا کچھ پڑھیں کہ سنیں
بھولتے ہی نہ تھے کبھی زنہار

دے خدا غم زدوں کو صبرِ جمیل
اور جمیل الحسن کو اپنا جوار

بعد مُردن ملی یہ عشق حسینؑ
ارضِ غفران مآب بہرِ مزار

ہے پریشاں نسیم[1] گلشن میں
بے جمیل ایک پل نہیں ہے قرار

انجم[2] و کوکب[3] اور اہل و بنات
دے خدا ان کے دل کو صبر و قرار

اپنی کوشش کے بعد بھی جو ہوا
لکھنا تاریخ فوت کا دشوار

میں نے رضواں سے پھر مدد چاہی
کہ وہی ہے جناں کا پہرے دار

بولا وہ عیسوی میں لکھ مسعود
حسن جنت جمیل خوش کردار
۱۹۸۵ء

[1] نسیم ایم لفوی [2] فرزند اکبر [3] فرزند اصغر

ناکردہ گناہ

امتیاز فاطمی ایم۔اے جعفرپور

حجلۂ عروسی میں تازہ پھولوں سے مہکتی خوابناک وادی کے کمرے میں نشاط دلہن بنی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی ۔ دل میں صرف ایک ارمان ایک خیال لئے۔ میرے خدا، میرے پالنے والے میرے خوابوں کی تعبیر دلکش دکھانا ۔ اس کے کانپتے گلابی ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے اور اس کے رنگین خوابوں کی حسین رنگت اسے ایک البیلا روپ بخش رہی تھی۔ بزرگوں کی دعاؤں کے زیرِ سایہ جب وہ رخصت ہو کر اس کے سجائے کمرے میں لاکر بٹھا دی گئی تو تھکن سے چور گھبرا کر اس نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اپنا جائزہ لیا۔ اپنے مہکتے دمکتے اور دلہن کے سہانے روپ کو دیکھا تو اس کا پورا وجود خود بخود شرم سے گلنار ہو گیا ۔ کچھ ہی لمحے کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ دو مضبوط قدم رفتہ رفتہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ قدم۔ وہ قدم جس کے ساتھ اپنے قدم ملاکر اسے زندگی کی طویل راہوں پر گامزن ہونا تھا۔ نہایت آہستگی کے ساتھ کوئی اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور ایک نرم سی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "آداب عرض کرتا ہوں حضور۔" اس کا سر آپ سے آپ گھٹنوں سے جا لگا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جذب کرنے کی کوشش کی تو طلائی انگوٹھیوں کی کھنک کے ساتھ ایکبارگی کانچ کی سہانی چوڑیاں ترنم خیز آواز کے ساتھ بج اٹھیں۔ اس آواز کے ابھرتے ہی گرم گرم ہاتھوں نے اس کے دو ٹھنڈے حنائی ہاتھ کو نرمی سے تھام لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گھونگھٹ الٹ کر دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ اپنے چہرے پر گرم گرم سانسوں کا لمس محسوس کر کے اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور آنکھیں کھولنے پر اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہ آنکھیں حیرت و استعجاب میں ڈوبی اس کے سپنیلے ہونٹوں پر آگے اس ننھے سے تل کو تک رہی ہیں جو اس کے حسن میں اضافہ کا سبب تھا لیکن ان نگاہوں میں اشتیاق نہیں تھا۔ پسندیدگی کی کوئی جھلک نہیں تھی بلکہ ان آنکھوں میں ایک تجسس تھا ایک سوال اور وہ ان نگاہوں سے ٹپکتی اس حقارت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایسا لگا کہ ان کالی آنکھوں میں اس کے لئے پیار کا وہ سمندر ٹھاٹھیں نہیں مار رہا تھا جس کی تمنا میں ابھی کچھ دیر قبل اس کے ہونٹ خدا کے حضور دعاگو تھے بلکہ ان میں تو اس کے لئے نفرت اور بیزاری کے ایسے شعلے دہک رہے تھے جس میں اس کا نازک وجود بھسم ہوا جا رہا تھا۔ اس کی تپش سے وہ راکھ ہو کر فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے گھونگھٹ چھوڑ دیا گیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے باہر چلا گیا کمرے کا دروازہ کھلا رہ گیا اور وہ ان چھوئی دلہن اپنی سہاگ سیج پر گم سم اسی طرح بیٹھی رہ گئی۔ سہاگ کے بستر کو معطر کرنے والی کلیاں کھل کر پھول بنیں پھر یہ پھول مرجھا گئے اور پھولوں کی پنکھڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بستر سے گرتی چلی گئیں۔ رات کی سیاہی نے رفتہ رفتہ اپنے پر سمیٹنے شروع کر دیئے اور صبح صادق کی آمد نے کمرے میں صبح کا نور پھیلا دیا۔ لیکن اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ آئی وہ اسی طرح ساکت و صامت تھی جس طرح لاکر بٹھا دی گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی اردگرد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وسیم نے اپنی زندگی کی سب سے حسین رات باہر باغ کی بنچ پر بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے۔ سبھی لوگ یہاں تک کہ اس کی سسرال سے آنے والے معزز مہمان بھی حیران و پریشان تھے۔ بڑی بھابی نے تو اس پر سوالوں کی بوچھار کر دی تھی لیکن اس کی زبان خاموش رہی۔ ہر زبان پر صرف ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ آخر وسیم اپنی ایک شب کی بیاہی دلہن کو طلاق دینے پر کیوں آمادہ تھا؟ بڑے بھیا کے سخت اصرار پر اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا مجھ سے اس فیصلے کی وجہ نہ پوچھو بھیا کچھ راز ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں انسان زندگی بھر اپنے آپ سے بھی چھپائے رکھتا ہے۔ تب انہوں نے نشاط کے بھائی سے کہا تھا آپ لوگ اپنی لڑکی کو اس گھر سے ہمیشہ کے لئے لے جائیں۔ وسیم اسے طلاق کیوں دینا چاہتا ہے اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کے فیصلے [illegible]

میں نے بطور باپ اس کی پرورش کی ہے اور اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں اور شاطا اس در سے طلاق کے تین الفاظ کی لعنت کا بوجھ اپنے وجود پر لئے ہوئے اسی طرح واپس آگئی جس گھر سے رخصت ہو کر وہ گئی تھی۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اسے اپنے کن سے ناکردہ گناہ کی یہ سزا دی گئی ہے۔

وسیم کو اپنے اصول سے بیحد پیار تھا۔ اسے اپنے کردار کی پختگی پر بڑا ناز تھا اپنے انہیں اصولوں کی خاطر سہاگ کی رنگین کو اس نے قربان کر دیا تھا۔ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے کے بعد سے اب تک اس نے اپنے ذہن کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا تھا ایک عزم ایک جذبہ ہمہ وقت اس کے پیش نظر رہتا تھا کہ زندگی کے ارمان اور چاہتیں صرف ایک ہی بار کسی ایک ہستی کو سونپنی چاہیئں یونیورسٹی میں اس کی شخصیت واحد تھی جس نے عشق و محبت کی فرسودہ رعایت کی کڑی سے خود کو محفوظ اور آزاد رکھا تھا۔ اس کی زاہد خشک جیسی فطرت یونیورسٹی کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے لئے ایک چیلنج تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے کلاس کی سب سے ہوش ربا اور قیامت خیز لڑکی رعنا نے جب اس کے قریب آنے کی کوشش کی تو اس کے ادا کئے تلخ جملے نے اسے پھر دوبارہ اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیا اس نے رعنا سے کہا تھا۔۔ "محترمہ پہلے آپ اپنے مشرقی حجاب و حیا کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کریں پھر کسی کے جذبات کے احترام کا طریقہ اپنا سکیں گی۔ ہر طرف اس کا کیریکٹر ایک مثال کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔

شاطا کے جانے کے بعد اس کے گھر پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی لیکن وہ مطمئن تھا شام ہونے کو تھی وہ برآمدے میں کرسی پر تنہا بیٹھا تھا اس کی نظروں کے سامنے اس وقت ایک سرد اور مضمحل سی سہ پہر گردش کر رہی تھی جب اس کے قریبی دوست شاہد نے اس کے سامنے سسکتے ہوئے اپنی محبوبہ کی بے وفائی کی داستان کہی۔ شاہد کو ایک لڑکی سے بے پناہ محبت تھی اور اس نے اس کی محبت کو ٹھکرا کر دوسری جگہ شادی کی حامی بھر لی تھی۔ شاہد نے اسے بتایا تھا کہ اس لڑکی نے اپنی محبت اور چاہت میں ہر دیوار کو گرا دیا تھا۔ ہر بندش کو توڑ کر پھینک دیا تھا وہ اسے والہانہ پیار کرتی تھی۔ ایک دن شاہد اس لڑکی کے ساتھ کسی پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ دفعتاً موسلا دھار بارش نے ان لوگوں کو گھیر لیا لڑکی نے اس سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔۔ "مجھے کافی ٹھنڈک لگ رہی ہے مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لو۔" شاہد نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنی بانہوں کے حصار میں چھپا لیا۔ دونوں کی گرم گرم سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ موسم کی خنکی نے دونوں کے بھرے ہوئے جذبات کو طوفان کے ہچکولے میں ڈھکیل دیا طوفان گزر جانے کے بعد جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وقت گزر چکا تھا۔ لڑکی اپنی نادانی پر بری طرح رو رہی تھی۔ شاہد نے اسے دلاسہ دیا۔۔ "گھبراؤ نہیں اب ہم دونوں اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپس ہونے کا کوئی امکان نہیں۔" وسیم کو مزید یاد آرہا تھا جب وہ ایک شام شاہد سے ملنے اس کے گھر گیا تھا وہ گھر پر نہیں تھا وسیم واپس لوٹنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک سخت بارش شروع ہو گئی اس نے شاہد کی برساتی اوڑھی اور واپس آگیا۔ اتفاقیہ اس کا ہاتھ برساتی کی جیب میں چلا گیا اور ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں آگیا اس نے غیر ارادی طور پر لفافہ کے اندر کا جائزہ لیا تو اس لفافہ کے اندر سے ایک لڑکی کی پاسپورٹ سائز کی تصویر برآمد ہو گئی تھی۔ اس نے غور سے اس تصویر کو دیکھا تھا۔ شاہد کی جیب میں سوائے اس کی محبوبہ کی تصویر کے اور کس کی تصویر ہو سکتی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کے ہونٹوں پر جم گئیں جہاں ایک کالا تل صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے تصویر کو دیکھ کر زیر لب کہا۔۔ "تم جو اپنی پاکیزگی کا بوجھ سنبھال نہ سکیں۔ وفاداری کا بوجھ کیا سنبھال سکو گی" اور بے دلی سے تصویر واپس جیب میں رکھ کر برساتی جب شاہد کو واپس کی تو اس تصویر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

وقت دبے پاؤں گزرتا گیا وسیم خود کو ذہنی طور پر دوسری شادی کے لئے تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک دن اسے خبر ملی کہ شاطا کی شادی کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ ہو گئی ہے اور وہ اسے لے کر بمبئی چلا گیا۔ وسیم کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے سوچا اس قسم کی لڑکیاں کتنی جلد اپنا آشیانہ تبدیل کر لیتی ہیں۔ کچھ ماہ گزرنے پر ایک دن اتفاق وسیم کی ملاقات شاہد سے ہو گئی ــــ اس نے شاہد سے پوچھا

"کہو تمہاری خدا رسیدہ کو کیا خبر ہے۔" شاہد نے جواب دیا —
"ارے دوست اب اسے برا نہ کہو وہ اب میری بیوی ہے اور
میرے پیارے گڈو کی ماں۔ ہم لوگوں کے درمیان کچھ غلط فہمی
ہوگئی پھر بات صاف ہونے پر ہماری شادی ہوگئی۔ وسیم نے کہا
تو کیا نشاط نے تم سے شادی کرلی؟ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اپنے شوہر
کے ساتھ جرمنی چلی گئی۔" شاہد نے حیرت سے کہا۔ "کون نشاط—؟"
میری بیوی کا نام تو روحی ہے۔" وسیم نے زور دے کر کہا۔ "نہیں
اس کا نام نشاط ہی ہوگا۔" شاہد نے کہا۔ "عجیب آدمی ہو بیوی
میری ہے اور نام تم بتا رہے ہو۔" وسیم نے کہا تو کیا تمہارے
پاس جو تصویر تھی وہ روحی کی نہیں تھی؟" شاہد نے جواب دیا بالکل
نہیں روحی نے تو مجھے اپنی کبھی کوئی تصویر ہی نہیں دی تھی۔ وسیم
کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی نظروں کے سامنے زمین آسمان
گھوم رہے ہیں اس نے بیٹھتے دل کے ساتھ اس سے برساتی والی
تصویر کے متعلق دریافت کیا تو اس نے اپنے دماغ پر کچھ زور دیا
اور کہا۔ "ہاں یاد آیا وہ تصویر میری بہن تارا کی ایک سہیلی کی تھی
جو اس نے مجھے مبارک کے فارم کے لئے صاف کرنے کو دی تھی۔"
اس کے بعد شاہد نے اور کیا کہا۔ وسیم کچھ سن نہ سکا۔ وہ تو
ایک بت بن چکا تھا۔ پتھر کا ایک سخت بت ہاں سخت بالکل
اپنے اصولوں کی طرح پتھر کی چٹان جس سے ٹکرا کر اس کی اپنی
ہی زندگی چکنا چور ہو چکی تھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی تھی۔

موجودہ موسم میں سلاد ضروری

اس موسم میں مولی، کھیرا، پودینہ، پیاز اور لیموں کا استعمال بے حد
مفید ہوتا ہے۔ ویسے بھی کھانے کی میز پر سلاد ہو — تو خواہ مخواہ
بھی کھانے کی اشتہا بڑھ جاتی ہے۔
مولی کے گول گول قتلے باریک باریک تراش لیں۔ دو دو قتلوں کے
درمیان پودینے کی پتیاں رکھ کر لیموں چھڑک کر پلیٹ میں سجا دیں۔ اسی طرح
کھیرے کے گول گول قتلے تراش کر پلیٹ میں رکھیں اوپر سے پیاز کے باریک
باریک لچھے تراش کر پھیلائیں — پھر پودینے کی پتیاں ڈال کر
ہلکا سا نمک چھڑکیں اور ہری مرچ باریک کاٹ کر چھڑکیں۔
پھر لیموں کا عرق نچوڑیں اور نوش فرمائیں
شدید گرمی سے پیدا ہونے والی پیٹ کی تکالیف نہ ہوں گی۔

زمانہ حال کا گیت

بنگلا دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی
بنگلہ دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی
نہ میں کھاؤں دال وال نہ میں وال سے راضی
جہاں ملیں گے کھٹے بیگن وہیں کروں گی شادی
بنگلہ دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی
نہ میں پہنوں لٹھا ململ نہ میں اس سے راضی
جہاں ملے کمخواب اطلس وہیں کروں گی شادی
بنگلہ دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی
نہ میں جاؤں پیدل ویدل نہ پیدل سے راضی
جہاں ملے گا گاڑی والا وہیں کروں گی شادی
بنگلہ دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی
نہ میں جانوں ٹی وی، وی وی نہ ٹی وی سے راضی
جہاں ملے گا وی سی آر وہیں کروں گی شادی
بنگلہ دلا دے بالم میں بنگلے سے راضی

مرسلہ اسما۔ لاہور

ہے مہاراجہ ہماری تیری ٹھن گئی
ہے مہاراجہ ہماری تیری بن گئی
پنیا بھرن ہم جائیں تو گلیاں پہ لاڈ کرے رے
ماروں گی بیلنا گھمائی کے ہائے ہلا کرے، دیا تا کرے، توبہ تلا کرے
ہے مہاراجہ ہماری تیری ٹھن گئی
ہے مہاراجہ ہماری تیری بن گئی
ہائے کلیا پہ رنگلی پہ لوٹا لوٹا جائے میری موا مجھ سے گمان کرے
ہے مہاراجہ ہماری تیری ٹھن گئی
ہے مہاراجہ ہماری تیری بن گئی
روٹی پکاوت ہم جائے تو بھیا پہ لاڈ کرے رے
ماروں گی بیلنا گھمائے کے ہائے ہلا کرے، دیا تا کرے، توبہ
ہے مہاراجہ ہماری تیری ٹھن گئی
ہے مہاراجہ ہماری تیری بن گئی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، سنجیدہ اور موزوں ہو، ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ جس ماہ میں شعر بھیجنا ہو، اس سے پہلے مہینے کی ۲۰ تاریخ تک شعر کا دفتر پہنچ جانا ضروری ہوتا ہے۔ ستمبر کے لئے عنوان ہے "تصویر" اور اکتوبر کے لئے "زخم"۔

اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو ہے
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار لگ جا

مرسلہ:۔ اقبال سلطانہ (موتی نگر محبوب نگر)

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جواب راکھ، جستجو کیا ہے

مرسلہ:۔ پروین نکہت (پریامٹ۔ مدراس)

ختم ہوتا ہی نہیں یہ جستجو کا سلسلہ
ہر نئے عنواں کو ہے تازہ کہانی کی تلاش

مرسلہ:۔ شہناز یوسف احمد (ترچی)

گل ناشگفتہ ہے آرزو مجھے دم بہ دم تری جستجو
ترے عشق میں مری زندگی یونہی وقف لیل و نہار ہے

مرسلہ:۔ ناہید (میسور)

رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

مرسلہ:۔ قرۃ العین (مندیال)

کبھی ذوق جستجو پر اگر اعتبار کر لوں
سر راہ منزلیں مجھے خود ڈھونڈھنے کو آئیں

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لال باغ۔ لکھنؤ)

اک بہانہ تھا تمہاری جستجو
درحقیقت تھی مجھے اپنی تلاش

مرسلہ:۔ نیلوفر (پٹنہ)

مجھے رہ نوردیٔ غم کا عذاب ہے گوارا
مری جستجو حصار در و بام تک نہ پہنچے

مرسلہ:۔ نجمہ انصار جنگل

نگاہوں کو ناحق تری جستجو ہے
یقیناً تمائش کے پردے میں تو ہے

مرسلہ:۔ نور جبیں دل افروز دریبت فوادہ

ساحل کی جستجو میں بھٹک یوں نہ عمر بھر
کشتی بھنور میں چھوڑ کے شعبدہ کو دیکھ

مرسلہ:۔ سعیدہ صبا (آبھور)

ڈھونڈھنے والو ادھوری جستجو لے جاؤ گے
پتھروں کے شہر میں انساں کہاں سے پاؤ گے

مرسلہ:۔ خجینہ شاہین (آرہ)

جستجو جس کی تھی اسکو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

مرسلہ:۔ ضیا خلق (دھنباد)

مرسلہ:۔ امتیاز فاطمی ایم۔اے (مظفر پور)

• ہر مہینے ۲۵ تاریخ تک حریم نہ ملے تو فوراً مطلع کریں دوسرے تیسرے مہینے شکایت لکھیں تو پھر کتابت کر کے پرچے قیمتاً وی پی سے بھیجے جائیں۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال پر ملال سے متعلق ہو۔ جو مختصر ترین الفاظ میں لکھ کر نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائے کہ جس ماہ کے پرچے میں چھپنا ہو، اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔

ولادتِ اطفال کی خبریں

• میری پارۂ جگر مسز نجم السحر منصور سلمہا کو اللہ پاک نے دو بیٹیوں اسمٰی اور آفرین اور فرزند کاشف سلمہ اللہ تعالیٰ کے بعد ۹ ر جولائی ۸۵ء وشب جمعہ کو سوا دو بجے، بمقام ہولی فیملی باندرہ، بمبئی، ایک اور دختر عطا فرمائی۔ فون سے ولادت کی خبر ملتے ہی میری چھوٹی مسز بشریٰ فہیم سلمہا نے اس کا نام عنبرین تجویز کر دیا۔ یہ نام نجم السحر، ان کی خوشدامن بہن مسز ساجدہ قاسم اے حق صاحب کو بھی پسند آیا۔ میری شریک حیات اپنی خرابی صحت کے باوجود محبت مادری سے مجبور ہو کر اسی سلسلہ میں آجکل باندرہ ہی میں مقیم ہیں تمام حریمی بہنوں اور بھانجیوں سے التجا ہے کہ عنبرین سلمہا کی صحت اور درازی عمر کے لئے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ میری بھی دعا ہے کہ اللہ پاک اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے، اپنے تمام بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور صاحب اقبال بنائے۔ (شکستہ دل نسیم انہونوی)

• مسرت ارشد کی نند دنشد وئی اور ثروت نازلی کی باجی وبھابھی (اپرنام بٹ) سلطانہ مشتاق کو اللہ پاک نے تیسری بار ایک لڑکی عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• رضیہ کاظمی (دیوبند) میرے پیارے بھیا کو اللہ پاک نے چار بیٹیوں کے بعد ۱۹ ر اپریل بروز ہفتہ بوقت صبح آٹھ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام فاروق عمر قرار پایا۔ اللہ پاک اس کی عمر دراز کرے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغاماتِ نشاط

• جناب عبد الحفیظ یالصادی (بمبئی مینج گنی) کے فرزند دلبند ابو لایاز سلمہٗ کی شادی ہمراہ تحسین سلمہا (دختر نیک اختر منیر اعظم صاحب) نجم باغ۔ شوز گری بمبئی میں ۲۹ ر جون ۸۵ء کی شام کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ نکاح کے بعد ایک شاندار دعوت طعام بھی دی گئی۔ جس میں اعزہ واقربا اور معتقد حضرات نے شرکت کی۔ میں محترم منشی عبد العزیز انصاری صاحب (منشی ہینڈ کمپنی) بہن تہذیبہ خانم انصاری اور بہن طاہرہ بیگم عبد القدیر انصاری صاحب کو اس تقریب سعید کے سلسلہ میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے معذرت خواہ ہوں کہ اپنی صحت کی خرابی کے باعث شرکت نہ کر سکا۔ (شکستہ دل نسیم انہونوی)

• امان اللہ صاحب (میسور) کی دختر نیک اختر حذیفہ راحت سلمہا کا عقد نکاح، رحمت اللہ سلمہ بی۔ اے (فرزند تولے عبد الرزاق عرف مولانا صاحب) کے ساتھ ۷ ر جولائی ۸۵ء کو ۱۱ بجے دن میں بمقام چھوٹی مسجد۔ آمبور نہایت سادگی کے ساتھ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (شکستہ دل نسیم انہونوی)

یہی خبر عزیزہ سائرہ بانو سلمہا خریدار حریم (آمبور) نے بھی روانہ کی ہے۔ انکی دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• سید مختار پاشاہ لکچرر گورنمنٹ کالج کولار اور مسز قمر جہاں مختار (کولار) کی دختر نیک اختر ثروت مبین، بی۔ اے کی شادی عزیزی عبد العزیز سلمہٗ بی۔ ایس۔ سی کے ساتھ ۷ ر جولائی ۸۵ء بروز اتوار رحمانیہ شادی محل (کولار) میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• خطیب محمد یوسف باخوی (بنگلور) کی دختر نیک اختر کے۔ ایم شاہدہ سلمہا کا عقد سعید ہمراہ ایچ عبد الحلیم، بی کام سلمہٗ (فرزند حافظ عبد الشکور صاحب مرحوم۔ وانمباڑی) بمقام چوک مسجد پرنام بٹ بتاریخ ۳۰ ر جون ۸۵ء بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (شکستہ دل، نسیم انہونوی)

• سمیعہ صباح (آمبور) میری سکھی اور کزن ریحانہ بانو سلمہا دختر پی عبد الکریم صاحب) کی شادی جی رحمت اللہ سلمہٗ (ابن درگم عبد الوہاب صاحب) کے ساتھ ۱۴ ر جولائی ۸۵ء کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بمقام محمود پورہ مسجد (آمبور) بخیر و خوبی انجام پائی۔ ربِّ ذو الجلال سے دعا ہے کہ زندگی کے اس نئے سفر میں اس جوڑی کو کامیاب و کامران بنائے۔

• ڈاکٹر افتخار احمد فخر صاحب سابق صدر شعبۂ اردو ایم جے کالج جلگاؤں کے فرزند جمیل اصغر ڈی۔ پی، ایم، ایس، سلمہ کا عقد مسنونہ زبیدہ سلمہا بی۔ اے آنرز بنت ہارون شبلی صاحب، مالیگاؤں کے ہمراہ نورانی مسجد مالیگاؤں میں ۱۱ ر جولائی ۸۵ء کو بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (شکستہ دل نسیم انہونوی)

• محمد رحمت اللہ صاحب (سابق۔ ایم۔ پی۔ کڑپہ) کی پوتی اور محمد کرامت اللہ صاحب کی صاحبزادی کا عقد مسعود عمران احمد (فرزند انجم صاحب۔ جگلور) کے ہمراہ

بمقام کاگی تالا بیٹھو کٹریہ، بروز ۱۴ر جولائی بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (شکستہ دل۔ نسیم انہونوی)

• ورسلا ترنم، عرفت توصیفہ عفت (آمبور) ہماری پھوپھی ورسلا سائرہ انجم کی شادی، ورثم سلیم الرحمٰن کے ہمراہ ۳ر مارچ ۱۹۸۵ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ دلہا دلہن شاد و آباد رہیں۔

• ایم اقبال تنصیر (آمبور) میری بہن نازکی شادی لئی فیاض احمد (سعودی عرب) کے ہمراہ ۳۰ر جون ۱۹۸۵ء کو بمقام آمبور انجام پائی۔ ولیمہ بنگلور میں ہوا۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• صبیحہ تسنیم روحی (کبی پور۔ بنگلہ) میری دیدی شاہدہ تبسم سلمہا کی شادی ۳ر جون ۱۹۸۵ء کو علیم احمد صاحب بی کام (فرزند حافظ عبدالشکور صاحب مرحوم۔ وانمبادی) کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پائی اللہ پاک دلہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• سید عبدالعزیز رضوی صاحب (نرالا نگر۔ لکھنؤ) کے فرزند عبداللہ سلمہ کی شادی صبیحہ سلمہا (دختر نیک اختر ایس خلیل احمد رضوی صاحب آئی۔ پی۔ ایس) کے ہمراہ بارہ دری قیصر باغ میں ۲۹ر جون ۱۹۸۵ء کی شام کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں عبدالعزیز صاحب نے کارلٹن ہوٹل لکھنؤ میں ۳۰ر جون ۱۹۸۵ء کی شام کو ایک ریسپشن دیا جس میں اعزہ اقربا اور معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔
(شکستہ دل۔ نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• رابعہ ممتاز (انگول۔ اڑیسہ) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے بچازاد ماموں سید عبدالستار صاحب چھ ماہ کی علالت کے بعد ۱۰ر مئی ۱۹۸۵ء بروز جمعہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ اپنی نشانی ایک بیوہ اور ایک فرزند عبدالغفار اور ایک بیٹی انجم افشاں چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

• اگر آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں ورنہ جواب نہ ملے گا۔

• خط پوسٹ کرنے سے پہلے احتیاط سے یہ دیکھ لیا کریں۔ کہ آپ نے اپنا نام و پتہ یا نمبر خریداری لکھ دیا ہے۔ دفتر میں ہر ماہ دو چار ایسے خط وصول ہوتے ہیں۔ جن میں پتہ لکھا نہیں ہوتا اس لئے تعمیل نہیں ہو پاتی۔

• نسیم بکڈپو سے شائع ہونے والے ناولوں کی خریداری کرنے سے آپ کو دس فیصدی رعایت نسیم بکڈپو کی مطبوعات پر مل سکتی ہے۔ مثلاً سال بھر میں آپ سو روپیہ کی کتابیں خریدیں تو آپ کو دس روپیے کی چھوٹ مل جائے گی۔ صرف ۹ کے علاوہ قیمت منی آرڈر سے -/8 اور وی پی سے دس روپیہ ہوتے ہیں۔

بیٹی نہیں بہن

عبدالمجیب سہالوی

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اکثر عورتیں شادی بیاہ میں اپنے کپڑے اور زیور دکھانے اور دوسری خواتین کے دیکھنے جاتی ہیں اور شادی سے واپسی کے بعد ہفتوں اسی کا ذکر رہتا ہے کہ طلعت باجی کی لڑکی کا کیا خوبصورت غرارہ پہنے تھیں اور نزہت آپا کا نکلس کیسا بھلا لگ رہا تھا جی چاہتا تھا دیکھتے ہی رہو۔

ایسے موقعوں پر جب خواتین جمع ہوں تو بعض وقت بڑی دلچسپ باتیں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ خواتین اپنی عمر کم بتانے کی کوشش کرتی ہیں۔ عمر کم یا بڑھا چڑھا کر بتانے کا خبط تو عورتوں اور مردوں سب میں پایا جاتا ہے۔ ایک بڈھے میاں کی عمر زیادہ سے زیادہ نوے سال کی ہوگی مگر جب کوئی ان سے ان کی عمر پوچھتا تو وہ ڈیڑھ سو بتاتے تھے یعنی ایک سو بیس سے کم نہ بتاتے بات یہ ہے کہ آدمی اپنے کو نمایاں کرنا چاہتا ہے اسی لئے یہ بڑھے میاں اپنی عمر زیادہ بتا کر نمایاں حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اسی طرح ایک صاحبہ جنھیں اپنے کو جوان ظاہر کرنے کا خبط تھا اپنے ایک عزیز لڑکے کی شادی میں شرکت کی غرض سے گئیں وہاں خواتین کی ریل پیل تھی وہ زرق برق لباس پہنے پان کھاتی اور باتیں کرتی نظر آرہی تھیں ان صاحبہ کے ساتھ ان کی جوان لڑکی بھی تھی۔ یہ صاحبہ خضاب، پوڈر، لپ اسٹک اور نیل پالش لگا کر جوان بننے کی کوشش کر رہی تھیں اتفاق سے ایک صاحبہ نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھ لیا کہ آپ کے ساتھ جو جوان لڑکی ہے وہ آپ کی کون ہے یہ سوال سن کر پہلے وہ گھبرا گئیں لیکن اپنے کو سنبھالتے ہوئے تڑاق سے بولیں یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ لڑکی اس لئے نہیں بتایا کہ جوان بننے کا راز فاش ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ پان کھانے چلی گئیں تھوڑی دیر بعد ان کے شوہر آئے اور کہا بیٹا نجمہ تمہاری امی کہاں ہیں۔

اس پر لڑکی نے منہ بنا کر کہا ابو وہ یہاں میری امی نہیں میری بڑی بہن ہیں۔ باپ نے حیرت سے پوچھا یہ کیسے لڑکی نے کہا وہ لڑکی بتائیں تو اپنے کو جوان کیسے ظاہر کرتیں اسی لئے انھوں نے ایک صاحبہ کے پوچھنے پر کہ یہ لڑکی آپ کی کون ہے بڑی صفائی سے کہہ دیا کہ میری چھوٹی بہن ہے۔

یہ سن کر باپ مسکرائے اور کہا اچھا میں جاتا ہوں ورنہ کہیں تمہاری امی میرے سفید بالوں کی وجہ سے مجھے اپنا شوہر بتانے کے بجائے ابا ہی نہ بتا دیں

اتنے میں ان کی بیوی آگئیں اور انھیں چھجے پر دیکھ کر بگڑ گئیں اور کہا نہ جانے کیوں آپ کو اپنے سفید بال دکھانے کا شوق ہے میں نے لاکھ بار کہا کہ خضاب لگا لیا کیجئے خواہ مخواہ بوڑھا بننے سے کیا فائدہ؟

ان کے میاں مسکرائے اور جوان لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے اتنی بڑی بڑی سالیاں ہوں وہ جوان ہی بنا رہے گا۔ یہ سننا تھا کہ ان کی بیوی سکتے کے عالم میں ہو گئیں کاٹو تو لہو نہیں وہ بت بنی دیر تک کھڑی رہیں اس کے بعد لڑکی کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں تیرے پیٹ میں کوئی بات رہتی نہیں آخر باپ سے یہ بات بتانے کی کیا ضرورت تھی؟

لڑکی مسکرا کر بولی تاکہ ابو بھی میرا آپ کا نیا رشتہ جان جائیں۔

حرمی دسترخوان

مرسلہ :- زہرہ حسین

کباب تو آپ نے بہت اقسام کے کھائے ہوں گے ممکن ہے چاول کے کباب نہ کھائے ہوں۔ ایک بار انھیں بھی پکا کر نوش فرمائیں شاید پسند آئیں۔

سامان :- چاول ۱۰۰ گرام۔ آلو ۱۰۰ گرام۔ بیسن ۲۵ گرام۔ دودھ۔ چار کی آدھی پیالی۔ زیرہ بھنا پسا ہوا چائے کا ایک چمچہ۔ لیمو بڑا ایک۔ سرخ مرچ حسب خواہش۔ نمک حسب ضرورت ہرا دھنیا تھوڑا سا کٹا ہوا۔ ہری مرچ حسب پسند۔ لوکی۔ ترئی کدو یا ٹنڈے ۱۰۰ گرام۔ گرم مسالہ چائے کا ایک چمچہ یا کچھ زائد۔ تلنے کے لئے گھی ڈالڈا یا تیل حسب ضرورت۔

ترکیب :- کسی بھی ترکاری کو اس طرح پکا لیں جس طرح آپ نوش فرماتی ہوں۔ چاولوں اور آلوؤں کو ابال کر سل پر باریک پیس لیں۔ پھر دودھ سرخ مرچ پسی ہوئی گرم مسالہ پسا ہوا ہرا دھنیا کٹا ہوا اور نمک شامل کر کے خوب ایکجان کر لیں۔ لیمو کا عرق بھی ملا لیں۔ لیموں نہ ہو تو ٹماٹر شامل کر لیں۔

بیسن کو اندازے اتنے پانی میں گھول لیں کہ کبابوں کو اس میں ڈبو ڈبو کر تلیں۔ بیسن ہلکا سا نمک اور باریک کٹی ہری مرچ ملا کر پھینٹیں۔ چاول اور آلو کے آمیزے کو تھوڑا تھوڑا لے کر ہتھیلی پر ٹکیاں بنائیں پھر تھوڑی ترکاری رکھ کر کبابوں کی شکل میں بنا کر بیسن کے آمیزے میں الٹ پلٹ کر کے فرائی پین میں [illegible] اور گرم پسندیدہ چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

ہوں گی ان کی صورت پر نظر ڈالوں۔ آپس کے مرے جئے پر بھی کوئی نہ آئے۔ بس، میں صبر کر لوں گی میں نے بڑھاپے کا سہارا بیٹا پیدا ہی نہ کیا تھا!"

"اماں آپ کی باتیں:" بیانے بھڑک کر کہا: "اسی کمزوری نے انھیں شیر بنا رکھا ہے۔ آپ چپکے چپکے رو دیا کیں۔ بد زبان لڑکی کے تیز تیز جواب سنا کیں۔ اور کچھ نہ کیا۔ میں ہوتی نہ آپ کی جگہ تو کبھی ایک وار میں معاملہ برابر کر دیتی۔ یہ منحوس مار آسیہ لگا ہی کر رہتا!" پھر انھوں نے نہایت فراخدلی اور سیر چشمی سے کہا: "تمھارے پاس پانچ ہزار ہی گت نہ ہوں گے۔ میں دے دیتی ہوں۔ طلاق نامہ اور چیک تیار کر کے رجسٹری سے بھجوا دو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ خبردار بلا جاتی یہاں نہ آئے۔ اب یہاں میاؤں میاؤں کرنے والی اماں سے سابقہ نہیں پڑے گا بھوکی شیرنی کا سامنا ہوگا۔ نرخرہ چبا ڈالوں گی۔ سمجھے۔ اس طرف سے نجات ملے تو میں اور اماں جائیں۔ امی خالہ کے ہاں۔ میں ہاتھ پاؤں پڑ کے انھیں شبنم کے لیے راضی کر لوں گی۔ رجب کا مبارک مہینہ بھی ہے بس تھوڑی سی تیاری کے بعد جاگنے کی رات سے پہلے پہلے یہ کام ہو لے اماں کے دل کو سکون ہو۔ صورت پر بحالی آئے تو پھر میں بھی سہارنپور جاؤں۔ ناگ سانپ کے آگے سپنولیے ادھر بھی تو ہیں۔ باواقضائی کا ان پر بس نہیں چلتا۔ یکبارگی لٹھ لے کے پل پڑتے ہیں۔ خدا غارت کرے۔ قرار نہ مجھے یہاں نہ سکون وہاں۔ کیا مصیبت ہے!"

اور پھر بے کہے سنے ہی احمد پر بے خبری میں ظلم ڈھایا گیا تھا۔ ناصر کے سب سے بڑے سکھ کا تھا طلاق نامہ مع مہر کا چیک رجسٹری سے احمد کو بھجوا دیا۔

(باقی آئندہ)

سمجھ دار بھی ہو۔ مگر کیا یہ تم کو خود اچھا لگے گا کہ لوگ کہنے لگیں۔ واہ بھئی ایاز میاں اپنی بہن صنوبیہ کے آگے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ تم تو مرد ہو۔ تم کو اپنی بہن کا خیال کرنا چاہیے! کیوں؟"

ایاز نے گھٹا ہوا چہرہ اٹھایا۔ ویرانی اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ پپڑی پڑے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں بڑے صاحب۔ چھوٹی بی بی کو کوئی کچھ کہے گا تو مجھے اچھا نہ لگے گا۔"

"تو پھر میں تمھیں دوسرے گھر میں پہونچا دوں؟"

"اچھا۔ بڑے صاحب!" ہونٹ بھینچ کر اس نے آنسو پیے۔ اگرچہ کہ بڑے سرکار سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہی تھی مگر مصلحتاً انھوں نے اس کی اشک شوئی مناسب نہ سمجھی!

صنوبیہ کو خبر بھی نہ لگی۔ اور شام کو چائے کے بعد کسی سے کچھ کہے بغیر بڑے سرکار نے اسے اپنے دوست نظام صاحب کے ہاں پہنچا دیا۔

|

اس کے خواب پھر بے تعبیر رہ گئے! خیال پرست ذہن حقیقت کی تلخیاں برداشت نہیں کر سکتا! چند ہفتے ایاز کے خود ساختہ بہشت میں گزرے تھے اور اب پھر غیروں کے جہنم میں سلگنا پڑا۔ نظام صاحب اور ان کا خاندان اتنا حساس اور جذباتی نہ تھا کہ ایک معمولی سے بے سروساماں لڑکے کو غیر معمولی اہمیت دیتے۔ وہ تو ملازم تھا اس سے

ایسے ہی کام لیے جانے لگے! ۔ نظام صاحب کی بھاری بھرکم بیوی ان کی
صاحبزادیاں دن بھر اسے نچائے رکھتیں۔ سودا سلف لانے کے لیے بار بار
اسے بازار بھیجا جاتا۔ اور چھوٹی سی غلطی پر کان کھینچے جاتے۔ تعلیم و مدرسہ
تو کبھی کا سلام کر کے اس سے رخصت ہو چکے تھے آج جو تھا روز تھا اور
اس کا حال ابتر تھا۔ چائے کی طشتری کے ٹوٹنے پر بیگم نے ایک طوفان
اٹھا دیا تھا اور پھر وہ اپنا زخمی انگوٹھا لیے بہتے خون کو دیکھ کر سہا جا
رہا تھا دوسرے بیگم کی کڑک دار آواز نا قابل ختم صلواتیں۔ انھوں
نے اس کے انگوٹھے وغیرہ کی پرواہ کیے بغیر ایسے زور دار تھپڑ اسے رسید
کیے تھے کہ ان کی جھنجھناہٹ دماغ تک پہونچی تھی اور دماغ بجے رہا تھا۔
• "چھوڑ آؤ اسے جہاں سے لائے ہو۔ کام کا نہ کاج کا ڈھائی سیر
اناج کا! ایسے بے چارے بادشاہ زادے ہیں کہ کام نہیں کریں گے کوئی
تین وقت پلاؤ۔ قورمہ کی سینی منھ کے آگے دھر دیا کرے۔ سارے کہہ رہا
تھا کہ ڈاکٹر بھیا کے گھر پڑھتا تھا۔ نخرے تو ایسے ہیں نہ معلوم سید بھائی
نے کیسے کھوپڑی پر چڑھا لیا ہے۔ مرا فقیر بچہ۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ وہ
بڑھی تجھ میرن جانے کس ناجائز اولاد کو سید بھائی کے گلے لگا گئی ہے۔
انھوں نے آمنا صدقنا کہہ کے رکھ بھی لی۔ میں تو باپ کی پوٹ کو اپنے صاف ستھرے
گھر میں نہ رکھوں گی۔ مار کے مری غلاظت اور اوقات دو کوڑی کی۔ باتیں نوابوں
کی سی!"

ان کہ اس افلاطونی کہرام نے نظام صاحب کے کان بھی کھڑے کر دیے۔ ایک
تو ہے گناہ کی پہلا بار کا تصور بھی گھناؤنا ہوتا ہے۔ انھوں نے ایاز کو حکم
دے دیا کہ وہ چوکیدار کے کمرے ہی میں رہے۔ اوپر دالانوں اور شفاف

اماں کو بہت چاہتی تھیں۔ انھوں نے پھر گرج برس کر نیامن کو خبردار
کر دیا۔
"اماں کی تم نے خاندان میں ناک ہی نہ رکھی۔ پرسوں تمہاری [illegible]
کے بچے کی سالگرہ میں گئی تھیں ادھر آئی خالہ منہ تکتی ہی رہیں ادھر
اماں نادم و شرمندہ کونے میں منہ چھپائے بیٹھی رہیں۔ دولہا بھائی
میں نفاق اسی کے پڑا ہے۔ صرف تمہاری من مانی اور بدمعاشی کی وجہ
سے۔ کیا تمھیں اماں کا دل دکھانا اچھا لگتا ہے۔؟"
"حق مہر کیا ہے اس موئی کا؟" اماں نے پوچھا۔
"پپ پانچ ہزار۔" مری ہوئی آواز میں نیامن نے کہا۔
"جہیز بھی لائی تھی؟" اپی بیانے دریافت کیا۔
"ہاں!" نیامن نے پھر لمبی سانس لی۔ ان کے خیالوں میں ڈھائی
سال کا شبیترا اور تین ماہ کا جہیز کلبلایا تھا!۔
"جہیز کا تنکا تنکا دوسرے گھر بٹورے گئی" اماں نے اطلاع دی
"پتیل کی ہنڈی میں چھید ہو گیا تھا وہ تک نہ چھوڑی۔"
"صدقے گئی" بیا نے حاتم بن کر کہا "اب تم پانچ ہزار اس کے منہ پر دے
مار دو اور واپس آؤ اماں کی طرف۔ کیسے بیٹھے ہو مرادے جلا دے۔ تین بہنوں
کے ایک بھائی۔ مٹی پڑے۔ منتوں مرادوں کے۔ پتہ ہوتا کہ آگے کو یہ دن تھا
ہونی ہے تو اماں یا دا بیٹے کی دعا ہی نہ مانگتیں! ایسی کلیجہ چبانے والی
ہی کس کام کی۔"
"اماں نے ایک اور پینترا بدلا" اگر ان باپ بیٹوں سے زیادہ پیاری
ہے تو جائیں اسی کے پاس۔ پھر [illegible] شکل دیکھیں تو میں [illegible]

بدنام ہو رہی تھی۔ اس کا کوئی رشتہ بھی نہ آ رہا تھا لہٰذا ان تمام فسادوں کی جڑ ناجرہ کو ٹھہرا کر انھوں نے فیاض پر زور دینا شروع کیا کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا، سویرا ہے۔ تین سال کون سا بڑا عرصہ ہے۔ وہ ناجرہ کو طلاق دے کر ماں کی بھانجی شبنم کو بیاہ لائیں۔ فیاض نے گڑ گڑا کر معذرت کیا تھا۔

ابیا۔ چھوٹے چھوٹے میرے دو بچے۔ مطلب یہ کہ انھیں لے کے وہ کہاں جائے گی؟ "بس بیا بارود کے قلعہ کی طرح پھٹ گئیں تھیں۔ بے غیرت۔ بے شرم۔ مجھے کیا خبر کہ وہ غلیظ کیڑے تیرے ہی ہیں نجانے کس کی گندگی کس طرح تیرے سر تھوپی ہے کہ انھیں اپنے بچے کہنے لگا ہے۔ اتنا سوچ بدبخت کہ جب وہ مجھ سے دیدے لڑا کر تیرے ساتھ آگئی ہے تو اسی طرح کسی اور سے بھی آنکھیں ملا سکتی ہیں۔ کیا تو ہر وقت بستر سے پر بیٹھا رہتا تھا۔ ایسی ہوائی دیدہ شوخ چشم، بد کردار لڑکیوں کا کیا بھروسہ۔ نہیں بھیا۔ میں نہ مانوں گی کہ جب تک تو اسے طلاق دے کر آزاد نہیں کر دیتا۔ اور میں تیرا بیاہ شمو سے نہیں کر دیتی۔ اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔۔!"

"کیا جواب دوں گا میں ناجرہ کو؟" فیاض نے بوکھلا کر کہا۔ "یقین جانئے کہ اسے اس انقلاب کا پتہ چلے گا وہ یہاں آکر حشر اٹھا دے گی! تب آپ کیا کریں گی؟"

"ہو دیکھو بھئی کہ جانے کون سی بوٹی گھس کے چٹا دی ہے کہ چوہے کی طرح اس کا نام لیتے ہوئے دبکتا ہے؟" اماں نے دہائی دی "تیری ذات کی بہکا لیا دور بیٹی سے بڑی مضبوطی ہوتی تھی۔ بیٹی

کمروں میں نہ آئے! پھر انھوں نے اپنے ایک ملازم کو شرے سرکار یعنی سید صاحب کے ہاں بھجوا دیا کہ آکے ایاز کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

سید صاحب ایک عجیب مخمصہ میں الجھ گئے تھے۔ پرانے وقتوں کے آدمی تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ بچوں کی بنیادی محبت اور لڑکپن کا سیدھا سادھا خلوص آخر میں چل کے بہت پختہ اور پائدار ہو جاتا ہے۔ کئی ایک خرابیوں اور معاشرے میں رسوائیوں کا باعث۔!

بیوی نے انھیں مشورہ دیا تھا: "فکر کرنے کی کیا بات ہے کسی بورڈنگ میں رکھوا دیجئے۔ خرچہ ہوگا سو اس کا کیا؟ دے دیا کریں گے!۔"

"میں یہ کہتا ہوں کہ یہ لڑکا آخر ہے کون۔ بیرن بی کے پاس آیا کہاں سے تم کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون سے گاؤں گئی ہے۔ میں انھیں پھر بلاتا اور سارے حالات پوچھتا۔!" سید صاحب پریشان ہوتے جا رہے تھے۔

"مجھے تو دھیان ہی نہ آیا۔" بیگم نے کہا "ایاز ہی سے پوچھیے۔ شاید اسے بتا کے گئی ہوں۔"

"میں تو یہ ڈرتا ہوں کہ کہیں ایاز کی توجہ اور دوستی ناجرہ کو ناگوار نہ گزرے۔" سید صاحب نے آواز نیچی کر لی۔ "وہ بیچاری بس بچوں ہی کے سہارے تو جی رہی ہیں۔ پے در پے واقعات نے دل چھالا بنا رکھا ہے۔ سوچیں گی کہ صنوبیہ کے ساتھ کے لیے بس ایاز ہی رہ گیا تھا۔!"

"کیا بات ہے ابا جی۔ آپ لوگ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں؟" شکیل نے پوچھا کمرے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ماں باپ کو فکر مند دیکھ کر کمرے میں آگئے تھے۔ انھیں بھی ایاز کے جانے کا خیال ستا رہا تھا۔ انہی کی کوششوں سے وہ مدرسہ میں داخل ہوا اور پڑھ رہا تھا۔

سید صاحب نے مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ شکیل ہنسنے لگے: "اف وہ۔
ابا جی آپ کی اور امی کی ہوشیاریاں۔ ایاز بالشت بھر کا ناسمجھ بچہ ہے۔ منوبیہ
کم عمر معصوم سی بچی۔ ان کی دوستی ایک گھر میں رہنے اور ایک مدرسہ میں پڑھنے
کی بنا پر ہے۔ آپ ایاز کو نعاذ چچا کے گھر والوں کے ستم سہنے کے لیے چھوڑ نہ
دیجیے۔ ہمیشہ بی بی اسے لاوارث کہہ کے آپ کے سپرد کر گئی تھیں۔ اس کی ذمہ داری
آپ پر ہے۔ چند دن برداشت کر لیجیے۔ میرن بی ضرور واپس آئیں گی۔ تب ان
کے حوالے کر دیجیے گا!۔ ابی جی۔ اگر وہ قانونی بچہ نہ بھی ہو تو کیا۔ انسان تو ہے
اپنے حالات کا ذمہ دار وہ خود کب ہے۔ آپ شریف کو بھجوا دیجیے۔ وہ ایاز کو
اپنے ساتھ لے آئے!"

"مگر منوبیہ!" بیگم نے کہا۔

"میں ایاز کو پیار سے سمجھا دوں گا۔ وہ اس کے ساتھ نہ رہا کرے۔ بہت
سمجھدار لڑکا ہے۔ مجھے بہت مانتا ہے۔ میرا کہا نہ ٹالے گا!۔"

"دوسری مصیبت ازتم کی ہے۔" سید صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان
پھیرتے ہوئے اور مزید مدھم لہجے میں کہا: "میں یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ
کوئی خواہ مخواہ کی دشمنی میں غریب بچے کا جگر چھلنی کیا کرے۔ اگر ازتم کو
کچھ کہو تو دلہن کو ناگوار ہوگا۔ میں پچھتا رہا ہوں۔ ان حالات اور ان
کے عواقب پر نظر کیے بغیر ایاز کو پناہ دینے کی حامی کیوں بھری؟"

"بڑھیا نگوڑی خود ہی خوار ساڑھے تین سو بھی لے مری"
بیگم نے کہا: "موئی بیچ گئی لڑکے کو۔ بہانہ بنا کر مردار چلی بھاگی ہے۔ اب جو
قیامت تک صورت دکھائے۔ لکھ لو"

"وہ۔ امی رائی کا پہاڑ مت بنا دیجیے۔" شکیل حیران تھے۔ "یہ کون سا

مگر بے فائدہ۔ وہ آٹھ آٹھ آنسو روتیں۔ عادت پڑی ہوئی تھی
زبان درازی کی۔ ان کی زبان چلتی اور فیاض کا ہاتھ چلتا۔ زندگی
دوزخ بن کر رہ گئی۔ مزید غضب یہ ہوا کہ سہاگ پور سے فیاض
کی بڑی بہن ماں باپ سے ملنے آئیں۔ نجانے انھیں ماں نے کیا کیا
لکھ کے بھڑکایا تھا کہ وہ ہاجرہ کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ
ہوئیں بلکہ بھائی کو طرح طرح سے لعنت ملامت کی۔ ہاجرہ پر نئے
نئے الزام رکھے جو تیز طرار لڑکی ایک فرد کو لگا رکھا سکتی ہے اس
کا کیا اعتبار۔ یہ کھیل وہ کسی اور مرد سے بھی کھیل سکتی ہے۔ انھیں
آوارہ، بد چلن، بد کردار بنایا۔ ان کے بچوں کو اپنے بھائی کی اولاد
ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ہاجرہ کے خلاف ایک طاقت ور محاذ تیار
تھا۔ ایک طرف پوری سسرال۔ زبان کے تیز، موثر ہتھیاروں سے
لیس۔ دوسری طرف صرف ہاجرہ۔ چھوٹے بچوں کا کیا ساتھ۔ زبان
کے ہتھیار مسلسل استعمال سے کند ہو چکے تھے۔ ان کا پلہ کمزور تھا۔
اب وہ زبان کی بجائے آنسو استعمال کر رہی تھیں۔ آنسو۔ جو ریاکار
مکار اور چالاک عورتوں کا آخری حربہ ہیں۔ وہ بھی سب پر
قطعاً بے اثر رہے۔ بڑی بہن جو سارے جگ کی بیا کہلاتی تھیں
کسی طرح ہار ماننے فیاض کو معاف کرنے اور ہاجرہ کو خاندان میں
شامل کرنے پر تیار نہ تھیں۔ ان کے مطالبات سب کے نزدیک قابل
قبول تھے۔ فیاض نے بوڑھی ماں اور کمزور باپ کا حکم نہ مانا تھا۔ ان کو
خاندان بھر میں شرمندہ کیا تھا۔ ایک معصوم اور انجان لڑکی کو عرصہ
تک مگر رکھا تھا اور پھر اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ سارے میں

ان کی والدہ نے اپنی بھانجی کو ان سے منسوب کر رکھا تھا۔ انھیں اپنی بات کے گرنے کا غم ہے۔ رفتہ رفتہ جب یہ احساس زائل ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ احساس زائل نہ ہوا۔ آپس کی شکررنجی اختلاف گہرا ہوتا گیا۔ ہاجرہ میں قوت برداشت کم تھی۔ وہ کسی کی کچھ سُن گُن لے بھاگتیں اور گھر میں خوب تہا بھارت مچتی۔ فیاض اس کھینچا تانی سے برگشتہ رہنے لگے۔ ادھر ماں باپ اور بہنیں ان سے ہاجرہ کی شکایت کرتے۔ اور اکیلے میں ہاجرہ ان پر اُمڈ جاتیں۔ وہ کسی کی طرف بول نہ سکتے۔ لیکن پھر وہ بیوی ہی پر نا راض ہونے لگے سسرال آکے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے کہ ان کے ہاں پہلا لڑکا ہوا تب خاندان بھر میں ایک پوشیدہ ہنگامہ مچ گیا۔ سب کا خیال تھا کہ یہ بچہ جائز نہیں تھا۔ اسے اس کے ماں باپ کے سوا کوئی چھوتا بھی نہیں تھا۔ اس کی پیدائش نت نئے جھگڑوں اور جگ ہنسائی کا باعث بن گئی۔ ساس سسر اب بہو کو اپنے ہاں رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ فیاض نے بھی علانیہ بے رخی شروع کر دی تھی۔ ہاجرہ کی جان پر دوگونہ عذاب تھا۔ نہ سسرال میں جگہ نہ میکے میں۔ انھوں نے فیاض کو مجبور کر کے ایک گھر لے لیا۔ لیکن یہاں کا خرچ آسان نہ تھا فیاض نے پارٹ ٹائم جاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تین سو کی آمدنی تین نفوس کے لیے کافی نہ تھی۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے کہ ان کے ہاں دوسرے بچے کی آمد آمد ہوئی۔ فیاض کی بے رخی چڑچڑا پن اور دل آزاری کی عادت عروج کو پہونچ گئی تھی۔ وہ چار چار دن گھر سے غائب رہتے۔ ہاجرہ کی آنکھیں اب کھلیں

ایسا سنجیدہ مسئلہ ہے جو آپ لوگ یوں پریشان ہو رہے ہیں۔ ابی جی۔ دن بھاگ رہے ہیں۔ آج کیا ہے کل کیا ہوگا۔ چند دن کی مصیبت ہے۔ تھوڑے عرصے بعد جب اسے سمجھ آئے گی تو وہ خود بھی ہاتھ پیر توڑ کر ہمارے ٹکڑوں پر نہ پڑا رہے گا۔ اپنی روزی تلاش کرنے چلا جائے گا۔!

"تو پھر کیا رائے ہے۔ اسے بلوا بھیجوں۔ جب سے کریم نے آکے کہا ہے کہ اسے بخار ہے اور نظام بھائی کی بیوی نے اس کا داخلہ اپنے ہاں بند کر دیا ہے۔ برابر میرا کلیجہ مسوس رہا ہے۔ اس کی تکلیف کا باعث میں ہی تو ہوں۔ معمولی سی بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی ارے ایک گھر میں رہتے ہوئے بچے آپس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ تو میں اسے بلوا لوں!"

سیّد صاحب کے چہرے پر پھر تازگی سی آگئی۔

"میں شام کو ٹہلنے جاؤں گا۔ واپسی پر اسے لیتا آؤں گا۔ آپ فکر نہ کیجیے" شکیل نے کہا۔ انھیں ابا سے عجیب سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے کہا "مگر یہ لڑکا تم آخر اس غریب کا دشمن کیوں بنا ہے؟ حالانکہ بھابی اتنے اچھے مزاج کی ہیں۔ ہمیشہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہیں۔ اس کی کل ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔"

بیگم نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا "ناز و نعم میں پلا بڑھا ہے۔ تین بہنوں کا سب سے چھوٹا اور آخری بھائی ہے۔ لاڈ پیار میں بگڑ گیا۔ کوئی کچھ کہہ کر برا کیوں بنے۔ آپ ہی عقل آئے گی!"

پھر شکیل تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلے گئے۔ سید صاحب نے اخبار سنبھالا اور بیوی نے پاندان سامنے سرکا لیا اور کسی گہری سوچ میں غرق ڈبیوں سے چونے کی کلھیاں صاف کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد سید صاحب نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور بیوی سے بولے

بیکار سے مسئلہ پر میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔ اگر ایک پیالی چائے کسی سے بنوا سکتی ہو تو بنا کے لے آؤ۔ تھوڑی دیر آرام کر دوں گا!"

بیوی پاندان اٹھا کر چلی گئیں اور دس منٹ بعد صنوبیہ کی ممی ہاجرہ چائے لے کر آئیں تو باپ کو فکر مند دیکھا۔ مگر وہ بے حد کم سخن، اور بے حد سیدھی سادی خاتون تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں پتہ تھا کہ سید صاحب کی ساری پریشانیوں اور فکروں کا مرکز وہ خود بھی تھیں!۔ جب تک وہ چائے پیتے رہے ہاجرہ خاموش رہیں۔ پھر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابا جی کوئی الجھن آپ کو میری وجہ سے ہے؟"

"نہیں۔ کیا کسی نے تم سے کچھ کہا ہے!" سید صاحب کا دل دھڑکا۔

"نہیں نے کچھ تذکرہ کیا تھا" ہاجرہ بولیں۔"ابی جی اگر آپ کا آرام اسی میں ہے تو آپ مجھے تھوڑے دنوں کے لیے اجازت دیجئے۔ مجھے بڑے ماموں جان بہت عرصہ سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ میں سال دو سال کے لیے —!"

"بیٹی۔ میرے پاس رہتے تم گھبرا گئی ہو کیا!"

ہاجرہ نے دکھ بھری سانس لے کر سر جھکا لیا "میرے شب و روز اماں کے دن رات ہیں۔ ابی جی۔ صبح ہو چاہے شام ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بس آپ کو فکر مند دیکھنا پسند نہیں کرتی"

"نہیں۔ تم اپنے دل پر جبر کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے دور ہو جاؤ!" سید صاحب نے کہا "ویسے میں بڑی ذہن کا ناخاص سلیقہ سے دیکھتا رہتا ہوں۔ خدا کی یہی مرضی تھی کہ وہ صاحب اولاد نہ

ان کے نام سے محفوظ رقم عطا کر دی۔! ہاجرہ جب مسرور مطمئن ہو کر گھر سے جا رہی تھیں تب ان کی یہ مکروہ اور بے شرم خوشی اس کو مار ہی ڈالتی۔ بیاض اور بیا ہاجرہ کا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاس پاس کھڑے ہوتا ہی انھیں پھوٹی آنکھ نہ بھا رہا تھا۔ چپکے چپکے دانت پیس رہی تھیں!۔ بالآخر جب ہاجرہ نے انھیں آخری سلام کیا تھا اور بیاض جب سید صاحب اور عادل و جمیل وغیرہ سے رخصت ہو رہے تھے تب بیگم نے بے حد خشک اور بے مہر لہجے میں کہا۔

"تم نے اپنی پڑھائی اور شریف خاندان میں بڑائی اور رسوائی کی کالک لگا دی ہے۔ خیر جو تمھاری مرضی تھی وہ تم نے پوری کر لی۔ دعا ہے کہ بیچے دھاگے کی سی شادی تمھیں راس آ کے مگر میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ کبھی سسرال سے کھٹ پٹ ہو جائے تو پھر یہاں کا رخ نہ کرنا"

ہاجرہ کو سخت غصہ آیا تھا۔ بڑے جارحانہ انداز میں انھوں نے کہا تھا کہ ہرگز نہ آئیں گی۔

سسرال میں ان کی پذیرائی ویسی نہ ہوئی جیسی انھیں متوقع تھی۔ ساس سسر کھنچے کھنچے سے تھے۔ دو نندیں جو چھوٹی تھیں۔ وہ بھی زیادہ خوش نہ تھیں۔ ہاجرہ سے کوئی کھلے دل سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک اچھوت کی طرح اپنے کمرے میں پڑی رہتیں۔ اگر کبھی ساس نندوں کے بیچ بیٹھ جاتیں تو وہ جلد ہی کوئی بہانہ کر کے کھسک جاتے!۔ یہ صورت حال انھیں سخت ناگوار گزرتی۔ بیاض نے ان کی شکایت سن کر کہا تھا۔

ادسٹا ہوگیا۔ تب فیاض کے دل میں نیکی آئی اور انھوں نے ہاجرہ سے نکاح
کرلیا۔ سید صاحب اس اچانک حادثے سے بیمار ہوگئے۔ ان کی بیوی
خودکشی پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ لڑکوں نے اپنی بے سروسامانی کی دہائی دے
کر انھیں اس اقدام سے باز رکھا تھا۔ ان دنوں سید صاحب کے گھر
میں یوں لگتا تھا جیسے بیک وقت کئی جنازے اٹھے ہوں۔ افسردگی،
سنسانی دیرانی در و دیوار کا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔ بڑے شرمندہ تھے
لڑکے باہر نکلتے گھبراتے۔ رسوائی انگشت نمائی کا خوف۔ انھیں گھر ہی میں
قید رکھتا۔ سید صاحب اور ان کی بیگم کے بنائے کچھ نہ بنتا تھا۔ ہاجرہ کسی
کے سمجھانے سے سمجھتی کہاں تھیں انھوں نے نکاح کیا تھا! کوئی فعل بد نہیں
کیا تھا۔ وہ ایک بار فیاض کو اپنے ساتھ گھر بھی لائی تھیں۔ مارے باندھے
سب کو ان کی پذیرائی کرنی ہی پڑی مگر ایک کھسیاہٹ تھی جو سب کے
چہروں پہ چھائی تھی۔ سید صاحب فیاض سے رسمی طور سے ملے اور کسی کام
کا بہانہ کر کے اٹھ گئے۔ بیگم بڑی مجبوری سی داماد کے سامنے بیٹھی ادھر ادھر
کی بے معنی باتیں کرتی رہی تھیں۔ عدیل اور جمیل بھی دل برداشتہ تھے
ہاجرہ کی سب سے چھوٹی بہن عامرہ بہن کی شادی کی خوشی میں ادھر
ادھر بھاگتی پھر رہی اور ضیافت کا انتظام کر رہی تھی۔ گھر بھر میں
ایک وہی خوش تھی۔

سید صاحب نے اپنے زمانہ ملازمت میں خاصا کمایا تھا۔ پولیس
محکمہ میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ انھوں نے لڑکیوں کا معقول جہیز جوڑ
رکھا تھا۔ داماد کے لیے بھی سلامی کے نام پر سینٹ تیار رکھی۔ لہٰذا انھوں نے
خوشی دلی پر جبر کر کے جہیز ہاجرہ کے حوالے کیا اور سلامی میں فیاض کو

ہوں۔ اس میں کسی کا کیا دخل ہے بیگم، تم سے انھیں کیا دشمنی ہے
کہ کسی وقت بھی سیدھے منہ نہیں بولتیں۔"
"جیسے کو آنگ رہی تھیں۔ بھائی جان کی مرضی بھی یہی تھی لیکن میں
کیسے دل پر پتھر رکھتی۔ بس یہی دشمنی ہے۔ کہہ چکی ہیں کہ بچوں کو ان سے
دور رکھنے کی خاطر میں نے انھیں ان کے چچا کے پاس بھجوا دیا ہے۔" ہاجرہ
کے مغموم چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھری۔ "اگر وہ سچ مچ بچوں کی
بہی خواہ ہوتیں تو ان کے اچھے مستقبل سے انھیں محروم کرنے کی کبھی کوشش
نہ کرتیں۔!"
"اللہ پر نظر رکھو بیٹی۔" بیگم صاحب نے جواب دیا۔ "کبھی زمانہ یکساں
نہیں رہتا ہو سکتا ہے کہ خدا ان کی مراد بھی پوری کر ہی دے گو کہ اب توقع
کم ہے۔ شادی کے بارہ تیرہ سال گزر چکے۔ یہی دکھ تو عدیل کو بھی ہے۔
خیر اب اس کا تذکرہ کیا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محسن میاں کے ہاں جانے کا
تذکرہ کیوں کیا تھا۔!
"میں تو اور تم اور ایاز کے جھگڑے سے بھی پریشان رہتی ہوں۔" ہاجرہ نے
کہا۔ "کتنی بری بات ہے کہ ایک بچی کی خاطر مالک و خادم میں تو تو میں میں
آج یہ حال ہے۔ کل کیا ہوگا۔ جبکہ تینوں ہی کو اس گھر میں رہنا ہے۔!"
"تم بھی بیٹی میری ہی طرح خفقانی ہو۔" سید صاحب ہنس دیے۔ "ابھی
میں کہہ چکا ہوں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ ایاز تھوڑے دنوں بعد اس گھر
سے چلا جائے گا۔ اور تم تعلیم کے ختم پر اپنے گھر کی راہ لے گا۔ اور صنوبر
ماشاءاللہ سسرال کی ہو رہے گی۔ پھر تمہارے بچے اس قابل ہو جائیں گے
کہ تم کو سہارا دیں۔ ایک وقت آئے گا جو کا رخانہ یونہی نہیں رہے گا بیٹی۔"

آپ کو پتہ نہیں ابی جی! اجرہ نے بڑی تشویش سے کہا: یہ جو چار پانچ دن سے ایاز گھر میں نہیں ہے تو صنوبیہ نے کیا نیل مچایا۔ ارقم کی چوٹی پر دونوں میں بڑی لڑائی ہوئی۔ میں حیران ہوں۔ ایاز کو دکھانے کے لیے خالہ میرن کو ہمارا ہی گھر ملا تھا! ابی جی کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہے کون اس کے ماں باپ کہاں ہیں۔ بڑی بی کے پاس وہ آیا کہاں سے ہے؟"

"سارے جھگڑے دل کا خاتمہ بہت جلد ہو جائے گا بیٹی۔ میں ایک بے یار و مددگار لڑکے کو محض تقدیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اس کا یہاں رہنا بھی مناسب نہیں۔ یا تو اسے کسی ہوسٹل میں شریک کرا دوں گا یا پھر میرن بی کا پتہ نشان معلوم کرکے انھیں بلاؤں گا اور ان کے حوالے کر دوں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ خدانخواستہ صنوبیہ کی ذات کسی طرح ملوث نہ ہوگی۔!"

"چھوٹا سا پودا ایک دن تناور درخت بن جاتا ہے ابی جی۔ بس میری زندگی کا خیال رکھیے گا۔!"

ان کے جانے کے بعد سید صاحب پھر سوچ میں گم ہو گئے۔

اجرہ، سید صاحب کی بڑی چہیتی بیٹی تھیں۔ بڑے دو لڑکے خاصی عمر کے ہو چکے تھے تب وہ پیدا ہوئیں اور اسی مناسبت سے ان کا دلار بھی اتنا زیادہ کیا گیا کہ وہ بڑی خود رائے، سرکش اور نسائیت کی عام روش سے ہٹ کر اپنی من مانی راہوں پر چلنے لگیں۔ بی اے کرنے تک ان کا یہ حال تھا کہ مارے غصے اور مزاج کے چڑچڑے پن کے ناک پر مکھی بیٹھنے نہ دیتی تھیں ان کی وہ عادتیں جو پہلے بہت بچپن پر محمول کرکے گوارہ کر لی گئیں۔ بعد از وقت نہایت ناگوار اور دلخراش معلوم ہونے لگیں لیکن اب کسی سے

کچھ نہ ہوا۔ ماں نے چپکے چپکے نصیحتیں کیں۔ باپ نے رسانیت سے سمجھایا لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اور اپنی من مانی کرتی رہیں۔ اسی عرصے میں بڑے بھائی عدیل کی شادی ہوئی۔ بھابی بھی تنک مزاج اور تعلیم یافتہ ملیں۔ شروع شروع میں دونوں دوست بن کر رہیں پھر معمولی معمولی باتوں پر اختلافات شروع ہوئے۔ ہارنا کسی کو بھی گوارہ نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ اب دونوں میں اتنی ہی دشمنی ہو گئی۔ اجرہ نے بھاوج کو بے اولادی کے طعنے بھی دیے۔ یہ طعنہ شہلا کو سخت ناگوار گزرا۔ انھوں نے عدیل سے خوب خوب شکایت کی۔ عدیل اپنی بہن کو چاہتے تھے۔ انھوں نے بہن کو سمجھایا۔ بیوی کو بھی ہدایت کی کہ اتنی سخت نہ ہوں۔ لیکن کب تک۔ مسلسل جنگ زرگری نے بالآخر عدیل کو بھی بیزار کر دیا اب وہ کسی کی طرف بھی نہیں بولتے تھے۔

پھر جمیل کا بیاہ ہوا۔ لیکن اجرہ نے کچھ دلچسپی نہ لی۔ انھوں نے اپنی دلچسپی تلاش کر لی تھی۔ بی اے کے بعد انھوں نے کسی کی اجازت لیے بغیر یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ یہاں کا ماحول ہی اور تھا۔ نئی فضا، دلچسپ ساتھی اور جانے کیا کچھ تھا۔ انھوں نے ایک سینئر طالب علم میں خاصی شدت سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ان صاحب نے بھی جواب میں گرمجوشی دکھائی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ دونوں کلاسیں گول کرکے پارک یا کسی اور تنہا جگہ مل بیٹھتے اور آئندہ کے پروگرام بناتے! یونیورسٹی کے کھلے کھائے تجربہ کار لڑکے جو لڑکے کم اور مرد زیادہ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ سید صاحب اور ان کے کنبہ کے کسی فرد کو پتہ نہ تھا۔ اجرہ نے پڑھائی سے فیض کم اٹھایا اپنی صورت کا فائدہ زیادہ۔ مانی جب سے

حریم

THE HAREEM

Sept 85

Rs. 1/60

نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر آفس: ۴۴۵۵۹

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہوگی۔

ٹیلیفون نمبر رہائش: ۳۵۴۴۲

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گزشتہ ۵۵ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم اہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم اہونوی مرحوم

جلد (۵۵) فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۸۵ء نمبر (۹)

اڈیٹر و نگراں: نسیم اہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم نوالہ ——— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	تیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	اٹھائیس روپیہ
معمولی خریداری	"	چوبیس روپیہ

دی پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ اضافی پرچہ ایک روپیہ ساٹھ پیسے

غیر ممالک سے

انگلینڈ، امریکہ کے علاوہ [illegible] سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ رو تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ رکے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ رکے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ ر تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

آفس اور [illegible] کا پتہ دفتر نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم اہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

عید مبارک
زلف گرہ گیر
کے اسیر آپ بھی ہو جائیں گے
اگر
سندری سہاگ
لگائیں گے
چشم آہو
حیا بار آنکھیں
سرمہ نورِ نظر
کے صدقے
مثال مہ و انجم
چمکدار صاف تندرست
دانتوں کے لئے
جگمگ منجن
طبلۂ عطار
خوشبوؤں کا بحرِ ذخار
دیرپا مسحورکن عطریات
عرق گلاب / کیوڑہ
شہد وغیرہ
مستقبل کا معمار
اپنے بچوں کو
بے بی گرائپ
پلائیے
پہاڑوں سے ٹکر
لینے کی طاقت پیدا کیجئے
شربتِ اکسیر
استعمال کیجئے
تیار کردہ:-
ایس، اے، بی بخشی کمپنی
۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ
(کولوٹولہ) کلکتہ ۷۳

۷۸۶

گزشتہ دو ماہ کے اندر کئی حریمی بہنوں کے ایسے خط ہمیں ملے ہیں، جن میں یہ خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ مطلقہ عورت کے نان نفقے کے سلسلے میں جو فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ حریمی بہنوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک جاہل اجہل انسان ہوں۔ میں نے عربی بس قرآن پاک کی حد تک ہی پڑھی ہے اسلام کا مذہبی لٹریچر اس وقت تک سمجھنا آسان نہیں، جب تک کہ عربی میں اعلیٰ درجے کی قابلیت نہ ہو۔ عربی ایک ایسی زبان ہے جس میں ایک ایک لفظ کے بہت بہت سے معنی اور مفہوم نکلتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی جو تفاسیر قابل ترین علما اور فضلائے لکھی ہیں۔ ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ اور اس فرق کو ہر مفسر نے اس طرح واضح کیا ہے کہ پڑھنے والا اگر ایک ہی تفسیر پڑھے تو وہ اسی کا قائل ہوجائے گا۔ قرآن پاک میں زیادہ تر اشارات ہیں۔ ان اشارات کی تفصیل احادیث سے ہوئی۔ اسلام کے متعدد اماموں نے انھیں کی بنیاد پر اسلامی قوانین بنائے ہیں۔ جن میں اختلافات موجود ہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق قرآن پاک میں صراحت بھی کر دی گئی ہے۔ اور یہ ایک ایسا ہی مسئلہ ہے جس کے متعلق قرآن پاک نے نان نفقہ کی وضاحت کر دی ہے۔ بہرحال یہ کام علمائے دین کا ہے کہ وہ قرآن کے منشا کی وضاحت کریں اور ایسا ہو بھی رہا ہے اور ہم مجبور ہیں کہ ان کی وضاحتوں کو تسلیم کریں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ انسانی ہمدردی کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس فیصلے کو مذہبی نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے تو یہ بہت ہی اچھا فیصلہ ہے۔ جیسا کہ میں اکثر لکھتا رہا ہوں کہ مرد ہی عموماً زیادتی کرتے ہیں عورت کے سلسلہ میں۔ خواہ عورت بیوی ہو، داشتہ ہو یا آشنا۔ لیکن یہاں مسئلہ ہے اسلامی پرسنل لا میں مداخلت کا اور پرسنل لا سے علما اور فضلا ہی واقف ہیں۔ انھیں کی تحریریں دیکھنے سے آپ سمجھ پائیں گی کہ علمائے اسلام کا کیا موقف اس سلسلے میں کیا ہے۔

> **اچھا ساتھی ذہن کا نمک ہوتا ہے**
> **اس کے بغیر دنیا سے مقبرے کی بو آتی ہے**

بدقسمتی سے میری ہی طرح ۹۹ فی صدی مسلمان صرف روزہ نماز، حج و زکاۃ کی حد تک اسلامی قوانین سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ہم میں یہ جذبہ کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کی کتب کا مطالعہ کرکے حقائق سے آگاہ ہوں۔ انگریزی دور میں ملازمت کے لئے انگریزی جاننا ضروری ہوتا تھا اس لئے لوگ خود انگریزی پڑھتے تھے اور بچوں کو بھی انگریزی پڑھاتے تھے، ہندوستان میں عربی تعلیم کے چند ہی ادارے ہیں، جبکہ انگریزی تعلیم کے لاکھوں اسکول اور کالج وغیرہ موجود ہیں، اس لئے عربی تعلیم میں عالم و فاضل بس انگلیوں پر شمار ہونے کی حد تک ہی ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے بعد یہ موجودہ دور آیا جس میں ملازمت کے لئے ہندی زبان کا علم ضروری قرار پایا، اس لئے اب لوگوں نے اپنے بچوں کو ہندی پڑھانا شروع کر دیا۔ انگریزی دور میں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی جس میں اسلام کی تقریباً مذہبی کتب موجود تھیں۔ اس وقت لوگ ان کا مطالعہ آسانی سے کر سکتے تھے، لیکن اب ۴۷ء کے بعد سے اردو کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس سے سب ہی واقف ہیں، اس لئے کوئی چاہے بھی تو اسلامی قوانین وغیرہ کی کتب کا مطالعہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ عربی یا اردو ہی میں ہیں اور انھیں ہندی میں لانا نہ صرف دشوار ہے بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ انھیں نہ معلوم کن تبدیلیوں کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ عالمہ نہ ہونے کی وجہ سے میں اسلامی پرسنل لا کے متعلق ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتی، ہوا اس کے کہ چند ماہ کے اندر مسلم الثبوت علما، مثلاً علی میاں صاحب قبلہ اور مولانا منظور نعمانی صاحب قبلہ وغیرہ کے جو مضامین اس بحث پر پڑھے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت چاہے جتنا سراہا جانے کے قابل ہو، لیکن مسلم پرسنل لا کے خلاف ہے اور مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہے، جس کے متعلق ہماری سرکار اپنا

ہے کہ حکومت [illegible] کوئی تبدیلی جبراً نہیں لا سکتی۔

جنس لطیف یعنی عورت ہونے کے اعتبار سے استفسار کرنے والی بہنوں کے خطوط سے بھی ترشح ہوتا ہے کہ انھیں سپریم کورٹ کے فیصلے سے اتفاق ہے، اس لئے کہ وہ عورت کی ہمدردی میں کیا گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے تو صرف اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اسلامی فقہی کتب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور لوگ بھی جو اس فیصلے سے متفق ہیں وہ بھی ایسے ہی ہونگے جو سیکولرزم کے پیرو ہوں گے اور اسلامی قوانین سے نابلد۔

قانون کیسے بنتے ہیں، کیوں بنتے ہیں، یہ وکلا ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی قوانین کیسے بنے کیوں بنے صرف متبحر علما ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بس اس سلسلے میں ایک اور اسلامی قانون کا ذکر کر دوں گا۔ وہ یہ ہے کہ اگر کسی کا لڑکا اس کی زندگی ہی میں انتقال کر جائے اور اس مرجانے والے لڑکے کی اولادیں ہوں تو وہ دادا کی میراث سے کچھ نہ پاسکیں گے، یعنی محجوب الوراثت ہو جائیں گے۔ بادی النظر میں یہ بات سراسر ظلم معلوم ہوتی ہے اور سطحی نظر سے پرکھنے پر ہر ایک ایسا ہی سوچے گا کہ مرحوم بیٹے کے بچے تو زیادہ حقدار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی روزی کا سہارا ان کا باپ مرجاتا ہے، لیکن اسلام کا کوئی قانون مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ میں اس قانون کے بارے میں وضاحت کرنا نہیں چاہتا کہ کیوں ایسا کیا گیا ہے۔ میں نے تو مثال کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے، تاکہ ہماری بہنیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اسلام نے عورت کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام سے زیادہ کسی مذہب نے بھی عورتوں کو حقوق نہیں دیئے اور اسلام کا ضابطۂ حیات اتنا مستحکم ہے کہ اس میں کہیں سے بھی لچک پیدا نہیں ہو سکتی۔ آج اگر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سلسلہ کا اسلامی قانون درست نہیں ہے۔ اور پھر اسی طرح کے معلوم نہیں کتنے فیصلے دوسری اسلامی باتوں کے سلسلے میں بھی ہوتے رہیں گے۔

خالد اقبال سلمہ کا خط

حیدرآباد سے عزیزی خالد اقبال سلمہ بی۔ اے نے لکھا ہے کہ حریم جولائی ۱۹۸۵ء "پردۂ عورت" کے زیر عنوان پی عقیلہ انجم صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ علم نکاح کے جملے ہیں جو بلا کسی تبدیلی یا بغیر حوالے کے شائع کئے گئے ہیں۔ میں نے علم نکاح نہیں دیکھا اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو نسیان اتنا بڑھ گیا ہے کہ انھیں یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ پی عقیلہ انجم صاحبہ نے ایسا کیا ہے تو افسوسناک ہے۔ ایسی شہرت حاصل کرلے سے کیا فائدہ (ادارہ)

ڈاک کی بدنظمی اور بے راہ روی

اسٹیٹسمین اخبار نے یہ خبر دی ہے کہ دہلی میں ڈھیر سارے لفافے اور خطوط کسی پوسٹ مین نے تقسیم کرنے کے بجائے کسی کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے۔ کسی طرح اسٹیٹسمین کے نامہ نگار نے انھیں دیکھ کر محکمہ کو متوجہ کیا۔

حالت یہ ہے کہ ہندوستان کے مرکزی شہروں سے چلے ہوئے منی آرڈرس اور رجسٹریاں بیس، دس، بارہ بارہ روز بعد ڈلیوری ہوتی ہیں۔ معمولی ڈاک کا تو بس خدا ہی حافظ ہے، جو خطوط مل جاتے ہیں، مل جاتے ہیں، بقیہ کیا ہوتے ہیں معلوم نہیں، اسلئے کہ اکثر ایسے خطوط ہمیں وصول ہوتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں تاریخ کو ہم نے خط بھیجا تھا۔ آپنے تعمیل نہیں کی۔ خط ملے نہ تھے تو تعمیل ہوتی کیسے یقیناً وہ ڈاک میں تلف ہوتے رہتے ہیں۔

اندر زو نم

ایک معتبر محقق اور ناقد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا کلاسیکی اور جدید رنگ لئے ہوئے ہر لحاظ سے معتبر کلام، جس میں رومانیت بھی ہے حقیقت پسندی بھی اور صوفیانہ اشارے بھی۔ طنز و مزاح کی بھی چاشنی ہے اور مطالعہ فطرت کے ساتھ ہی مطالعہ انسانی بھی۔ غزلوں، منظومات اور رباعیات کا قابل مجموعہ R15/-

ساز اودھی میں نغمۂ غالب

غالب کے سو مشکل اور مشہور اشعار کی نہایت آسان عبارت میں تشریح اور پھر ان کا آسان اودھی زبان میں منظوم ترجمہ (اودھی الفاظ کا اردو میں ترجمہ بھی دیا گیا ہے) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب کا یہ یادگار کارنامہ ہے۔ ہر ادب دوست اور خصوصاً طلبہ کے لئے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ غالب کے اشعار کا یہ آسان ترین و رواں ترجمہ ہے۔
R6/-

پیغامات تعزیت

بھائی سید جمیل الحسن صاحب ردولوی منیجر نسیم بکڈپو لکھنؤ کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھ کر صدہا حریمی بہنوں اور بھانجیوں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے تعزیتی خطوط لکھے، جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، افسوس کہ تمام بہ تمام ہر ایک کو اس ہمدردی کے لئے شکریے کے خطوط لکھنا یا ان کی تفاصیل حریم میں شائع کرنا ممکن نہیں، اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ ایسی تمام ہمدرد حریمی بہنوں اور بھانجیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے میرا غم بٹانے کے لئے یہ تحریریں روانہ کیں۔ بیگم صاحبہ جمیل صاحب ان کی صاحبزادیوں اور ان کے پسران و خویش و اقارب تک تمام تعزیتی پیغام پہنچا دیئے گئے ہیں۔ شکستہ دل۔ نسیم انہونوی اڈوائزر نسیم بکڈپو

میری صحت

اکثر حریمی بہنوں کو میری صحت کی فکر رہتی ہے اور ایسے خطوط آتے رہتے ہیں، جنمیں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اب میری تندرستی کا کیا حال ہے۔

میں حریم میں اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھتا کہ یہ بھی پروپیگنڈا ہو جاتا ہے، بہرحال صحت دن بدن گرتی ہی جاتی ہے جو عمر اور مرض کی سنگینی کا تقاضہ ہے تنفس کے ساتھ ہی خون میں شکر بھی بڑھ گئی ہے۔ پیشاب کی تکالیف میں بھی اضافہ ہے۔ ادھر گردے کی جگہ پر بھی درد ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ پراسٹریٹ کا آپریشن کرا لوں، لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ اس آپریشن کی نوبت آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اٹھا لے تو اس کا کرم ہوگا۔

(شکستہ دل۔ نسیم انہونوی)

شہرِ خموشاں

(ب۔ ن۔ آنسہ ابراہیم)

ان ویران قبروں کی اداسی میں! ــ خدا جانے وہ کون سا راز پنہاں ہے ــ جیسے ان خفتگانِ خاک کی قبروں پہ ــ سرسراتی ہوئی سرد ہوائیں سرگوشیوں میں سنا رہی ہیں

ان خاک کے تودوں پر عجیب حسرت برس رہی تھی۔ اس ویرانے میں غضب کا سناٹا چھایا ہوا تھا جسے کبھی کبھی الو کی دہشتناک چیخ توڑ دیتی تھی۔

اندھیری رات، ہُو کا عالم، جہاں آدمی نہ آدم زاد نہ چراغ نہ روشنی

کل تک جو اس سرزمین پر ہشاش بشاش چل پھر رہے تھے آج اسی زمین کے اندر تاریک لحد میں بے بسی و بیکسی کے عالم میں محو خواب ہیں ــ خدا جانے ان کی نیندیں کس غضب کی ہیں کہ زلزلہ طوفان، باد باراں، بادل کی گرج بجلی کی کڑک کوئی عنصر بھی ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

اس عبرتناک اور ہیبتناک سناٹے کے عالم میں ــ میں ہم بجود سر جھکائے ــ اطراف و اکناف سے بےخبر انجام ہستی پر آنسو بہا رہی تھی۔ مجھ پر خوف و محویت کا عالم طاری تھا۔ میں سر تا پا کانپ رہی تھی ایسے میں تخیل نے مجھے عالم ہاہو پہنچا دیا۔ جہاں کی ہولناک خاموشی میں روحوں کی سرگوشیاں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔

کاش اس دن کے لئے ہم دنیا میں نہ آئے ہوتے ــ ہمیں اس عالم اسباب میں عاقبت کی خریداری کے لئے بھیجا گیا۔ ہائے غفلت کہ ہم اس بازار میں آکر کھو گئے۔ یہاں کی رونق و دل فریبی نے ہمیں اپنے فرائض بھلا دیے۔ ہمیں اس سودے میں سود و زیاں کا امتیاز نہ رہا باوجود عقل و شعور اور ہدایات اور پیغام کے ہم نے وہاں کے لئے کچھ نہ خریدا اس غفلت میں کہ ابھی سفر بعید ہے۔ دنیا کے عیش و طرب میں کھو گئے۔ پھر اچانک یہاں سے طلبی کا حکم آگیا۔ ۴

۴ ہواؤں کی تیزی کے ساتھ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ نے مجھے اس عالم خیال سے چونکا دیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ روحیں ٹھنڈی سانسیں بھر کر ہوئی اپنی ناعاقبت اندیشی پر سر دھنتے ہوئے کف افسوس مل رہی تھیں۔

حضرت عیسیٰ

ابن مریم علیہما السلام

سلسلہ انبیاء کرام میں حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ بے حد نمایاں اور عظمت و تقدیس کے حامل ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے آپ آخری نبی ہیں اور آپ کے وصال کے ۵۰۰ سال بعد آخری نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیائے آب و گل میں تشریف لائے اور آپ کی ذات اقدس پر نبوت و دین کی تکمیل ہوگئی۔ ۵۰۰ سال کے اس طویل عرصے میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا حضرت عیسیٰ کے بعد نبوت سے سرفراز ہونے والے حضرت محمد ہی تھے اس طرح ان دونوں پیغمبروں کے درمیان گہرا رابطہ پیدا ہوگیا۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کا ذکر بے شمار مرتبہ اور مختلف سورتوں میں آیا ہے لیکن ایک پوری سورہ مریم کے نام سے اور ایک آل عمران کے نام سے موسوم ہوئی جس میں ان کی پیدائش کے حیرت انگیز واقعے اور کارناموں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک بزرگ عمران جن باسم بڑے پاک باز اور عابد و زاہد مشہور تھے ان کی حیثیت مذہبی پیشوا کی تھی ان کی اہلیہ کا نام حنہ تھا وہ بڑی عبادت گزار تھیں دونوں میاں بیوی عمر کی آخری منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اتنا کے جذبے سے سرشار حنہ اولاد کی تمنا میں تڑپتی تھیں۔ روایت ہے کہ ایک روز انھوں نے مکان کے صحن میں ایک پرندے کو دیکھا وہ اپنے بچے کو پرواز سکھا رہا تھا حنہ کو یہ منظر دیکھ کر بڑا رشک آیا اس وقت اللہ تعالیٰ کے حضور خضوع و خشوع سے اولاد عطا کرنے کی دعا دل سے نکلی جو بارگاہ الہیٰ میں قبول کر لی گئی۔ حنہ حاملہ ہوئیں تو انھیں بڑی مسرت ہوئی اور اظہار تشکر کے طور پر انھوں نے عہد کیا کہ جو بچہ پیدا ہوگا اسے ہیکل یعنی عبادت گاہ کے لئے وقف کر دیں گی۔ بچے کی پیدائش سے قبل ہی ان کے شوہر عمران کا انتقال ہوگیا۔

مدت حمل گزرنے کے بعد ولادت ہوئی تو لڑکی پیدا ہوئی ماں کو بے پایاں مسرت تو ہوئی مگر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ عبادت گاہ کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی جو منت مانی تھی بیٹی کی صورت میں کیسے پوری ہوگی لیکن انھیں غیب سے بشارت ہوئی کہ غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی جگہ تمہاری بیٹی ہی کو قبول فرمایا ہے اس کے ذریعے تمہارے خاندان کا نام روشن ہوگا۔ بیٹی کا نام مریم رکھا گیا جس کے معنی خدمت گزار کے ہیں۔

حضرت ذکریا حضرت مریم کی خالہ الیشع کے شوہر ہیکل کے خادم اور نبی تھے اس لئے وہی مریم کے نگہبان و مربی مقرر ہوئے اور وہ اپنی خالہ کے زیر کفالت اور زیر تربیت آگئیں۔ سن شعور کو پہنچتے ہی وہ ہیکل کی خدمت پر مامور کر دی گئیں۔ حضرت ذکریا نے نوجوان لڑکی کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے عبادت گاہ ہی میں ایک حجرہ ان کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ دن بھر وہاں عبادت و ریاضت میں مصروف رہتیں اور رات کو خالہ کے پاس آجاتیں۔

مریم کے خالو حضرت ذکریا جب کبھی ان کی دیکھ بھال کی غرض سے ان کے حجرے میں جاتے تو اکثر وہاں بے موسم کے پھل رکھے ہوئے دیکھتے کئی بار جب ایسا ہوا تو انھیں قدرتی طور پر تجسس ہوا کہ یہ پھل کہاں سے آجاتے ہیں ——؟ ایک دن انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ بیٹی یہ پھل کہاں سے آتے ہیں ——؟

جواب میں مریم نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ جس کو چاہتا ہے رزق پہنچاتا ہے —— حضرت ذکریا چونکہ خود بھی نبی تھے اس لئے اس جواب سے مریم کے مقام و مرتبے کا اندازہ لگا لیا۔

حضرت مریم حسب دستور عبادت و ریاضت میں مصروف رہتیں ایک دن وہ ہیکل کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک ایک فرشتہ (جبرئیل) انسانی شکل میں نمودار ہوا۔ مریم (ایک اجنبی مرد کو) سامنے یوں دیکھ کر گھبرا گئیں اور التجا کرنے لگیں کہ اگر تجھے خدا تعالیٰ کا خوف ہے تو اللہ کے واسطے سے پناہ مانگتی ہوں۔

فرشتے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں

میں کوئی انسان نہیں بلکہ اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہوں "

حضرت مریم نے یہ سنا تو ظاہر ہے کہ اور بھی گھبرائیں اور کہنے لگیں کہ مجھے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں میں نے نہ تو نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں "

فرشتے نے جواب میں کہا میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں تجھ تک پہنچا رہا ہوں۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ میں تجھ کو اور تیرے بیٹے کو کائنات کے لئے اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کی ایک نشانی بناؤں گا۔ لڑکا میری جانب سے رحمت ثابت ہوگا۔ میرا یہ فیصلہ اٹل ہے ۔ اے مریم اللہ تجھ کو ایک بیٹے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا حکم ہوگا اس کا لقب "مسیح" اور نام عیسیٰ ہوگا اور اس کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

اللہ کے فرشتے جبرئیل۔ مریم کو یہ بشارت سنا کر چلے گئے کچھ دنوں کے بعد مریم نے خود کو حاملہ محسوس کیا جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب وضع حمل کا وقت قریب آیا تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں تو اللہ کی مصلحت کا کیا علم۔ کنواری ماں کے بچے کی پیدائش پر لوگ لعن طعن کریں گے اتہام باندھیں گے یہ سوچ کر وہ عبادت گاہ سے نکل کر کچھ دور ایک ٹیلے پر چلی گئیں یہی جگہ بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ دردِ زہ کے وقت کھجور کے درخت کے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں کہ کاش میں پہلے ہی مر چکی ہوتی اور میری بستی کے لوگ قطعاً فراموش کر چکے ہوتے تاکہ اس رسوائی اور اذیت سے محفوظ رہتی۔

تب ہی نخلستان سے اللہ کے فرشتے نے آواز دی " اے مریم غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے لئے نہر جاری کی ہے۔ کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلا کہ اور تازہ کھجوریں گریں گی تو آرام سے کھا لینا اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم بھول جا۔

اس کے بعد بچہ تولد ہوا تو اسے دیکھ کر حضرت مریم کو بڑی طمانیت حاصل ہوئی اور ذہنی پریشانیاں دور ہو گئیں تاہم یہ کھٹکا بدستور رہا کہ لوگ کیسے مطمئن ہوں گے کہ یہ بچہ باپ کے بغیر کیسے پیدا ہوا۔ لوگ میری پاکدامنی کا کیسے یقین کریں گے۔

اس موقع پر پھر فرشتہ آیا اور یہ پیغام دیا کہ لوگ تجھ سے اس کے بارے میں سوالات کریں تو کہہ دینا کہ میں روزے سے ہوں بات نہیں کر سکتی جو کچھ پوچھنا ہو اس بچے ہی سے پوچھ لو تیرا پروردگار اپنی قدرت کو ظاہر کر کے ان کی حیرت کو دور اور ان کے دلوں کو مطمئن کر دے گا۔

حضرت مریم بچے کو گود میں لے کر ہیکل کی طرف واپس روانہ ہو گئیں جب وہاں پہنچیں تو لوگوں نے ایک نوزائیدہ بچے کو ان کی گود میں دیکھ کر انہیں گھیر لیا اور کہنے لگے۔ مریم یہ تو نے کیا کیا، اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی۔

مریم نے حسب ہدایت الٰہی بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ لوگوں نے حیرت سے کہا ہم شیرخوار بچے سے کیا پوچھیں۔ مگر فوراً ہی بچہ بول اٹھا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے اپنے فیصلہ تقدیر میں مجھے ایک کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے اس نے مجھے مبارک بنایا ہے جس نے مجھ کو میری ماں کا خدمتگزار بنایا ہے ۔ اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے ۔ اور جس دن میں مروں گا اور جس دن کہ میں زندہ اٹھایا جاؤں گا۔ سورہ مریم میں یہ گفتگو تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

لوگوں نے جب ایک دن کے بچے کی زبان سے ایسی باتیں سنیں تو بے حد حیران ہوئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ مریم پاک دامن ہے اور جو کچھ ہوا وہ قدرت کا نتیجہ اور اللہ کی ایک نشانی ہے۔

حضرت عیسیٰ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت یہودیوں کے بادشاہ ہیرودس کی حکومت تھی۔ یہ دور برائیوں اور بدعنوانیوں کے عروج کا تھا۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا گیا تھا حد یہ ہے کہ بادشاہ ہیرودس نے پیغمبر حضرت یحییٰ کو اپنی محبوبہ کی خواہش پر بے دردی سے قتل کر دیا تھا کیونکہ وہ حق بات چھپانے کو تیار نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ نے سن رشد پر پہنچنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں اور اللہ نے ان کو رشد و ہدایت کے لئے مامور کیا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کے رسول اور صاحب کتاب ہونے کا اعلان اس طرح کیا گیا ہے۔

(ترجمہ) پھر ان کے بعد رسولوں اور ابراہیم کے بعد ہونے

رسول بھیجے پھر ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کو کتاب انجیل عطا کی۔ (حدید)

"اور وہ یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا۔ اے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ تصدیق کرنے والا ہوں۔ توریت کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے (سورۂ صف)

جب قوم سرکشی پر آمادہ ہو اور حق بات سننے کو تیار نہ ہو تو پھر انبیاء کو معجزات عطا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کو بھی معجزات عطا کئے گئے قرآن حمید میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:۔ اے عیسیٰ ابن مریم تو میری اس نعمت کو یاد کر جب تو میرے حکم سے گارے سے پرندے کی شکل بنا دیتا، ور پھر اس میں روح پھونک دیتا اور میرے حکم سے وہ پرندہ زندہ بن جاتا اور جب تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو بینا کر دیتا اور سفید داغ کے مرض کو اچھا کر دیتا اور جب تو میرے حکم سے مردے کو زندہ کر دیتا۔ (مائدہ)

حضرت عیسیٰ نے نہ تو شادی کی نہ رہائش کے لیے کوئی گھر بنایا وہ شہر شہر گاؤں گاؤں دین الہیٰ کی تبلیغ میں مصروف رہے وہ جہاں جاتے لوگوں کا مجمع ان کے گرد اکٹھا ہو جاتا اس طرح حق کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو اس وقت کے صاحبانِ اقتدار اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں اور دین کے اجارہ داروں نے ان کی ذات مقدس کو اپنے لئے خطرہ جانا چنانچہ مذہبی اجارہ داروں نے مل کر ایک سازش تیار کی کہ بادشاہ کو اس طرح مشتعل کیا جائے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو تختہ دار پر لٹکا دے۔ اس سازش کے مطابق یہ لوگ روم کے گورنر پلاطیس کے دربار میں پہنچے اور سب نے مل کر کہا کہ عیسیٰ ہمارے دین اور قدیم روایات و عقائد میں رخنہ ڈال کر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا رہا ہے دین کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اسے دار پر لٹکا دیا جائے۔

پلاطیس بھی اس موقع کا منتظر تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک دن انھیں سولی پر لٹکا دیا گیا ــــ دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونکیں۔ سینے کو برچھے سے زخمی کیا اس طرح حضرت عیسیٰ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ یہ یہود و نصاریٰ کی روایت ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کا بیان مختلف ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ یہودیوں نے عیسیٰ کے خلاف خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے اس کے خلاف خفیہ تدبیر کی اللہ خفیہ تدبیر کا سب سے بڑا مالک ہے۔ اصل میں اللہ نے حضرت عیسیٰ کو سازشی یہودیوں کے فتنے سے بچا لیا

قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:۔ اور یہود (ملعون قرار دیئے گئے) اپنے اس قول پر ہم نے مسیح ابن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا۔ حالانکہ انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا (بلکہ اللہ کی خفیہ تدبیروں کی بدولت) اصل معاملہ اس پر مشتبہ ہو گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں وہ بلاشبہ اس کی (عیسیٰ) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت حال کے بارے میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے۔ انھوں نے عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی (ملائے اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا۔

رازِ جو کھل نہ سکا

رضیہ بٹ

اس نے کبھی مات کھائی نہ ہار مانی تھی۔ حالات ہمیشہ اُس کی مرضی اور خواہش کے مطابق ڈھلے تھے اس کی ضد کے سامنے پہاڑ بھی جھک جاتے تھے وہ بڑا خود پسند آدمی تھا۔ تین گاؤں کی زمینداری سے مزاج میں مطلق العنان بادشاہوں کی سی خو پیدا ہو گئی تھی — بہت سی عادتیں اس نے وراثت میں بھی پائی تھیں۔

اس کے دادا کے متعلق مشہور تھا کہ جو شخص بھی اس کی ہاں میں ہاں نہ ملانے کی جرأت کرتا — صبح کا سورج اسے دیکھنا نصیب نہ ہوتا اس طرح کی باتیں اس کے باپ چوہدری اکرم کے متعلق بھی سننے میں آئی تھیں۔ بڑے بوڑھے ابھی زندہ تھے...... جو ظلم و ستم کی کہانیاں سینوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ چوہدری کی ہیبت اور دبدبہ ایسا تھا کہ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

باپ دادا کی خامیاں اور خوبیاں چوہدری کرامت اللہ خاں میں بھی منتقل ہوئی تھیں۔ تین گاؤں کا مالک تھا۔ تین گاؤں کی زمینوں ہی کا نہیں ان کے مکینوں کا بھی جیسے مالک تھا۔ بڑا رعب تھا۔ بڑا دبدبہ تھا۔ زبان سے جو بات نکل جاتی غلط ہوتی یا صحیح پتھر پر لکیر ہوتی کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ اس کی تصحیح یا توضیح کرے۔ وہ خود تو ایک طرف اس کے کارندے اور حواری بھی اس کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ من مانی کرتے پھرتے تھے ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز بنا دینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی دراصل یہی لوگ چوہدری کے پر و بازو تھے اور انہی کے سہارے وہ اڑانیں لیتا پھرتا تھا لیکن انسانی بساط کی ترکیب ہی کچھ ایسی ہے کبھی کبھی زوال ہو جاتی ہے ایسے ایسے مہرے بھی پٹ جاتے ہیں جن کے متعلق کبھی گمان بھی نہیں کیا جاتا — جو جیتنے کو نشان ہوتے ہیں۔ بھلا کی [illegible] جانے والے ہوتے ہیں۔

چوہدری کرامت جس نے کبھی ہار نہ مانی تھی۔ [illegible]

[illegible]

گیارہ سال ساتھی زندگی کے بعد [illegible] ہوئی تھی۔ [illegible] اولاد تھی۔ گیارہ سال شادی کو ہو گئے تھے لیکن اولاد کی نعمت میسر نہ آئی تھی حالانکہ ہم پلہ چوہدریوں کی بیٹی خدیجہ سے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی — خدیجہ کو ماں کی طرف سے ملے ہوئے سات مربع آراضی کے علاوہ اتنا دھن دولت ملا تھا کہ خاندان بھی مرعوب ہو گیا تھا۔

چند سال بڑی خوشگوار رفاقت رہی تھی۔ لیکن وسیع و عریض حویلی سونی سونی تھی۔ یہاں جن پھولوں کی مہک کی ضرورت تھی وہ نہیں کھلے تھے — دلوں میں طلب تھی لیکن زبانوں پر لاتے ہوئے دونوں جھجکتے تھے۔

لیکن جب خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے خدیجہ کی سونی گود کے چرچے شروع کر دیئے تو چوہدری کے ہونٹوں پر بھی معصوم بچوں کی خواہش ابھرنے لگی۔

چوہدری اپنی خواہش کا اظہار خدیجہ سے کرتا تو وہ شرما کر کہتی

"اللہ کو منظور ہوگا تو ہو جائے گا —"

"لیکن کب ہوگا —؟"

"وہی بہتر جانتا ہے۔"

"ہمیں بچوں کی ضرورت ہے —"

"مجھے احساس ہے۔ لیکن میں کیا کروں —"

"کیا کروں" کا جواب خاندان کی عورتوں کے پاس تھا۔ خدیجہ کو پہلے گاؤں کی غیر تربیت یافتہ دائیوں کے سپرد کیا گیا۔ پھر ٹونے ٹوٹکے ہوئے۔ نیم حکیم قسم کے لوگوں کی دوائیاں کھلائی گئیں۔ لیکن کچھ مقصد حاصل نہیں ہوا۔

مگر [illegible] بہنوں کو بھی فکر تھی — [illegible] طریقے سے بھی اس کا علاج معالجہ کرایا گیا۔ پھر [illegible] کی طرف رجوع کیا گیا۔

لیکن —

خدیجہ کی گود ویران ہی رہی۔

[illegible]

حق تھا۔ گاؤں والے تو دوسری شادی کرنے لیکن خدیجہ بھی بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ کرنل جہانگیر خان کی بہن تھی۔ اس پر سوت لانا آسان نہ تھا۔ [illegible] خاندان بھی چودھری کرامت کے خاندان سے کم نہیں تھا۔ حالات بگڑ رہے تھے۔

"مجھے بچے چاہئیں —" چودھری خدیجہ کو حکم کے لہجے میں کہنے لگا۔

خدیجہ اس معاملے میں بے بس تو تھی لیکن گری پڑی نہ تھی جو ادا وہ بھی کر جاتی۔ "مجھے بھی بچے چاہئیں۔" نوک جھونک اکثر ہی ہونے لگی۔

انہیں دنوں چودھری کے ایک شہری دوست اعظم نے اسے مشورہ دیا۔ "چودھری کیا گاؤں کے نیم حکیموں اور عاملوں سے الٹے سیدھے علاج کرا رہے ہو بھابی کے — شہر لے چلو۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ — کیا عجب اللہ تعالیٰ رحم کر ہی دے —"

چودھری نے خدیجہ کو شہر لے جا کر ڈاکٹر سے علاج کرانے کی حامی بھرلی۔ چند دنوں بعد وہ خدیجہ کو لے کر اس دوست کے ہاں گیا۔ یہ پڑھے لکھے لوگ گاؤں کے لوگوں کی جہالت سے بھی آگاہ تھے۔ اس دوست کی بیوی سنبل نے خدیجہ کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا اس کا حوصلہ بڑھایا — "خدا نے چاہا تو تمہارا دامن مراد ضرور بھرے گا۔ مشہور گائناکالوجسٹ مسز سعدیہ رحیم کے چرچے دور دور تک پھیلے تھے۔ بہت سی بانجھ عورتیں اس کے علاج سے اولاد کی نعمت سے بہرہ ور ہوئی تھیں۔ میری بھابی کے ہاں اسی کے علاج سے پچھلے سال چاند سا بیٹا پیدا ہوا — ہم لوگ تو بالکل مایوس ہو چکے تھے —"

اس نے خدیجہ سے کہا — "ڈاکٹر میری دوست بھی ہے تمہارا علاج پوری توجہ سے کرے گی —"

"واقعی —" خدیجہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں —" وہ بولی — "میں تمہیں بھابی سے بھی ملواؤں گی۔ دینے والا تو خدا ہے لیکن وسیلہ بھی تو کوئی بن جاتا ہے — بڑی سیانی ڈاکٹر ہے — تجربہ کار بھی ہے — اور اللہ نے اس کے ہاتھ میں شفا بھی دی ہے — تمہیں بھی خدا اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا —"

خدیجہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر سر اس کے کندھے پر رکھ دیا — "خدا تمہارا منہ مبارک کرے بہن سنبل۔"

"آمین —"

خدیجہ کی آس بندھ گئی — دل ہی دل میں اس نے بھی آمین کہی۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر کے علاج سے وہ ضرور اپنی ویران گود میں بہار آتے دیکھے گی۔

دوسرے دن وہ اس کے ساتھ — "گائناکالوجسٹ" کے پاس گئی۔

"آؤ سنبل —" ڈاکٹر نے خیر مقدمی لہجے میں کہا اور پھر سنبل کے ساتھ آنے والی خدیجہ کو دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ —" سنبل نے سرسری طور پر تعارف کرانے کے بعد کہا — "بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہیں —"

ڈاکٹر شفقت سے مسکرائی پھر نرس سے کہا — "انہیں ٹیبل پر لٹاؤ —"

معائنے کے بعد ڈاکٹر پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھی — اور کچھ ضروری سوال خدیجہ سے کیے جن کا جواب تسلی بخش تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد ڈاکٹر سنبل سے بولی — "یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں —"

"تو پھر بچے کیوں —" سنبل بیتابی سے بولی۔

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "نقص میاں میں بھی ہو سکتا ہے — میری تجویز یہ ہے کہ ان کے میاں کے بھی ٹسٹ ہوں اس کے بعد علاج کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

سنبل نے ڈاکٹر کی بات سمجھ کر خدیجہ سے کہا — "چودھری صاحب ابھی یہاں ہی ہیں —"

"ہوں —" وہ ڈاکٹر کی زبانی اپنے بارے میں سن کر بڑے اطمینان سے بولی — "لیکن ایک نئی فکر نے ذہن میں بے چینی پیدا کر دی —"

"بس ٹھیک ہے — اب آپ لوگوں کو ہم پوری تسلی کے بعد ہی گاؤں واپس جانے دیں گے —" سنبل نے کہا ڈاکٹر کی فیس کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے سنبل اٹھی خدیجہ بھی گم صم سی کھڑی ہوئی — اس کے ذہن میں خاصی ہلچل مچی تھی۔

سنبل نے ساری کیفیت اپنے شوہر کے گوش گزار کی — اعظم نے چودھری کو بتایا۔

چودھری کے مزاج گرامی پر اتنی بات گراں گزری لیکن اس کے بعد شکیل نے بمشکل غصہ دباتے ہوئے بولا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے۔"

اعظم اس کی ذہنی کیفیت اور انا پسندی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "بھئی اس میں ہرج کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے وہی تمہیں بتایا ہے۔ ٹسٹ کے بعد ہی پتہ۔"

"بکواس کرتی ہے ڈاکٹرنی۔" وہ غرایا۔ "میرے متعلق اسے ایسی بات کہنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ وہ کل میری اور تمہاری بیوی کے سامنے میں اس سے نپٹ لوں گا۔"

اعظم سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ گاؤں کے اس جاہل رئیس سے نپٹنا عقلمندی سے ہی ہو سکتا تھا ورنہ وہ تو بات بے بات خون خرابے پر اتر آنے سے بھی گریز کرنے والا نہیں تھا۔

اس وقت تو اس نے بات ٹال دی لیکن چودھری کے واپس لوٹنے سے پہلے ڈاکٹر کی تجویز پر عمل کروا ہی لیا۔

"اب۔ تم اطمینان سے واپس چلے جاؤ میں رپورٹ کارڈ لے آؤں گا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد تمہیں مطلع کر دوں گا۔ خدا کرے تم دونوں صحت مند ہو۔ اور اولاد کی نعمت تمہاری جھولی میں آپڑے۔"

چودھری نے اعظم کی بات تو مان لی تھی لیکن ایک انجانے رعب آمیز انتشار نے اس کے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس کی خود پسندی انا پرستی اور بات نہ کھانے اور ہار نہ ماننے والی طبیعت بھلا کوئی تازیانہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

اعظم کے بجائے وہ خود رپورٹ لینے گیا۔

اور اسسٹنٹ نے جو کچھ بتایا وہ چودھری کے حواس پر لمحہ بھر کے لئے بجلی گرا گیا۔

"ناممکن۔" وہ رپورٹ غصے سے ڈاکٹر کی میز پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں نقص میری بیوی۔"

ڈاکٹر اس کی جھلاہٹ پر مسکرا دی کیونکہ اس کے خیال میں جاہلوں کا رد عمل ایسا ہوتا ہی تھا۔

"چودھری صاحب۔" اس نے ملائمت سے کہا۔ "خدا کی رضا کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور"

باقی رہے بچے۔ تو آپ اس کمی کو یوں پورا کر سکتے ہیں کہ کسی کو گود لے لیں

وہ رعونت سے میز پر مکا مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بات وہ تسلیم کر ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بچے نہیں ہو سکتے۔ وہ تو سارا دعب، سارے عار خدیجہ پر ہی کر رہا تھا۔

"چودھری صاحب" ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

"سنو ڈاکٹر۔" وہ اس کی بات سے بغیر قہر برساتی آنکھوں سے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "اس رپورٹ کا نتیجہ جو بھی ہے وہ تم راز رکھو گے۔ سمجھے۔"

اس نے تحکمانہ انداز میں اس طرح کہا کہ ڈاکٹر کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی محسوس ہوئی۔

وہ ایک لمحہ کو گھبرایا لیکن پھر کندھے اچکاتے اس کی بلا سے کیا ضرورت ہے کسی کو بتانے کی۔

چودھری پیچ و تاب کھاتا واپس آ گیا۔

خدیجہ نے آتے ہی بیتابی سے پوچھا۔ "کیا کہا ڈاکٹر نے۔"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" وہ دبے دبے سے بولا۔ "تم اس قابل نہیں ہو کہ ماں بن سکو۔"

"لیکن۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا۔ کہ میں بالکل ٹھیک۔"

وہ بدحواس سی ہو گئی۔

"بکواس کیا تھا۔" وہ غرایا۔

"نہیں۔ اس نے سچ کہا تھا۔" نفی میں سر ہلاتے وہ بے اختیارانہ کہہ اٹھی۔

"تو کیا میں جھوٹ بک رہا ہوں۔" چودھری غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔

"ہاں۔" خدیجہ نے پورے یقین سے کہا۔ یہ کہنا تھا کہ چودھری غصے سے جیسے پاگل ہو گیا اور اس ہاں کے جواب میں اس کا زوردار تھپڑ خدیجہ کے منہ پر پڑا۔ خدیجہ دوہری ہو کر پلنگ کی پٹی پر جھک گئی۔

وہ غصے سے بپھرا اور ٹہلنے لگا۔

خدیجہ عام گھر کی عام سی عورت نہیں تھی۔ سات مربعوں کی مالک اور چار گاؤں کی زمیندار کی بیٹی تھی۔ یہ ذلت کیسے برداشت کر لیتی۔

غصے سے وہ بھی تلملا رہی تھی۔ گال پر ہاتھ رکھے سسکتے ہوئے

ایک سہیلی نے یہ بات زیباں کو بھی بتائی۔ لیکن اس نے
شرمیلی سی [illegible]۔ الہڑ سی لڑکی صرف چودھری کی دلہن بننے
ہی کے حسین خوابوں تک محدود تھی۔ ایسی سنگین باتیں سوچنے کی
اس کی عمر تھی نہ ذہنی صلاحیت۔ نکاح ہو گیا بہت بڑا حق مہر
کرم دین کی تسلی کے لئے لکھا گیا۔ زیباں سونے چاندی سے لدی
لال دوپٹہ جوڑا پہن کر حویلی میں آگئی۔ رات چودھری کی سجائی
خواب گاہ میں وہ ریشمی بستر پر گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی تو اس کے دل
میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں آنکھوں میں ان گنت دیکھے ان
دیکھے سنہرے سپنے لہرا رہے تھے اتنی بڑی زمینداری کی مالکن ہونے
کا احساس جانفزا تھا۔ اس کے تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں
آیا تھا کہ تقدیریں پلٹا کھائے گی لیکن بیچاری لڑکی اپنے خوابوں
ہی میں گم تھی۔ کیا جانتی تھی کہ یہ خواب بکھر جائیں گے اور ان کی
کرچیاں اسے لہولہان کر دیں گی۔

چودھری کمرے میں داخل ہوا تو قدموں کی چاپ پر اس کا دل
دھک دھک کر اٹھا اس نے سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔ رواں رواں
سرشار ہو گیا لیکن شرم و حیا سے وہ اور سمٹ گئی۔

چودھری نے کچھ کہے سنے بغیر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔
زیباں کی آنکھیں بند ہو گئیں لب پھڑپھڑائے اور شرم
سے فوراً ہی سر جھکا لیا۔

"سنو۔" چودھری کی سپاٹ سی آواز آئی۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

"زیباں۔" چودھری نے پکارا۔ وہ اب بھی چپ رہی۔

چند لمحے چودھری بھی چپ بیٹھا رہا۔

پھر اس نے زیباں کے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھایا۔ اور
بولا "میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" زیباں
نے شرمگیں انداز میں ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

چودھری جذباتی نہیں تھا۔ بڑے سنگین لہجے میں بولا۔
"سیدھی ہو کر بیٹھو اور میری بات سنو" وہ چپ رہی۔

"سن رہی ہو؟" چودھری نے زور سے کہا تو زیباں
کا دل دہل گیا۔ اس نے حیران ہو کر چودھری کو دیکھا۔
چودھری کے چہرے پر ملائمت تھی نہ محبت۔ درشتی تھی
بھوری چٹانوں جیسی سختی تھی۔ چھپا ہوا اضطراب تھا اور کسی
فیصلے کی تباہ کن سنگینی تھی۔

وہ پلک نہ جھپکا سکی۔ سارے خواب بکھر گئے اندر
ہی اندر اس کا حسن زخمی ہو گیا۔

"سنو۔" وہ پھر اسی لہجے میں بولا۔

"جی۔" وہ بمشکل کہہ پائی۔

"میں نے تم سے شادی کی ہے۔" وہ بولا۔

زیباں حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔ اس کی حیرانگی
کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "شادی بچے کے لئے
کی ہے۔ مجھے بچہ چاہیے سمجھیں۔"

وہ ٹکر ٹکر اسے تکنے لگی۔ انجان سی لڑکی کچھ بھی تو نہ سمجھ
پائی۔ چودھری نے اگر ملائمت سے یہ بات کی ہوتی تو شاید شرم سے
پانی پانی ہو جاتی لیکن اتنا سخت اور ایسا سنگین لہجہ تھا۔ چودھری اپنی
پہلی شادی اور اولاد سے محرومی کی باتیں اسے سنانے کے بعد بولا۔

"میں جو کہوں گا اس پر تمہیں عمل کرنا ہوگا۔ سمجھیں یہ میرا حکم
ہے۔ حکم جسے آج تک کسی کو ٹالنے کی جرأت نہیں ہوئی۔"

اس نے یونہی سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ "میں نے ہار کبھی نہیں
مانی۔ دنیا جانتی ہے۔ خدا سے بھی نہیں مانی۔ تم سے بھی نہیں مانوں گا
جو میں چاہوں گا تمہیں وہی کرنا ہوگا۔ تکرار کی گنجائش ہے نہ انکار کی
مجھے ہر صورت بچہ چاہیئے۔" چودھری نے اپنا پلان اسے بتا دیا۔ اس
پلان کی دو کڑیاں وہ اور زیباں تھے۔ تیسری کڑی مراجو تھا۔ زیباں
دنگ ہو گئی۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ بدن برف
کی طرح ٹھنڈا ہو گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی۔ وہ تو
لگتا تھا جیسے جی مر گئی ہے۔

چودھری کرخت لہجے میں بولا۔ "مجھے ہر صورت بچہ
اور اس کے گھر والوں کا منہ بند کرنا ہے۔ انہیں بات [illegible]
دکھانا ہے۔ سمجھیں۔"

چودھری کا لہجہ آتشیں ہو گیا تھا۔ وہ جوالا مکھی کا دہانہ بنا
ہوا ہے۔ زیباں کی کیا مجال تھی جو بات بھی کرتی۔ وہ تو اس کی بات
سن کر پتھرا ہی گئی تھی شاید۔

"وہ بات تم تک رہے گی [illegible]

اس کی بھنک بھی جو پتے آدمی کے کان میں پڑی ۔ تو ۔۔
"جو کچھ کہنا چاہتا تھا بتا کے ہی بھاگا ۔۔ کسی کو تہس نہس کر دینا ۔۔ مروا ڈالنا ۔ غائب کروا دینا اس کے لئے بڑی بات نہ تھی ۔ راجو نے بھی اس نے یہی رویہ اپنایا تھا ۔

زیباں کا کلیجہ تھر تھر کانپ رہا تھا ۔۔ رنگ فق تھا اور آنکھیں چودھری کے خوشنت اور رعونت بھرے چہرے پر ٹکی تھیں ۔

"تم ہمیشہ چپ رہو گی ۔ کبھی زبان کھولی تو یاد رکھنا تم تمہارے خاندان کا ایک فرد بھی نہیں بچے گا ۔۔"

اس نے دھمکی دی ۔ زیباں تو پہلان سنتے ہی مر گئی تھی دھمکی کا کیا تھا دینا یا نہ دینا برابر تھی ۔۔ چودھری کے شکنجے میں آ گئی تھی ۔ اس سے رہائی کی صورت ہی کون سی تھی ۔۔

زیباں تھرائی ہوئی تھی ۔

"سن لیا ہے نا" چودھری نے درشت لہجے میں کہا ۔

وہ کچھ نہیں بولی ۔

"نہیں سمجھی ہو ۔" وہ غرایا ۔ زیباں سہم گئی ۔

"سمجھاؤں ۔" اس نے میز پر پڑی پستول ہاتھ میں لے کر اچھالی ۔

زیباں نے گھبرا کر سر ہلایا ۔

"سمجھ گئی ہو ۔" چودھری سنگینی سے مسکرایا ۔

وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولی ۔ "ہاں ۔ ہاں ۔"

پھر چودھری نے جو چاہا ویسے ہی ہوا ۔ زیباں تو کسی معمول کی طرح عامل کے اشارے پر عمل کر رہی تھی ۔

چودھری نے یا جو کچھ دروازے سے اس کی زندگی میں دھکیل دیا تھا ۔

صبح زیباں کی لاش حویلی کے پچھواڑے پڑی ملی کہا گیا کہ اس نے خودکشی کر لی تھی ۔ پوسٹ مارٹم وغیرہ کے بغیر ہی پولیس نے پنچایت نا [illegible] دفن کرا دیا ۔

زیباں کے ماں باپ کا تو سینہ اور [illegible] سے بند ہو گیا تھا ۔ کس کی مجال تھی کہ [illegible] کر سکتے ۔

راجو کا [illegible] پتہ نہیں [illegible] کہاں گیا ۔ چودھری صاحب [illegible]

[illegible] ۔۔

حریمی دسترخوان

قیمہ بھرے آملیٹ

آملیٹ ناشتے میں عام طور پر سب ہی گھروں میں بنائے اور نوش جان کئے جاتے ہیں لیکن میں ایک آملیٹ بنانے کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو کھانے میں رکھا جا سکتا ہے یہ غذائیت سے بھرپور اور بے حد لذیذ ہوتا ہے ۔

سامان :۔ ۴ انڈے ۔ باریک قیمہ ۱۲۵ گرام ۔ میدہ چائے کے دو چمچے ۔ گوشت کی یخنی ۲ ٹیبل اسپون ۔ ٹماٹر کا جوس ۔ کھانے کے دو چمچے پسا ہوا نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ حسب خواہش ۔ تازہ مٹر ہوں تو تازہ ورنہ خشک کئے ہوئے مٹر جو پیکٹوں میں ملتے ہیں ۵۰ گرام ۔ دودھ ۵۰ گرام یا چائے کے بڑے ۲ چمچے ۔ مکھن یا گھی ۔ حسب ضرورت ۔ پیاز ایک عدد

ترکیب :۔ قیمہ کو دھو کر پانی نچوڑ لیں ۔ پھر کسی پتیلی میں پیاز کے لچھے تراش کر گلابی کریں ۔ پھر قیمہ ڈال کر ہلکی آنچ پر دس منٹ تک بھونیں اس کے بعد میدہ نمک اور کالی مرچ ، یخنی ، ٹماٹر کا جوس اور مٹر ڈال کر بیس پچیس منٹ تک پکائیں (مٹر تازہ نہ ہوں تو انہیں پہلے ایک گھنٹے تک پانی میں بھگو لیں)

(یخنی بنانے کی ترکیب سب ہی بہنیں جانتی ہیں ۔ پائے یا گوشت کی چند بوٹیوں کی یخنی بنا لیں) مٹر اور قیمہ گل جانے کے بعد اتار لیں بجائے پانی کے یخنی ڈالی جاتی ہے اسی میں قیمہ اور مٹر گل جاتے ہیں ۔

اگر آپ چٹپٹا زیادہ پسند کرتی ہیں تو تھوڑی سی سرخ مرچ یا ہری مرچ تراش کر حسب خواہش ملا سکتی ہیں ۔

خیال رہے کہ قیمہ اور مٹر کا آمیزہ تقریباً خشک ہو جائے یعنی اس میں سالن نہ رہے ۔

آخر میں انڈوں کو پھینٹ کر تھوڑا نمک کالی مرچ اور دودھ شامل کر کے پھر پھینٹیں ۔ اس کے بعد کسی فرائی پین میں تھوڑا گھی یا مکھن ڈال کر انڈے کے آمیزے کا ایک چوتھائی حصہ ڈال کر فرائی پین [illegible] انڈے کا آمیزہ ہر طرف پھیل جائے [illegible] ہو گیا ہے [illegible] سے سنبھال کر [illegible] دیں ۔ دوسری طرف [illegible]

اس کے بعد بھی وہ تگ و دو کرتے رہے۔ خواتین آتی جاتی رہیں لیکن کم رو ناصیہ کو کسی نے قبول نہ کیا اس لئے کہ اب تو اس کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ بعد ازاں لڑکیوں کی شادیاں کر کے اس کے باپ کی مالی حالت بھی اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اگر کبھی کچھ عورتیں مشاطاؤں کے کہنے سننے سے آ بھی جاتیں تو ان کی خاطر خواہ مدارات بھی نہ ہو پاتی۔

والدین کا خواب و خور حرام تھا۔ ناصیہ ان کے سامنے آتی تو ان کے کلیجے پھٹنے لگتے۔ انھیں اپنے آنسوؤں کو روکنا بھی دشوار ہو جاتا۔ ناصیہ اپنے والدین کے غم سے ناواقف نہ تھی اس لئے وہ ان کے سامنے آتی تو اس طرح کہ جیسے اسے خود کسی طرح کا غم نہ ہو۔ اسے اب اپنی شادی سے کہیں زیادہ اس کی فکر رہتی تھی کہ اس کے ماں باپ اس غم کو فراموش کر دیں جو اس کی وجہ سے ان پر مسلط تھا۔

ناصیہ نماز کے بعد یہی دعا مانگتی کہ خدایا تو مجھے اٹھا لے یا میرے والدین کے دلوں سے میرا غم نکال دے۔ اور ماں باپ نماز اور وظائف کے بعد بھی یہی دعا مانگتے کہ ناصیہ کے ہاتھ کسی طرح پیلے ہو جائیں۔

پھر ایک روز اچانک ہی ایک مہمان نے دروازہ کھٹکھٹایا رحیم صاحب نے جا کر دروازہ کھولا۔ دیکھا تو ایک خوش رو اور خوش پوشاک جوان سامنے کھڑا تھا۔ ایسی حیثیت کے کسی بھی آدمی سے رحیم صاحب کی ملاقات نہ تھی وہ سمجھے کوئی غلطی سے ان کے دروازے پر آ گیا ہے یا پھر وہ کسی اور کا پتہ معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ سکے تھے کہ آنے والا "چچا جان آپ نے پہچانا نہیں مجھے" کہتا ہوا رحیم صاحب سے لپٹ گیا اور رحیم صاحب مبہوت سے ہو کر بولے "ہاں بیٹا۔ میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تمام اعضا کے ساتھ ہی حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا ہے"

آنے والے نے ہنس کر [illegible] کہا "چچا جان میں ہوں آپ کا غلام شاہان اقبال۔"

"ارے شاہان میاں تم ہو۔ [illegible]" کہتے ہوئے رحیم صاحب نے اس بار شاہان کو لپٹا لیا اور گھر کے اندر لے گئے

شاہان اقبال۔ رحیم صاحب کے ایک جگری دوست صفی حیدر مرحوم کے فرزند تھے۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھیں اس لئے اس یتیم و یسیر لڑکے کو رحیم صاحب نے اپنی سرپرستی میں رکھ کر تعلیم دلائی۔ کافی عرصہ بعد صفی حیدر مرحوم کے بھائی نے جو لندن کے ہو کر رہ گئے تھے شاہان کو اپنے پاس بلا لیا اور وہ وہیں تعلیم پاتے رہے۔ لندن کی آب و ہوا اور رہن سہن کے طور طریق نے شاہان کو ایسا بنا دیا تھا کہ رحیم صاحب اسے پہچان نہ سکے تھے

رحیم صاحب نے اپنی بیوی کو آواز دے کر کہا — "ارے بھئی دیکھو تو کمرے سے نکل کر۔ یہ کوئی اور نہیں اپنا شاہان اقبال ہے۔ برا ہو حافظہ کا میں تو پہچان ہی نہ پایا تھا۔"

ناصیہ کی ماں شاہان کا نام سنتے ہی کمرے کے باہر آ گئیں اور شاہان کی بلائیں لینے لگیں۔ پھر انھوں نے ناصیہ کو آواز دے کر کہا بیٹی شاہان کے لئے کچھ چائے ناشتہ تو لا لیکن ناصیہ باہر نہ نکلی مجبوراً ناصیہ کی ماں ہی یہ کہتی باورچی خانے میں چلی گئیں کہ شرما رہی ہوگی۔

جو کچھ میسر تھا ناصیہ کی ماں نے ٹرے میں رکھ کر شاہان کے سامنے رکھ دیا۔ شاہان سمجھ گیا کہ رحیم صاحب مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ پھر اس نے گھریلو حالات کا جائزہ لینا چاہا۔ رحیم صاحب نے اسے ساری روداد سناتے ہوئے اس ناسور کا بھی ذکر کر دیا جو ناصیہ کی صورت موجود تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ رو دیئے۔ انھوں نے کہا بیٹا! میں نے بہت کوشش کی کہ ناصیہ سب سے بڑی ہے پہلے اسی کی شادی کروں گا۔ لیکن اسے کسی نے پسند نہیں کیا۔ مجبوراً مجھے وہ کرنا پڑا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹی بیٹیوں کو کسی طرح بیاہ دیا وہ اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں لیکن اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے ان کا گلا رندھ گیا تھا۔

شاہان بیحد متاثر ہوا۔ اس نے رحیم صاحب کو تسلی دینے کے لئے کہا "اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو سکتی ہے چچا۔"

اور رحیم صاحب نے ایک لمبی سی سانس لی۔ جواب میں کچھ نہ کہا۔ یکایک شاہان نے سوچا کیوں نہ رحیم چچا کے سلوک کا بدلہ دیتے ہوئے ناصیہ سے خود شادی کر لے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کہا — "چچا جان میرے دوست ہیں جو شادی کرنا چاہتے ہیں آپ ناصیہ کو [illegible] میں دیکھ لوں گا کہ اس کے تعلق سے کچھ [illegible] کرنا [illegible] اس کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

ناصیہ بھی کیا چیز ہے۔ اس کے سہارے اکثر ڈوبتے ہوئے بھی کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ رحیم صاحب جانتے تھے کہ ناصیہ کو جب اس وقت کسی نے پسند نہ کیا۔ جب وہ پندرہ سولہ سال کی تھی تو بھلا اب کوئی اسے کیا پسند کرے گا جب کہ وہ تیس سال کی ہو گئی ہے۔ لیکن انھوں نے بیٹی کو آواز دے کر سامنے آجانے کے لئے کہا۔

ناصیہ ساری باتیں سنتی رہی تھی۔ اسے شاہان کی بات پہنچی لگی تھی وہ جانتی تھی کہ شاہان کے دوست بھی اعلیٰ معیار کے ہوں گے وہ اس غریب اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی کو کیوں پسند کریں گے لیکن باپ کے بار بار بلانے پر وہ اپنا دوپٹہ سر و سینے پر پھیلاتی نگاہیں نیچی کئے باہر نکلی۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور وہاں سے الگ ہٹ کر بیٹھ گئی۔

شاہان جو دل میں ایک حسین جمیل شریک حیات کا خواب بسائے ہوئے تھے۔ ناصیہ کو دیکھ کر ایک کرب میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ میں جنگ ہونے لگی۔ دل نے کہا یہ میرے خوابوں کے برعکس ہے اس خیال سے باز آجاؤ۔ تمہارے خواب لندن میں بکھرے پڑے ہیں وہیں سے کسی کو اپنا لیتا۔

دماغ نے فوراً جواب دیا۔ "تو پھر تم نے یہ باتیں کیوں کیں۔ کیا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اس بے بس معصوم اور شکستہ دل لڑکی کا دل چکنا چور کرنا چاہتے ہو۔ نہیں شاہان یہ تمہارے شایان شان نہیں۔ تم ایک تعلیم یافتہ انسان ہو۔ انسانیت کی بلندی سے گرنے کی کوشش نہ کرو۔" اور پھر یہ تو سوچو کہ رحیم صاحب کا تم پر احسان ہے وہ تمہارے برے وقت میں کام آئے تھے۔ تمہارے سر پر دست شفقت پھیرا تھا۔ اٹھو۔ بڑھو۔ اور ناممکن کو ممکن بنا دو یعنی دکھ بھری ہستیوں کے غموں کو مسرتوں سے بدل دو۔ یکایک شاہان نے ہاتھ رحیم صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "آپ ناصیہ سے دریافت کر لیجئے کہ انھیں میں پسند ہوں۔ اگر وہ پسند کریں تو میں آپ کا غلام بننے میں فخر محسوس کروں گا۔" اتنا کہہ کر شاہان نے اپنا سر جھکا لیا۔

رحیم صاحب نے شاہان کی پیش کش کو سنا تو انھیں خیال ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں کہاں شاہان اور کہاں ناصیہ۔ ناصیہ اٹھ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ اسے خیال ہوا کہ شاہان مذاق کر رہا ہے اور یہ سوچ کر اس کے آنسو نکل آئے۔

شاہان نے ناصیہ کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور وہ اس ارشاد کے لئے تیار ہو گیا تھا کہ اپنے سے بڑی عمر کی لڑکی کو اپنا شریک حیات بنائے۔ اس نے اس کے تمام اوصاف رحیم صاحب کی زبانی سن لئے تھے۔ ایسی ہی لڑکی بیوی بن کر گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ ظاہری چمک دمک والیوں کو وہ لندن میں دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ ان کا کردار کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ ناصیہ ایک مشرقی لڑکی تھی اس کی شرم وحیا ہی اس کا سب سے بڑا حسن تھا۔

آخرکار رحیم صاحب کو یقین آگیا کہ ان کی اس ہمدردی کا صلہ انھیں آج اس طرح مل رہا تھا کہ ان کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا تھا۔ انھوں نے روتے ہوئے شاہان کو گلے سے لگایا۔ لیکن ان کے یہ آنسو فرط مسرت سے نکل رہے تھے۔ جنھیں شاہان اپنے معطر رومال سے صاف کر رہا تھا۔

اس کے بعد رحیم صاحب کی ایک زوردار آواز فضا میں گونج اٹھی۔ "بیگم کھانے کا انتظام کرو میں اپنے مرحوم دوست کی نشانی اور ہونے والے داماد کو بغیر کھانا کھلائے جانے نہیں دوں گا۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ شاہان اپنا بیٹا ہے وہ سارے حالات سے واقف ہے۔"

مہندی کے دلکش ڈزائن

مہندی لگانا خواتین کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ اب صرف مہندی لگائی ہی نہیں جاتی بلکہ اسے خوشنما ڈزائنوں کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں ایسی شائق خواتین ہوتی ہیں جو شادی بیاہ کے موقع پر جا کر ڈزائن دار مہندی لگا کر کافی رقم وصول کر لیتی ہیں۔

شائستہ پروین

نے بہت سے ڈزائن کتابی شکل میں یکجا کر کے انھیں لگانے کے طریقے بھی لکھ دیے ہیں تاکہ خواتین خود اپنے دلکش ڈزائنوں کے ساتھ مہندی لگا سکیں۔ قیمت بارہ روپے۔

• رسالہ پرچہ نہ ملنے کی شکایت ۲۰ تاریخ کے بعد کی [illegible] جائے گی۔ اگر پرچہ نہیں ملا ہو تو [illegible] شکایت کرتی ہیں [illegible] ری لکھ دیا کریں کہ پرچہ وی۔ پی سے بھجوا دیں۔

تک بھی پہنچا محسوس کرتی تھی اور وہاب کو اکثر ذہن سے نکال کر اپنے ذہن [illegible] کا مقدمہ کرنا چاہتی تھی جہاں محبت یا بے وفائی کی کوئی لکیر کوئی نشان باقی نہ ہو۔ میرے ساتھ شیخ ناصر صاحب بھی کام کرتے تھے وہ ہمارے افسر تھے نگاہیں نہ رکھتے یا پکڑتے ہوئے میری نظر ان کے ہاتھوں پر پڑ جاتی۔ بالکل وہاب جیسے سفید گلابی ہاتھ کلائیوں پر دیسے ہی گھونگھریالے سیاہ بال۔ میرا دل چاہتا کہ میں شیخ صاحب کے یہ ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں۔ ایسے ہی دونوں ہاتھوں نے کبھی میری زلفیں سنواری تھیں میرے نازک ہاتھوں کو تھام کر کسی اور کا دامن پکڑ لیا تھا مگر شیخ صاحب کو مجبوراً قبول کرنا پڑا تھا کہ یہ دفتری کام تھا ان سے میری گفتگو صرف جی اور نہیں سر تک محدود تھی مجھے کسی سے اس سے زیادہ سروکار نہیں تھا

ایک روز آفس سے آتے ہوئے کسی خرابی کی بنا پر میرا رکشا بیکار ہوگیا مجھے رکشے سے اتر کر سڑک پر دوبارہ سواری کے انتظار میں کھڑا ہونا پڑا جب ہی میرے نزدیک ایک لمبی سفید مرسڈیز آکر رکی جو مجھے غالباً لفٹ دینا چاہتی تھی ایک لمحے کو میں آگے بڑھی مگر دوسرے ہی لمحے مجھے وہاب کی گاڑی یاد آگئی۔ ایسی ہی سفید مرسڈیز تھی۔۔۔ اف اونو پلیز مجھے لفٹ وغیرہ نہیں چاہیئے آپ جاسکتے ہیں ۔ گاڑی آگے چل دی۔ دل چاہا اینٹ اٹھا کر گاڑی پر دے ماروں یہ گاڑی والے کیا جانیں ہمارے دل کی دنیا انھیں تو اپنی امارت سے غرض ہے دوسرے رکشے میں بیٹھ کر اپنے گھر چل دی زندگی گزرتی رہی ہاں زندگی کو تو گزرنا ہی ہوتا ہے اچھے طریقے سے یا برے یا دوں سے میں بھی جوانی کو کہیں دور پیچھے بلکتا چھوڑ کر بڑھاپے کی سیڑھیوں پر لرزتے پاؤں رکھ رہی تھی کہ مجھے بیماریوں نے آن گھیرا جو شاید بڑھتی ہوئی عمر اور تنہائی کا تقاضہ تھیں۔ میں نے وہاب کے بعد کسی آدمی کو یعنی جنس مخالف کو دوبارہ دل میں جگہ نہ دی کہ ایک ہی تجربہ اپنی جان کا روگ بن گیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اپنا کھوکھلا اور مجروح وجود لئے ہسپتال کے خاموش کمرے میں پہنچ گئی اور پھر ڈاکٹروں کی مسلسل کوشش کے باوجود میں اپنی زندگی کی گاڑی کو مزید دھکیلنے سے معذور ہوگئی اب میں زندگی کے آخری اسٹیج پر ہوں اس اسٹیج پر آکر جب انسان موت کے خوفناک سائے اپنے اردگرد دیکھ رہا ہوتا ہے وہ کسی راز کو اپنے ساتھ قبر میں دفن کرنا نہیں چاہتا اور شاید میں بھی انھیں انسانوں میں سے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے خود کو ان سب انسانوں سے الگ سمجھ لیا تھا مگر آج ۔۔۔ آج میں اعتراف کر رہی ہوں بلکہ مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ وہاب میری زندگی، میری روح، میری روح میں سمانے والے، میرے دوست ہیں تو تمہیں ایک پل کے ہزارویں حصے میں بھی خود سے جدا نہ کرسکی۔ میں جو خود کو انا کی دیوی سمجھتی تھی۔ مگر میں تو درحقیقت محبت کی ایک دیوانی تھی جو ہر لمحے اندر سے گھٹتی رہی اور میں جبراً اسے تعمیر کرتی رہی مجھے اب خود پر کتنی ہنسی آرہی ہے کہ میں نے ایک [illegible] کے پجاری مجبور انسان کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیا اس کی مجبوریوں کو نفرت کی آگ میں جھلسا کر خود اس کی راکھ پھانکتی رہی۔

یہ تم سے محبت ہی تو تھی وہاب جو تمہاری اک اک یاد سے وابستہ نفرت کا روپ دھار رہی ہر وہ چیز جو تم سے وابستہ تھی مجھے اس سے حسد جلن اور نفرت ہوتی رہی بھلا کیوں اس لئے کہ یہ محبت کی انتہا تھی یہ میری طویل محبت جو بچپن سے جوانی تک ساتھ ساتھ پڑھتے اور سنگ سنگ چلتے میں نے تم سے پائی تھی یہ بات میرے تصور سے کہیں دور تھی کہ میری زندگی، میری روح کسی اور کے جسم میں داخل ہوکر میرے جسد خاکی کو درد اور دکھ کی بے رحم لہروں کے حوالے کردے گی تمہاری ہر ہر ادا مجھے ہر موڑ پر یاد آتی جانے نفرت کے ساتھ آتی مگر آتی تو یاد بن کر۔

وہاب جن لوگوں سے نفرت ہو ان کا تو ذکر بھی زبان پر نہیں آیا کرتا نہ ہی ان کا خیال دل میں لایا جاتا ہے مگر تمہارا خیال تو دل سے گیا ہی نہیں میں کتنی معصوم تھی کبھی تھی میں نے انتقام لیا ہے اپنی محبت کی توہین کا مگر نہیں ایسا بالکل نہیں ہوا آج تم سے بچھڑے مدت ہوگئی سنا تھا تم اپنی بیوی کے ساتھ برطانیہ چلے گئے تھے۔ اب نہ جانے کہاں گئے ہو مجھے کچھ علم نہیں میں تو دور جا رہی ہوں ۔۔۔ بہت دور جہاں سے تمہیں میری آواز سنائی نہ دے گی ۔ چاہے میں چلا چلا کے کہوں کہ وہاب میں نے زندگی بھر تم سے نفرت نہیں کی پلیز یہ سب تو تمہاری محبت کے صدقے ہوتا رہا ہمارا عشق تو ہمیشہ ایسی محبت کے لئے ہوتی ہے ۔۔۔ چاہے اس کے چاروں طرف نفرت کی دیواریں کھڑی ہوں ۔۔۔ وہاب پلیز مجھے معاف کردینا ۔۔۔ میری

بے بس عورت

وردہ بشیر

اسے دیکھتے ہی مجھے ہمیشہ کیٹس کی ایک نظم یاد آجاتی — LA BELLA SANS MERCI یعنی بے رحم خوبصورت عورت — فریدہ جلال یقیناً ایسی ہی تھی۔ بلا کی حسین بڑی بڑی غزالی آنکھیں جو ہر لمحے کچھ کہتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ مرمریں باہیں، یاقوتی ہونٹ اسے دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا تعلق کسی اور دنیا سے ہے سراپا غزل معلوم ہوتی۔

میں اسے شروع سے کلب کے فنکشنز میں دیکھتا آیا تھا۔ "فل مون کلب" اپنے نام کی مناسبت سے چاند کی چودھویں کو تقریبات کا اہتمام کرتا اور میں شاید ہر فنکشن میں اسے دیکھنے کی خاطر جاتا۔ فریدہ جلال — اس نام سے بے شمار اسکینڈل وابستہ تھے۔ کلب میں شاید ہی کوئی مرد ایسا ہو جو فریدہ سے اپنی دوستی کا دعویٰ نہ کرتا ہو۔ خوش قسمتی سے میں ان مردوں میں گنوایا جاتا تھا جو فریدہ جلال کے قریب ترین حلقے میں سے تھے — مگر اس کے باوجود میں فریدہ کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ نہ جانتا تھا۔ اس نے کبھی بتایا نہ تھا البتہ اتنا سب جانتے تھے کہ فریدہ سیٹھ جلال کی جیتی بیوی ہے اس کے باوجود وہ ہر کلب فنکشن میں تنہا آتی ٹھیک اپ اور جدید فیشن کے ملبوسات میں سجی ہوئی۔

اس کی کھلی کھلی گفتگو سے ہر شخص مستفیذ ہوتا مگر صرف چند لمحوں کے لئے کیونکہ وہ ایک مرد سے بات کر کے مسکراہٹ کے چند پھول نذر کر کے آگے بڑھ جاتی اور پہلا شخص دوبارہ گفتگو کی حسرت لئے بیٹھا رہتا اس کی خوشبوؤں میں گھرا ہوا، جو شاید وہ سر سے پیر تک اپنے اوپر انڈیلتی تھی۔ وہ ہر محفل کی جان تھی اس کی موجودگی محفل میں خاص فضا [illegible]۔ مرد اپنی [illegible] مدارت کرتے اور عورتیں حسرت و رشک اور حسد بھری نگاہوں سے اسے دیکھتیں۔ مگر وہ ہر چیز سے بے پرواہ جلترنگ آواز سے قہقہے لگاتی ادھر سے ادھر کسی تتلی کی مانند اڑتی پھرتی۔

فریدہ جلال کا نام میرے لئے تجسس بن کر ابھرا تھا اور اب اس کے اتنے قریب پہنچ کر بھی میرے لئے اس کی شخصیت اندھیرے میں تھی — وہ لاکھ آزاد سہی مگر آج تک اس نے اپنے کسی دوست کو گھر پر نہیں بلایا تھا شاید وہ خود بھی چھپ کے رہنا پسند کرتی تھی۔ تب ہی تو اس نے اپنی ذات کو اتنے دبیز پردوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا میرے ذہن میں لوہے کی عورت کی تصویر ابھرتی ایسی عورت جو نہ ٹوٹ سکتی ہو نہ جھک سکتی ہو۔ جو مکمل ہو اور سمندر کی گہرائی اور پہاڑوں سا عزم رکھتی ہو — میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا اتنا ہی الجھ جاتا۔ اور اس حسین ساحرہ کی یاد میرے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگتی میرے دل کا ہر گوشہ اس کے حصول کے لئے تڑپتا مگر فریدہ جلال کی چٹان جیسی شخصیت کے سامنے یہ لہر بھلا کیا دم خم رکھتی تھی ایک کشمکش نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا — جی چاہتا تھا کہ وہ سامنے ہو تو دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں — اس کا حصول مجھے جتنا ناممکن نظر آتا اس سے کہیں زیادہ میرے جنون کی شدت بڑھتی جاتی۔ جی چاہتا کہ اسے حاصل کروں یا اسے بھی ختم کر دوں خود بھی ختم ہو جاؤں۔ مگر یہ سب باتیں میں صرف سوچتا — فریدہ جلال کے سامنے تو جیسے میں برف کے ڈھیر تلے پڑا ٹھنڈا ہو جاتا الفاظ کھو جاتے اور جذبے خدا جانے کہاں سو جاتے۔

اس کی یاد میرے لئے مانیا کے انجکشن کا کام دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اپنوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ دنیا کی خبر جیسے ختم ہو گئی تھی تب ہی تو میں بھول گیا تھا کہ میری اپنی خالہ میرے ہی شہر کے ایک ہسپتال میں بستر مرگ پر لیٹی ہیں اتنے دنوں بعد خیال آیا تھا سو چلا آیا۔ میں ہسپتال پہنچا تو گاڑی کھڑی کر کے شعبہ حادثات کے سامنے سے گزرا تو جیسے میرے پاؤں زمین نے روک لئے — سامنے فریدہ جلال کھڑی تھی — میک اپ سے بے نیاز چہرہ — زرد [illegible] اس کے مقابل ایک ڈاکٹر کھڑا تھا اور فریدہ جلال جسے میں آہنی عورت سمجھتا تھا دونوں ہاتھ جوڑے ڈاکٹر سے [illegible] التجا کر رہی تھی۔

سلمیٰ آپا احسان صاحب کی دور پرے کی رشتے دار تھیں اور یہ رشتہ ان کے سسرالی عزیزوں میں ہوا تھا۔ بڑی معتبر شخصیت تھی سلمیٰ آپا کی اس لئے احسان صاحب کو ان پر پورا اعتماد تھا لڑکے والے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے اور انہیں کسی قسم کے جہیز کا لالچ بھی نہ تھا لڑکے والے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق جلدی شادی مانگ رہے تھے شکیل کے دونوں بڑے بھائی اور بہن شادی شدہ تھے۔ گھر کی آخری اولاد تھی اس لئے بڑے چاؤ سے یہ نسبت ٹھہرائی گئی اور جوش و خروش سے انھوں نے تیاریاں شروع کر دیں یوں سلمیٰ آپا کا لایا ہوا رشتہ صدف کے لیے ثابت ہوا اور صدف کے گھر اور من میں خوبصورت ہنگامے جاگ اٹھے خواب سارے دلکش روپ چرا کر صدف کی آنکھوں میں آن بسے دل میں اتھل پتھل ہونے لگی۔ وہ کیسا ہوگا؟ کیسا سوال تھا یہ کہ جو روئیں روئیں میں دلنشیں سا تجسس کر دیتیں سے رہا تھا۔ سوچوں پر نازک سے تصورات شبنم کی مانند آٹھہرے اور پھر صدف احسان نے جان لیا کہ من کے آنگن میں گلاب کیسے کھلا کرتے ہیں۔ احسان صاحب متوسط حیثیت کے آدمی تھے مگر گھر میں پہلی شادی تھی اس لئے انہوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بیٹی کے لئے جہیز تیار کیا تھا۔ خوبصورت کپڑے۔ سونے کے زیور اور ایک اپ کی دوسری بے شمار چیزیں۔ صدف سب چیزوں پر اپنی ملکیت محسوس کرتی اور ایک عجیب طرح کی مسرت اسے سرشار کر دیتی۔ صدف اور عافیہ نے مل کر دوپٹوں پر دھنک اور گوٹہ لگایا بیلیں ٹانکیں۔ عافیہ کے مذاق بھی جاری رہتے جو ذرا صدف چھیڑنے کی کوشش کرتی تو عافیہ پر ذرا اثر نہ ہوتا۔

"ارے ہم جھگڑے کی مانگ والوں کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ بچپن سے سارے ایک نام کے ساتھ چھیڑ چھیڑ کر پکا گھڑا بنا دیتے ہیں۔" عافیہ بڑے آرام سے کہہ دیتی۔

دن تیاریوں میں جلدی سے گزر گئے اور شادی کا دن آ پہنچا عافیہ، شمری، رخشندہ اور سدرہ سب سہیلیاں صدف کے پاس کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں اوپر کوٹھے پر جو چھوٹا کمرہ تھا صدف وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں شور ہنگامے سے بچاؤ کے علاوہ بچوں کے دروازہ کھٹکھٹانے کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ صدف کو آج اس گھر سے رخصت ہو جانا تھا جہاں زندگی کے اتنے خوبصورت لمحے اس نے گزار دیئے تھے۔ سو بیتے لمحوں کی یادیں آنکھوں کو شبنمی بنا رہی تھیں اور آنے والے دنوں کے تصورات دل کو بہا بھی رہے تھے چنانچہ صدف خلاف عادت آج کے دن چپ سی تھی۔

"مسز شکیل کے مزاج ابھی سے آسمان پر پہنچ گئے ہیں نگاہیں جھکا رہی ہیں نہ گفتگو فرما رہی ہیں۔" شمری نے شوخی سے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو صدف مسکرانے لگی۔

"بس صدف نہ جانے کیوں دل گھبرا رہا ہے گھر کو چھوڑنے کا تصور سوہان روح بنا ہوا ہے۔" صدف دھیرے سے بولی۔

صدف نے ہاتھ بڑھایا تو رخشندہ نے جلدی سے ہاتھ تھام لیا۔

"واہ بھئی شوہر کی محبت تو دیکھو، نکاح سے پہلے ہی مہندی سے صدف شکیل لکھوا چکا ہے۔"

"یہ ساری عافیہ کی بدتمیزی ہے میرا قصور نہیں۔" جھکے سر کے ساتھ صدف نے عافیہ کو گھورا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ بارات کا شور اٹھا، اور چند لمحوں بعد گھر کے صحن میں ترتیب سے رکھی کرسیاں بڑی بے ترتیبی سے بارات والی خواتین اور بچوں سے بھر گئیں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام عافیہ کے گھر میں کیا گیا تھا۔ فاخرہ بھابی کمرے میں آئیں۔

"نکاح کے لئے مرد آنے لگے ہیں دوپٹے لو سروں پہ —" لڑکیاں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ عافیہ پیچھے ہٹ کر بیٹھنے لگی تو صدف نے پیچھے سے اس کی قمیض پکڑ کر اسے بٹھائے رکھا۔

"شرافت سے بیٹھی رہو عافی۔ حوصلہ دو مجھے—" صدف نے سرگوشی کی۔

نکاح کے لئے تنویر بھائی تین اور رشتے داروں کے ساتھ آئے صدف سے کہا تمہارا نکاح شکیل طاہر ولد طاہر حسین کے ساتھ کیا جاتا ہے قبول ہے — خالہ اسلم نے صدف کے جھکے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیارے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

صدف کی آنکھوں سے آنسو امنڈ آئے اور جھکا ہوا سر اقرار میں ہلا۔ دوپٹہ پیشانی سے بھی نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔ تین دفعہ ایجاب کے بعد تنویر بھائی نے نکاح نامے پر صدف کے دستخط کروائے۔ مرد کمرے سے باہر نکل گئے۔ فاخرہ بھابی نے صدف کو گلے لگایا۔ سہیلیاں ہنسنے لگیں۔ فاخرہ بھابی نے مبارکباد دی صدف مسکرانے لگی تو رخشندہ کی زبان کھلی۔

دو دو نا مچلا آپ کیے ۔ خوشی ہی اتنی زیادہ ہے صدف شکیل بننے کی ۔۔۔۔

"ہاں رونا تو نہیں چاہیئے ۔۔۔ " سدرہ کی اس بات کو سب نے کہا اور پھر کھی کھی خرد سا ہو گئی ۔

"شرم کرو صدف تو! میں اتنا گھبرا رہی تھی اور کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ۔۔۔

"میری جگہ خود دستخط کر دیتیں ۔ توبہ توبہ ابھی ہم ایسے دیدہ دلیر نہیں ہوئے ۔" صدف کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی مگر سدرہ نے درمیان سے بات اچک لی ۔

خوش گپیوں میں صدف کو دلہن بنایا گیا ۔ سرخ کامدار غرارہ شلوکا سرخ دوپٹہ، ماتھے پر لگی بندیا اور لرزتے موتیوں والی نازک سی نتھ نے صدف کو بڑا متوالا روپ دے دیا تھا ۔

"عافیہ دروازہ کھولو" باہر سے فاخرہ بھابی کی آواز آئی ۔ دروازہ کھولنے پر فاخرہ بھابی نے بتایا کہ سلامیوں کے لئے دولہا گھر کے اندر آ رہا ہے صحن میں کرسی رکھی گئی ہے کھڑکی پر پوزیشن سنبھال لو فاخرہ بھابی بتا کر نیچے چلی گئیں ۔

دولہا آ کر بیٹھ چکا تھا ۔ سالیاں دودھ کا گلاس لئے کھڑی تھیں چھیڑ چھاڑ جاری تھی ۔ دو بدو جواب دیئے جا رہے تھے سدرہ اور رعنا بھاگ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئیں ۔

"پہلا حق صدف کا ہے بھئی جس بیچاری کو ابھی تک مجازی خدا کی تصویر دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوئی ۔ چلو صدف پہلے تم دیدار کرو ۔" عافیہ نے صدف کا ہاتھ تھاما ۔ صدف کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور عافیہ اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانکنے لگی باقی، سدرہ رعنا اور فوزی بھی کھڑی ہو گئیں ۔ ایک دم عافیہ نے صدف کا ہاتھ زور سے دبایا مگر صدف کا سر تو جھکتا جا رہا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ منہ ہاتھوں سے چھپائے کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ چکی تھی منہ ہنوز ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا عافیہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھی ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی رعنا و فوزی بھی ہنستے ہوئے عافیہ نے زبردستی صدف کے منہ سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے دیکھا کہ چہرے پر ہاتھ رکھنے چھپانے کے لئے رکھے گئے ہیں ۔ باقی تینوں کچھ نہ سمجھے

ہوئے پاس کھڑی تھیں بات تھی ہی ایسی کہ رخصتی کے ان انمول لمحوں کا سواگت یوں بے ساختہ ہنسی سے کیا جا رہا تھا ۔ شکیل طاہر صدف کا دکھلیا اور بے ہودہ سا وہ شخص جسے صدف بے غیرت ہونے کے باوجود بھی پسند کرنے کا تصور نہ کر سکتی تھی آج بقائمی ہوش و حواس انتہائی غیرت مندی کے ساتھ پورے تین دفعہ قبول کرنے کے بعد پسند کر کے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا چکی تھی ۔ عجیب سی بات ۔

بچوں کا بٹوارہ

(از: عبدالمجیب سہالوی)

پھر پہلے تو لڑکی دکھانا برا سمجھا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ حالات بدل گئے اور اب بغیر لڑکی دیکھے بات طے نہیں ہوتی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے حالات اتنے بدل گئے کہ پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے زمانے میں لڑکے والے لڑکی تلاش کرتے تھے اس کے یہاں وہ لوگ جاتے تھے اور شادی کی بات چیت چلاتے تھے لڑکی کی طرف سے اس سلسلے میں پیش قدمی کو برا سمجھا جاتا تھا لڑکی دکھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میراثن یا نائن کے ذریعے چوری چھپے لڑکی کی صورت شکل کے بارے میں پتہ لگایا جاتا تھا مگر اب تو لڑکے کے یہاں کی خواتین باقاعدہ لڑکی دیکھنے جاتی ہیں۔

ایک صاحبہ نے تو کمال ہی کیا وہ ایک جگہ لڑکی دیکھنے گئیں خوب خاطر مدارات ہوئی۔ انھوں نے لڑکی اچھی طرح دیکھی بھالی۔ لیکن اب انھیں لڑکی کا قد اور چال دیکھنے کی فکر ہوئی۔ لڑکی شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ یہ کہنے کی انھیں ہمت نہیں ہوئی کہ لڑکی کو چلا کر دکھائیے۔ وہ اسی فکر میں تھیں کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک لڑکا ربڑ کا مصنوعی سانپ جس سے وہ کھیل رہا تھا ڈال کر بھاگ گیا انھوں نے پیچھے سے اسے اٹھا لیا اور لوگوں کی آنکھ بچا کر لڑکی کے اوپر ڈال دیا لڑکی گھبرا کر بھاگی۔ ان کا کام پورا ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ خود ہی بگڑنے لگیں کہ یہ کس لڑکے کی شرارت ہے۔

شادی بیاہ میں کوئی شک نہیں کہ شکل صورت کی اہمیت ہوتی ہے لیکن گھریلو زندگی کامیابی سے بسر کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت مزاج میں یکسانیت کی ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے صورت کی جھلک دیکھ کر شادی ہوتی ہے لیکن مزاجوں میں اختلاف کی وجہ سے شادی کے کچھ دنوں کے بعد جب دونوں کو مل کر گھریلو زندگی کی گاڑی کھینچنی ہوتی ہے تو جھک جھک شروع ہو جاتی ہے اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ صورت تو دیکھی جا سکتی ہے لیکن مزاج اور طبیعت کے بارے میں ایک نظر میں پتہ لگایا نہیں جا سکتا۔ اس کے بارے میں تو قریب کے لوگ ہی جان سکتے ہیں اس لئے سمجھدار لڑکی اور لڑکے والوں کو چاہئے کہ وہ لڑکی اور لڑکے کے مزاج میں یکسانیت کا بھی لحاظ رکھا کریں اور خود ایسے رشتے نہ ڈھونڈیں جہاں لڑکی اور لڑکے کے مزاج میں اختلاف ہو۔

ایک صاحب کو اس کا خبط تھا کہ ان کی بیوی کافی خوبصورت ہو۔ بہت جگہ سے پیغام آئے لیکن انھوں نے تصویر دیکھنے کے بعد ناپسند کر دیا۔ یہ شریف خاندان کے تھے پڑھے لکھے تھے صورت شکل کے بھی اچھے تھے۔ اور برسر روزگار بھی تھے اس لئے ان کے یہاں پیغامات کی کوئی کمی نہیں تھی آخر کار انھیں ایک لڑکی پسند آئی۔ لڑکی صورت شکل کے لحاظ سے واقعی ہزاروں میں ایک تھی۔ سرخ سفید رنگ، چوڑی پیشانی بڑی بڑی رسیلی آنکھیں صراحی دار گردن، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑی جیسے لب، چھریرا بدن، پتلی کمر، میانہ سے کچھ بڑا قد۔ چال ڈھال پرکشش، آواز سریلی، گھونگھر والے لمبے بال، موتی جیسے دانت، مخروطی انگلیاں۔ یہ بیوی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے شروع کے چھ مہینے ہنسی خوشی سے گزرے سال بھر کے بعد ایک بچہ ہوا۔ لڑکی صورت کے لحاظ سے جتنی اچھی تھی مزاج کے لحاظ سے اتنی ہی خراب تھی۔ چڑچڑی منہ پھٹ لڑاکا، تنک مزاج، غصیلی، پھوہڑ، فضول خرچ۔ دوسرا بچہ ہوا جھک جھک تو تو میں میں اور بڑھ گئی۔

تیسرا بچہ ہوا تو شوہر نے کہا اب زیادہ بچوں کی گنجائش نہیں۔ یہ کہنا تھا کہ لڑاکا بیوی پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئی۔ ایسی ہی غرض تھی تو شادی کی کیا ضرورت تھی۔ میاں نے سمجھانے کی کوشش کی تو ہزار الٹی سیدھی سنائیں اور بگڑ کر گھر چلی گئیں۔ [illegible] خاموش رہے [illegible] گئے خفا کیا۔ بات اتنی بڑھی کہ بیوی نے [illegible] کا مقدمہ دائر کر دیا۔

جج نے مقدمہ کی سماعت کے بعد بیوی سے کہا تمہیں طلاق مل سکتی ہے اور مہر کے معاوضے میں جائیداد میں حصہ بھی مگر بچوں کا کیا ہوگا؟

چونکہ بیوی نے فوراً کہا ان کا بھی بٹوارہ ہوگا۔

عدالت نے کہا — مگر بچے تو تین ہیں۔ ان کا بٹوارہ کیسے ہوگا؟

پھر عدالت [illegible]

[illegible]

[illegible]

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی بہنوں کا بھیجا صرف ایک ہی شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ اور موزوں و معیاری ہو۔ صرف وہی اشعار شائع کئے جاتے ہیں جو ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہوجاتے ہیں۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری حریم ضرور لکھیں۔ اکتوبر کے لئے عنوان ہے "زخم" اور نومبر کے لئے "ارادہ"

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

مرسلہ:۔ مس ناہید اختر (گیا)

عشق کے رنگ لئے پھرتا ہوں
ان کی تصویر بنا دے کوئی

مرسلہ:۔ زرینہ الحق (کلکتہ)

آہ یاد آتی ہیں رہ رہ کے پرانی صحبتیں
ہے قیامت سامنے رہنا تری تصویر کا

مرسلہ:۔ جہاں آرا بیگم (ناگپور)

اس کی تصویر لئے بیٹھا ہے آنکھوں میں قتیل
جس کے ملنے کی کوئی آس نہیں ہے یارو

مرسلہ:۔ رونق جہاں بیگم (سہارنپور)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

مرسلہ ب۔ ن آر۔ ابراہیم (بنگلور)

تصویر بنی خالقِ اکبر نے بنائی
پھر نورِ محمدؐ سے بنی ساری خدائی

مرسلہ:۔ شیریں سحر دختر روحیلہ (حیدرآباد)

کوئی تصویر نہ ابھری تری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسۂ سائل کی طرح

مرسلہ:۔ ناہید (میسور)

کہاں سے لاؤں وہ الفاظ جو تصویر بن جائیں
اگرچہ حال دل لکھا ہے سب کچھ نامہ بر میں نے

مرسلہ:۔ سلطانہ بیگم نسیم (مظفرپور)

تم کو یادوں کی کسک سے بڑی الجھن ہوگی
میری تصویر نگاہوں سے ہٹائے رکھو

مرسلہ:۔ نغمہ پروین۔ بڑودہ

مجھ کو اب تک نہیں بھولا مری رخصت کا سماں
وہ ہی تصویر ان آنکھوں میں بسی ہے اب تک

مرسلہ:۔ اختر حسین (میرٹھ)

آپ کی تصویر پائی، ہم نے دیکھا غور سے
سب ادا اچھی، خموشی کی ادا اچھی نہیں

مرسلہ:۔ کشور عظیم (آگرہ)

اک خموشی دل کو دیتی ہے ملال
اور سب باتیں پسند آئیں تری تصویر کی

مرسلہ:۔ بیگم سلطانہ (مدراس)

دل کے آئینے پہ لکھی ہوئی تحریر ہو تم
جو نگاہوں میں بسی ہے وہی تصویر ہو تم

مرسلہ:۔ اقبال سلطانہ (بہار)

بیخودی میں تری تصویر کے لب چوم لئے
جذبۂ عشق کی شدت کے سبب چوم لئے

مرسلہ:۔ مس روبی دیبا (آگرہ)

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو سکے گردیدۂ تقدیر کو

مرسلہ:۔ قرۃ العین (شوپال)

دل میں اب کوئی مسرت نہ تمنائے حیات
زندگی گردشِ حالات کی تصویر ہے اب

مرسلہ:۔ نگار سلطانہ جلیل (رائچور)

چہرے سے نمایاں ہے اک اک ادا غم کی
انساں جسے کہتے ہیں تصویر ہے ماتم کی

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (بھاگلپور)

تصویر تیری ہم نے فردوسِ تصور میں
سو آئینے جوڑے ہیں تب جا کے اتاری ہے

مرسلہ:۔ خدیجہ زبی [illegible]
(رفاب گنج۔ [illegible])

آزادی، ایکتا اور خوشحالی کا تصور ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں

آزادی حاصل کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے آزادی برقرار رکھنا اس کے لئے ملک کے اندر پنپنے والی تخریب پسند طاقتوں سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔

مذہب، زبان اور ذات پات کے نام پر قومی ایکتا اور قومی مفاد کو چوٹ پہنچا کر بعض لوگ ملک میں ہمیشہ بدامنی کا ماحول قائم رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ملک و قوم کی طاقت کم اور بیرونی آلہ کار دو رہوتی جائے ان مفسد افراد کو سختی کے ساتھ شکست دینا ہے۔

کیونکہ آزادی اور اتحاد کے رشتے میں بندھا ملک ہی ترقی کے راستہ پر بڑھ سکتا ہے۔

اترپردیش امن و خیرسگالی کے راستہ پر گامزن ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام پر عملدرآمد میں ریاست کو ملک میں چوتھا مقام حاصل ہے۔ ہمیں زبردست آبادی کو ایک قوت بنانا ہے۔

اناج کی پیداوار بڑھانے میں بھی ریاست کو نمایاں کامیابی ملی ہے سال ۸۰-۱۹۷۹ء کے مقابلے میں چاول کی پیداوار ۷.۰۵ کوئنٹل فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں تقریباً ۱۳ کوئنٹل فی ہیکٹر ہو گئی۔ گیہوں کی پیداوار ۱۳.۱۴ کوئنٹل فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۱۰.۶۶ کوئنٹل فی ہیکٹر ہو گئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پیداوار کے اعتبار سے پسماندہ مشرقی علاقوں میں بھی پیداوار بڑھی۔ گیہوں کی پیداوار میں نہ صرف یہ کہ ۱۶۵ ٹن کا نیا ریکارڈ قائم ہوا بلکہ گیہوں کی وصولی بھی ملک بھر میں پنجاب کے بعد دوسرے نمبر پر رہی۔

صنعتوں کے شعبے میں پیش رفت کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ریاستی مالیاتی کارپوریشن نے ۵۴.۲۸ کروڑ کا قرضہ صنعت کاروں کو تقسیم کیا جو ملک بھر میں سب سے زیادہ تھا۔ اس سال نئی صنعتیں قائم کرنے کے لئے ۱۳۶ خطوط ارادہ حاصل ہوئے ہیں جن میں ۱۹۴۴ کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری کی تجویز تھی۔ سابقہ برسوں کے مقابلے میں شکر اور کپڑے کی پیداوار میں بھی اطمینان بخش اضافہ ہوا ہے۔ چھٹے منصوبے کے آخر تک شرح نمو اوسط سے بھی زیادہ رہی۔ پہلی بار ریاست میں پٹرول پر مبنی کیمیاوی کارخانوں اور موٹر گاڑیوں کے کارخانوں کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں جتنا کام ہوا اتنا چالیس پچاس برسوں میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ کامیابیاں ہمارے دلوں میں نئی امیدیں پیدا کرتی ہیں۔ آیئے آزادی کی سالگرہ کے موقع پر ہم نئے جوش و خروش کے ساتھ خود کو اور ملک کو مضبوط بنانے کا عہد کریں۔

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

احمد دادا بھی کبھی بڑے صاحب کے بیٹے نے الّو بن کیا ہے۔ ارے تم ہو کون بہت بلیٹے آئے۔ چلو۔ اپنا راستہ ناپو۔ مجھے ۔ میں بہت برا ہوں ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو چپاتی ہو جاؤ گے! ۔

بھائی یہ تو دیکھو کہ یہ ہماری برابری کر رہا ہے: جمیر نے کہا۔ مطلب یہ کہ یہ اگر ان کا نواسہ ہے تو ہمارا بھائی ہوا۔ ایسے دو ٹکے کے لونڈے کو کیا ہم اپنا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری بھی ناک نہ کٹے گی۔ اسے سزا دینی چاہیے کہ یہ بڑے سرکار کا بیٹا ہونا بھول جائے!:

وہ تم مجھے بھی اپنے ساتھ سمجھو!: ایک طرف سے ارقم کی شرارت سے بھری آواز آئی: تمھیں نہیں معلوم۔ یہ بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ تھوڑے پر سے پھرتی اٹھا لائی تھیں۔ آج اسے اتنی ریٹیاں لگی ہیں کہ نمک حرام ہماری برابری کرتا ہے۔ میرے اترے ہوئے کپڑے پہن کر اسکول جاتا ہے۔ اور صنوبیہ کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔ تم ہی دیکھ لو۔ یہ ہمارے ساتھ کیرم، شطرنج، ٹیبل ٹینس نہیں کھیلتی۔ اس نوکر بچے کے ساتھ واہیات کام کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ اسے اتنا مزہ چکھاؤ کہ پھر سارے مزے ہی بھول جائے!:

اچھا تو پھر دیر کیا!: جمیر نے آستین چڑھا کر کہا۔ صنوبیہ یکبارگی احمد کے سامنے آگئی اور ایاز کی ڈھال بن کر ارقم سے بولی: تم بہت برے ہو۔ ارقم تم جلتے ہو۔ اشرف صاحب نے تمھارے ٹکیاں لگائی تھیں۔ ایاز کو شاباشی دی تھی۔ تم اس کا بدلہ لینا چاہتے ہو!:

دیکھا!: ارقم نے رقابت اور غصے کے ارے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دونوں سے کہا: یہ کیا جھوٹ کہہ رہا تھا!۔ (باقی آئندہ)

فیاض کے والد کو یہ کارروائی پسند نہ تھی۔ انھیں احساس نہ تھا کہ ایسے جذباتی تماشے میں مرد عورت برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اکیلی عورت قصوروار نہیں ہوتی لیکن وہ دائم المریض، اور بڈھے تھے۔ ان کی شنوائی کیا ہوتی! بس تو فیاض کا بھی نہیں چلا۔ اگر ان کی مرضی ہوتی تو وہ یہ ظلم ہاجرہ پر نہ ہوتا۔ مگر اب وہ بھی روایتی مردوں کی طرح دوسری لڑکی سے وابستگی کا لطف لینے لگے تھے۔ وہ کیا زندگی تھی۔ خانہ داری کا چکر۔ پیٹ پالنے کی فکر، بیوی سے لڑائی، بچوں کی جھک جھک ان کی نامعلوم بیماریاں، ڈاکٹروں کے در کے پھیرے۔ کوئی راحت، دلچسپی، شگفتگی نہ تھی۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ ہاجرہ کے بچے صرف ان ہی کے اولاد تھے۔ مگر جان بوجھ کر انھوں نے خود کو باور کرایا کہ وہ بچے صرف ہاجرہ ہی کے تھے۔! اور اپنی بھیانک غلطی، گناہ کبیرہ پر ضمیر کی چیخ پکار کے باوجود مطمئن ہو گئے!۔

سب نے سکون کی سانس لی۔! پھر کسی کو بدنصیب عورت اور بدقسمت بچوں کی یاد نہ آئی۔ ماں اور بہنوں نے چاروں طرف سے فیاض کو جکڑ لیا تھا۔ بہن نے بڑی ہوشیاری سے انھیں شبنم کا دیدار کرا دیا تھا۔ فیاض ریشہ خطمی ہو گئے۔ ماں نے اپنی بہن سے معافی مانگی تھی۔ غلطی فیاض کی تھی۔ ان کی نہ تھی لہٰذا بہن نے بھی مصلحتاً دوسری بہن کو معاف کر دیا۔! اور دنیا کے ارادے کے مطابق جاننے کی بات سے دو دن قبل فیاض اور شبنم کا نکاح ہو گیا۔ تھوڑا سا کھٹکا یہ لگا تھا کہ شاید ہاجرہ کے باپ بھائی وغیرہ اس ظلم پر احتجاج کرنے ان کے ہاں آ دھمکیں۔ لڑائی جھگڑا ہوگا۔ مار پیٹ ہوگی۔ سو بیانے یہ ترکیب لی کہ جا

جاتا اپنے ساتھ فیاض اور شبنم کو لیتی گئیں۔ سہارنپور میں ان کا قیام کہاں تھا یہ ہاجرہ یا اس کے ماں باپ کو کیا معلوم تھا۔ لہذا فیاض ہر وقت سے محفوظ ہو گئے۔ شبنم کی رفاقت میں وہ جلد ہی ہاجرہ اور اپنے بیٹوں کو بھول بھال گئے۔ زندگی میں ایسے معمولی واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان پر زیادہ دیر تک سوچنا اور دماغ تھکانا بے فائدہ تھا۔

شروع میں تو ہاجرہ کو یقین ہی نہ آسکا کہ فیاض نے یہ مذموم و رکیک حرکت کی ہے۔ وہ اپنے سامنے سارے حقائق کو دیکھتے ہوئے بھی باور کرنے کو تیار نہ تھی کہ وہ ایک بھیانک حقیقت تھی! اور جب ان کے حواس درست ہوئے تو ایسے چونکے کہ شاید بدحواسی ان پر طاری ہوگئی ان کی نگاہوں میں زمین آسمان ساکت، دنیا جہنم اور اپنا وجود نفرت و کراہیت کا باعث بن گیا۔ وہ بچے جو ان کے جسم کا ایک حصہ تھے اب جسم پر لگے ناسور معلوم ہونے لگے! اس وقت کوئی نہ تھا جو انھیں سہارا دیتا۔ گھر والا انھیں دغا یا بے مروتی کے ساتھ جینے کا حوصلہ بندھاتا۔ انھوں نے خود کو بیکس اور سسرال سے ہر طرح الگ پاکر بالآخر اپنی اور بچوں کی زندگیاں ختم کرنے کا آخری فیصلہ کرلیا۔ ان کی حالت عجیب تھی۔ کبھی وہ چیخیں مار کر رو دیتیں، کبھی فیاض کو کوستیں اور کبھی بچوں کو پیٹ دیتیں۔ ساری حرکتیں دیوانگی کی تھیں۔ اتفاق سے انھوں نے جھانگی

تو انھیں ایک بہانہ ہاتھ آیا تھا، بہرحال جب لڑکوں پر سے دیے ہو گئے تو وہ بھی چپ ہو گئے! ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا، دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے!

برآمدے میں ایاز بیٹھا نرسری سے آئے ہوئے ننھے ننھے گملوں میں لگے پودوں کو بڑے گملوں میں منتقل کر رہا تھا! اس نے انھیں دیکھا اور ان کی بات چیت سن کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ فرعون بے سامان تھے۔ لہذا ایک نظر ان پر ڈال کر وہ پھر ایک گملے کی مٹی برابر کرنے لگا! یہ اتفاق تھا کہ وہ دن اتوار کا تھا اور چونکہ مدرسے کی چھٹی تھی لہذا صنوبر بھی وہیں بیٹھی تھی! اور شاید وہ بھی اس بھرے کام میں بھائی کی مدد کر رہی تھی! وہ اپنے بھائیوں کو دیکھ کر سہم گئی! اور جلدی جلدی ہاتھوں سے مٹی جھاڑنے لگی!

واہ بھئی۔ یہ بھی خوب ہے۔ جبیر نے کہا وہ زیادہ تند خو اور فتنہ ساماں تھا۔ ہماری ایک بات بھی بڑے ماموں جان کو اچھی نہ لگی۔ ہمیں دھمکی دی گئی اور یہ ہماری بہن جو گھر میں کام کاج کرنے والے چھوکرے کے ساتھ لگی رہتی ہے تو کسی کو برا نہیں لگتا۔ اب دیکھنے والے کہیں گے کہ یہ ہماری بہن ہے۔ سب لوگ نوکرانی ہی کہیں گے!

مٹی جھاڑ کر ایاز بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ناسمجھ لڑکا ہی تھا۔ ملازم کا لفظ اسے ناگوار گزرا۔ اس نے جواب دیا: میں ملازم نہیں ہوں میں بھی بڑے صاحب کا بیٹا ہوں!

شبیر نے پھر منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا: بڑے صاحب کا بیٹا۔ ہا۔ ہا۔ ذرا ان کی صورت تو دیکھو۔ چڑا ہنسا ہے۔ جیسا بولا بھڑے

کی آنکھوں کے پیچھے سے سمندر اُبل پڑا۔ دل بھر کر رونے سے طبیعت ہلکی ہو گئی۔ کسی نے رونے سے منع نہیں کیا۔ فی الحال یہی ایک علاج تھا۔ انھوں نے کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی ہچکیاں اور سسکیاں لے کر اپنی تباہی کی داستان سنا دی۔ ان کا خیال تھا کہ سب لوگ نیاض پر لعنتوں کے ڈونگرے برسائیں گے۔ انھیں ان کی خود رائی پر برا بھلا کہیں گے۔ لیکن یہ کچھ نہ ہوا۔ سید صاحب نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

"زندگی اپنی تکالیف کا نام ہے بیٹی۔ یہاں سکون سے ایک ہموار انداز میں کون جیتا ہے۔ تمھیں ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ بہت برا اقدام کر رہی تھیں تم۔ خود تو تم عذابِ دائم کی مستحق ٹھہرتیں۔ ان معصوموں کا خون بھی تمھاری گردن پر ہوتا۔ مطلب یہ کہ راندۂ درگاہ۔ ابھی تم کے لیے اب تم سب کچھ بھول جاؤ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔!"

میں پہلے ہی کہتی تھی وہ موا بھگوڑا ایمان خور صورت ہی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ بیگم نے نفرت سے منہ بنا کر کہا: نجانے میری بھولی بھالی بچی کو کیونکر

سید صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا۔ "اب ان باتوں کا کیا حل ہے دھوکا سبھی کھاتے ہیں۔ یہاں کوئی فرشتہ نہیں۔ اچھا بیٹی۔ وہ مکان کیا تمھارا اپنا ہے کہ کرائے کا۔ خاصہ معقول سامان میں نے دیکھا تھا اس میں۔"

"کرائے کا ابی جی۔!" سخت ترین شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ناجرہ نے کہا: "وہ سامان۔ البتہ میرا ہے۔ آپ نے جو جہیز۔!"

سید صاحب نے پھر بات کاٹ دی۔ "تو بھئی انھیں یہاں زحمت کریں ساتھ غفور کو لے لو۔ جو کرایہ بنتا ہے۔ ادا کر کے سامان لے آئیں۔ اب انشاء اللہ تم یہیں رہنا ہے۔"

اس کے بڑے بھائی اس سے بالکل [illegible] تھے۔ صبح وہ اپنے ملازم کے ساتھ پہنچے اور شام تک گھر کو مکمل [illegible] کسی بزرگ کا احترام انھیں کرنا آتا نہ تھا [illegible] کرتے تھے۔ ان کی بھی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ ایک بار ان کے [illegible] مذاق پر خندہ دل کا قہقہہ لگانے پر جمیل نے کہا۔

"شریف بیٹا اس [illegible] کیا تمھیں ماموں سے بھی [illegible] ہے! اسکول میں تمیز تہذیب تم نے نہیں سیکھی؟"

برا چڑھا [illegible] انھیں بھی جو [illegible] نکلا: "ہم تو پڑھنے آئے ہیں آپ کو اچھا نہ لگتا ہو تو کہہ دیجیے چلے جائیں گے۔ اس سے اچھے تو ہم [illegible] کے گھر میں تھے۔ کوئی بھی [illegible] نہ تھا۔!"

بھائی جب [illegible] نہیں ہے تو چلو اپنا چلیں۔ "جبیر نے کہا جمیل ونگ سے تھے۔ یہ کیسے بچے تھے۔

ناجرہ نے اپنی عزت اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "بڑوں کی بات [illegible] کو جواب نہیں دیتے۔ میں ماموں کو [illegible] کی۔ تمھیں تہذیب اور سلیقہ [illegible] بالکل بے لگام ہو گئے ہو۔"

"[illegible] تو اپنے پاس رکھا ہوتا۔ ہمیں یتیم لڑکوں کی طرح دوسروں کے گھر کیوں پھنکوا دیا ہے۔" جبیر نے ترکی بہ ترکی کہا: "کیا یہاں [illegible] اور پھر ہم کو [illegible] میں پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں کوچنے اپنے پاس کیوں نہ رکھا!"

"اب رکھ لوں گی۔" ناجرہ نے طیش میں آ کر کہا۔

جمیل [illegible]: "بھائی۔ ہم بہتر [illegible]۔ بھلا تم نے اپنے آپ کو دیکھا

THE HAREEM

Oct. 85

Rs. 1/60

ایڈیٹر

نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر آفس:- ۴۴۵۵۹

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس مہینہ ختم ہو گئی

ٹیلیفون نمبر رہائش:- ۴۵۳۴۴

گزشتہ ۵۵ سال سے پابندئ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ـــــــ اور خواتین کا
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۵) فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء نمبر (۱۰)

اڈیٹر و نگران:- نسیم انہونوی
معاونین:- شوکت جہاں بیگم غزالہ ـــــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	تیس روپیہ
مخصوص خریداری	" "	اٹھائیس روپیہ
معمولی خریداری	" "	چوبیس روپیہ

وی، پی سے پرچہ منگانے پر ۔۔ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ساٹھ پیسے

غیر ممالک سے

اسی روپیہ یا اس کے مساوی غیر ملکی سکہ ایئر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ / ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ... قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور ... کے خریدار ... شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ... تاریخ سے پہلے ... وصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ... آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ...

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے ... پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

زلف گرہ گیر
کے اسیر آپ بھی ہو جائیں گے اگر
سندری سہاگ
لگائیں گے
چشم آہو
حیا بار آنکھیں
سُرمہ نورِ نظر
کے صدقے
مثال مہ و انجم
چمکدار صاف تندرست
دانتوں کے لئے
جگمگ منجن
طبلۂ عطار
خوشبوؤں کا بحر ذخار
دیرپا مسحور کن عطریات
عرق گلاب / کیوڑہ
شہد وغیرہ
مستقبل کا معمار
اپنے بچوں کو
بے بی گرائپ
پلائیے
پہاڑوں سے ٹکر
لینے کی طاقت پیدا کیجئے
شربت اکسیر
استعمال کیجئے
تیار کردہ:-
ایس، اے، بی بخشی کمپنی
۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ
(کولوٹولہ) کلکتہ ۷۳

۱۵ ستمبر کو لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں لکھنؤ کی مقتدر مسلم خواتین نے ایک جلسۂ عام کر کے حکومت ہند سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جلد سے جلد یہ اعلان کرے کہ مسلم پرسنل لا اور شریعت اسلامی میں نہ تو کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی اور نہ کوئی تبدیلی ہوگی۔

مسلم خواتین کا یہ جلسۂ عام بارش اور موسم کی خرابی کے باوجود بہت کامیاب رہا۔ کافی خواتین نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت بیگم صاحبہ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب نے کی۔ جو قرارداد اس جلسہ میں بہ اتفاق رائے منظور کی گئی اس کا متن یہ ہے۔

" مسلم خواتین لکھنؤ کا یہ اجتماع شاہ بانو مقدمہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کو قانون شریعت میں کھلی مداخلت تصور کرتے ہوئے اس کی پرزور مخالفت کرتا ہے، اس فیصلے سے آئندہ بھی اسلام کے بنیادی اصولوں اور شریعت کے قوانین میں مداخلت کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ مسلم خواتین پُرزور الفاظ میں یہ اعلان کرتی ہیں کہ ان کو اپنا مذہب اور اس کے جملہ اصول اور قوانین اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں اور وہ ان میں کسی قسم کی کوئی مداخلت یا تبدیلی، خواہ وہ عدالت کے ذریعہ ہو یا مجلس قانون ساز کے ذریعہ برداشت کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں۔

مسلم خواتین کا یہ اجتماع حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد اس بات کا اعلان کرے کہ مسلم پرسنل لا اور شریعت اسلامی میں نہ تو کسی قسم کی مداخلت ہوگی اور نہ کوئی تبدیلی لائی جائے گی۔ مسلمانان ہند کے مجروح جذبات کو حکومت ہند کی اس یقین دہانی کی اشد ضرورت ہے۔"

جلسے کا آغاز ایک کمسن بچی عفت بانو کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جلسے کی کنوینر محترمہ نسیم اقتدار علی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جلسے کے مقصد کا تعارف کرایا اور سپریم کورٹ کے متذکرہ حالیہ فیصلے کی تفصیلات سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لیا۔ موصوفہ نے فرمایا کہ شریعت کے معاملے میں کسی قسم کی نکتہ چینی، تبدیلی یا مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر اس سب سے پہلے جلسۂ عام میں تقریر کرنے والوں میں ڈاکٹر صبیحہ انور نے ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔ ان کے علاوہ مسز راشدہ خاتون اور مسز ریحانہ سہیل اختر نے بھی تقریریں کیں، جن کا موقف یہ تھا کہ اس فیصلے سے مذہبی، اخلاقی اور سماجی حیثیت سے ہماری غیرت اور حمیت کو جو دھکا لگا ہے اس پر تکلیف کا اظہار بھی ہماری زبان سے ہونا چاہئے ——— انھوں نے ایک سوال کی شکل میں اپنے اس احساس کا بھی اظہار کیا کہ کیا اس مرد سے کسی مطلقہ عورت کا واسطہ رکھنا درست ہوگا۔ ان کے اس سوال کا لب لباب یہ تھا کہ جب طلاق اسی کا نام ہے کہ شوہر اور بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے تو پھر نان نفقہ کی صورت قائم رہنے کی صورت میں طلاق کہاں ہوئی۔

مقررین نے فخریہ یہ بات بھی کہی کہ وہ ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھتی ہیں، جس نے سب سے پہلے عورت کو اس کا جائز مقام دیا۔

> خلق خدا سے محبت کرنا اور انکی تکالیف کا مداوا کرنا
> بہت بڑی عبادت ہے

توجہ طلب علمائے کرام

اس حریم میں جسٹس حیدر عباس صاحب الہ آباد ہائیکورٹ لکھنؤ برانچ کا ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو شریعت اسلامی سے متعلق ہے۔ میں اس مضمون پر اپنی کوئی رائے دینا پسند نہیں کرتا، لیکن ان علمائے کرام سے اس کا جواب چاہتا ہوں جو صرف نان نفقہ ہی کے مسئلہ کو شریعت کے نظریہ سے ایک اہم مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ اس کا تعلق اس طبقہ سے ہے جو ہمیشہ مردوں کے ظلم و ستم برداشت کرتا رہا۔ آخر شریعت کے دوسرے مسائل کو بھی کیوں نہیں اٹھایا جاتا جن کا تذکرہ قابل احترام جسٹس حیدر عباس صاحب نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے۔

(عمزدہ۔ نسیم انہونوی)

خواہ تم کم ہو یا زیادہ ہو، خواہ اکثریت میں ہو یا اقلیت، خواہ کمزور ہو یا طاقتور ہو اپنے نصب العین، مقصد، منزل اور صداقت کے حصول کے لئے پھر اس راستے سے منھ نہ موڑو، پیچھے نہ ہٹو، تمہارے قدم پسپائی کا راستہ نہ دیکھیں، پھر ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظالم کی آنکھیں نکال لو، پھر ڈٹ جاؤ، پھر حق کے لئے اڑ جاؤ، لڑ جاؤ لیکن اپنے نصب العین سے سرِ مو انحراف نہ کرو۔

معزز قارئین! حضرت حسینؓ نے جن دو نکات کی تفسیر اپنے لہو سے کربلا کے میدان میں پیش کی کیا ہم اُن نکات کی عملی تفسیر اپنی زندگی میں پیش کر رہے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا کیونکہ قربانی و استقامت کے لئے جس جذبے اور جگرے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں باقی نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ کیا ہم اتنے بزدل ہوگئے ہیں کہ استقامت اور شجاعت کی رسمیں ہمارے معاشرے میں زندہ رکھنے والا کوئی باقی نہیں رہا؟ ہر شخص مفاہمت، مصالحت اور منافقت کا لبادہ اوڑھے ذکرِ حسینؓ کی مجلس سجا رہا ہے۔

حضرت حسینؓ کا پیغام یہی ہے کہ سچائی اور حق کے لئے ڈٹ جایئے لیکن کسی قسم کی مفاہمت اور مصالحت کو اختیار نہ کیجئے۔ منافقت کی چادر تار تار کیجئے تاکہ معاشرہ سدھر سکے اور زندگی سنور جائے، ہمارے معاملات بہتر ہوں اور ملک و ملت ترقی کے زینے پر گامزن ہو سکیں۔

(بقیہ صفحہ ۸ کا)

مجھے کچھ اچھی نہ لگتی تھی لیکن یہ بھی اتفاق ہی تھا۔ مجھے بس اسٹاپ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ روز والی بس جا چکی تھی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی تنہا کھڑی تھی میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی ساتھ والی لڑکیوں کے ساتھ صرف اس لئے نہیں گئی کہ اسے میرا انتظار ہوگا اس خیال کے آتے ہی میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے میں تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا مگر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی میں اس کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا اس لئے کہ اب تک دو نگاہیں ہی ملی تھیں گفتگو کی نوبت نہ آئی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ گفتگو کرنے کا یہ موقع نہایت عمدہ ہے میں نے قریب جا کر اس کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا اس لئے کہ آج اس کے چہرے پر وہ روزوالی شگفتگی نہ تھی جس نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں نے ہمت کر کے لہجے میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے پوچھا ـــ "خیریت تو ہے آپ اتنی مغموم کیوں نظر آ رہی ہیں"

اس نے بڑے ہی افسردہ لہجے میں کہا "کیا آج آپ کے ساتھی نہ آئیں گے۔

معاشرے کو امن و سکون کا گہوارہ بنایئے

(ادارہ)

ہمارے معاشرے میں بہت ساری برائیوں، انتشار، فتنہ و فساد اور قتل و خون ریزی کی وارادات کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے ارشادات کو جاننے سمجھنے انھیں پھیلانے اور ان پر عمل کرنے میں مسلسل کوتاہی کی گئی۔ ہم زبان سے تو محبت رسولؐ اور اسلام سے عقیدت و وابستگی کے دعوے کرتے ہیں لیکن عمل کی دنیا اس سے خالی ہے۔ قول و فعل کا یہ تضاد ہمارے ایمان کی کمزوری کا راز فاش کر دیتا ہے۔

ہم اپنے اردگرد معاشرے میں ہونے والے واقعات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ بیشتر برائیاں اور فساد محض زبان اور بدگوئی کی پیداوار ہیں۔ عورتوں اور مردوں دونوں کا یہ حال ہے کہ مزاج میں تحمل نہیں رہا ذرا ذرا سی بات پر گالم گلوج، لعن طعن اور فحش کلامی پر اتر آتے ہیں معمولی باتوں پر عورتوں میں جھگڑے شروع ہوتے ہیں اور تو تو میں میں کی نوبت آجاتی ہے پھر مرد بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی یہی انداز اختیار کرتے ہیں گالی گلوج فحش گوئی سے بات بڑھتی ہے تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ چھری چاقو اور پستول نکل آتے ہیں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بڑی آسانی سے خون بہا دیتا ہے پھر مقدموں اور انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے۔ سخت کلامی اور بدگوئی تہمت طرازی کے بعد طلاق و علٰحدگی یا قتل و خون کی نوبت آجاتی ہے معاشرے کی ان برائیوں کی جڑیں اس قدر گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ ان کا خاتمہ مشکل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے امن و سکون اور حقیقی خوشی کی زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے بلکہ تمدنی، انسانی اسلامی صفات مفقود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان برائیوں کو معمولی کہہ کر نظر انداز

کر دینا در اصل حقیقت سے آنکھیں چرانا اور اپنی تہذیبی و اخلاقی زندگی کی بربادی پر پردہ ڈالنے کی احمقانہ کوشش سے زیادہ نہیں ہے۔

ان برائیوں کی سنگینی اور ان کے دور رس نتائج کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر خصوصی توجہ فرمائی اور اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کو ان برائیوں سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

ابو وائل حضرت عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مسلمان کا ایک دوسرے کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

ظاہر ہوا کہ گالم گلوج کرنا فسق ہے تو یہ حرکت کرنے والا فاسق ہوا اور ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے لڑائی کرنا کفر کے برابر ہوا۔ لیکن ہم ہیں کہ دن رات فسق و کفر میں مبتلا ہیں اور اس کا احساس بھی نہیں رکھتے کہ یہ سب گناہ ہیں۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گوئی کرنے والے، لعنت کرنے اور گالم گلوج کرنے والے نہ تھے آپ جب کبھی ناراض ہوتے تو صرف اس قدر فرماتے کہ اسے کیا ہو گیا ہے اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

ثابت بن ضحاک نے بیان کیا کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسری ملت کی قسم کھائے تو وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے کہا اور جو چیز آدمی کے بس میں نہیں اس کے متعلق نذر کا پورا کرنا ضروری نہیں اور جس نے کسی چیز کے ساتھ دنیا میں خودکشی کی تو اس کے ذریعے قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور جس نے مومن پر لعنت کی تو وہ اس کے قتل کرنے کی طرح ہے اور جس نے کسی مومن کو متہم کیا تو وہ اس کے قتل کی طرح ہے۔

دیکھئے اس حدیث میں دوسری ملت کی قسم کھانے خودکشی کرنے اور اس کے عذاب کے ساتھ ہی لعنت ملامت کرنے اور تہمت تراشی کی نہ صرف مذمت کی گئی بلکہ اسے قتل کے برابر قرار دیا گیا۔ ہمارے معاشرے میں اتہام اور دشنام طرازی ایک عام بات ہو گئی ہے اور اس کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی سامنے ہے۔ عورتوں کی اکثریت میں تہمت بازی کی وبا کچھ زیادہ ہی ہے ناخواندہ اور خواندہ گھریلو رہنے والی اور کام کرنے والی ہر ذہن طبقے کی عورتوں میں بھی تھوڑے سے فرق سے یہ عادت پائی جاتی ہے ایک دوسرے پر تہمت لگانے میں کوئی برائی نہیں محسوس کرتیں۔ مرد بھی اس میں شامل ہیں اس کے نتیجے میں کتنی زندگیاں عورتوں کی برباد ہو جاتی ہیں۔ کتنے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے تہمت کو قتل کے برابر قرار دیا ہے اگر ہم صرف اس ایک برائی سے دور رہنے کا تہیہ کر لیں اور اپنے پیارے نبی کا حکم مان لیں جو ہمارے ہی مفاد میں ہے تو معاشرے کا نقشہ بدل جائے اور ان ہزاروں قتل و خون کا سلسلہ بند ہو جائے جو براہ راست تہمت طرازی کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں۔

اسی طرح غیبت اور چغلخوری ہے۔ یہ برائی بھی ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے برائی کرنا اور چغلخوری کرنا اس قدر رواج پا گیا ہے کہ یہ برائی کے بجائے ہنر اور فن بن گیا ہے اکثر حالتوں میں اسے ترقی و خوشحالی کا ذریعہ بھی بنا لیا گیا ہے۔

غیبت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں کوئی کسی کی غیبت نہ کرے کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، تم اس کو برا سمجھو گے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے غیبت کرنے کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے برابر قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ کراہت آمیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم مسلمان ہیں کہ دن رات غیبت کرنے یعنی پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کرنے اور اس میں کیڑے نکالنے میں مصروف رہتے ہیں اور کبھی اپنا کام نکالنے کے لئے غیبت کا سہارا لیتے ہیں۔

- کارخانۂ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے (حضرت علی)
- جو سوچ سکتا ہو وہ اپنی روح سے روبرو بات کر سکتا ہے (دانشور)
- مردے میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ میں سوچ سکتا ہوں وہ اس نعمت سے محروم ہے۔ (ڈسرائیلی)
- ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن دوسرے یہ سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا ہے۔ (وہ تھمک لیو)

افسانہ

غلط فہمی

رئیس وارثی

میں اور اشفاق دونوں نہ صرف جگری دوست تھے بلکہ ایک ساتھ ہی پڑھتے تھے ہم دونوں کو سروس بھی ایک ہی کالج میں مل گئی تھی۔ پروفیسر مجیب کی سفارش پر ہمیں ممتحن بھی بنا دیا گیا تھا ہم دونوں کی ڈیوٹی سیکنڈ شفٹ میں تھی جس کے پرچے ۳ بجے سے ہوتے تھے اس لئے ہم دونوں ایک بجے گھر سے نکل کر ساتھ بس اسٹینڈ پر آتے اور کالج چلے جاتے۔

ایک روز ہم دونوں بس اسٹاپ پر پہنچے تو دیکھا کہ لڑکیوں کا بڑا ہجوم ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی بس خرابی کی وجہ سے نہیں آئی تھی۔ جب ہماری بس آئی تو لڑکیاں بے تحاشہ اسی میں گھس گئیں۔ خواتین کی محدود سیٹیں پر غیر محدود لڑکیاں گھس پل کر کسی طرح بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں اس بات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک لڑکی پر پڑی جو ہماری سیٹ کے برابر ہی بیٹھی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہماری باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔

شاید اسے بھی ان باتوں سے دلچسپی تھی یا پھر اچھا وقت گزار رہی تھی۔ اسی دوران ہمارا اسٹاپ آگیا اور ہم دونوں اتر گئے۔ اشفاق کہنے لگا یار یہ بس والے بھی کس قدر بے رحم ہوتے ہیں انسانوں کو جانور کی طرح ایک دوسرے پر سوار کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی اس کی بات پر بات نکالی یار شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی میں ہزاروں ایسے مسائل ہیں جہاں اس سے بھی ابتر حالت ہے اس کی واحد وجہ وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی ہے۔

دوسرے دن حسب معمول ہم بس اسٹاپ پر کھڑے تھے دوسری طرف کالج کی لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ ایک لڑکی نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے ذہن پر زور دیا کہ یہ وہی لڑکی تھی جو کل ہماری باتیں بڑی توجہ سے سن رہی تھی ہم دونوں بس میں سوار ہو گئے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میں گویا ہوا۔ وہ لڑکی میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھی شاید وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہمت نہ کر پا رہی تھی میں بھی اس کی طرف توجہ سے دیکھتا رہا۔ اچانک اشفاق کو اس لڑکی کا بالکل علم نہ تھا میں نے بھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا میں چپ چاپ بیٹھا تھا مگر وہ نجانے کیوں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھی اس کے چہرے پر عجیب طرح کا تاثر تھا ہر چند میری اور اس کی بات نہیں ہوئی مگر پھر بھی لگتا تھا میں اس سے باتیں کر رہا ہوں وہ مجھ سے چپ رہنے کی شکایت کر رہی ہے۔ میں اس میں محو ہو گیا تھا کہ اشفاق نے بڑے زور سے کہا — "اترنا نہیں ہے اسٹاپ آگیا ہے۔" اور یوں میں سارے خواب و خیال بس ہی میں چھوڑ آیا۔ آج میری کیفیت میں تبدیلی تھی میرے ذہن میں اس لڑکی کا خیال مسلسل گردش کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیل ہے اور وہ اس پر پوری اترتی ہے۔ چہرے پر معصومیت، نگاہ شرمگیں، گداز جسم، زیرلب تبسم، سادہ لباس میں وہ اس قدر اچھی لگ رہی تھی

میری اس لڑکی سے روزانہ بس میں ملاقات ہوتی رہی مگر اشفاق بیچارہ میری اور لڑکی کی نگاہوں کی باتوں کو سمجھ نہ پایا۔ اور ویسے بھی اس کو بتانا کچھ مناسب نہ تھا۔

آج نسبتاً بہت کم رش تھا۔ میں اور اشفاق اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ بس چلنے والی تھی میری نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ شاید وہ آج نہیں آئے گی یا پھر اگلی بس سے چلی گئی ہو ابھی میرے ذہن میں سوالات جوابات کا سلسلہ جاری تھا دیکھا وہی لڑکی دور سے بس کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی میں نے کنڈکٹر سے بس رکوائی اور وہ جلدی سے اس میں سوار ہو گئی اور بس نے چلنا شروع کر دیا۔ آج وہ اکیلی تھی اور رش بھی نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے میں بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ تھی لگتا تھا میرا آئیڈیل میرے قریب آ رہا ہے میرے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے تھی۔ اشفاق نے سکوت توڑا — "یار کیا چپ چپ بیٹھے ہو اچھا خاصا فاصلہ ہے بالکل بور ہو جائیں گے" اور اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں میری توجہ کہیں اور تھی میں اشفاق کی باتوں کا بے ربط جواب دے رہا تھا اشفاق غصے سے بولا۔ "کہاں ہو تم آخر پوچھتا کیا ہوں جواب کیا دیتے ہو کیا ذہن گھر رکھ آئے ہو۔" اس بیچارے کو کیا پتہ کہ ذہن کہاں گم تھا اسی دوران ہمارا اسٹاپ آگیا اور ہم حسب معمول اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

ایک روز اشفاق علالت کے باعث نہ آ سکا [illegible] میں تنہا ہی تھا۔ کالج پہنچنے تک میں جا رہا تھا تنہائی [illegible] اشفاق کی موجودگی اب

افسانہ

بوجھ

نگار سلطانہ جلیلی آمبور

عابدہ خاتون خاندان بھر میں اپنی رحم دلی اور ہمدردی کی وجہ سے مشہور تھیں۔ وہ بڑی نیک، خوش اخلاق اور بلند کردار کی مالک تھیں اس لئے اپنے شوہر کی بھی اطاعت شعار اور خدمت گذار تھی۔ عابدہ خاتون کے شوہر سعادت میاں کو لڑکے کی بڑی تمنا تھی۔ جبکہ وہ صرف دو لڑکیوں کی ماں تھیں۔ یوں تو ان دو لڑکیوں کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا بھی ہوا۔ لیکن وہ بڑا نحیف اور کمزور تھا۔ ایک ہی ماہ میں چل بسا۔ عابدہ خاتون اکثر اسی وجہ سے آزردہ رہتی تھیں کہ سعادت میاں کی آرزو وہ پوری نہ کرسکیں۔ دس سال بعد لڑکے کی شدید تمنا کے باوجود ان کے ہاں پھر ایک خوبصورت لڑکی ہی تولد ہوئی۔ لڑکی بڑی حسین تھی۔ اس کا نام انھوں نے مہ وش رکھا۔

سعادت میاں ایک کاروباری انسان تھے، اسی لئے انھیں لڑکے کی خواہش تھی تاکہ ان کے بعد ان کا کاروبار سنبھالنے والا ان کا اپنا ہی لخت جگر ہو۔ تیسری بار بھی لڑکی ہی ہونے سے ان کا دل ٹوٹ سا گیا۔ مہ وش کی پیدائش کے تیسرے ہی دن وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں دہرہ دون چلے گئے۔ عابدہ خاتون کو بڑا دکھ ہوا کہ وہ اس بار بھی اپنے سرتاج کی دلی تمنا پوری نہ کرسکیں۔ یوں بھی سعادت میاں کی بے رخی سے ان کے دل کو بڑی ٹھیس پہونچی۔ پھر بھی انھوں نے صبر و ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھاما۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ مہ وش کی پیدائش کے ایک ماہ بعد انھیں ایک ایسا خط ملا جس نے ان کے دل کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ سعادت میاں کی بے رخی سے پہلے ہی انکا دل رنج و غم سے بھرپور تھا۔

بیگم صاحبہ۔ السلام علیکم

دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں۔ اللہ پاک آپ کو خوشیوں کی دولت سے مالا مال کرے بیگم صاحبہ۔ میری اس تحریر اور میرے دل کے ٹکڑے کو دیکھ کر واقعی آپ بڑی حیران ہوں گی۔

بعض وقت انسان کو حد درجہ مایوس اور بے بس ہو کر اپنی عزیز شئے کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ میں آپ کی رحمدلی سے بہت متأثر ہوں۔

بیگم صاحبہ۔! پانچ سال قبل میں بنگلور کے پرائمری اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ چونکہ میں غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں اپنے گھر سے پیدل ہی اسکول جاتی تھی۔ ہمارے گھر کے قریب چمڑے کی ایک منڈی تھی۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر سعادت صاحب منڈی میں آتے رہتے تھے چار پانی وغیرہ کے لئے سعادت صاحب ہمارے ہی گھر آتے تھے۔ کیونکہ ہوٹل وغیرہ بہت فاصلے پر تھے۔ اسی لین دین میں ہماری دوستی ہوگئی۔ مجھے اپنانے کے لئے انھوں نے ماں سے خواہش ظاہر کی۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ماں راضی ہوگئیں، پھر دس پندرہ لوگوں کے درمیان میں ہمارا نکاح ہوگیا۔

تین ماہ تک میں مسرتوں کی دنیا میں مگن رہی۔ سعادت صاحب کے اصرار کی وجہ سے میں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

سعادت صاحب سے میں برابر کہتی رہی کہ مجھے میری سسرال لے چلیں، لیکن وہ حیلے بہانے کرکے بہلاتے رہے۔ میری بیوہ ماں مجھے بہت چاہتی تھیں، اس لئے مجھے زیادہ تکلیف بھی نہ تھی۔

میں سوچتی کہ اس طرح ماں کی خدمت کرنے کا موقع مل رہا ہے لیکن ایک روز سعادت صاحب غسل کر رہے تھے۔ مجھے صابن منگوانے کے لئے کھلے پیسوں کی ضرورت پڑی میں نے ان کی جیب ٹٹولی تو آپ کا خط ہاتھ آگیا۔ خط پڑھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں صبر نہ کرسکی اور ان سے جھگڑ پڑی۔ دراصل انھوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اگر انھوں جھوٹ نہ بولا ہوتا، تب بھی میں شاید ان سے عقد کرلیتی اس لئے کہ میں ایک جانس مجبور تھی۔ بلا شوہر کی عورت کتنی ہی پاکباز کیوں نہ ہو دوسرے اسے شک کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ میری ضعیف ماں کو بھی یہی فکر دامنگیر تھی کہ کسی طرح میری شادی ہو جائے۔ لیکن سعادت صاحب کے جھوٹ کا پول کھلا تو میری ماں کو بھی بہت دکھ ہوا۔ میرے بھائی نے انھیں سخت سست کہا تو ان سے بھی سعادت صاحب سے اچھا خاصہ جھگڑا ہوگیا۔ اس کے بعد سے سعادت صاحب ایسے غائب ہوئے کہ ان کا پتہ نہ چلا۔ میں امید سے تھی۔ اللہ پاک نے مجھے ایک فرزند دیا جو اب چار سال کا ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ سے میں دوسری

...ت کی کوشش بھی نہ کرسکی۔ میری غمزدہ ماں بھی گذشتہ سال
...ر کو پیاری ہوگئیں۔ اب میرے بھائی بضد ہیں کہ میں دوسری شادی
...یں تاکہ انھیں دو روٹیاں جو مجھے کھلانا پڑتی ہیں، نہ دینا پڑیں۔
...ا بھابی روایتی قسم کی بھابی ہیں ان کی بدسلوکی کی وجہ سے میں
...یشان ہوں۔ میں دوبارہ اسکول میں نوکری کی بھی کوشش نہ کرسکی۔
...ائی میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود ایک جگہ میری شادی ٹھہرا چکے
...یں۔ میری ہونے والی ساس صاحبہ کا حکم ہے میں اپنے ساتھ بچے کو
... لاؤں۔ کیونکہ پہلے ہی سے ان کی مرحومہ بہو کی دو لڑکیاں اور تین لڑکے
ہیں ـــــ مزید اور ایک لڑکے کو قبول کرنے کو وہ تیار
نہیں ہیں ـــــ اس ننھی سی جان کی وجہ سے ہمارے گھر میں روز
روز جھگڑے ہو رہے ہیں۔ میں کسی حالت میں بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو
اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں کیا کروں۔ مجبوریوں کی
زنجیر میں جکڑ چکی ہوں۔ میری ظالم بھابی مجھ پر دباؤ ڈال رہی ہیں کہ بچے
کو یتیم خانے میں داخل کرادو، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ یتیم نہیں ہے،
پھر اسے یتیم خانے میں کیوں بھیجا جائے۔

چار سال بعد سعادت صاحب کے کوئی دوست انھیں تلاش کرتے
ہوئے کسی طرح میرے گھر آئے تو میں نے رو رو کر انھیں اپنی بپتا سنائی۔
آدمی شریف تھے۔ سعادت صاحب پر لعنت ملامت کرتے رہے پھر انھوں
نے میری درخواست پر آپ کا پتہ مجھے بتا دیا۔ اور میں اپنے جگر کے ٹکڑے
کو یہ خط دے کر اس بہانے سے آپ کے گھر میں داخل کر رہی ہوں کہ یہ اس
کے باپ کا گھر ہے، جسے اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

بیگم صاحبہ! یہ چار سالہ بچہ اب اپنوں کے پاس آگیا۔ امید کرتی
ہوں۔ آپ اس ننھی سی جان کو اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں کی طرح پروان
چڑھائیں گی۔ بچہ ہر ایک کے ساتھ بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے بچہ بھابی
کے ظلم برداشت کرچکا ہے۔ آپ سب سے پیار و محبت ملے گی تو بہت
جلد گھل مل جائیگا پیار و محبت کا بھوکا ہے۔

بیگم صاحبہ!.... مجھ بیکس پر رحم فرمایئے اور اس ننھی سی
جان کو اپنا لیجئے۔ یوں سمجھئے میں آپ کے قدم چوم رہی ہوں۔ آپ
بچے پر رحم فرمایئے گا۔ یہ آپ ہی کے شوہر کی اولاد ہے اور جائز اولاد
ہے ـــــ

کم نصیب بیکس و مجبور آپ کی بہن۔ دل نواز

ایک لمبی سانس لے کر انھوں نے یہ طویل چٹھی ختم کی اور بچے کی
طرف متوجہ ہوگئیں، جسے لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا، واقعی بچہ انھیں تک
رہا تھا اور پوچھ رہا تھا" میرے ابو کہاں ہیں۔ میری امی کہاں چلی گئیں۔
انھوں نے بچے کو گلے لگا لیا، پیار کیا۔ اور اس سے پوچھا:
بیٹے تمہارا نام کیا ہے۔
بچہ معصومیت سے بولا" گڈو"۔
عابدہ خاتون نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا" دیکھو میرے لال میں آج سے
تم کو فراست کہا کروں گی سمجھ گئے نا۔ تم میرے بیٹے فراست ہو۔
عابدہ خاتون کی بڑی دو لڑکیاں تسکین و تحسین کو یہ ننھا گڈو بڑا پسند آیا۔
انھوں نے بچے کو نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ
اپنی ماں کو بھول کر ان بہنوں سے مانوس ہوگیا۔

عابدہ خاتون کو دلنواز کی تحریر سے بڑا دکھ ہوا۔ سعادت میاں کے
کردار اتنے گرے ہوں گے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔ کیونکہ بظاہر وہ بہت
شریف تھے ـــــ کبھی کسی عورت کی نظر بھر دیکھتے بھی نہ تھے۔ لیکن
دلنواز کی کہانی کی صداقت اس بچے ہی سے معلوم ہوگئی تھی انھیں دلنواز
سے دلی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن افسوس کہ بچے کو خط کے ساتھ اندر بھیجکر
وہ لاپتہ ہوگئی تھی۔ پھر عابدہ کو معلوم تھا کہ پانچ سال پہلے سعادت میاں کا کاروبار
بنگلور میں تھا۔

سعادت میاں کو دہرہ دون گئے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ اب ان کے
واپسی کے دن قریب آنے لگے عابدہ خاتون سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہیں۔
زندگی انھیں بے کیف لگنے لگی۔ سعادت میاں سے خط کا ذکر کیسے کریں۔ ان پر
اس کا ردِ عمل کس طرح ہوگا۔ وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے۔
یہی باتیں انھیں حد سے زیادہ پریشان کر رہی تھیں۔

اپنی ننھی مہوش سے بھی بیگانہ رہنے لگیں۔ اکثر پاؤڈر ملا کر دودھ
کی شیشی تسکین یا تحسین کو تھما دیتی تھیں۔ وہی مہوش کو دودھ پلاتیں۔
سرلاک بھی مہوش کو وہی کھلاتیں ـــــ عابدہ خاتون پلنگ پر لیٹے
طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر سوچوں کی وادی میں گم رہتیں۔

یوں تو عابدہ خاتون بڑی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں
سے بھی انھیں واسطہ پڑا تھا۔ وہ خوشگوار زندگی کی آرزومند تھیں۔ انھوں نے
مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ سعادت میاں سے دلنواز کے خط کا ذکر نہیں کریں گی۔
ان کا خیال تھا کہ اگر دلنواز کا خط سعادت میاں کو دکھا یا گیا تو واقعی

زندگی بدمزہ ہو جائے گی۔ سعادت میاں ان کے ساتھ پہلے کی طرح محبت سے پیش نہ آئیں گے۔ عابدہ خاتون ہمیشہ اپنے سرتاج کے پیار و محبت کی باتوں کی متمنی رہتی تھیں۔ ان کی ہر بات کو حکم کا درجہ دیتی تھیں اس فیصلے کے بعد انھیں کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ پریشانیوں میں قدرے کمی ہوگئی۔

آخرکار سعادت میاں کی آمد کے بعد انھوں نے سعادت میاں سے کہہ دیا۔ اللہ میاں کو ہم پر رحم آگیا، اس نے ہمیں ایک پلا پلایا فرزند دے دیا ہے۔ یہ میری بہن کی نند کا لڑکا ہے۔ چند ماہ پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ میں نے بچے کو گود لے لیا ہے۔

اندھے کو چاہیئے دو آنکھیں۔ سعادت میاں تو لڑکے کو دیکھکر خوشی سے پھولے نہ سمائے دو تین دنوں میں ہی فراست تسکین و تحسین کی طرح انھیں ابا..... ابا۔ کہنے لگا۔

مہ وش کی پیدائش کے بعد ان کا کاروبار خوب چلنے لگا تھا۔ چھ ماہ کی مہ وش چینی گڑیا کی طرح سرخ و سفید اور بڑی پیاری تھی۔ سعادت میاں ننھی مہ وش کو تسکین و تحسین سے زیادہ چاہنے لگے۔ سعادت میاں نے فراست کو کانونٹ میں داخل کر دیا۔ مہ وش بھی تین سال کی ہو چکی تھی۔ دوسرے سال اسے بھی کانونٹ میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح دونوں تعلیم حاصل کرتے رہے۔

تسکین و تحسین کو سعادت میاں نے سولہ اور اٹھارہ سال کی ہونے پر ہی شادی کر دی —— اور دونوں اپنی اپنی سسرال میں خوش و خرم رہنے لگیں۔

فراست اور مہ وش نے بھی عمر کی منزلیں طے کرتے کرتے کالج میں داخل ہوگئے۔

فراست بی۔ ایس۔ سی کے اختتام پر پہنچا تو مہ وش بی۔ ایس سی فرسٹ ایر میں گئی دونوں جوانی کے دور میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے دونوں کے دل بھی ایک دوسرے کے لئے دھڑکنے لگے۔

فراست کو سعادت میاں بہت زیادہ چاہتے تھے۔ عابدہ بیگم کے دل میں فراست کے لئے اتنی زیادہ چاہت نہ تھی۔ عابدہ خاتون کے غیر مانوس سلوک کی وجہ سے فراست اپنے آپ کو اس گھر میں اجنبی محسوس کرتا۔ وہ بھی سعادت میاں کی طرح سنجیدہ اور کم گو تھا۔ دل ہی دل میں مہ وش کو ٹوٹ کر چاہنے لگا۔ پہروں مہ وش کے تصورات میں کھویا رہتا، لیکن مہ وش سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مہ وش اپنے والدین کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے بڑی چنچل نکلی۔ ہمیشہ فراست کی پڑھائی میں مخل ہوتی، الٹے سیدھے سوالات کرتی۔ اسکی معصوم شرارتیں فراست کو بڑی پیاری لگتیں۔ یوں تو مہ وش فراست کو پرستش کرنے کی حد تک چاہتی تھی لیکن اظہار محبت میں پہل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو اچھی طرح احساس تھا فراست بھی اس کو بہت چاہتا ہے۔ فراست اتنی میٹھی نظروں سے اس کو دیکھتا کہ وہ جھوم جھوم اٹھتی۔ اپنے دل میں محبت کے پاکیزہ جذبات کو چھپائے فراست سے ایسے گھل مل کر باتیں کرتی جیسے محبت کے نام سے آشنا ہی نہ ہو۔

سعادت میاں فراست کو اعلیٰ تعلیمی مدارج تک پہنچانا چاہتے تھے، اس لئے اس سے کہتے رہتے تھے کہ وہ جہاں تک تعلیم حاصل کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اور جب سعادت میاں ایسی باتیں فراست سے کرتے تو عابدہ خاتون کے دل میں نہ جانے کہاں سے سوتیلا پن آجاتا تھا۔ رنج و غم کے شعلے ان کے دل میں بھڑک اٹھتے۔ اس وقت وہ غیر معمولی سنجیدہ اور پریشان نظر آنے لگتیں۔ اسی لئے وہ کہا کرتی تھیں کہ فراست کو اپنے کاروبار میں لگا لیجئے۔ آپ کی صحت اب ایسی نہیں رہی کہ آپ اتنی محنت کر سکیں۔

سعادت مسکرا کر کہتے۔ ہم کو تو اللہ میاں نے ایک ہی بیٹا دیا ہے اسے ہم خوب پڑھائیں گے وہ جل کر کہتی..... ہاں..... ہاں..... آپ کا بیٹا ہے نا بی ایس سی، ایم ٹیک، پی، ایچ ڈی ..... ایم فل..... کرائیے یہی نہیں، وہ یہ بھی کہنے لگی تھیں کہ میں بھی بوڑھی ہوگئی ہوں، اب گھر کا کام کاج سنبھالنا میرے لئے دشوار ہے۔ جلدی سے اس کی شادی کر دو تاکہ بہو آکر گھر کو سنبھالے۔

اس کے جواب میں سعادت میاں کہتے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ لڑکا ہے، لڑکی تو نہیں۔ شادی کرنا ہے تو مہ وش کی کرو۔ تم نے اسے تو بی۔ ایس سی میں داخل کرا دیا ہے، حالانکہ لڑکیوں کے انٹر تک کی تعلیم ہی کافی ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اسے گھر گرہستی کے کاموں میں اپنا شریک بنا کر ہر فن مولا بنا دیتیں۔

اس پر عابدہ بیگم کہتیں میں مہ وش کو ڈاکٹری پڑھا کر رہوں گی۔ اس سے پہلے گھر گرہستی کے چکر میں اسے ڈالنا مجھے پسند نہیں۔

سعادت میاں کو فراست سے عابدہ خاتون کا رویہ بڑا ہی عجیب لگتا۔ انھیں بڑی الجھن رہتی۔ کیوں عابدہ خاتون مہ وش کی طرح فراست کو نہیں چاہتی۔ انھیں کے خاندان کا لڑکا ہے۔ انھوں نے خود ہی اسے گود لیا ہے۔

بہرحال یہ فیصلہ انھوں نے دل ہی دل میں کرلیا تھا کہ وہ فراست سے مہ وش کی شادی کر دیں گے۔ مگر اس خیال کا اظہار انھوں نے بیوی سے نہیں کیا تھا۔

پھر سعادت میاں کی صحت خراب رہنے لگی، اس لئے انھیں فراست کی تعلیم ختم کرا کے اپنے ساتھ لگانا پڑا جب مہ وش بی، ایس، سی مکمل کر چکی تو ـــــ عابدہ خاتون کو ایک انجینئر کا رشتہ پسند آگیا۔ مہ وش اپنے والدین کی لاڈلی تھی۔ جب اس کو اس رشتے کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے سعادت میاں اور عابدہ خاتون کے سامنے اس رشتے کو ناپسند کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے صاف صاف کہدیا۔ شادی کروں گی تو صرف فراست سے۔

عابدہ خاتون سنتے ہی جان و دل سے لرز اٹھیں۔ غصّے میں آکر مہ وش کے گال پر زور دار طمانچہ مار دیا۔ کم بخت۔۔ ہمارے سامنے یوں منھ کھولتی ہے۔ کیا اسی لئے تجھے تعلیم دلائی تھی کہ تو بے شرم بن جائے۔ تجھے نہیں معلوم لیکن میں تو جانتی ہوں کہ فراست سے تیری شادی ـــــ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان پر کچھ بیہوشی کا سا غلبہ طاری ہوگیا۔

مہ وش سسکیاں بھرنے لگی۔ سعادت میاں نے بیوی کو سنبھالا اور مہ وش کو پیار سے اپنے کمرے میں چلے جانے کے لئے کہا۔

فراست کا کمرہ قریب ہی تھا۔ وہ اندر بیٹھا یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہہ سکے۔

جب عابدہ خاتون کچھ سنبھلیں تو سعادت میاں سمجھانے لگے۔۔ دیکھو بیگم۔۔۔ فراست تو آپ کی ہی نگرانی میں پروان چڑھا ہے۔ اس کی شرافت اور سنجیدگی آپ کو بھی پسند ہے وہ کتنا نیک، سعادت مند اور فرمانبردار ہے، تم خود جانتی ہو۔ پھر کیوں ہم اپنی لاڈلی بیٹی کو کسی غیر گھر جانے دیں۔ فراست لاکھوں میں ایک ہے اور پھر مہ وش بھی اسے چاہتی ہے، جیسا کہ آج اس نے ظاہر ہی کر دیا ہے۔

لیکن آپ نہیں جانتے کہ فراست سے مہ وش کی شادی نہیں ہوسکتی" عابدہ بیگم نے آخر کار راز اُگل ہی دیا" ایک ہی باپ سے پیدا بیٹے اور بیٹی کی شادی نہیں ہوسکتی۔

کیا مطلب ہے تمہارا بیگم، میں خاک نہیں سمجھا۔

فراست تمہاری بہن کی نند کا بیٹا ہے۔ جیسا کہ تم نے مجھے بتایا تھا ـــــ پھر ان میں بھائی بہن کا رشتہ کیسے ہوسکتا ہے۔

عابدہ بیگم اٹھکر اپنے کمرے میں گئیں اور وہ خط لاکر شوہر کو یہ کہتے ہوئے دے دیا کہ، ۲۰ سال تک میں نے اس راز کے بوجھ کو اٹھائے رکھا اور شاید کبھی اسے ظاہر نہ کرتی کہ مبادا آپ کو ندامت ہو، لیکن جو موڑ اب اسکی زندگی میں آگیا تھا، اس کے پیش نظر مجھے اسے افشا کرنا پڑا۔

سعادت میاں نے خط کو پڑھا تو انھیں ہنسی آگئی، انھوں نے کہا "بیگم کاش تم نے پہلے مجھے یہ بات بتادی ہوتی۔ دراصل بنگلور میں میرے کاروبار کے ساجھے دار کا نام بھی سعادت تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ میرا نام سعادت علی تھا اور اس کا سعادت حسین۔ مجھے لوگ سعادت میاں کہکر مخاطب کرتے تھے اور انھیں صرف سعادت کہتے تھے۔ یہ بات میں نے سنی ضرور تھی کہ انھوں نے بنگلور ہی میں کسی عورت سے شادی کرلی ہے لیکن یہ ان کا نجی معاملہ تھا، کاروبار سے اس کا تعلق نہ تھا، اس لئے میں نے کوئی توجہ نہ کی ـــــ اور پھر ان سے میرا کاروباری تعلق بھی ختم ہوگیا ـــــ بہرحال تم میری بات پر یقین کرو ـــــ نہ میں نے کوئی شادی تمہارے سوا کسی اور عورت سے کی نہ ہی فراست میرا بیٹا ہے، اس لئے اس کی شادی مہ وش سے ہوسکتی ہے۔ تم اطمینان رکھو اور مہ وش کو بھی بتادینا۔ فراست یقیناً میرے ہم نام پارٹنر ہی کا بیٹا ہوگا۔ کاش یہ عقدہ تم نے پہلے ہی کھول دیا ہوتا۔ عابدہ خاتون کو اپنے شوہر کے چال چلن پر ہمیشہ کامل اعتماد رہا وہ ان کی شرافت کی قائل تھیں۔ ان کا بیان سن کر انھیں یقین ہوگیا کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ درست ہوگا، اس لئے اب فراست اور مہ وش کی شادی ہوسکتی تھی، لیکن صبح جب سب بیدار ہوئے تو فراست کا پلنگ خالی تھا۔ اس پر ایک خط پن سے لگا ہوا تھا۔ گھبرا کر مہ وش نے اسے اٹھایا پڑھا اور پریشان ہوکر ماں کے پاس جاکر رونے لگی۔

گھبرا کر سعادت میاں نے اسے گلے سے لگایا اور گریہ وزاری کا سبب دریافت کیا۔ مہ وش نے خط باپ کو دے دیا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں بنگلور جا رہا ہوں اور اپنے ماں باپ کا پتہ لگا کر ہی واپس آؤں گا۔ خدانخواستہ پتہ نہ لگا تو واپس نہ آؤں گا۔

سعادت میاں بھی گھبرا گئے، لیکن انھوں نے مہ وش کو تسلی تشفی دے کر کہا کہ میں بھی بنگلور جا رہا ہوں۔ فراست کے باپ کا پتہ میں اس سے

زیادہ آسانی سے لگا سکوں گا۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ فراست اور سعادت کے بنگلور جانے کے دوسرے ہی دن فراست کی ماں سعادت میاں کے گھر آگئیں۔ طویل مدت گذر جانے کے باوجود وہ اس گھر کو بھول نہ سکیں، جہاں وہ اپنے لخت جگر کو ایک خط کے ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ اس وقت نہ تو اس نے سعادت میاں کے گھر کے کسی فرد کو دیکھا تھا نہ ہی سعادت میاں کی بیوی بچوں نے انھیں دیکھا تھا۔ اس روز وہ چوروں کی طرح آئی تھیں، لیکن آج انھیں کسی طرح کا خطرہ نہ تھا۔

سفید لباس میں ملبوس، چوڑیوں سے کلائیاں اور بکھرے بالوں سے یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ وہ کوئی بیوہ عورت تھیں جو کوئی سوال لئے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ عابدہ بیگم نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا" جہاں تک میرا حافظہ کام کر رہا ہے۔ آپ میرے لئے اجنبی ہیں۔ آپ کیسے آئی ہیں۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی میں۔

فراست کی ماں اپنی نگاہوں سے گھر کی تلاشی لے رہی تھیں۔ انھیں فراست کی تلاش تھی، لیکن انھیں کوئی نوجوان نظر نہ آیا۔ عابدہ بیگم قدرے پریشان ہو کر بولیں۔ بہن! آپ کیا دیکھ رہی ہیں۔ کچھ بتائیں تو مجھے" پھر انھوں نے فراست کی ماں کو ایک کرسی پر بٹھا کر خادمہ سے ناشتہ لانے کے لئے کہا۔

فراست کی ماں نے آخر کار قفل خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

" بہن! نہ آپ مجھے جانتی ہیں، نہ ہی میں آپ کو جانتی ہوں۔ تقریباً ۲۰ سال پہلے میں آپ کی ڈیوڑھی پر آئی تھی، لیکن آپ سے ملے بغیر چلی گئی تھی" قدرے سکوت کے بعد پھر انھوں نے کہا" شاید آپ سعادت صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں۔

تم نے ٹھیک ہی سمجھا واقعی میں وہی ہوں، لیکن آپ کون ہیں۔ اپنا تعارف بھی تو کرا دیں۔

اپنا تعارف کیا کراؤں۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں رشتے کا علم ہونے پر آپ کی ہمدردیاں ختم نہ ہو جائیں۔ لیکن اب تو مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ میں آپ کی سوت ہوں اور آپ کے سوتیلے بیٹے کو ایک خط کے ساتھ یہاں چھوڑ گئی تھی ——— کہاں ہے وہ، میرے جگر کا ٹکڑا ——— اس کی ایک جھلک مجھے دکھا دیجئے ——— وہ اچھا ہے نا ——— اب تو جوان ہو گیا ہوگا۔ میں اسے لے نہیں جاؤں گی ——— وہ آپ کا ہے، آپ ہی کے پاس رہے گا ———"

عابدہ بیگم اور مہ وش ہکا بکا ہو کر فراست کی ماں کو دیکھنے لگیں۔ پھر عابدہ بیگم نے انھیں گلے سے لگا کر اندر کا رخ کیا اور فراست کی ماں کو لے جا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ پھر انھوں نے ایک بڑے فوٹو کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ ہے ہمارا تمہارا بیٹا، فراست ——— مگر تم اس نام سے واقف نہ ہوگی، تم نے تو اس کا نام گڈو رکھا تھا۔ رکھا تھا نا یہی نام ——— اس نے یہی بتایا تھا۔

اس کے بعد مہ وش نے ایک البم نکال کر فراست کی ماں کو دے دیا، جس میں فراست کے اس وقت سے اب تک کے بہت سے فوٹوز شامل تھے۔ اسمیں ایسے فوٹوز بھی تھے، جن میں سعادت میاں اور عابدہ بیگم وغیرہ بھی فراست کے ساتھ تھیں۔

فراست کی ماں نے ایسے ہی ایک فوٹو کو دیکھ کر پوچھا" بہن! یہ کون صاحب ہیں۔

" ارے تم انھیں نہیں پہچانتیں بہن۔ یہی تو میرے شوہر اور فراست کے باپ ہیں۔

" یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ" فراست کی ماں نے چونکتے ہوئے کہا" یہ فراست کے باپ نہیں ہیں۔ اس بے وفا کو میں اب بھی ہزاروں میں پہچان سکتی ہوں"

تو پھر ہمارے شوہر کا یہ بیان سچ ہی ہے کہ انھوں نے نہ تم سے شادی کی اور نہ ہی فراست ان کا بیٹا ہے۔

" لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" فراست کی ماں نے کہا" مجھے تو یہیں کا پتہ دیا گیا تھا اور اسی گھر میں، اپنے لخت جگر کو اسی لئے چھوڑ گئی تھی کہ وہ یہاں چین سکھ سے رہ سکے گا ——— لیکن وہ ہے کہاں ——— کیا کرتا ہے وہ ——— میں اسے دیکھنے آئی ہوں بہن"

" لیکن" عابدہ بیگم نے آہستگی سے کہا" تمہیں آنے میں دیر ہو گئی ——— وہ کل ہی اپنے باپ کو تلاش کرنے کے لئے بنگلور گیا ہے ——— اور اسی تعاقب میں مہ وش کے ابو بھی بھاگتے ہوئے بنگلور گئے ہیں۔

اس کے بعد عابدہ بیگم نے پوری داستان احمدی بیگم کے گوش گذار کر دی کہ کس طرح انھوں نے فراست کو اپنی بہن کی نند کا

لڑکا بنا کر پرورش کیا ـــــ لیکن جب اس نے اور مہ وش نے آپس میں محبت کر کے شادی کرنے کا منصوبہ بنایا تو مجبوراً انھیں بھانڈا پھوڑنا پڑا۔ بہر حال فراست کی ماں کے آجانے سے عابدہ بیگم کا ماسبق شک بھی جاتا رہا ـــــ اور اب وہ سب سعادت میاں اور فراست کی واپسی کی دعائیں مانگنے لگے۔

فراست کی ماں نے اپنی قسمت کی خرابی کا رونا روتے ہوئے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے دوسرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ بھائی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھابی نے کوئی سہارا نہ دیا۔ سسرال والوں کے ظالمانہ برتاؤ سے تنگ آ کر اس نے ادھر کا رُخ کیا۔

کہتے ہیں ڈھونڈھنے پر آئے تو خدا بھی مل سکتا ہے۔ سعادت صاحب تو شیطان کے چیلے تھے۔ سعادت میاں اور فراست نے ان کا پتہ لگا لیا۔ انھوں نے کسی دولت مند بیوہ کو پھنسا کر شادی کر لی تھی اور اس کے مرنے کے بعد اب ایک بہت بڑے کاروبار کے مالک بن گئے تھے۔

سعادت میاں نے انھیں فراست کی کہانی سنائی تو انھوں نے ندامت کے ساتھ قبول کر لیا کہ انھوں نے ہی فراست کی ماں کے پاس اپنے ایک آدمی کو بھیجکر سعادت میاں کا پتہ بتانے کی ہدایت کی تھی تاکہ فراست کی پرورش اچھی طرح ہو سکے۔

سعادت میاں نے انھیں ان کی اس حرکت پر اچھی طرح سرزنش کی اور اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ان کے ساتھ چلکر اسے مہ وش سے بیاہ دیں۔ سعادت صاحب تیار ہو گئے۔ انھیں اپنے بیٹے کو دیکھکر بڑی خوشی ہوئی تھیں، اس لئے کہ لاکھوں کا کاروبار تھا اور اولاد کوئی نہ تھی جنکو سے یہ تینوں لوگ واپس آئے تو سعادت صاحب کو مردانی حویلی میں ٹھہرایا گیا۔ عابدہ بیگم اور فراست کی ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا ـــــ پھر جس وقت عابدہ بیگم نے فراست کو اس کی ماں سے ملایا تو دونوں فرطِ مسرت سے رو دئے۔

بچھڑے مل جاتے ہیں جب فضل خدا ہوتا ہے

ابھی تک تو فراست کو صرف باپ کا پتہ تھا۔ مگر ماں نصیب ماں کا اسے بے حد خیال پیدا ہو گیا تھا، لیکن اسے تلاش کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی سراغ نہ تھا۔

عابدہ بیگم نے فراست کی ماں کو شوہر سے چھپا کر رکھا تھا، لیکن فراست سے ملانے کے بعد انھوں نے شوہر کو بھی ان سے ملا دیا ـــــ ملا ہی نہیں دیا بلکہ ان سے کہا کہ جب یہ بیوہ ہو چکی ہیں اور سعادت صاحب کی بیوی بھی اب اس دنیا میں نہیں رہ گئیں تو ان کی شادی ہو جانا چاہئے۔

اس کام کے لئے فراست کو اپنایا گیا۔ فراست کو اپنی مصیبت کی ماری ماں سے ویسے بھی بڑی ہمدردی تھی۔ اس نے باپ کو راضی کر لینے کا بیڑا اٹھایا۔ پڑھا لکھا اور ذہین نوجوان تھا۔ اس نے دو چار روز باپ سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ان کی محبت پدری کو جوش میں لایا اور اس کے بعد اس نے ان سے کہا کہ میں آپ سے ایک قول لینا چاہتا ہوں۔

محبت کے سیلاب میں بہتے ہوئے سعادت صاحب نے بیٹے کو گلے لگا کر کہا اے میرے لخت جگر۔ تو ہی تو میری کل کائنات ہے۔ ایک نہیں سو قول مجھ سے لے سکتا ہے۔

دیکھئے، پھر مکر نہ جائیے گا۔

"نہیں بیٹے۔ میں تیرے لئے اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔ تو کہکر تو دیکھ کہ کیا چاہتا ہے۔ کس بات کا قول لینا چاہتا ہے؟"

فراست نے باپ کے گلے میں جھولتے ہوئے کہا "اچھا تو پھر سنئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری ماں سے نکاح کر لیں۔

سعادت صاحب نے مسکرا کر کہا تیری ماں تو سعادت میاں کی بیگم صاحبہ ہیں ـــ کیا ـــــ

"جی نہیں" فراست نے کہا، میرا مطلب اپنی والدہ ماجدہ احمدی بیگم صاحبہ سے ہے ـــــ"

"لیکن بیٹا" سعادت صاحب نے حیرانگی سے کہا "میں نے تو سنا تھا کہ انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی اور پھر وہ نہ جانے کہاں ہوں؟

انھیں میں ڈھونڈھ نکالوں گا ابا جان۔

لیکن ـــ وہ شادی شدہ ہوئیں تو

آپ کو اس سے سروکار نہ ہوگا۔ میں آپ سے کسی ناجائز بات کی فرمائش نہ کروں گا۔

"تو پھر مجھے بھی انکار نہ ہوگا میرے لخت جگر"

اور پھر اسی شب کھانے کی میز پر جب سعادت میاں سعادت صاحب کو لے کر اندر آئے تو کھانے کی میز پر عابدہ بیگم اور مہ وش کے ساتھ انھیں ایک نیا چہرہ بھی نظر آیا، جسے سعادت صاحب پہچان نہ سکے۔

سعادت میاں نے انھیں مخاطب کر کے کہا "یہ ہیں میری بیوہ بہن

احمدی بیگم "

احمدی بیگم نگاہیں نیچی کئے شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھیں۔ سعادت صاحب نے بھی بس ایک اچٹتی سی نظر ہی احمدی بیگم پر ڈالی۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوسکتی تھی کہ ان کی احمدی بیگم یہاں موجود ہوں گی ــــ لیکن جلد ہی فراست نے مسکرا کر کہا "ابا جان! ذرا غور سے دیکھئے تو۔ کیا آپ نے محترمہ احمدی بیگم صاحبہ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ انھیں اچھی طرح پہچانتے ہیں "

سعادت صاحب نے اب چونکتے ہوئے نگاہ بھر کر احمدی بیگم کو دیکھا تو ان پر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ گو ایک طویل مدت گذر چکی تھی کہ انھوں نے انھیں نہ دیکھا تھا، لیکن ان کے خد و خال انھیں بھولے نہ تھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپالیا۔ ان کا ضمیر انھیں ملامت کر رہا تھا، اس لئے اور بھی کہ وہ اپنے بیٹے، اپنے دوست اور کبھی کے شریک کار، جن کے ساتھ انھوں نے دھوکا کیا تھا، ان کی بیوی اور اپنی ہونے والی بہو کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے سے عرق انفعال بہنے لگا تھا۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ ان سب سے آخر کار سعادت میاں نے اٹھکر ان کے چہرے سے ان کے ہاتھ اٹھائے اور بولے میرے ہمنام میرے دوست۔ ہم نے سابقہ سارے اختلافات ختم کر دیئے ہیں۔ ہم نے غلط فہمی ہی کے تحت سہی، لیکن تمہارے بیٹے کی پرورش و پرداخت اعلیٰ پیمانے پر کی ہے ــــ اور ظاہر ہے کہ اسے پال پوس کر اب تمہارے حوالے کرنا پڑے گا، اس لئے کہ تم اس کے اصلی والد ہو، لیکن اس حق المحنت کے عوض۔ میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم احمدی بیگم سے عقد نکاح کر لو تاکہ فراست کو ماں مل جائے۔ احمدی بیگم کی سابقہ تلخ زندگی مسرتوں اور شادمانیوں میں گذرے۔ اللہ نے تمہیں بہت کچھ دیا ہے اور جو نہیں دیا تھا وہ بھی چھپر پھاڑ کر تمہیں دے دیا ہے۔ یعنی ایک نیک اور سعادت مند اولاد ــــ اس کے ساتھ ہی نیک، پارسا اور شریف بیوی گویا سونے پر سہاگہ ثابت ہوگی ــــــــ

اتنا کہکر سعادت میاں خاموش ہو گئے تو سعادت صاحب نے کہا۔

" بھائی صاحب میں بخوشی اس کے لئے تیار ہوں "

سعادت میاں نے کہا "لیکن احمدی بیگم اب میری بہن ہے اسے جرہ کما باندھ لو ــــ اگر تم نے اب اسے کوئی تکلیف پہنچائی تو یاد رکھو کہ میں تم سے اس کا انتقام لوں گا "

فراست نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ابا جان! ابھی وقت میں بھی آپ کے ساتھ ہوں گا۔

اور پھر دوسرے ہی روز سادگی کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ مہر پر سعادت صاحب کا نکاح احمدی بیگم سے ہوگیا۔

فراست کے لئے سعادت صاحب نے کہا کہ میں اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہوں۔ بارات بنگلور سے لے کر آؤں گا۔

○ سدا بہار ناول

رومہ	مسرور جہاں	۲۰/-
تاباں	" "	۲۷/-
تزئین	" "	۲۱/-
صاعقہ	رضیہ بٹ	۳۰/-
روپ	" "	۲۴/-
نمو	" "	۱۴/-
اس دیوانگی میں	سلمیٰ کنول	۲۷/-
عروج	" "	۴۰/-
عندلیب	" "	۳۰/-
بے نام	" "	۳۵/-
نمود سحر	ہاجرہ نازلی	۲۲/۵۰
انتظار سحر	" "	۲۳/-
شہابی	شہناز کنول	۲۵/-
ظالم پناہ	رفیعہ منظور الامین	۳۰/-
سارے جہاں کا درد	" "	۲۱/-
پلکوں تلے	عطیہ پروین	۱۶/-
آنکھوں کے دیئے	" "	۱۹/۵۰
ناظمہ	" "	۲۳/۵۰
بہاریں پھر بھی آتی	" "	۱۸/-
ارجیت	عفت موہانی	۱۸/-
معصوم گناہ	وسیم بانو قدوائی	۱۵/-
انگارے	شبنم سحر	۳۲/-
چھل	عشرت تمیز	۴۴/-
صباحت	" "	۲۸/-

موجودہ قوانین اور طلاق کا مسئلہ

(از۔ حیدر عباس صاحب ایڈوکیٹ، الٰہ آباد ہائیکورٹ۔ بنچ لکھنؤ)

مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے جس میں مقتدر سنی شیعہ علماء اور دانشور شامل ہیں جمعۃ الوداع کے دن ۱۴ر جون کو تمام مساجد میں حالیہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف جس میں مطلقہ خاتون کو اپنے شوہر کے خلاف نان نفقہ کی ڈگری دی گئی تھی جو یوم احتجاج منائے جانے کی وجہ سے ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ شرع و فقہ کے مسائل نعرے بازی اور مناظرہ بازی سے الگ رکھے جائیں نیز ان کو علمی مباحث کے ذریعے حل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں علمائے دین، مسلمانوں کے دانشور طبقے کے ساتھ جو قانون شریعت سے واقف ہو اس سے قبل کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر بحث کی جائے یہ ضروری ہے کہ قانون شرع محمدیہ و فقہ کے متعلق اور ہندستان جیسے ملک میں جہاں ایک سیکولر جمہوری نظام قائم ہے جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اس میں مسلم قوانین کے طلاق کے بارے میں مزید غور و فکر سے کام لیا جائے۔

امام جعفر صادق کے بعد امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد امام یوسف اور امام محمد و دیگر مسلم قانون دانوں اور مفکرین نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید کی تشریحات سنت و حدیث کی روشنی میں شرعی فقہی مسائل کے عمیق مطالعے کے بعد کی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی تشریحات یا اقوال حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے خود اس بات کو واضح اور صاف طور پر یوں کہا ہے۔

۔ اگر ان کے اور ان کے کسی ایک شاگرد کے درمیان کسی ایک مسئلے پر اختلاف ہو تو ان کی رائے صحیح مانی جائے لیکن اگر ان کے اور ان کے دونوں شاگردوں کے مابین کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو ان کے دونوں شاگردوں کی رائے کو اولیت دی جائے۔

مسلم قانون شریعت قرآن مجید، سنت، حدیث اجماع و قیاس پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے وہی سنت و حدیث قابل قبول ہے جو قرآنی احکامات کے منافی نہ ہو۔ اسی طرح اس اجماع و قیاس کے نظریے نے اسلامی قانون شریعت کو وقت کے تقاضوں کے ہم آہنگ بنانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حضرت امام مالک نے "نئے مسائل پر نئے فیصلے" پر زور دیا ہے۔ اجماع کے اصول کی بنیاد پیغمبر اسلام کی اس حدیث پر مبنی ہے کہ اللہ مومنین کو ہرگز غلطی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اجماع کا مقصد کسی ایسے مسئلے پر جس کی صراحت و وضاحت قرآن مجید اور سنت و حدیث میں نہ ملتی ہو اس سے علمائے کرام کو عام اتفاق رائے سے فیصلہ کرنے کا حق ہے امام ابو حنیفہ کا نظریہ استحسان امام مالک کا استصلاح اور امام شافعی کا قیاس کے ذریعے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے مطابق اسلامی قوانین کو ترقی یافتہ بنانے اور وقت سے ہم آہنگ کرنے میں اہم رول ادا کرنے پر مبنی ہے۔

فلسفہ قیاس کی بنیاد پیغمبر اسلام کی اس حدیث پر قائم ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر قرآن مجید اور سنت سے ہدایت نہیں ملتی ہے تو عقل و فہم، دلیل و ادراک کی بنیاد پر عمل کرنا چاہیئے۔ قیاس کی بنیاد منطقی دلائل پر مبنی ہے۔۔ تیرہویں صدی میں امام تیمیہ نے اجتہاد کا نظریہ پیش کر کے اسلامی قوانین کو وسعت دینے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے میں مدد دی ہے بعد میں مصر کے عالم مفکر اور قانون دان محمد عبدہ اور ان کے استاد جمال الدین افغانی نے تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے اجتہاد پر زور دیا۔ ہندستان میں جسٹس امیر علی اور علامہ اقبال نے فلسفہ تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے آزادانہ غور و فکر کی دعوت دی اس ضمن میں علامہ اقبال نے قرآن مجید کی سورۃ ۲۹ — ۱۹،۷ کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا ہے۔۔ "جو اللہ کے راستے پر چلنے کی جد و جہد کرتے ہیں اللہ انھیں ضرور راستہ دکھاتا ہے۔۔"

موجودہ دور کے افراد ملت، مسلم مفکرین، فلسفیوں اور قانون دانوں کی ہزار سال سے زیادہ کی کاوشوں کو جنھوں نے قرآن مجید تشریحات سنت و حدیث کی روشنی میں اسلامی قوانین کو وسعت دے کر وقت کے ہم آہنگ بنایا۔ نا سمجھی میں پس پشت ڈال رہے ہیں اگر ایسا ہوا تو انسانیت کا یہ بحر العلوم ایک تنگ و تاریک کنویں میں مقید ہو جائے گا۔ قرآنی احکامات و ہدایات سنت و حدیث وقت کی قید و بند سے آزاد ہیں وہ ایک ابدی و لافانی دین

اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ہی ساتھ آج کے موجودہ ترقی یافتہ دور میں ایک عملی نظریۂ حیات اور جامع قانون کو پیش کرتی ہیں اسلامی قوانین جامع نہ ہو کر ایک متحرک روشن عملی ضابطۂ حیات پر چلنے کی ہدایت دیتے ہیں۔

اودھ اسٹیٹ ایکٹ

ہندستان میں مسلم قانون کا اطلاق ایک دشوار گزار مرحلہ ہے کیونکہ اس ملک کی غالب اکثریت غیر مسلم اقوام پر مشتمل ہے جب تک اس ملک پر مسلم حکمرانوں کی حکمرانی رہی مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ دارالقضاء کے ذریعے ہوتا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے کچھ عرصہ بعد ہندستان کی تمام اقوام پر جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں انگریزوں کے بنائے ہوئے قانون رفتہ رفتہ نافذ کر دیئے گئے۔ ضابطہ فوجداری و تعزیرات ہند میں فوجداری کے جو قوانین نافذ ہوئے اس میں جرم و سزا کے زمرے میں اسلامی قوانین ختم کر دیئے گئے۔ اسلام کے قانون شرع میں ایک شراب خوار کے لئے تازیانے کی سزا مقرر کی گئی ہے اسی طرح چوری کے ملزم کے ہاتھ کاٹنے اور زناکار کو سنگسار کرنے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ اگر کسی مقتول کے اعزا خون بہا لینے پر رضامند ہو جائیں تو قاتل سزا سے بچ سکتا ہے۔ لیکن وقت کی تیز رفتاری، بدلتے ہوئے سیاسی حالات کی وجہ سے آج کوئی مسلمان بھی مندرجہ بالا اسلامی قوانین کے نفاذ کی بات یا مطالبہ نہیں کرتا۔ اسلام میں اسلامی قوانین کے مطابق ایک مسلمان شخص کے انتقال کے بعد اس کے ورثا کو قانون شرع کے مطابق حصہ ملتا ہے لیکن ۱۸۶۹ء میں اودھ اسٹیٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت ایک مسلمان تعلقدار کے انتقال کے بعد اس کے بڑے لڑکے ہی کو حصہ مل سکتا ہے۔ اور اس میں حصص کی تقسیم نہیں ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں گود لینے یا متبنیٰ کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن اودھ اسٹیٹ ایکٹ کے تحت ایک مسلمان لاولد تعلقدار کو گود لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔

قانون شرع کے مطابق کوئی بھی نابالغ لڑکا یا لڑکی سن بلوغ پر پہنچ کر (۱۵ سال اندازاً) بالغ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن انڈین مجارٹی ایکٹ و گارجین مد وارڈ ایکٹ میں سن بلوغ کی بنیاد ۱۸ سال متعین ہے اسلامی قانون جس کے تحت ۷ سال سے کم عمر بچے کو ماں کی نگرانی میں سن بلوغ تک لڑکی کو دینے کا حق دیا گیا ہے لیکن گارجین اینڈ وارڈ ایکٹ مجریہ ۱۸۹۰ء میں عدالتوں کو اس امر کا مجاز کیا گیا ہے کہ وہ لڑکے و لڑکی کی بہبودی کو دھیان میں رکھتے ہوئے ماں باپ یا کسی بھی شخص کی نگرانی میں دے سکتے ہیں اس طرح قانون ہذا کو یکسر رد کر دیا گیا ہے اور وہ ٹیننسی ایکٹ آگرہ ٹیننسی ایکٹ ملک کی آزادی کے بعد خاتمہ زمینداری ایکٹ کے ذریعے زرعی زمینوں کے لئے وراثت کا ایک قانون بنایا گیا جو کہ مسلم قانون وراثت کے صریحاً منافی ہے۔ یہاں تک شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کے ذریعے صرف وراثت (بہ استثناء زرعی زمین) نکاح، طلاق، نان نفقہ جہیز و مہر گارجین شپ، ٹرسٹ و اوقاف کے معاملات ہی اگر فریقین مسلمان ہوں متعین کیا گیا ہے۔

اسی طرح بہت سے قوانین اور ضابطہ سے متضاد ہیں لیکن ان قوانین کے نفاذ کے خلاف عام مسلمانوں اور خصوصاً علماء کی جانب سے کبھی بھی کوئی مطالبہ مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ کرنے اور پرسنل لا نافذ کرنے کا نہیں کیا گیا جس سے یہ تاثر پیدا ہو تا گیا ہے کہ ملکی قوانین کو مسلمان اور علماء کرام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چونکہ ہندستانی عوام کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے اس لئے یہ توقع کرنا کہ اس ملک میں مسلم قوانین کا مکمل طور پر نفاذ کیا جائے گا ناممکن ہے۔ بیشتر اسلامی ممالک میں بھی اسلامی قوانین نافذ نہیں ہیں۔ خوش قسمتی سے اس ملک میں مسلم قوانین کو فتاوائے عالمگیری کے ذریعے مکمل طور پر جمع کیا گیا۔

اس ملک کی عدالتوں نے جس میں ہندو ججوں کی اکثریت رہی ہے قانون شریعت کو اپنی نظیروں کے ذریعے وسعت دی ہے اور آج تک اسے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کو چھوڑ کر شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جس میں اسلامی قوانین کو اپنے قانون میں قانونی حیثیت سے نافذ کیا ہو۔

طلاق

افسوس کی بات ہے کہ ہندستان میں جب بھی پرسنل لا کا سوال مسلمانوں کی صفوں سے اٹھایا جاتا ہے۔ وہ تعداد ازدواج، طلاق و نان و نفقہ تک ہی محدود ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتیں زندہ جلائی جاتی ہوں تعداد ازدواج پر کوئی پابندی نہ رہی ہو۔ اسلام نے عورتوں کے حقوق کو بلند کر کے محفوظ کیا ہے لیکن شاید ہی کوئی مسلمان طلاق کے بعد اپنی مطلقہ

شریک حیات کو ہراداکرتا ہو جس کی وجہ سے مطلقہ بیویوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ مہر کی ادائی کے لئے عدالت سے رجوع کریں۔ ہندستان میں ننانوے فیصدی قرآن مجید کے احکامات جو سورۂ نسار میں درج ہیں کے مطابق نہیں دیئے جاتے بلکہ جو طلاق کا طریقہ مروج ہے وہ طلاق البدعت یا طلاق المغلظ ہے۔

اس مسئلے پر تمام مسلم قانون دانوں کا اتفاق ہے کہ طلاق کا یہ طریقہ قانون شرع کے خلاف ہے یہاں تک کہ اگر مذاقاً حالت غصہ میں، نشہ میں، حالت جبر میں یعنی کسی کے دھمکانے یا زد دینے پر یا اپنے والد یا کسی اور کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ایک مسلمان تین بار طلاق کا لفظ کہدے تو وہ حتمی اور آخری طلاق ہے۔

اور پھر زن وشوہر بغیر حلالہ کے ایک دوسرے سے رجوع نہیں کرسکتے طلاق مغلظہ کے رائج ہونے کی وجہ سے سیکڑوں سال سے لاکھوں مسلم عورتیں خانماں برباد ہوچکی ہیں اور ان کی بربادی کیمپرسی پر مسلمانوں کے کسی گروہ اور طبقے نے غور وفکر کرکے اس کا حل نکالنا مناسب نہیں سمجھا جب کہ اسلامی ممالک میں اس مسئلے پر کافی غور وخوض کرنے کے بعد قرآنی احکامات کی بنیاد پر قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔

میں اس موقع پر صرف پاکستان کے مسلم فیملی لاز ایکٹ ۱۹۶۱ء کا حوالہ دینا چاہوں گا جس کی دفعہ، مندرجہ ذیل ہے۔

"...... ، (۱) الف کوئی بھی شخص جو اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہتا ہو وہ کسی بھی شکل میں طلاق کا فیصلہ جاری کرنے کے بعد حکومت کے مقرر کردہ صدر کو اس بابت طلاق کی نوٹس دے گا جس کی نقل زوجہ کو فراہم کی جائے گی۔

(۲) جو بھی شخص اس دفعہ کی مخالفت کرے گا اس کو ایک سال کی سزا یا پانچ ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں کی سزا دی جائے گی۔

(۳) اس وقت تک طلاق نافذ نہیں ہوگا جب تک صدر کو دیئے جانے نوٹس کی تاریخ سے ۹۰ دن نہ گزر جائیں۔

(۴) نوٹس کی وصولیابی کے ۳۰ دن کے اندر صدر ایک ثالثی کونسل فریقین میں مصالحت کرانے کے لئے تشکیل کرے گا اور ثالثی کونسل ہر وہ ضروری اقدامات کرے جس کے ذریعے فریقین میں مصالحت ہوسکے۔

(۵) اگر طلاق کے وقت زوجہ حاملہ ہو تو اس وقت تک طلاق نافذ نہیں ہوگی جب تک ۹۰ دن کی میعاد نہ گزر جائے

(۶) کسی بھی مطلقہ بیوی کے لئے اس بات میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی کہ وہ حلالہ کئے بغیر اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرے

اس سلسلے میں ایک دلچسپ مقدمہ جس کا فیصلہ پاکستان میں ہوا جو کہ ۶۴ء ۱۹ (مغربی پاکستان) کراچی صفحہ ۳۰۶ پر مندرج ہے۔ سماۃ توقیر فاطمہ نے اپنے شوہر کے خلاف عدالت سے نان نفقہ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈگری کے بعد توقیر فاطمہ کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ طلاق کے بعد فوجداری عدالت نے یہ حکم جاری کیا کہ توقیر فاطمہ صرف عدت کے ایام میں اسی مدت تک نان ونفقہ پانے کی حقدار ہے لیکن ہائی کورٹ نے فوجداری عدالت کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ طلاق اس وقت تک نافذ نہیں ہوگی جب تک کہ نوٹس کے بعد ۹۰ دن کی مدت ختم نہ ہوجائے۔

مسلم فیملیز ایکٹ ۱۹۶۱ء کے مندرجہ بالا دفعات سورۃ النساء میں بھی دیئے گئے قرانی احکامات کے عین مطابق ہیں اور اس قانون کو پاکستان کے تمام علماء کرام کی حمایت حاصل ہے۔ پاکستان ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف پاکستان میں ایک بھی ویسی آواز نہیں۔ آج جیسی آوازیں ہندستان میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے متعلق اٹھ رہی ہیں۔

جہاں تک مسلم قانون تعداد زوجیت کا تعلق ہے ہندستان میں گورنمنٹ کنڈکٹ رولس کے ماتحت تمام سرکاری ملازمین کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ بغیر حکومت کی اجازت کے دوسری شادی نہیں کرسکتے۔ لیکن گزشتہ ۳۰ سال میں اس قانون کے خلاف ہمارے علمار کرام نے کوئی متحدہ آواز نہیں اٹھائی اور نہ اس سلسلے میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے غور وفکر کرنا جاری رکھا۔ ہندستان میں یہ قانون صرف سرکاری ملازمین تک محدود ہے لیکن دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک میں جیسے مصر انڈونیشیا اور پاکستان میں یا تو تعداد ازدواج پر مکمل پابندی لگا

گئی ہے۔ یا دوسرے نکاح کو حالات کے تحت محدود کردیا گیا ہے۔ پاکستان میں مندرجہ بالا قانون کی دفعہ ۶ کے تحت ہر مسلمان پر لازم کردیا گیا ہے کہ وہ بغیر حکومت کے مقرر کردہ ثالثی کونسل کی اجازت کے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ جو بھی شخص ایک یا ایک سے زیادہ بیویوں کی موجودگی میں شادی کرنا چاہتا ہو اسے ایک درخواست حکومت کے مقرر کردہ صدر کو دینا پڑے گی جس میں اسے یہ وجہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ دوسری شادی کن اسباب کی بنا پر کرنا چاہتا ہے۔ ایسے شخص کو ایک درخواست حکومت کے مقرر کردہ صدر کو دینا پڑے گی جس میں متذکرہ وجہ بتانے کے ساتھ یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس نے اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں سے اس سلسلہ میں اجازت حاصل کرلی ہے ایسی درخواست کی وصولیابی کے بعد صدر شوہر اور اس کی موجودہ بیوی یا بیویوں کو اس بات کا اختیار دے گا کہ وہ اپنی اپنی جانب سے ایک ایک نمائندہ مقرر کردیں اگر ثالثی کونسل اس بات پر مطمئن ہوگی کہ دوسری شادی ضروری، مناسب اور انصاف پر مبنی ہے تو وہ ضمن شرائط پر مناسب سمجھے عائد کرنے کے بعد شوہر کی دوسری شادی کرنے کی وجوہ ظاہر کرتے ہوئے اجازت دے گا اور فیصلے میں اس کا ذکر کرے گا۔ اس فیصلے کے خلاف فریقین کو کلکٹر کے سامنے نگرانی داخل کرنے کا اختیار ہوگا جس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ اگر کوئی شخص ثالثی کونسل کی اجازت کے بغیر شادی کرتا ہے تو اسے تو اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کو اس کا پورا مہر یک مشت ادا کرنا ہوگا ورنہ وہ لگان کی طرح وصول کرلیا جائے گا۔

کیا پاکستان کا مندرجہ بالا قانون شریعت کے منافی ہے ؟ اس کا فیصلہ میں ہندستان کے مسلم علماء اور دانشور حضرات پر چھوڑتا ہوں کیا ہندستان میں مندرجہ بالا قانون کے نفاذ کی راہ میں کچھ رکاوٹیں ہیں ؟ اور اس طرح کے قانون کا نفاذ اس ملک میں بھی کیا جائے تو اس میں کس قسم کی دشواریاں پیش آئیں گی ؟ اس کے لئے میں ہندستان کے علماء، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دانشوروں کو دعوت غور و فکر دیتا ہوں۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے خلاف جو تحریک تحفظ شریعت کے نام سے پورے ملک میں چلائی جارہی ہے اس سے عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ عدالت عالیہ سپریم کورٹ نے مسلم پرسنل لا میں دخل اندازی کی ہے جب کہ یہ چیز (الزام) حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ہمارے ملک کے ضابطۂ فوجداری میں ۱۹۷۳ء میں بڑے پیمانے پر ترمیمات کی گئیں ان کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے ہوا۔ دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری بیویوں کو، بچوں کو اور والدین کو نان و نفقہ فراہم کرنے کی بابت ہے۔ اس دفعہ کے تحت زوجہ کی تعریف میں مطلقہ بیوی جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے اسے نان و نفقہ اسی حالت میں دلایا جائے گا۔ اگر وہ خود نان و نفقہ کی مستحق نہیں ہوسکتی لیکن اگر وہ طلاق کے بعد شادی کرے یا طلاق کے بعد اس کے تمام مطالبات جو پرسنل لا کے مطابق ہوں ادا کردیئے جائیں تو گزارے کی رقم منسوخ کی جاسکتی ہے۔

۱۹۷۴ء سے کر اب تک اس قانون کی مخالفت مسلمانوں کے کسی حلقہ سے نہیں کی گئی دس سال گزر گئے اس قانون کے نفاذ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں مقدمات فیصل ہوچکے ہیں اور مطلقہ بیویوں کو اپنے سابق شوہروں سے نان و نفقہ عدالتوں سے ڈگریوں کے مطابق مل رہا ہے اس سلسلے میں دو مقدمات سپریم کورٹ میں پیش کئے گئے جن میں دفعہ ۱۲۵ کے قانونی جواز کو اس بنا پر چیلنج کیا گیا کہ وہ مسلم پرسنل لا کے منافی ہے۔

سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے جو مسٹر جسٹس کرشنا آئیر اور دوسرے ججوں پر مشتمل تھی اس نے دفعہ ۱۲۵ کی آئینی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے برقرار رکھا۔ لیکن ایک دوسرے مقدمے میں سپریم کورٹ کی ایک دوسری بنچ نے جو جسٹس مرتضیٰ علی اور دوسرے ججوں پر مشتمل تھی دفعہ ۱۲۵ میں لفظ "زوجہ" میں مطلقہ بیوی کو شامل کرنے کے آئینی جواز کو قانونی تسلیم نہیں کیا۔ بعد میں مساۃ شاہ بانو نے اپنے مقدمے میں دفعہ ۱۲۵ کی مسلمانوں میں آئینی حیثیت کو چیلنج کیا جس کی وجہ سے یہ مقدمہ سپریم کورٹ آئینی اور دستوری بنچ کے سپرد کیا گیا جس نے دفعہ ۱۲۵ میں لفظ "زوجین" میں مطلقہ بیوی کی شمولیت کو آئینی و قانونی قرار دے دیا۔

ظاہر ہے کہ سپریم کورٹ کے ججوں کے موجودہ فیصلے کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں کوئی دخل اندازی نہیں کی گئی اگرچہ دخل اندازی مان بھی لی جائے تو یہ ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کی ترمیم کے ذریعے ہوئی جس کے خلاف موجودہ سپریم کورٹ کے فیصلے تک نہ کوئی جدوجہد کی گئی نہ اس کے تبدیل یا منسوخ کرانے کے لئے کی تھی۔ ممبر پارلیمنٹ کی جانب سے کوئی ترمیم پارلیمنٹ

میں پیش کی گئی۔ نہ ہی کسی مسلم تنظیم نے یا علماء کرام کی صفوں سے اس مسئلے پر غور و خوض کر کے رائے عامہ ہموار کی۔ آخر گیارہ سال تک مسلسل خاموشی کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران کے چونکنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ۔؟ اس کا جواب وہی دے سکتے ہیں ۔

جہاں تک موجودہ دفعہ ۱۲۵ کے ذریعے مطلقہ بیویوں کو نان نفقہ دلانے کا تعلق ہے اس پر آج تک کسی مسلم دانشور یا عالم نے یہ کہنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ کیا مطلقہ بیوی جو کہ نان و نفقہ کی محتاج ہو کو نان و نفقہ دلانے سے کسی مذہبی اور شرعی قانون کی مخالفت ہوتی اور قرآنی تعلیم سے روگردانی ہوگی ۔ ؟ کیا اس حقیقت سے کوئی بھی مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۴۱ میں مطلقہ بیوی کو بطور عطیہ اور اخلاقی احسان کے حسب ضرورت مالی امداد دینے کی ترغیب موجود ہے آخر کن قرآنی احکامات، سنت، حدیث کے ذریعہ ہدایت دی گئی ہے کہ مطلقہ عورت کو نان و نفقہ نہ دیا جائے اور لاوارث چھوڑ دیا جائے، جب کہ موجودہ دور میں تعلیم یافتہ اور متمول خاندان کی لڑکیوں کی شادی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے تو پھر مطلقہ بیویوں سے شادی کون کرے گا ؟ اگر مطلقہ عورتوں کو بغیر گزر بسر کے انتظام کے چھوڑ دیا جائے گا تو ان کے سامنے سوا جسم فروشی اور خودکشی کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جائے گا اور ہم مسلمان کیا اس طرح خود اسلام کی بنیادی تعلیم کے قاتل نہیں کہے جائیں گے ۔؟ کیونکہ ہندستان میں طلاق البدعت اور مغلظ کے مروج ہونے سے طلاق کے تناسب میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور غیر مسلم سماج کی طرح مسلم معاشرے میں بھی کیسی خرابیاں اور اسی طرح کے غیر انسانی بحرانی مسائل جنم لے رہے ہیں جو دوسری اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ کیا ہندستان کے علماء کرام اور مسلم پرسنل لا بورڈ اس بدعت اور مغلظ کو مسلم سماج سے دور کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھا کر حقیقی معنوں میں تحفظ شریعت کا فرض انجام دیں گے ۔؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن مجید، سنت و حدیث میں مطلقہ بیوی کو نان نفقہ دینے کی ہدایت نہیں ہے تب بھی کیا اس مسئلے کو اجماع و قیاس کی بنیاد پر مسلم علماء کرام از خود مطلقہ بیویوں کو نان نفقہ دلانے کا فتویٰ جاری نہیں کر سکتے ۔؟ آخر اس امر میں کون سی چیز مانع ہے ۔؟

مندرجہ بالا مضمون تحریر میں لانے کا ایک مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید سنت و حدیث کے ابدی اور لافانی احکامات کو محدود نقطۂ نظر کا نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ اس جامع مکمل ابدی قانون یا ضابطۂ حیات کو بالغ النظری سے دیکھا جائے اور جو بدعتیں ہمارے قانون شریعت یا سماج میں مروج ہو گئی ہیں ان کا سدِ باب کرتے ہوئے مسلم علماء کرام، دانشور قانون داں صحافی حضرات از خود قانون شریعت میں اس کے حقیقی منشاء کے مطابق تجاویز پیش کریں گے۔ اس طرح وہ اپنے سماج کی اصلاح کے ساتھ اس تشنگی کو بھی دور کر سکتے ہیں جو عام طور پر پائی جاتی ہے۔

مسلم قوانین کو وقت کی قید سے آزاد کر کے مسلم معاشرے میں ترقی پسندانہ تبدیلیوں کا موثر ہتھیار بنانا ہی مسلم علماء و مفکرین کا اولین فرض ہے ۔

"عبدالعزیز خالد"

عفت موہانی

انسان پرستش پسند ہے۔ ابتدائے آفرینش ہی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر قوم و مذہب میں عقائد کے مطابق خدا، دیوی دیوتا کا وجود پایا جاتا ہے۔ خدا کی وحدانیت کے ماننے سے پہلے بھی ؎

کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر

انسانی ذہن نے اپنی روحانی تسکین کے لئے بھی پیکر محسوس کی پرستش جاری رکھی ہے۔ اسے آئیڈیل پرستی یا آدرش پسندی کا نام دے لیجئے۔ ہیرو ورشپ بھی تو یہی ہے۔ جس کی مثال ڈھونڈنے کے لئے کسی انسائیکلوپیڈیا کے اوراق الٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدم قدم پر ہیرو لپند مل جاتے ہیں۔ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ آدمی جس کسی کو چاہتا ہو اسے اس کی ہم نشینی کا فخر یا ہم کلامی کا غرور بھی نصیب ہو۔ مفارقت اور دوری انسانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی بشرطیکہ معاملہ یہ ہو ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ میرا جنم اسی زمانے میں ہوا ہے۔ جس زمانے میں ایک تاریخ ساز ہستی جناب عبدالعزیز صاحب خالد بھی خدا کی رحمت و نعمت کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کا مجمل سا تعارف یہ ہے کہ وہ پاکستانی شاعر کہے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرے نظریے کا تعلق ہے۔ کسی شاعر ادیب یا کسی اور منفرد ہستی کو کسی مقامیت تک محدود نہیں کرنا چاہیئے۔ جس طرح آفتاب کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں رہتی۔ وہ بڑھتی ہے پھیلتی ہے اور باریک سے باریک معدوم سی درازے سے بھی فرش زمین تک پہنچتی اور اس حصۂ زمین کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک منفرد و مجتہد، موجد، مخترع، اور محقق شاعر کے کلام کو ہر صاحب ذوق و صاحب دل تک پہونچنا چاہیئے۔ اچھے کلام کی تبلیغ و اشاعت کا مؤثر ذریعہ ہی یہی ہے!!

جناب خالد صاحب جتنے مشہور و معروف ارض پاکستان کے لئے ہیں۔ اتنے معروف ہندوستان میں نہیں ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہی تو ہے کہ ہم ایک عجوبۂ روزگار، محیرالعقول، نابغہ ہستی سے ناواقف اور اس کے عجیب و غریب کلام سے یکسر محروم ہیں! صرف ایک مختصر سا حلقۂ اخص خاص حضرات ہی ان سے واقف ہیں۔ جنھوں نے اپنے علم و استعداد کے مطابق خالد صاحب کی بے انتہا تعریف و ستائش کی ہے۔

خالد صاحب دراصل بنیادی طور پر نعت گو شاعر ہیں۔ سب سے پہلا شعر جو اوائل مشق میں انھوں نے کہا تھا وہ بھی نعت ہی کا تھا ؎

اور اس کے بعد متفرق اسالیب سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ سب سے پہلے ان کی تخلیق "رہ رسم منزلہا"

شاہد احمد صاحب دہلوی کے مشہور رسالے ساقی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کے قلم نے کہیں منزل نہیں کی۔ وہ برابر رواں دواں ہے اور قلم کی طاقت و توانائی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ وہ مزید دشوار گزار راہوں پر سفر کرتا چلا جائے گا!۔

خالد صاحب نے پہلے نعتیہ مجموعہ کلام کا نام فارقلیط ہے۔ یہ سرکار نبی کریم کا اسم گرامی ہے۔ حضور کی مدح میں یہ طویل ترین اور خوبصورت ترین نعت شریف ہے۔ چند اشعار ہیں۔

میں فرش زمیں ہوں تو سقف سما ہے
میں سانسوں کا جہاں تو موج ہوا ہے

شہنشاہ لولاک و مولائے سدرہ
تو میرے تخیل سے بھی ماورا ہے

تری ذات فخر بنی نوع انساں
تو صل علی خیر خلق خدا ہے

ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ
تو قرآن ناطق نہیں ہے تو کیا ہے

انہی اشعار میں غنائیت اور ترنم کا انداز کتنا مسحور کن ہے۔

کریم السجیہ جمیل الطویہ
تو خیر البریہ شہ دوسرا ہے

یہ ایک بہت طویل نعت ہے! ——— اور اتنی مرصع اور اتنی موثر کہ یوں لگتا ہے الفاظ کا ایک سیل بے پناہ ہے جو شاعر کی محبت و ارادت رسولؐ کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے!۔

فارقلیط کے بعد خالد صاحب نے دوسرے نعتیہ مجموعے منحمنا "طاب طاب"

[illegible] ، حبابطا ، حفظیا اور حبیبہ لکھے ہیں۔ یہ نام ایک کم علم یا ذی علم کو بھی [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے خالد صاحب نے متعدد دوسرے حوالوں سے ثابت کر دیا ہے کہ بڑی معتبر کتابوں میں یہ سب نام حضور صلعم کا نامت ہی کے ہیں !۔

نعتیہ کلام کے علاوہ انھوں نے دوسری اصناف سخن پر بھی توجہ دی ہے۔ مثلاً سراب ساحل ، جو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ گیتا بخلی ، اسلوجی ، لحن حریر (رباعیات) کف گلفروش ، زرداغ دل ، اقبال عطیہ ، بادشمال ، پرواز عقاب ، کف دریا ، دانہ ہائے ریختہ ، اور متعدد دوسرا کلام اسی ضمن میں ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے قرآن پاک کا ترجمہ نظم کیا۔ جو فرمان جاوید کے عنوان سے پاکستان کے رسائل میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے بھی اسی قسم کی کوشش کی تھی۔ مگر خالد صاحب کا منظوم ترجمۂ قرآن بلاشبہ ایک کارنامہ ہے !۔

خالد صاحب اردو شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں وہ ہمہ گیر بھی ہیں اور ہمہ گیر بھی۔ ان کے کلام کا قدما ، معاصرین اور متوسطین کے کلام سے موازنے اور مقابلے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خالد صاحب پچھلے اور معاصر شعراء سے بہت آگے ہیں اور یقیناً مستقبل میں بھی ان سا عالم پیدا ہونا ناممکن ہے۔ دور حاضر کے یا قدیم شعراء میں بھی کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جسے عربی فارسی ہندی سنسکرت کے ساتھ ساتھ یونانی ، چینی اور گرگی زبانوں پر بھی ایسا عبور و دسترس حاصل ہو۔ عربی اور فارسی کے وہ اسکالر ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر دعوت غور و فکر دیتا ہے اور بہت کچھ سکھاتا بھی ہے۔ خالد صاحب نے شاعری کو محدود تخیل ، فرسودہ جذبات ، اور ناقص پیرایۂ اظہار کے دائرے سے نکال کر پیغمبرانہ عرفان کی نامعلوم رفعتوں تک پہونچا دیا ہے : اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان کے شاعرانہ محاسن کا احاطہ بھی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خالد صاحب ہی کا سا عالم فاضل ہو۔ اور فی الحال ہند و پاک میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک جتنے ضخیم و عظیم خالد نمبر نکلے ہیں۔ اور نجانے سینکڑوں یا ہزاروں لوگ ان کی مدح و ثنا کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب ادھورے اور نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔ اتنے عظیم [illegible] اور جیت ، علم و فن کی معراج پر پہونچے ہوئے بے بدل و بے مثال شاعر کی کما حقہ تعریف و ستائش کا حق کوئی بھی شاعر ادا نہ کر سکا !۔

[illegible] علمی تبحر ، ان کے بلند و برتر اظہار احساس اور انداز کلام کا کوئی [illegible] نہیں کر سکتا۔ اس کلام کے لئے [illegible] درست علم ، کافی وقت ، اور [illegible] وسیع مطالعہ درکار ہے۔ ایک مختصر سے تعارفی مضمون میں ان کے کمالات کا جائزہ لینا آفتاب کی کرنوں کو مقید کرنے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل ناممکن ہے !۔

سمندر کو عمیق ، آسمان کو بلند اور صحرا کو وسیع کہہ دینے سے اصلی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ گویا کہ ——— پانی میں اترتے نہیں منڈلاتے ہیں !

خالد صاحب لسان العصر ہیں۔ الفاظ کے جادوگر ہیں۔ معلومات کے کوہ گراں ہیں۔ افلاک تخیل کے بلند پرواز طائر ہیں۔ بحر العلوم کے ماہر غواص ہیں۔ لیکن پھر بھی ؎

خالد جو نظر آتا ہے کچھ اس سے سوا ہے

کسی کی صحیح تعریف وہ ہے جو دشمن کرے۔ پہلے پہل خالد صاحب کے مشکل اور ادق انداز اظہار پر اعتراضات کی بوچھار ہوئی۔ انہیں تمسخر و استہزا کا نشانہ بنایا گیا ، لیکن وہی معترضین بعد میں مداحین بن گئے۔ مگر خالد صاحب اتنے وسیع النظر اور ضابطہ انسان ہیں کہ جب ان پر پتھر پھینکے گئے۔ انھوں نے تب بھی اُف نہ کی۔ اور جب انھیں پھولوں کا مستحق سمجھا گیا تب بھی غرور و تکبر سے وہ کوسوں دور رہے۔ خاصان خدا کا یہی شعار ہوتا ہے۔

جتنی بھلی ان کی سیرت ہے۔ بے ریا ، بے غرض ، بے لوث ، انتہا سے زیادہ پُرمحبت اور مخلص انسان ہیں سیدھے سادے۔ معصوم سادگی پسند ، اسی قدر وہ حسین و جمیل بھی ہیں۔ اللہ خوبصورتی سے محبت کرتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اپنے ایک عبد عزیز کو اس نے تمام اعلیٰ صفات سے متصف کر کے اسے انعام میں وہ نعمتیں عطا کر رکھی ہیں جو لاکھوں میں ایک کو بھی شاید ہی نصیب ہوتی ہوں۔ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کسی انسان میں کوئی ایک خوبی ہو تو آدمی اس کی تعریف کرے یہاں تو صورت حال اُسی حدیث کی سی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ بارش کے قطروں میں پچھلے اچھے تھے کہ اگلے اچھے ہوں گے ، نگاہ حیران ، عقل گم اور شعور و فہم بجو۔ ان کا ہر شعر اول ریزہ بدل خیرو کی مثال ہے۔ کسے اچھا کہئے کسے بہت اچھا !۔

خالد صاحب کی بندہ نوازی اور خلوص کیشی کی یہ روشن مثال ہے کہ انھوں نے مجھ بے قسمت بے بضاعت [illegible] پر بھی اپنی توجہ

اور محبت دے رکھی ہے۔ بھلا وہ کہاں اور میں کہاں عرش و فرش کی بات ہے۔ میں کا وسبکسار ہوں وہ کوہ وقار ہیں۔ لیکن میرے لئے یہ اعزاز کتنا قیمتی ہے کہ ان کے خط مجھ بے نام کے نام آتے ہیں۔ اپنی دو کتابوں کا انتساب انھوں نے مجھ بے نوا کے نام کیا ہے۔ مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرا دماغ اتنا چھوٹا میرا علم اتنا محدود و ناقص اور میرا ذخیرۂ الفاظ اس قدر معدوم و مبہم ہے کہ میں پوری طرح خالد صاحب کی محبت، اخلاص، التفات، اور توجہ کے لئے کسی صورت اپنی نیازمندی کا اظہار نہیں کرسکتی۔ یہ حسرت ہے ؎

جو میرے دل میں ہے کیو نکر ہو بیاں

یا پھر یہ افسوس ہوتا ہے ؎

پیکر حرف میں کس طور ڈھلے جذب نہاں
میرے بس میں ہے فقط ان سے محبت کرنا۔

اس وحید الدہر شاعر کے چند اشعار دیکھئے۔ سمندر سے گویا میں بھرتی ہوں گھونٹ۔

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

میری اک عمر تجھ سے وابستہ
میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں

تو مرے خندۂ مسرور و مطمئن پہ نہ جا
اک آرزو مرے پہلو میں سوگوار بھی ہے

خالد! طیبی ذکر حبیبی
لب پر مسلسل صلّی علیٰ ہے

لکھنے والے نے عمر بھر کے لئے
میری قسمت میں رتجگے لکھے

طلوعِ ازل سے غروبِ ابد تک
میں راہِ غمِ آرزو کا مسافر

یہ دنیا نمود کی ہے یہاں
خلوص و وفا کا کام کہاں

بہر حال یہ چند [illegible] اشعار میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی سمندر کے چند قطرے۔ [illegible] کام نہیں ہے!

یہ چند سطریں [illegible]
[illegible] الفاظ ہیں

سوز دل پیرایۂ اظہار۔
شعر کا مصنف کتابوں میں چھپتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ایک عمر اور ساری عمر کا علم بھی ناکافی ہے!

اے ماہِ محرّم

نازش رضوی

پھر ارض و سماوات میں رونے کی صدا ہے
اے ماہ محرم
غمگین تری آمد سے ہر اک سمت فضا ہے
اے ماہ محرم
اسلام کی عظمت کا نشاں تیری گواہی
اے وقت کے راہی
تو دینِ خدا کے لئے پیغام بقا ہے
اے ماہ محرم
ہے ماتم شبّیر میں تائید الٰہی
اور پشت پناہی
حیرت سے زمانہ تجھے کیوں دیکھ رہا ہے
اے ماہ محرم
ہے جانِ رسولِ عربی سے تجھے نسبت
اے غم کی علامت
ماحول میں آنے سے ترے آہ و بکا ہے
اے ماہ محرم
کس طرح سے تڑپے تھے مدد کرنے کو لاشے
بے کس کی صدا سے
دنیا کے لئے آج بھی تو درس وفا ہے
اے ماہ محرم

تبصرا

"حرف نوا" شعری مجموعہ جناب جنید حزیں لاری سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ۱۰۸ صفحات ۔۔ کاغذ نفیس، کتابت طباعت اچھی۔ گرد پوش دیدہ زیب قیمت بیس روپیہ جو اس گرانی کے دور میں نہایت مناسب ہے۔

"حرف نوا" اتر پردیش اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کرائی گئی ہے ۔۔ ملنے کا پتہ۔ خواجہ سرفراز احمد، پیپر مرچنٹ۔ دال منڈی۔ وارانسی۔ کتاب میں حمد و نعت کے بعد تقریباً ۵۰ غزلیں۔ چند منظومات کچھ قطعات اور حسین اور معیاری کلام کے ساتھ ہی مورکے پیروں کی طرح چار ترقی پسندانہ نظمیں بھی شامل ہیں، جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہوتیں تو اچھا ہی ہوتا۔

"حرف نوا" کے تعارف میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے لکھا ہے "ستائش اور حسن طلب ان کی تخلیق کے محرکات و مقاصد نہیں اس لئے وہ سچائی کو کسی تکلف و تصنع کے بغیر سامنے لے آتے ہیں۔ سچائی کے اظہار کا یہی اسلوب ان کی شاعری کی جان ہے"

ان الفاظ سے حزیں صاحب کی شاعری پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ چند اشعار نمونتاً ذیل میں دے رہا ہوں تاکہ آپ لطف اندوز ہو سکیں۔

ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے
کیا گردشِ ایام سے ڈر جائیں گے ہم لوگ.

وہ دور ہے کہ حوصلے پستی کے ہیں بلند
ذرّات ڈالتے ہیں مہ و مہر پر کمند

ادنیٰ سے اک دماغ میں قدرت کا یہ کمال
اسرار کائنات کا دفتر لئے پھروں

کچھ اور فاصلوں کو بڑھا دیں گی قربتیں
ہے شرط دوستی، تو مرے پاس آیئے

قطعہ

تری زلفوں میں امڈتی ہوئی ساون کی گھٹا
تیری آنکھوں میں مچلتی ہوئی برسات کی رات
یہ پھواریں۔ یہ ہوائیں، یہ چھلکے ہوئے جام
رہ بھی جا اے مرے محبوب یہیں رات کی رات

شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ اسے خرید کر لائبریری میں رکھا جائے۔

"قرآنی علاج" مؤلفہ قاری محمد ابراہیم عابدی صاحب۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۰۴، کتابت و طباعت صاف ستھری۔ قیمت چھ روپیہ پچاس پیسے۔ ناشر مسعود میموریل چھوٹا قاضی پور۔ گورکھپور۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں آیات قرآنی اور دعاؤں کے ذریعہ بیماریوں کو دفع کرنے کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ کلام اللہ کے اوصاف سے ہر مسلمان واقف ہے۔ البتہ اس کے لئے میرے خیال سے عامل باعمل ہونے کی ضرورت ہے۔ مؤلف کتاب ہٰذا قاری محمد ابراہیم عابدی صاحب ماشاء اللہ عامل باعمل ہیں، اس لئے جو کچھ ہدایات دعاؤں کے ذریعہ علاج کے متعلق ہیں وہ موصوف کی آزمودہ ہیں اعتقاد ہو اور پاکی و طہارت کے ساتھ ایسے علاج کئے جائیں تو اللہ چاہے گا تو ضرور فائدہ ہوگا۔ ویسے تو سب کچھ اللہ پاک کے اختیار میں ہے۔ دواؤں سے بھی شفا اسی وقت ہوتی ہے جب خدا صحت بخشتا ہے۔ یہی صورت دعائیہ علاجوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے، جس کا مجھے خود تجربہ ہے اس لئے کہ ایسے علاج میرے دادا، پردادا ہی نہیں میرے والد مرحوم بھی کیا کرتے تھے اور بیشتر مریضوں کو شفا حاصل ہوتی تھی۔ عام بیماریوں کے ساتھ ہی آسیبی خلل کے سلسلے میں بھی عمل و علاج بتائے گئے ہیں۔

رَدِّ عمل

محمد اللہ خان

بہت سے والدین کو اپنے بچوں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ ان کا احترام نہیں کرتے۔ ان کا کہنا نہیں مانتے ان کی خدمت نہیں کرتے۔ اسی طرح اولاد کو اپنے ماں باپ سے۔ ساس سسر کو اپنی بہوؤں اور دامادوں سے۔ بہوؤں اور دامادوں کو ساس سسر سے، بہنوں کو بھائیوں سے، بھائیوں کو بہنوں سے، بڑوں کو چھوٹوں سے اور چھوٹوں کو بڑوں سے شکوے شکایتیں ہوتی ہیں جن کا بھری محفلوں اور نجی صحبتوں میں بڑے جوش و خروش سے پروپگنڈہ بھی کیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ایک شخص اپنے جن عزیزوں کو برا کہتا ہے انھیں دوسرے لوگ بھی برا سمجھیں اور سماج میں ان کی پوزیشن خراب ہو جائے۔

ہمارے یہاں ایک ضعیف شخص رہتے ہیں۔ انھیں اپنے بیٹوں اور بہوؤں سے بڑی شکایتیں ہیں اور وہ بالخصوص اپنی ایک بہو کی بہت برائی کرتے ہیں۔ ایک رات وہ اتنے سخت بیمار ہو گئے کہ انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا اور ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ نماز کے پابند ہیں لیکن اس دن عشاء کی نماز بھی نہ پڑھ سکے ان کی اس کیفیت کی ان کے بیٹے کو اطلاع کی گئی تو وہ انھیں اپنے گھر لیجانے کے لئے فوراً رکشہ لے کر آ گیا اور انھیں رکشہ میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران انھیں ہوش آ گیا تو بیٹے کی صورت دیکھتے ہی بڑی بے زاری سے بولے۔ ”تو کیوں آیا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے گھر چلئے آپ کے لئے رکشہ لے آیا ہوں۔“

”میں ٹھیک ہوں تیرے گھر نہیں جاؤں گا۔“

دوسرے [illegible]

[illegible]

چارپائی پر پڑ گئے۔

انھیں بڑے میاں کی آنکھ کا آپریشن ہوا تو انھوں نے ایک غیر عورت کو پیسے دے کر اپنی تیمارداری کے لئے مقرر کر لیا۔ اس کے باوجود ان کا بیٹا اور بہو ان کے لئے کھانا لے کر جاتے ان کی خدمت کرتے۔ بہو پاؤں دابتی لیکن بڑے میاں کو اس کی کوئی ادا پسند نہیں آتی تھی اور وہ اس کی ہر چیز اور ہر کام میں مین میخ نکالتے تھے۔ اس کے باوجود ان دونوں نے ان کی خدمت ترک نہیں کی لیکن بڑے میاں آنکھوں کے کیمپ سے ان کی برائیاں بیان کرتے ہوئے واپس آئے اور اب بھی ان کی تضحیک کرنے کا کوئی موقع نظر انداز نہیں کرتے۔

ان حالات میں ان کی بہو جسے وہ گھریلو فساد کی جڑ بتاتے اور اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ان کے بیٹے کو بھی باغی بنا دیا ہے۔ اپنے خسر کے اس غیر انسانی اور غیر شریفانہ عمل کے جواب میں کسی موقع پر سخت رویہ اختیار کرتی ہوگی تو بڑے میاں کو اپنے سماج میں یہ پروپگنڈہ کرنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہوگا کہ ان کی بہو نہایت نالائق اور ظالم ہے اور جو لوگ اصل حقیقت سے ناواقف ہیں وہ ان کی ضعیفی، کمزوری اور لاچاری کو دیکھ کر یہی سمجھتے ہوں گے کہ ان کے بہو بیٹے ان پر یقیناً ظلم کرتے ہوں گے۔

ہماری نگاہوں کے سامنے کچھ اس طرح کے واقعات بھی آتے ہیں کہ ماں باپ یا دوسرے بزرگ اپنے چھوٹوں کے ساتھ غیر شریفانہ اور جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں پھر بھی ان کی اولاد ان کے ساتھ غیر شائستہ رویہ اختیار کرتی اور قدم قدم پر ان کی دل آزاری کی مرتکب ہوتی ہے جسے دیکھ کر لوگوں کو بزرگوں پر ترس اور چھوٹوں پر غصہ آتا ہے جو فطری عمل ہے لیکن ان واقعات کے اصل کے پس منظر میں دیکھا جائے اور ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو کچھ عجیب و غریب واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ایک شخص پڑھے لکھے، مذہبی زندگی کے حامل اور [illegible]

[illegible]

دوسری اولاد کے مقابلے میں ان سے زیادہ قربت محسوس کرتی تھیں لیکن وہ اپنی والدہ سے ہمیشہ کشیدہ رہتے کبھی سخت کلامی کرگزرتے تھے جس کا انھیں بعد میں افسوس ہوتا۔ اس کے لئے وہ خود کو ملامت کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قلب کی تالیف کے لئے دعا بھی کرتے تھے لیکن اپنی ماں کی وفات تک ان کا رویہ تبدیل نہیں ہوا اور جب ان کی والدہ کی وفات ہوگئی تو انھیں سخت صدمہ ہوا اور وہ بلک بلک کر رو دئے۔

ان کے اس رویہ کو سمجھنے کے لئے ان واقعات پر نگاہ رکھنا ضروری ہے، جو ان کی ابتدائی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی والدہ نے انھیں اپنا دودھ نہیں پلایا تھا۔ کبھی اپنے ساتھ سلایا بھی نہیں۔ کبھی اپنے ہاتھ سے منھ دھلایا نہ نہلایا۔ بیماری میں ان کی تیمار داری نہیں کی۔ یہاں تک کہ کبھی سر پر ہاتھ بھی نہیں پھیرا بچپن کے دور میں وہ شخص اپنے دلی جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی ماں کے دستِ شفقت کا لطف اٹھانے کے لئے ان کی طرف بڑھتا تو وہ اسے اپنے جسم تو کیا، شفاف بستر سے بھی ہاتھ نہ لگانے دیتیں اور خادمہ کو حکم دے دیتیں کہ وہ بچہ کو وہاں سے ہٹالے۔

ان خاتون کا اپنے جگر گوشہ کے ساتھ وہ رویہ کچھ سال تک قائم رہنے کے بعد بدل گیا تھا لیکن بیٹے کے دل میں ان کی طرف سے جو بیزاری پیدا ہوگئی تھی اس نے اس کے دل و دماغ اور احساسات کو اس مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود ان تلخ جذبات پر قابو حاصل نہ کرسکا اور عمر کے کسی بھی حصے میں اپنی ماں سے صحیح جذباتی تعلق قائم نہ کرسکا۔

ایک بچہ بہت چلبلا اور اس کے ابا اسی درجے کے غصہ ور تھے۔ وہ بچہ کی ہر شرارت پر اسے بڑی بیزاری سے ڈانٹا کرتے اور ذرا سی بات بھی نظرانداز نہ کرتے تھے اس بچہ سے کھانا کھانے کے دوران نادانستہ طور پر پانی کا گلاس الٹ جاتا، یا بھاگتے میں کواڑ سر میں لگ جاتا تب بھی وہ خاموش نہ رہ سکتے بچے کے سر میں چوٹ لگتی تو فطری طور پر اس کے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ اس کے ابا اس کا سر سہلا دیں۔ ہمدردی کے دو الفاظ کہدیں لیکن ابا اس موقع پر بھی اسے ڈانٹتے ہوئے یہ فرماتے تھے ۔۔۔ "اچھا ہوا سر پھوٹ گیا تم بیہودہ شرارتوں سے باز ہی نہیں آتے ۔۔۔"

باپ کے اس تند و تیز رویئے کو وہ بچہ عمر بھر نہ بھلا سکا اور عمر کے ہر حصے میں باپ کے خلاف اس کے دل میں جذباتی لہریں ابھرتی رہیں۔

بعض لوگ اپنی اولاد یا دیگر متعلقین کے درمیان توازن قائم نہیں رکھتے۔ مثلاً بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں یا چھوٹے بیٹوں کے مقابلے میں سب سے بڑے بیٹے کے ساتھ بہت زیادہ مراعات برتتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ حرکت بھی کرتے ہیں کہ ایک بیٹے کے نام اپنی پوری جائداد منتقل کرکے دوسروں کو اس سے محروم کر دیتے ہیں اس کا جو نتیجہ ہوسکتا ہے اسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا اور محسوس کرسکتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اپنے متعلقین کے ساتھ دوسرے انداز کا برتاؤ کرتے ہیں ان کے متعلقین کا رویہ بھی ان کے ساتھ عموماً اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔

ایک صاحب کا لڑکا پاکستان چلا گیا تھا وہاں اس نے تجارت میں اس درجہ ترقی کی کہ لاکھوں میں کھیلنے لگا اس کے بیٹے بھی پڑھ لکھ کر معزز عہدوں پر فائز ہوگئے اس ماحول میں اس کے ابا کئی برس کے بعد اس سے ملنے پاکستان گئے تو اس نے ان کی خوب آؤ بھگت اور خاطر مدارات کی لیکن ایک موقع پر بڑے میاں کو یہ احساس ہوا کہ لڑکا انھیں نظرانداز کر رہا ہے اور اس کے اس رویئے کو انھوں نے اس کی غیر معمولی دولت مندی پر محمول کیا اور یہ سمجھے کہ لڑکا دولت کے نشے میں انھیں نظرانداز کر رہا ہے۔ یہ بات بڑے میاں برداشت نہ کرسکے اور پہلے تو انھوں نے بیٹے کو خوب ڈانٹا اس سے ان کا غصہ کم نہ ہوا تو مارنا شروع کیا اور جب مارتے مارتے تھک گئے اور ان کی سانس پھول گئی تو کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ بیٹے نے ان کی ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ سر جھکا کر برداشت کی وہ کمرے میں جاکر لیٹے تو بیٹا بھی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اور باپ کے پاؤں اس خیال سے دابنے لگا کہ انھیں یہ احساس نہ ہو کہ بیٹا ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ سے برہم ہوگیا ہے اور جب باپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو ان سے اپنی خطا کی معافی چاہی۔

بیٹے کی اس انتہائی سعادت مندی کا پس منظر یہ ہے کہ اس کی ماں اس وقت وفات پاگئی تھی جب کہ وہ بہت چھوٹا تھا اس وقت اس کے باپ نے اسے باپ کی شفقت کے ساتھ ماں کی بھرپور محبت بھی دی اور کافی متمول ہونے کے باوجود یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ بچے کو خادموں کے سپرد

کردیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے وہ سارے کام کئے جو ایک شفیق ماں اپنی اولاد کے لئے کر سکتی ہے۔

اسی طرح کے عوامل دوسرے رشتوں اور تعلقات میں بھی اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً جو بہوویں یا داماد سسرال کی چوکھٹ پر چڑھتے ہیں شروع ایام میں اس نئے ماحول اور نئے بزرگوں کے طریقوں کا مشاہدہ کرنے کے دور سے گزرتے ہیں اس دور میں ان کے ساتھ جیسا رویہ اختیار کیا جائے مستقبل کے لئے خود ان کا رویہ اسی سے متعین ہوتا ہے۔

شادی کے ابتدائی دور میں دولہا دلہن کے جذبات و احساسات نازک آبگینوں کی طرح ہوتے ہیں اور ذرا سی بھی ٹھیس کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس خوابوں کی دنیا میں ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی بچہ کی سوتے میں پٹائی کر دی جائے اس وقت شوہر اپنی بیوی کو بلانے سسرال جائے اور اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ "بیٹا! ابھی ایسی کیا جلدی ہے پھر آکر لیجانا" تو اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے اور وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہے تب بھی اس کا دل زبردست احتجاج کرتا ہے اسی لئے سمجھدار اس موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بیٹی اور داماد کے درمیان کبھی حائل نہیں ہوتے اور بیٹی کو روکنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اس صورت حال کے پیش نظر اپنے متعلقین کے ساتھ محبت آمیز ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے باہمی تعلقات خوش گوار رہتے ہیں۔ خاندان کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اور معاملہ اس کے برخلاف ہو تو عزیزوں اور رشتہ داروں کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ خاندان برباد ہو جاتے ہیں اور افراد خاندان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما رک جاتی ہے۔

لطیفے

• پروفیسر صاحب ریسٹوران میں جا کر بیٹھے۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ بیرا کھانا لگا کر چلا گیا۔ واپس آیا تو انھوں نے اسے ٹپ بھی دے دی اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

بیرے نے کہا "حضور آپ کو یاد نہیں رہا۔"

پروفیسر نے کہا "بھئی میں نے تمہیں ٹپ تو دیدی ہے"

بیرے نے کہا۔ جی ہاں، لیکن کھانا آپ نے کھایا ہی نہیں۔

• ایک پروفیسر صاحب نے چند طالبات کو پڑھانے کے لئے گھر پر بلایا پڑھنے کے بعد لڑکیاں رخصت ہو گئیں۔ لیکن خاتون بیٹھی ہی رہیں جب کافی دیر گذر گئی تو انھوں نے انھیں مخاطب کر کے کہا "بیٹی تم ابھی تک گئیں نہیں۔ تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔

خاتون نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا "خدا غارت کرے تمہیں۔ اب تم کو تمہاری بیوی بھی بیٹی نظر آتی ہے۔

• ایک پروفیسر صاحب بیٹھے اپنی بیوی سے باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بیوی بھی اتفاق سے فلسفہ کی پروفیسر تھیں، گھبرا کر بولیں معلوم ہوتا ہے میرے شوہر آگئے۔ یہ سنتے ہی پروفیسر صاحب گھبرا کر اٹھے اور کھڑکی سے باہر پھاند گئے۔

• شادی کے کچھ روز بعد میاں بیوی میں جھگڑا ہونے لگا۔ ایک روز بیوی نے غصے میں کہا تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ اگر میں اس گھر میں نہ آتی تو کتے لوٹتے نظر آتے۔ یہ ٹی۔ وی۔ یہ فرنیچر صوفہ سیٹ۔ قالین۔ الماریاں وغیرہ کہاں ہوتیں۔

شوہر نے بھی کہا "بیگم یہ بات کہنا تم کیوں بھول گئیں کہ اگر تم دولتمند نہ ہوتیں تو آج یہاں خود بھی موجود نہ ہوتیں۔"

• شادی شدہ مرد ایسی کار ہوتا ہے جسے عورت پوری رفتار سے دوڑا رہی ہو۔

• ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔ "تم سب سے زیادہ کس سے ڈرتے ہو؟"

جواب ملا۔ "خدا سے۔" "جھوٹ۔ یقیناً تم کنوارے ہو۔"

اس نے کہا۔ "نہیں جناب میری شادی ہو چکی ہے۔ لیکن بیوی مر چکی ہے۔"

حریمی دسترخوان

سیخ کے کباب

کباب درجنوں قسم کے پکتے ہیں۔ مسالوں اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے ان کی لذت بدل جاتی ہے۔ سیخ کے کباب اپنا علیحدہ ہی مزہ رکھتے ہیں اس لئے اور بھی لذیذ معلوم ہوتے ہیں کہ کم پکتے ہیں۔ ان کی تیاری میں سیخوں وغیرہ پر لپیٹنا اور سینکنا دشوار ہوتا ہے یا داروں میں کم ہی پکتے۔ لکھنؤ کے قریب قصبہ کاکوری شریف سیخ کے کبابوں کے لئے مشہور ہے وہیں کی ایک بہن صاحبہ ملنے آئی تھیں انھیں نے یہ ترکیب بتائی تھی۔ میں نے پکا کر کھائے کافی لذیذ تھے آپ بھی آزمائیں۔

سامان:۔ بلا چربی کا باریک قیمہ ۵۰۰ گرام کچے پپیتے کا [illegible] گرام (جتنے چھوٹے پپیتے ہوں بہتر ہوں گے) دھنیا بھنا ہوا ۵ گرام یا کچھ زیادہ دال چینی ۳ گرام زیرہ سفید ۵ گرام کالی مرچ ۱۰ عدد بڑی الائچی دو عدد۔ لونگ دس عدد۔ سرخ مرچ اور نمک حسب خواہش و ضرورت۔ زعفران ممکن ہو تو آدھا ماشہ ورنہ کیوڑے کا عرق دس گرام۔ گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت۔ پیاز ۱۰۰ گرام۔

ترکیب:۔ تمام مسالوں کو خوب باریک پیس لیں۔ پھر قیمے کو دھو کر نچوڑ لیں اور مسالوں کو ملا کر سل پر پیس لیں یا گرائنڈر ہو تو اس میں باریک کر لیں

بگھار:۔ پیسنے کے بعد قیمہ کو کسی بھگونے میں رکھ کر درمیان میں انگلی سے ایک بڑا گڑھا سا بنا لیں ایک پیاز کا نصف خول اس میں رکھ کر گھی ڈال دیں پھر ایک دہکتا انگارہ اس گھی میں ڈال کر جلدی سے ڈھکن بند کر دیں اور ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک یوں ہی بند رہنے دیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ کر گھی میں سرخ کر لیں پھر انھیں مسل کر قیمے میں ملا دیں اور لوہے یا تانبے کی سیخوں پر لپٹا لپٹا چڑھا کر ہلکی آنچ پر سینکیں ایک کڑاہی میں [illegible] کر گھی کا ہلکا ہلکا پچارا دیتی جائیں۔ سیخوں کو آہستہ آہستہ گھماتی رہیں جب کچھ لیں کہ کباب اچھی طرح سنک گئے ہیں تو کسی پتے یا موٹے کاغذ میں سیخ رکھ کر آہستہ سے کبابوں کو نکال کر پلیٹ میں رکھتی جائیں کھانے کے وقت پھر ہلکی آنچ پر گرم کر کے نوش فرمائیں۔

سیخوں کے اڈے ہوتے ہیں ان میں آسانی سے سیخوں کو لگا کر سینکا جا سکتا ہے اگر سیخیں ہوں اڈا نہ ہو تو دو تین اینٹیں دو طرف رکھ کر اس پر سیخوں کو رکھیں اور نیچے انگارے دہکائیں۔ اگر سیخیں نہ ہوں تو انھیں کبابوں کی ٹکیاں بنا کر فرائی پین میں تل لیں کافی لذیذ ہوں گی۔

(مسز بشریٰ فہیم انہونوی۔ لکھنؤ)

---

۲۰ راگست کو شش ناگپور والی گلی اور اسی شب مومن پورہ قبرستان میں سپرد خاک کی ہوا بیا اعزہ، اقربا اور پرستاروں کے ہجوم میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون میرا مرحوم کے تمام متعلقین اور خصوصا محمد حنیف صاحب مالک حنیف بکڈپو ناگپور سے تلقین صبر کرتے ہوئے ان کا شریک غم ہوں۔ (غمزدہ ۔ نسیم الجوزی)

• یاسمین پیرزمیز (دکا بند) افسوس کہ میرے نانا حاجی مختار احمد لاری صاحب دل کا دورہ پڑنے سے ۳۰ راگست ۱۹۸۴ء بروز جمعہ بوقت ۳ بجے دن اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم و صلوٰۃ اور پرہیز گار تھے۔ اپنی نشانی ایک بیٹی طاہرہ اور اپنی بیوہ چھوڑ گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں اور پاکیزہ ہو۔ جس ماہ میں شعر چھپنا ہو، اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ رتاریخ تک دفتر میں وصول ہونے والے اشعار ہی شریک اشاعت کئے جاتے ہیں۔ اشعار کے ساتھ اپنا نام پتہ اور نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔ نومبر کے لئے مقررہ عنوان ہے "ارادہ" اور دسمبر کے لئے "آرزو"۔ (ادارہ)

زخم کو مرہم دل، درد کو درماں سمجھا
چارہ گر، خوب علاج غم پنہاں سمجھا

مرسلہ:۔ ب۔ ن آنسہ ابراہیم (بنگلور)

ہمدم کیلئے ہمدم کی قسم، ہم دم سے گئے، ہمدم نہ ملا
زخم ایسا لگا، مرہم کے لئے مرہم بھی گئے مرہم نہ ملا

مرسلہ:۔ نگار سلطانہ جلیلی قمر لطیف (آمبور)

دل اگر پھول نہ تھا، کانچ کا ٹکڑا ہوتا
توڑنے والے کو اک زخم تو آیا ہوتا

مرسلہ:۔ ورسلا تنصیرہ تبسم (آمبور)
ایم ۔ اے پہلا سال (دھسن)

کون سا زخم ہے سینے میں مرے پوشیدہ
زخم وہ، دل کے دریچے سے دکھایا ہوتا

مرسلہ: اے رشید بلدہ عرق (بحرین)

دل پہ لگی خراش تو چہرے شفق ہوئے
اب تک تو زخم راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

مرسلہ:۔ تنویر شمسی (لکھنؤ)

وہ الم کشوں کا ملنا وہ نشاط غم کے سائے
کبھی رو پڑا تبسم، کبھی زخم مسکرائے

مرسلہ:۔ کاکا وحیدہ ناز (عمر آباد)

زخم جو دل پہ لگا ہے وہ بھرے گا کیسے
درد اپنوں نے دیا ہے، وہ مٹے گا کیسے

مرسلہ:۔ نجم النساء۔ (بجنل)

ہر زخم دکھو ہم نے سینے سے یوں لگایا
رہتا ہے ساتھ جیسے انساں کے اسکا سایا

مرسلہ:۔ طاہرہ تبسم اعظمی (راجہ پور سکرور)

دونوں کے زخم وقت کے مرہم نے بھر دئے
دونوں کے دل میں کوئی کدورت نہیں رہی

مرسلہ:۔ نیلوفر (پٹنہ)

کوئی پرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا
زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کیونکر

مرسلہ:۔ قمر قلعہ دار (بیجاپور)

کتنی یادیں زخم ہوئیں، کتنے زخم ناسور ہوئے
کیا کہیے اس پیار کے ہاتھوں ہم کتنے مجبور ہوئے

مرسلہ:۔ وحیدہ خانم (کلکتوی)

تیرے لب زخم کے کنارے ہیں
تیرے لب ہائے کتنے پیارے ہیں

مرسلہ:۔ اے، ایس نیاز احمد (ارکل گوڈ)

یہ زخم عشق ہے مرہم کہاں تک
علاجِ دیدۂ پرنم کہاں تک

مرسلہ:۔ نور جبیں، (رجہت۔ لوادہ)

اے معاذ اللہ، مجبورِ وفا کی زندگی
زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے

مرسلہ۔ عزیزہ خاتون (دھنباد)

کوئی داغ جل نہ جائے، کوئی زخم پھٹ نہ جائے
ذرا دیکھ کر گزرنا، مرے دل کی رہگزر سے

مرسلہ۔ مس روبی دیبا (آگرہ)

ہمیں بھی دیکھ کر ہم زندگی کے صحرا ہیں
کھلے ہوئے ہیں کسی زخمِ آرزو کی طرح

مرسلہ:۔ یاسمین (لکھنوی)

ہمیں کبھی ہے دیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو، تم بھی تو ہو آخر نظر والے

مرسلہ:۔ اقبال سلطانہ
(موتی نگر، محبوب نگر)

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

مرسلہ:۔ قرۃ العین (منڈپالی)

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

مرسلہ۔ مومنہ مختار (میسور)

ہر زخم ہے قبول مجھے اے نگاہِ ناز
ہموار ہے حسین مگر یہ بچے تو ہو

مرسلہ:۔ ناہید (میسور)

زخمِ جگر کھلا تو تبسم کہا گیا
انصاف ہو سکا نہ چمن میں کلی کے ساتھ

مرسلہ۔ شہناز بیگم (بنگارہ پیٹ)

زخموں سے چور چور ہے اپنا دلِ غریب
کچھ دوستی کے زخم ہیں کچھ دشمنی کے زخم

مرسلہ:۔ شمیمہ شاہین (ملکی محلہ۔ آرہ)

• نسیم بانو بیتیا۔ نمبر خریداری نہیں لکھا۔ شعر بھی موزوں نہیں۔
حالتِ زخمِ درونِ دیکھئے دل میں آکر
چشمِ خوں بار تو اک منظرِ بیرونی ہے

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (۹۰۹۹)

اتحاد میں طاقت

✡

آزاد ہندوستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے مہاتما گاندھی تمام زندگی برسرِ پیکار رہے اور آخر کار ڈیڑھ دو سو سال کی غلامی کی سیاہی ان کی بے مثال کوششوں سے دھل گئی لیکن کیا باپو اس تاریخی کامیابی سے مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ——— ؟ نہیں —— اگست ۱۹۴۷ء میں ان کا جسم اور ان کی روح ملک میں رہنے والوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے اور ساری انسانیت کو دکھوں سے نجات دلانے کے لئے چلائی جانے والی عظیم تحریک پر قربان ہو جانے کے لئے مضطرب تھی۔ وہ بے چین تھے ملک کے باشندوں سے اپنے ایک پیغام میں انھوں نے زور دار لفظوں میں کہا تھا۔

"جینا ہے تو ساتھ جیو، مرنا ہے تو ساتھ مرو
دونوں ہی صورتوں میں اپنے ان ساتھیوں سے دور
نہ رہو جو تم ہیں سے ہی ایک ہیں اپنے میں رسّی
جیسی طاقت پیدا کرو۔ دھاگے یا تنکے کی کمزوری نہیں"

کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ آج باپو کی یہ نصیحت کس قدر اہمیت رکھتی ہے —— ؟ کیا ہم قومیت کی روح کو اس کی قوت کو بے کار جانے دیں گے ——

کا ننگ ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ پیغمبروں پر بھی وقت پڑا تھا ہم پر
بھی آیا تھا۔ تب تعدیل نے پوچھا نہ شکیں کے پاس کچھ تھا۔ جمیل کی نئی نئی
نوکری لگی تھی۔ یہی بے چارہ بال باندھا غلام تھا جو ٹیوشن کر کے اپنا خرچ
چلاتا ہے فیس دیتا ہے۔ کتابیں خریدتا ہے۔ کپڑے بناتا ہے اور کھانا
پینا بھی الگ ہی ہے۔ مدتوں سے اس نے ہمارے گھر کا پانی تک نہیں پیا
اسی نے اس آڑے گاڑھے وقت میں ہماری مدد کی تھی۔ بہن احسان
ایک تنکے کی تنکری کا ہو تب بھی یاد رکھنا چاہئے میں پوچھتی ہوں۔ اس
کی ذات سے کسی کو نقصان کیا ہے۔ ہمارے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا
ہے کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ آخر کیوں ایک ایک کی آنکھوں
میں کھٹکتا ہے؟"

ارقم کی والدہ آسیہ بیگم نے منہ کی کھائی تھی۔ کھسیائی ہوئی بلی کی طرح
کھمبا یوں نوچا کہ ڈھکے چھپے انداز میں صنوبیہ پر تہمت رکھنے لگیں۔
دراصل ارقم بھڑکاتا تھا۔ اسے ایاز سے اتنی سخت دشمنی تھی کہ بعض وقت
وہ سوچتا کہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنی راہ سے ہٹا دے۔ ایاز نے اپنے زور بازو
ترقی کی تھی۔ اس نے محنت کی تھی مشقت سے اسے عار نہ تھا کسی کو بتائے
بغیر اس نے مزدوروں میں مل کر عمارتوں کے لیے اینٹیں ڈھوئی تھیں
چونا گارا ملایا تھا۔ اسٹیشنوں پر قلی گیری کی تھی۔ اور جب وہ میٹرک ہو گیا
تو اس نے چھوٹی جماعت کے طالب علموں کے ٹیوشن شروع کر دیے۔ اسے
اتنے ٹیوشن مل گئے کہ خود اس کی تعلیم کے لیے وقت کا نکلنا مشکل مسئلہ ہو
گیا تھا۔ اس نے سارا دن اپنے طالب علموں کے لیے وقف کر دیا اور خود
نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر اس کی سوئی ہوئی تقدیر بیدار ہو گئی۔
(باقی آئندہ)

اب تو سالے کو اور مارو۔!" شبیر نے یہ کہتے کہتے ایک تھپڑ ایاز کے رسید
کر دیا۔ جبیر نے ہنسی ضبط کر کے کہا: "پلا خدا کے ورنہ نہیں چھوڑا جائے گا۔!"
"بھیا!" صنوبیہ چیخی۔
"اسے بڑا رحم آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس غلام کی رشتہ دار ہے۔"
ارقم بولا۔ بس ان الفاظ نے جیسے ان چھوٹے شیطانوں کے آگ لگا دی
ایاز پر دفعتاً پل پڑے اور اسے رگید کر رکھ دیا۔ ارقم ہنس رہا تھا
صنوبیہ چلا رہی تھی۔ مگر ایاز خاموش پٹ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے نہ
ایک کراہ نکلی نہ اس کا ہاتھ ان پر اٹھا۔ اس کے رستے ہوئے گالوں پر
آنسو البتہ کبھی کبھی آ کر لکیریں بناتے قمیص کے کالر میں جذب ہو رہے تھے۔
اتنے میں صنوبیہ کی چیخ پکار سن کر اندر سے جمیل، ہاجرہ اور چھوٹی
بھابی بھاگ کر آئیں۔ ارقم دریچے کے پیچھے دبک گیا۔ شبیر بھی کھسک لیا۔
مگر جبیر غصے سے آگ بگولہ کھڑا رہا۔ ایک جارحانہ نظر ان بڑوں
پر ڈال کر بولا: "مار ڈالوں گا نوکر کے بچے کو۔ ہماری برابری کرنے چلا ہے"
"کیا ہوا۔ کیا کیا تم نے۔ یہ مار پیٹ کیوں شروع ہو گئی۔" جمیل نے کڑک
کر پوچھا۔ "جبیر۔ تم نے ہاتھ کیوں اٹھایا ہے اس پر۔"
"ماموں جان۔" صنوبیہ نے بلک بلک کر روتے ہوئے سارا قصہ کہا۔ اور
بولی: "ارقم نے کہا تھا۔ ماموں جان۔ ارقم نے ایاز کو مار کھلوائی۔ آپ اسے
بھی اتنا ہی ماریئے۔ دیکھئے۔ ایاز کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔!"
"یہ جھوٹی ہے ماموں جان۔" جبیر نے ڈھٹائی سے کہا: "اس نے ایاز کے ساتھ
مل کر ہمیں گالیاں دی تھیں۔"
"جھوٹے، اپاہج۔!" صنوبیہ غصے میں پاگل ہو کر جبیر پر جھپٹ پڑی: "میں

تمہاری طرح کمینی نہیں ہوں کہ گالیاں بکتی پھروں "
"ہٹ الگ، کم بخت" جبیر نے اسے جھٹک دیا "تیرے منہ سے بھی لہو نکال دوں گا!"

"پاجی بدمعاش رذیل۔ یہ چلن سیکھا کہاں ہے۔ غارت ہو جاؤ تم دونوں بھائی میری موت کا سامان بن رہے ہو!" ہاجرہ نے بے تحاشہ کئی طمانچے جبیر کے لگا دیے۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ جمیل نے حیرت سے پاگل ہو کر سوچا ان لڑکوں کی یہ معاندانہ فطرت آگے چل کر کوئی خطرناک گل کھلائے گی۔ انھوں نے ایاز کو اپنی طرف کھینچا اس کے منہ کا خون صاف کیا اور چمکار کر بولے "جاؤ۔ منہ دھو لو۔ رو نہیں۔ تم نے ان لوگوں سے کیا کہا تھا!"

ایاز سسکی لے کر چپ ہو رہا۔ صنوبیہ بول پڑی "کچھ بھی نہیں۔ اللو جان۔ میں اور ایاز مل کر پھول لگا رہے تھے۔ نہ یہ کچھ بولے تھے نہ میں بولی تھی۔ بڑے بھیا چھوٹے بھیا اور ارقم نے مل کر خواہ مخواہ انہیں مارا ہے۔" "ارقم سے بھی میں بڑی عاجز ہوں۔" چھوٹی بھابی نے آہ بھر کر کہا۔ "اکلوتے پن کے دُلار نے بدبخت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا بے چارے غریب سے اسے دشمنی کیا ہے۔ خواہ مخواہ پاپ سمیٹتا ہے۔ اسے تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ یہ بچے کو کھلائے!"

"اچھا اچھا۔ جو ہوا سو ہوا" جمیل نے کہا "یہ کھٹ پٹ تو بچوں میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی سیدھے سادے ہوتے ہیں کچھ کا مزاج تیز ہوتا ہے۔ اب چلو اندر چلو۔ بارش ہونے والی ہے۔ سب کو دالان میں رہنا چاہیے۔"

کو اتنی فرصت نہ ملی تھی کہ نانا کی خدمت کرتے۔ انھوں نے تو خیریت بھی نہ پوچھی تھی۔ تب بیگم سید کتنی اکیلی اور دہشت زدہ ہو گئی تھیں ان دنوں صرف ایاز ہی ایسا نکلا تھا۔ جس نے ہر طرح ان کی خدمت کی تھی۔ بھاگ بھاگ کر ڈاکٹروں کو لاتا تھا۔ دوائیں بند ھواتا تھا۔ رات رات بھر ان کے پاس جاگتا تھا۔ اور جب سید صاحب نے صحت مند ہونے کے بعد اس کی ان خدمتوں کا تذکرہ کیا تب جبیر نے کہا تھا۔

"اولاد اپنا فرض سمجھ کر تیمارداری کرتی ہے اور دوسرے لوگ غرض کے لیے۔ ہمیں جب کسی سے کوئی غرض نہیں ہے تو ہمیں خدمت کی کیا پڑی ہے!"

یہ تلخ دل شکن جواب جو تیر کی طرح بیگم سید کے دل میں چبھ گیا تھا اس کی کھٹک اور تکلیف جوں کی توں برقرار تھی۔ جل کر انھوں نے سمدھن کو جواب دیا تھا۔

"آسیہ بہن۔ سچ پوچھیے تو اب ہم اسی غیر کو اپنا سمجھنے لگے ہیں۔ انسان کی اولاد ہے۔ لوگ کتے بلی پالتے ہیں۔ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ بھلا کون ہے جو ہمیں ایاز کو اپنا کہنے اور سمجھنے سے روکے؟ کیا ہم کسی کو جوابدہ ہیں۔ کیا کسی نے ان کی پرورش میں ہمارا ساتھ بٹایا ہے۔ یا کسی میں اتنی ہمت ہے جو اسے اس گھر سے نکال سکے۔ وہ تو شاید کبھی تیرے میرے طعن تشنیع سن کر چلا جاتا۔ اسے تو شکیل کے ابا نے اپنی جان کی قسم دے کر روکا ہے۔ ہماری اولاد بے شک اپنے ہاتھ منہ کی ہو چکی کھانے لگی ہے۔ ہمارے دکھ سکھ کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ مگر کا کوئی ...

جاتے جاتے صنوبر نے گردن گھما کر دیکھا۔ دریچے میں کھڑے ارقم و شبیر ہنس رہے تھے۔ صنوبر چیخ کر بولی "ارقم۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ بہت نفرت ہے۔ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ تم اپنے گھر چلے جاؤ۔" اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ ارقم کے شیطانی چہرے کی مکروہ ہنسی غائب ہوگئی۔ یک بیک اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ہونٹ بھنچ گئے۔ شبیر اسے حیرت سے تک رہا تھا۔ بولا۔

"کیا تمھاری شادی صنوبر سے ہونے والی ہے؟ مگر ابھی تو تم صرف دسویں میں پڑھ رہے ہو۔ کہیں تمھاری نوکری بھی نہیں لگی۔!"

تو کیا؟ ارقم نے گردن اکڑا کر کہا "میرا اتنا بڑا گھر ہے۔ ڈیڈی کا بہت سا روپیہ بینک میں ہے۔ ڈیڈی نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے ایک کار دلا دیں گے! میرا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔ مگر انھوں نے شرط لگا دی ہے کہ پاس ہونے پر ہی کار خرید دیں گے ورنہ نہیں۔ اس لیے جھک مار رہا ہوں۔ باجی نے ۲ بڑے بڑے ٹیوٹر سر پر مسلط کر رکھے ہیں۔ ایسی سختی سے پڑھاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے گلے دبا کر مار ڈالوں۔ یقین کرو کہ کار کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ پھر کون اوقات خراب کرتا ہے۔ شادی ہو گی تو مزے میں گاڑی میں گھوما کریں گے!"

"ہمیں بھی بٹھاؤ گے کہ نہیں! ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے" شبیر نے کہا "سنا ہے کہ ہمارے باپ کے پاس تھی۔ مگر ممی نہ جانے کیوں ہمیں ان سے چھڑا لائیں اب ہم کون سے مزے میں ہیں۔ اپنے باپ کے پاس رہتے تو اچھا تھا!"

"اب کس نے روکا ہے۔ اب چلے جاؤ!" ارقم نے مشورہ دیا۔

صنوبر نے انٹرنس کے بعد تعلیم ختم کر دی تھی۔! اب وہ بوڑھے نانا نانی اور ماں کی خدمت میں لگی رہتی تھی!۔

بہت دنوں تک ایاز کا وجود خاندانوں میں چہ می گوئیوں اور سرگوشیوں کا باعث بنا رہا تھا!۔ ارقم کی والدہ کا خیال تھا کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے۔ یا ملازم کی حیثیت دی جائے۔ اسے گھر کا ایک رکن سمجھنا غلطی تھی۔ کتنی دفعہ وہ سید صاحب کی بیگم سے کہہ چکی تھیں "آپ لوگوں کو کسی خیر خواہ کی بات یا اسی کا مشورہ بد طینتی معلوم ہوتی ہے مگر دیکھنے والے تو دیکھتے ہیں کہ ایک گمنام لڑکے کو آپ نے کسی وجہ سے خاندان کا آدمی بنا رکھا ہے۔ ارے۔ کل تک وہ نا سمجھ بچہ تھا۔ مگر آج بائیس تئیس سال کا نوجوان مرد ہے۔ نامراد کو بیٹھی جگہ کی روٹیاں ایسی لگی ہیں کہ لنگوٹا سانڈ بن گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کا ڈھب ایسی کہ جیسے کسی شریف کے ہاں پیدا ہوا ہو۔ میں کہتی ہوں بھابی وہ مرد ہے۔ گھر سے نکلے گا تو کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے گا۔ آپ لوگ اس سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھیا اب ہم نے تم کو ہاتھ سیدھا کر دیا ہے۔ جاؤ اپنی روٹی آپ کھاؤ۔ اس طرح کسی کا در پکڑے بیٹھے رہنا اچھا نہیں ہے۔!"

بیگم کے دل میں لوکا سا اٹھ گیا! انھوں نے ان دس برسوں میں خوب اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ لوگوں کی فطرت اور طینت کیا چیز ہوتی ہے ان کے اپنے کیسے نکل گئے تھے اور یہ پرایا خون جو گمنام اور بے نام تھا ان کے حق میں خون کے ناطوں سے بڑھ کر اپنا ثابت ہوا تھا۔ ایک دفعہ سید صاحب بہت شدید بیمار پڑے تھے۔ تب ان کے اپنے لواحق

بے راہ روی سے دل گرفتہ ۔ ارقم کی بڑھتی ہوئی جسارت سے پشیماں
اور اپنے اجنبی محسوسات سے گھبرائی ہوئی وہ ایک ایسی نودمیدہ
کلی بن چکی تھی جسے چاروں طرف سے اٹھنے والی بادِ مخالف کھل کر پھولنے
نہ بننے دیتی ہو۔ جس پر بادِ سموم کا اثر ہو رہا ہو جو جھلس رہی ہو۔ وہ
جتنی شوخ اور خوش مزاج تھی اتنی ہی گم صم خاموش اور اداس بن
کر رہ گئی تھی!۔

ارقم گریجویشن کر کے اپنے گھر چلا گیا تھا۔! اور اپنی ماں پر زور
دے رہا تھا کہ وہ اب صنوبیہ کے لیے پیغام دینے میں مزید تاخیر نہ کریں
پچھلی یادیں جو زیادہ خوشگوار نہ تھیں اس کے ذہن سے محو نہ ہوئی تھیں
وہ دل ہی دل میں خائف رہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں پھوپھی جان یا
صنوبیہ انکار کر دے!۔

شبیر نے عرصہ ہوا میٹرک میں ناکام ہو کر معمولی سی ورکشاپ کھول
لی تھی ۔ وہاں وہ تین چار غنڈوں کے ساتھ بیٹھا پان چبایا اور
سگریٹ کا دھواں اڑایا کرتا تھا ۔ جبیر اپنی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ
گھومنے ڈلہوزی گیا تھا وہ ادھر ہی کا ہو رہا کسی نے یہ خبر سنائی تھی
کہ جبیر نے سارہ سے شادی کر لی اور اسی کے گھر رہ پڑا تھا ۔! بہرحال
ہاجرہ کی تقدیر نے انھیں اس عمر میں اس حال کو پہونچنے کے بعد بھی چین
سے بیٹھنے نہ دیا۔ ان کی صحت گر چکی تھی ۔ انھوں نے ڈھائی سال
قبل ہی پنشن لے لی تھی ۔ مکمل طور سے بڑھاپا ان پر چھا رہا تھا!۔
وہ صنوبیہ کے لیے فکرمند رہتی تھیں ۔ ایسا نہ ہو کہ قسمت لڑکوں کے
ساتھ ساتھ لڑکی کو بھی شکار کر لے!۔

"کہاں چلا جاؤں ۔ مجھے کوئی ان کا پتہ نشان معلوم ہے" شبیر نے
برا سا منھ بنا کر جواب دیا۔ "جو بھی یہی کہتا ہے ۔ ممی ظالم ہیں ۔ نہ ہمیں
باپ کے پاس رہنے دیا نہ خود رکھا ۔ محسن نانا کے ہاں پھنکوا دیا۔ کیا ہم
باپ کے رکھتے ہوئے بھی یتیم نہیں ہیں؟"
"بالکل بالکل!"
"ایک دن میں اور جبیر محسن نانا کے ہاں سے بھاگ کر اپنے ڈیڈی کے
پاس چلے جائیں گے!" شبیر نے کہا ۔ "کچھ تمھیں ان کا پتہ معلوم ہے؟"
"نہیں یار۔ میں تو فقط دو سال سے یہاں رہتا ہوں" ارقم سہما۔
"پہلے کی باتیں مجھے کیا معلوم ہیں ۔ مگر تم پوچھ لو نا اپنی ممی ہی سے۔!"
"وہ نہیں بتاتیں کہتی ہیں بدمعاش باپ کا نام لے گا تو گدی سے زبان
کھینچ لوں گی ۔ ہمنھ!۔ ایسی ہی نفرت تھی تو پھر ان سے شادی کیوں کی تھی؟"
"مگر وہ صرف تم تینوں ہی کے لیے تو محنت کرتی ہیں ۔ ایک دفعہ مجھ ہی
سے گیارہ سو روپے بیمہ کروائے تھے ۔ تب کوئی سی عید تھی شاید!۔
تمھارے باپ نے تمھارے ساتھ کیا کیا ہے ۔ انھوں نے پھوپھی جان
کو گھر سے نکال کے دوسری شادی کر لی تھی"
"جیسا سلوک ممی ہم سے کرتی ہیں ۔ ویسا ہی میرے باپ سے کیا ہو گا۔
وہ انھیں گھر سے نکال کے دوسری شادی نہ کرتے تو پھر کیا کرتے ۔
سچ مانو کہ مجھے ممی بالکل پسند نہیں ہیں ۔ مجھے اپنے ڈیڈی پسند ہیں ۔
بس بڑا ہو کر نوکر ہوں گا تو ممی کو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا!" شبیر نے
کہا ارقم چپ رہا۔ وہ اچانک کچھ سوچنے لگا تھا۔
"آؤ اندر چل کے بیٹھیں ۔ دیکھیں اس ملازم لونڈے کے کیا ڈلار

تھا چوکی یا عدالت کا نام بھی نہ لیا تھا۔ اب وہ لوگ حیران تھے۔
باجرہ کو دق میں مبتلا ہونے اور بیٹوں کی نازل کی ہوئی زبردستی
کی موت سے کیونکر بچائیں!۔"

وقت کے مضبوط ان دیکھے ہاتھ لمحوں کے فیتے کو مسلسل کھینچے جا رہے تھے
ایک ایک پل ایک ایک دن میں ڈھل رہا تھا اور دن رات کا چکر
ہفتوں مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہو رہا تھا!۔

زمانے کی عادت عجیب ہے کبھی کوئی بڑا انقلاب یکبارگی نمودار ہوتا
اور خاندانوں کا تختہ پلٹ دیتا ہے۔ کبھی کوئی انقلاب بہت آہستہ آہستہ
کسی کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ایک زہریلے سانپ کی طرح اچانک حملہ
کردیتا ہے۔ جیسے کسی مضبوط دیوار کی جڑیں قطرہ قطرہ پانی پہنچا کرے
اور بالآخر دیوار کو ڈھا دے!۔ ایک انقلاب گربہ قدم سید صاحب
کے خاندان کی طرف بھی بڑھا آرہا تھا!۔ جس کی بے آواز گونج بھی ان
کا دل ہلا رہی تھی اور وہ یہ انقلاب بڑے عرصہ سے دیکھتے آرہے تھے
جس سے بچنے یا جس کے مداوے کا کوئی موثر ہتھیار ان کے پاس نہ تھا

ان برسوں میں سید صاحب زیادہ کمزور ہوگئے تھے۔ گھر کا چارج
عدیل کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اور ان کی بیگم ان سے علیحدہ ہو کر اپنے
باپ کے گھر چلی گئی تھی! چھوٹے بھیا نے میڈیسن کر لیا اور ہاؤس جاب
کر رہے تھے۔ جن کے ہاں تین لڑکے اور ہو چکے تھے؟ صنوبیہ اب سترہ
اٹھارہ سال کی دوشیزہ تھی۔ اس طویل عرصہ میں جو کمل دس سال
پر محیط تھا۔ اسے خاصہ شعور آگیا تھا وہ اپنی پوزیشن جانتی تھی۔ ماں
کی بے کسی اور ان کے آنے والے بڑھاپے سے خائف۔ بھائیوں کی بدکرداری

ہو رہے ہیں" شبیر نے کہا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ صنوبیہ کو کیا ہوا۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ
اسے مجھ سے نفرت ہے۔ ابھی تک تو نہ تھی۔!"

ہاں" شبیر بھی چونک کر بولا "وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ تم سے
ہرگز شادی نہ کرے گی!" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگا۔ یہ
ہنسی اچھے اچھوں کو غصہ دلا سکتی تھی!۔ چنانچہ ارحم کو بھی غصہ آگیا
"کیسے نہ کرے گی امی جان نے تو کہہ ہی رکھا ہے کہ اسے ہم نہ چھوڑیں گے!۔"

کسی نے انھیں آواز دی تھی اور وہ اندر چلے گئے تھے!

اور کچھ دیر پہلے کا مہیب سناٹا اب پُرشور بارش میں تبدیل ہو چکا تھا۔
پختہ برآمدے پر پانی ایک آہنگ سے گر رہا تھا سیمنٹ کے شیڈ پر جیسے
پتھر کے ٹکڑے برس رہے تھے! کبھی کبھی بادلوں میں بجلی کڑکتی اور بادل کی
خوفناک گرج زمین کی بنیادیں تک ہلا دیتی! پل بھر کے لیے بادل کی گرج
میں بارش کا شور دب جاتا اور پھر وہی ہوا کے تیز جھکڑ، اور بارش۔ بارش
کے آثار تھے کہ دیر تک برسے گا۔

کھلی کھڑکی سے بوچھاڑ کمرے میں آرہی تھی۔ ہوا کے طوفانی جھکڑ بارش
کو ادھر ادھر اُٹھائے پھر رہے تھے۔ اس کمرے کا فرش دور تک بھیگ
گیا تھا۔ میز پر پھیلی ہوئی کتابوں تک پھوار آرہی تھی۔ کمرے کی حدود
وسعت میں گیلی سرد ہوا ابھری ہوئی تھی! کبھی بجلی بڑے خوفناک انداز
میں چمکتی تو کمرہ روشن ہو جاتا اور پھر مزید اندھیرا محیط ہو جاتا!۔ لیکن
ارباز عناصر کی برہمی سے لاپرواہ بستر کے ایک گوشے میں بیٹھا جانے
کیا سوچے چلا جا رہا تھا۔ ایک طوفان اس کے پھوٹنے سے دماغ میں بھی

تباہی مچا رہا تھا! - وہاں بھی غصے کی بجلیاں کوند رہی تھیں - وہاں بھی انتقام کے بادل گرج رہے تھے - لیکن آنکھوں سے بارش نہیں ہو رہی تھی - وہ جہنم کے الاؤ کی طرح جل رہی تھیں -

وہ سب کو تباہ کر دینا چاہتا تھا - اپنے ان دیکھے ماں باپ کو - میرن خالہ کو - اپنے بدترین دشمنوں کو - سب کو - جنھوں نے کسی وجہ کے بغیر اس کی زندگی اس پر حرام کر رکھی تھی - وہ خواب پرست اور خیال پسند تھا دنیا چاہے اسے کچھ بھی نہ دیتی - وہ اپنے خوابوں سے زندگی کی ساری رعنائیاں وصول کر لیتا تھا - اس کے خیال اسے ایک بہترین مستقبل کے سبزہ زار پر چہل قدمی کراتے تھے! لیکن یہ دشمن جو اسے ناجائز، ذلیل اور غلام جیسے القاب سے یاد کرتے تھے - اس کے رگ رگ سے لہو کھینچ لیتے تھے اسے خارزار حیات میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتے تھے - کیوں؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا - اگر وہ یتیم ویسیر ہے تو زیادہ محبت اور توجہ کا محتاج ہے - پھر ایک ہیبت ناک خیال اس کے دماغ میں تیز سلگتے انگارے کی طرح چیخا - ظاہر ہے کہ وہ یونہی وجود میں نہیں آیا - نہ آسمان سے ٹپکا ہے نہ زمین سے اگا ہے تو پھر کہاں ہیں اس کے وجود میں لانے کے ذمہ دار - کہاں ہیں؟ یہ سوال یوں اس کے سر کی وسعت میں گونجا کہ طوفانی بارش کا ہولناک شور معدوم ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ پاگل ہو کر کمرے سے نکل بھاگتا اور جانے کہاں بھاگتا چلا جاتا؟ - مگر اس نے بس سسک سسک کر رونے پر اکتفا کر لی! -

چپکے سے دروازہ کھلا - وہ سمجھا کہ گھر کی پلی ہوئی بلی گھس آئی ہے - لیکن دروازے میں پھیلی تاریکی میں صنوبیہ کا سفید لباس میں ملبوس نازک

معاشرے کی تمام خرابیاں ہاجرہ کے سامنے عیاں تھیں - لہٰذا انھوں نے امکان بھر کوشش کی تھی کہ لڑکی کو ہر طرح سجا سنوار دیں - صورتاً اس کی ہزاروں میں ایک تھی - سیرت وہ چمکا رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ تھوڑا ہی جہیز اور رام منھ مانگی تلک کے کلی پھندنے بھی اسے لگا دیں وہ ماں کی طرح دکھ نہ سہے - خوش رہے! لیکن ان کی بھی تقدیر عجیب ستم ظریف تھی ان کے لڑکے ان کے قابو سے باہر نکلے - لڑکی میں خاموش ضد تھی کہتی سب کی تھی مگر کرتی وہی جو اس کا دل چاہتا! -

شبیر جوں جوں بڑھتا گیا - خود سر، زبان دراز اور کم ظرف ثابت ہوا - جبیر اس سے دو ہاتھ آگے تھا - وہ اپنی دربدری کو ماں کا قصور ٹھہراتا تھا - ان میں جیسے جیسے دلیری آتی گئی وہ سب کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئے تھا اب وہ ناسمجھ بچے نہ رہے تھے - کسی بھی خواہ بزرگ سرپرست کی عدم موجودگی میں وہ من مانی کرتے تھے - ہاجرہ کے ماموں اور ممانی نے بطور ایک بورڈر کے انھیں اپنے ہاں رکھا تھا - ان کا کھانا پینا، رہن سہن سب الگ تھا - اب تو شبیر اپنے نانا سے خرچ کا حساب لینے لگا تھا - دونوں بھائی تعلیم سے الرجک تھے - بار بار محسن صاحب سید صاحب کے نام خط لکھتے ابکی گھر سے واپسی پر وہ زیادہ شوخ چشم اور منھ پھٹ ہو گئے تھے! -

سید صاحب کا کنبہ شریف تھا - وہ لوگ خاموشی سے کسی جھگڑے فساد اور آپس کی دشمنی کے بڑی بے غبار زندگی گزارنے کے عادی تھی - جب نیاض اور ان کی والدہ اور بہنوں نے ہاجرہ پر ظلم کا پہاڑ ڈھایا تھا تب بھی سید صاحب اور ان کے تینوں جوان بیٹوں نے کسی احتجاج اور جائز فریاد کے بغیر اپنی لڑکی کو مدد اور امداد کے قبول کر لیا تھا!

نازک سا ہیولیٰ دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا اور آستین سے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے!۔

"ایاز۔!" وہ دہلیز کے پاس کھڑی تھی۔

"جی۔!" جلدی سے اُٹھ کر اس نے بجلی آن کی۔

"اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟" صنوبیہ نے پوچھا اور اندر آکے کرسی پر ٹک گئی۔

"وہ۔ وہ۔ جو اندھیرے میں۔ زور سے بجلی چمکتی ہے نا۔ تو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے میں نے روشنی گل کر دی تھی۔" اتنا شعور تو اسے تھا کہ اپنے آنسو ایک لڑکی پر ظاہر کر کے خود کو خفیف و سبک نہ کرے

صنوبیہ نے جھوٹ بھانپ لیا۔

"تم تو رو رہے تھے۔ جھوٹ نہ بولو۔ اچھا ایاز دیکھو۔ اب نہ رو۔ دیکھو میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں۔"

اس نے دامن میں چھپایا ہوا ہاتھ سامنے لاکے مٹھی کھول دی مٹھائی کے کاجو اور شہتوت تھے۔! وہ مسکرا رہی تھی: "بڑے ماموں جان نے دیے ہیں۔ چپکے سے کھا لو۔"

"صنوبیہ بی بی۔ میں آپ کے گھر سے جا رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"میں نہ پڑھوں گا نہ لکھوں گا۔ میں کہیں چلا جاؤں گا۔ آپ کے بھائی اور ارتم مجھے مارتے ہیں۔ جمن دادی جو خالہ کے پڑوس میں رہتی ہیں۔ میں ان سے پوچھ لوں گا کہ خالہ کہاں گئی ہیں۔ پھر وہیں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں ایاز۔ تم مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ تمھارے سوا میرے ساتھ کون

اس کا سسر اس کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالے کبھی ساس نندیں اس پر تیل چھڑک کر زندہ جلا دیں کتنی پرکشش سزائیں ہیں معصوم بےگناہ لڑکیوں کے لیے۔ کتنا سرسبز مستقبل ان بےچاریوں کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ خدا کی پیدا کردہ دنیا میں نہیں آتیں۔ وہ اپنی بدقسمتی بھگتنے کے لیے خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی پیدائش کے سلسلے میں ماں کوئی دکھ درد یا تکلیف نہیں اٹھاتی۔ اگر اٹھاتی بھی ہے تو گناہ بےلذت۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ پورے نو ماہ کی مصیبت اور خاص گھڑی کی اذیت کے بعد اس کے ہاں لڑکی نے جنم لیا ہے تو اسے یہ ساری تکلیفیں، مشقت اور ریاضت محض بےکار لگتی ہے۔ جس کا کوئی پھل نہیں۔ کیا تقدیر ہوتی ہے لڑکی کی بھی پیدائش باعث نفرت و استکراہ۔ اس کے بعد اس کا حق بھی بہت کم ہوتا ہے۔ وہ کم مدت تک دودھ سے سیراب ہو سکتی ہے۔ کچھ بڑی ہوتی ہو اسے دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ اس کا حصہ شرع نے بھی کم رکھا ہے۔ وہ بہت سی رعایتوں اور خدمتوں سے محروم ہے۔ اس پر گراں ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں۔ جبکہ وہ حکومت سیاست، فرماں روائی کی اچھی صلاحیتیں رکھتی ہے۔! اور پھر جب وہ سن بلوغ کو پہنچتی ہے تو ماں باپ کے سینوں کا بار کم اور ادھر ادھر کے لوگوں کے سر پہ رکھا ہوا بوجھ زیادہ بن جاتی ہے۔ اسے جلدی کے مارے کہیں جھونک دینے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اگر سسرال اچھی ملے تو اس کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ اچھی نہ ملے تو ماں باپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ صرف خمیازہ اٹھانے والی کی تقدیر کی خرابی ہے۔ زندہ جلے یا ناکردہ گناہ سولی پا جائے سب جائز۔

کھیلتا ہے۔ تم چلے جاؤ گے تو پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں گی! تم نہیں دیکھتے
کہ میرے بھائی مجھے بھی تو مارتے ہیں ابھی دوپہر کو جیو بھیا نے میرے ہاتھ
سے خربوزہ چھین کر کھا لیا تھا۔ ابا نے۔ پھر میں کہاں بھاگوں":
نہیں نہیں۔ آپ کہیں نہ بھاگیے گا!۔
تو پھر تم بھی کہیں نہ جاؤ۔!
اچھا" وہ مسکرانے لگا" میں نہیں جاؤں گا۔
تم تجمن دادی سے میری خالہ کا پتہ تو نہ پوچھو گے!۔
نہیں! نہیں پوچھوں گا۔
اچھا تو اب یہ کھا لو۔ مگر تم نے رات کا کھانا کھایا ہے کہ نہیں!۔
مجھے بھوک نہیں لگی!۔
میں غفور سے کہوں گی۔ کھانا تمہیں دے جائے۔!
آپ بہت اچھی ہیں۔ صنوبیہ بی بی۔ آپ سے ایک بات پوچھوں؟
"ہاں"
کیا آپ سچ مچ ارقم سے شادی نہ کریں گی۔ دوپہر کو آپ نے کہا تھا!۔
چھی توبہ: آٹھ سال کی ناسمجھ لڑکی نے پر نفرت انداز میں ہونٹ
سکوڑ لیے:
میں اتنے خراب لڑکے کے ساتھ کبھی شادی نہیں کروں گی۔ تم دیکھ لینا۔
" وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کو گاڑی میں لیے لیے پھریں گے!"
اس کے پاس گاڑی کہاں ہے!۔
وہ خرید لیں گے۔
اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔ ارقم کے پاس پیسے بھی کہاں ہیں

ہاں۔ یہ بات تو ہے۔! مگر وہ گاڑی خرید لیں تو پھر۔!"
تو کیا!: وہ معصوم انداز میں اس کا چہرہ تکنے لگی۔
تو پھر آپ کو چمکیلی سی گاڑی میں بیٹھنا اچھا لگے گا!۔
مجھے گاڑی بھی اچھی نہیں لگتی۔ ارقم بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ مجھے
چڑھاتا ہے۔ مجھے چھچھوندری بلی کہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مجھے نانا جان نے
بھنگن سے مول لیا ہے۔ وہ کتنا برا ہے۔ تم یہ سب کچھ مجھے نہیں کہتے۔ تم
بھی بہت اچھے ہو۔ اچھا یہ لو کھا لو۔! پانی رک گیا۔ اب غفور آئے گا بلانے
کے لیے۔ کھانا بھی لگ گیا ہو گا:

ہاجرہ نے اپنی ضد اور خود سری کا خمیازہ جو نوجوانی کے دور میں بھگتا
تھا۔ وہ انہیں اتنا زیادہ ہولناک اور شدید نہیں محسوس ہوا تھا کیونکہ
ان کے دکھ کے بٹانے والے بہت سے تھے۔ ماں باپ اور بھائیوں نے ان کا
ہر غم ہلکا کر دیا۔ اور وہ صرف اپنے بچوں کے لیے وقف ہو گئی تھیں انھیں
معقول ملازمت مل گئی تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کے مصارف پورے کرنے
کے باوجود اپنی لڑکی کے لیے بھی کافی ساز و سامان جوڑ رکھا تھا۔ اس لعنتی
دور میں لڑکی کے ماں باپ ہونا گناہ ہے۔ لڑکی بے شک ایک بوجھ بن
کر پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے ساتھ ایک لاکھ کی دستاویز لانا بھول جاتی
ہے۔ اس کی یہ بھول بڑی پر عقوبت ہوتی ہے۔ سزا ماں باپ کو جھیلنی
پڑتی ہے۔ اور خود وہ بھی اس مقصد کے تحت پروان چڑھتی ہے کہ کبھی

HAREEM
Nov. 05
Rs. 1/60

زلف گرہ گیر
کتنے اسیر آپ بھی ہو جائیں گے
اگر
سندری سہاگ
لگائیں گے
چشم آہو
حیا بار آنکھیں
سرمۂ نورِ نظر
کے صدقے
مثالِ مہ و انجم
چمکدار صاف تندرست
دانتوں کے لئے
جگمگ منجن
طبلۂ عطار
خوشبوؤں کا بحرذخار
دیرپا مسحور کن عطریات
عرق گلاب / کیوڑہ
شہد وغیرہ
مستقبل کا معمار
اپنے بچوں کو
بے بی گرائپ
پلائیے
پہاڑوں سے ٹکر
لینے کی طاقت پیدا کیجئے
شربتِ اکسیر
استعمال کیجئے
تیار کردہ:-
ایس اے بی بخشی کمپنی
۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ
(کولوٹولہ) کلکتہ

۴۸۶

یہ حریم آپ کو ماہ ربیع الاول میں ملے گا۔ اس متبرک جینے سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے، اس لئے کہ اس ماہ مبارک میں اس بزرگ و برتر ہستی کی ولادت ہوئی تھی، جو نبی آخرالزماں تھی اور اسلامی عقائد کے مطابق اللہ تعالےٰ اس دنیا کو اسی مقدس ہستی کے لئے عالم وجود میں لایا۔

حضرت محمدؐ کا اسم گرامی ہر مسلمان کی زبان پر رہتا ہے۔ خدا کے بعد بھی وہ قابل فخر ہستی ہے جس کا نام درود و سلام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مسلم اس سے بھی واقف ہیں کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت دنیا میں بھیجا، جب عرب میں خدائی قوانین کے بجائے فرعونی اور ہامانی قوانین پر عمل ہوتا تھا اور یہ دور مطلق العنانی اور ظلم و استبداد کا دور تھا۔ عوام سیاسی حقوق سے محروم تھے۔ حکومت جو چاہتی کرتی تھی۔ قبائل معمولی معمولی باتوں کے لئے پشتہا پشت تک برسرپیکار رہا کرتے تھے۔ قزاقی اور رہزنی کا دور دورہ تھا۔ ہر وقت خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ عزت آبرو اور جان و مال کا قطعی کوئی تحفظ نہ تھا۔ عورت ایک ذلیل جنس تھی۔ جسے کھلونوں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ عورتیں اشیائے ضرورت کے تحت منڈیوں میں نیلام کی جاتی تھیں۔

غرض ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول کو بھیجا اور پیغمبر آخرالزماں بنا کر بھیجا کہ ان انسانوں کی اصلاح کی جائے جو درندوں سے بھی بدتر ہو رہے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کس طرح حضرت محمد صلعم نے خدائے واحد کا لوگوں کو یقین دلایا، کس طرح حضرت بت پرستی کا خاتمہ کر کے ان جاہل وحشی اور جنگجو عربوں کی کایا پلٹ دی اور وہی عرب صفت انسان اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے ہمہ صدا بے سرو سامانی میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے ہر طرف گئے اور جب انھیں ذلیل کیا گیا تو ان سے جنگ کرنے کے لئے بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتوں سے ٹکرائے اور ایسی فتوحات حاصل کیں، جیسی کسی قوم نے کبھی دنیا میں نہیں کی تھی۔

ان جاہل بت پرست عربوں کو کس طرح اسلام کی تعلیم دی گئی۔ اور اس کے لئے خود ہمارے نبیؐ اور دائرۂ اسلام میں شامل ہو جانے والے عربوں کو کیسے کیسے مظالم سہنا پڑے۔ دنیا کا کوئی بھی ایسا ظلم و تشدد نہ ہوگا جو خود نبی اکرم صلعم اور نومسلموں کے ساتھ کفار عرب نے نہ کیا ہو، لیکن ہمارے رسولؐ اور ان کے رفقا نے سب کچھ برداشت کیا اور اسلام سے نہ روگردانی کی نہ ہی تشدد پر آمادہ ہوئے۔

بلا تفریق مذہب و ملت اپنے پڑوسیوں سے بہترین سلوک کریں

جن بہنوں نے سیرۃ النبی یا ایسی ہی دوسری کتابیں پڑھی ہیں، انھیں علم ہوگا کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلعم کا حسن اخلاق کیا تھا، جس نے لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ شاید ہی دنیا کے کسی انسان نے ایسے ضبط و صبر کا مظاہرہ کیا ہو، جیسا ہمارے پیارے نبی نے کیا تھا۔ انھوں نے عورت کو قعر ذلت سے نکال کر بلندی عطا کی۔ انھوں نے آقا اور غلام کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے مساوات کا سبق دیا۔ انھوں نے اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق مٹا دیا تھا۔ انھوں نے فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہر وہ شخص جس نے کلمہ پڑھ لیا، یکساں درجہ پا گیا۔ انھوں نے ہی فرمایا کہ انسانی برتری اس کے اعمال سے ہوتی ہے نہ کہ خاندانی بلندی سے۔

انھوںؐ نے بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آکر ہمیں یہ سبق دیا کہ ہم بھی ایسا ہی کریں —— لیکن آج کے مسلمانوں سے سوال ہے ہر شخص کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے کتنے مسلمان ہیں جو اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرتے ہوں۔ ان کے برے وقتوں میں ان کے کام آتے ہوں۔ کتنے مسلمان ہیں جو ذات پات کے بھید بھاؤ نہ کر کے اسلامی مساوات کا مظاہرہ کرتے ہوں۔ کتنے ... [illegible] بیویوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہوں جیسا کہ انھیں حکم

لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سرزمین عرب کے اندر مکمل اخلاقی، معاشی تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرکے دکھا دیا۔

پھر وہی جماعت جسے آپ نے منظم کیا تھا عرب کی اصلاح سے فارغ ہوکر آگے بڑھی اور اس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بیشتر حصے کو اس انقلاب کی برکتوں سے مالا مال کردیا جو عرب میں رونما ہوا تھا۔

آج ہم نئے نظام (نیو آرڈر) کی آوازیں ہر طرف سے سن رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جن بنیادی خرابیوں نے پرانے نظام کو آخر کار فتنہ بنا کر چھوڑا وہی اگر صورت بدل کر کسی نئے نظام میں بھی موجود ہوں تو وہ نیا نظام کب ہوا وہ تو وہی پرانا نظام ہوگا جس کے کاٹنے اور ڈسنے سے جاں بلب ہوجانے کے بعد ہم نئے نظام کا تریاق مانگ رہے ہیں۔ انسانی اقتدار اعلیٰ خدا سے بے نیازی اور بے خوفی، قومی و نسلی امتیازات۔ ملکوں، قوموں اور طبقوں کی سیاسی و سماجی خود غرضیاں اور ناخدا ترس افراد کا دنیا میں برسراقتدار ہونا یہ ہیں وہ اصلی خرابیاں جو اس وقت تک نوع انسانی کو تباہ کرتی رہی ہیں اور آئندہ بھی اگر ہماری زندگی کا نظام انہی خرابیوں کا شکار رہا تو یہ ہمیں تباہ کرتی رہیں گی۔ اصلاح اگر ہوسکتی ہے تو انہی اصولوں پر ہوسکتی ہے جن کی طرف سے انسانیت کے ایک سچے بہی خواہ نے اب سے صدیوں پہلے ہماری محض رہنمائی ہی نہ کی تھی بلکہ عملاً اصلاح کرکے دکھا دی تھی۔

صفحہ ۸ کا بقیہ

خالق نہیں ہوسکتی۔ روشنی کو تاریکی میں بدلنے والی کوئی اور ہی قدرت ہے جو حقیقی خالق کائنات ہے اس کی ملاقات نے اس تجربہ سے اس کو حقیقت سے روشناس کردیا اس نے سمجھا کہ اس کو اپنے مولیٰ کو پالیا اور ــــ پھر وہ ایک ان دیکھی ہستی کا پرستار ہوگیا۔ اس لازوال ان دیکھی ہستی نے اس کو مستقبل میں آزمائشوں کی بھٹی میں تپا کر کندن اور ایک عظیم الشان ہستی بنا کر تاقیامت اس کے نام کو زندہ جاوید کردیا۔ یہ ہیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ جن کی یاد آپ نے گزشتہ ماہ عید قربان کے موقع پر منائی ہے۔

● حریم میں اشاعت کے لئے مضمون بھیجیں تو اپنا نمبر خریداری لکھ دیجئے مضامین پسند نہ آنے کی صورت میں اسی وقت واپس کئے جاتے ہیں جب کہ واپسی کے لئے ٹکٹ بھی بھیجے ہوں

ظہور قدسی

شبلی نعمانی

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیئے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں۔ عناصر کی جدت طرازیاں۔ ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں عالم قدس کے انفاس پاک توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گی۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا دریائے ساوہ خشک ہوگیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جہنم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا چمنستان سعادت میں بہار آگئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و جلال ہوا۔

اللھم صل علی محمد وعلی آلہ واصحابہ وسلم

عظیم الشان ہستی

ب۔ ن آنسہ ابراہیم (بھکر)

بابل شہر کے جنوب میں ایک شہر آباد تھا۔ جس کا نام اُور تھا۔ یہاں نمرود نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نمرود کے دربار کا ایک بہت بڑا امیر تارخ بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل تھا۔ تارخ کے ہاں بہت مدت کے بعد ایک لڑکا تولد ہوا جس کی خوشی میں اس نے دوست و احباب امراء و وزراء کی بڑے پیمانہ پر دعوت کی اور اس زمانہ کے اصول کے مطابق اس کی قسمت معلوم کرنے کے لئے نجومیوں سے رجوع کیا۔ جس وقت یہ لڑکا پیدا ہوا اس کی پیدائش کی صبح اُور میں ایک عجیب واقع پیش آیا۔ مشرق میں ایک بڑا اور روشن ستارہ طلوع ہوا اور آسمان کے چاروں کونوں کے چاروں ستاروں کو کھا گیا۔ نجومی یہ دیکھ کر حیران ہوئے اور کہا کہ چونکہ اس ستارہ کا تعلق تارخ کے بچے سے ضرور ہے اس لئے انہوں نے اس بچہ کا زائچہ دیکھ کر کہا کہ یہ بہت بااقبال اور مقتدر ہوگا اور حکومت حاصل کرے گا اسی علاقہ کی حکومت اس کی اولاد کے ہاتھوں میں جائے گی اور وہ برسرِ حکومت ہوں گے۔

رفتہ رفتہ یہ خبر جب بادشاہ وقت تک پہنچی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ تارخ سے اس بچہ کو طلب کیا۔ تاکہ اس کو قتل کر کے آنے والے خدشہ سے نجات حاصل کر لے۔ بادشاہ کے حکم کے آگے کس کی مجال تھی کہ اس کے حکم کو ٹالتا۔ نجومیوں کے وہم پر بادشاہ کے ہاتھوں ایک معصوم جان کا قتل ہو گیا اور بادشاہ آنے والے خطرے کے ٹل جانے سے مطمئن ہو گیا۔

مگر جسے خدا رکھے اسے کون مار سکتا ہے۔ خدا کی قدرت [illegible] رات یہ بچہ پیدا ہوا۔ اسی دن تارخ کے [illegible] ایک [illegible] پیدا ہوا تھا۔ [illegible] نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں اس غلام کے بچے کو [illegible] بادشاہ [illegible] اپنے [illegible] کو شہر سے کہیں دور لے جا کر ایک غار میں چھپا دیا۔ کتب بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق بچے نے دس سال تک غار میں پرورش پائی۔ ان دس سال کے عرصہ میں بادشاہ اس واقعہ کو بھول گیا۔ جب تارخ کو اپنے بچے کے متعلق اطمینان ہوا تو اس نے اپنے بچہ کو غار سے نکال کر نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کے ہاں پہنچا دیا۔ تاکہ وہ سام کی صحبت میں رہ کر اس کی صحبت اور علم سے مستفید ہو۔ دس سال کی طویل مدت نے اس کو باہر کے مشاہدات سے لاعلم رکھا تھا۔ جب یہ بچہ غار سے باہر نکلا تو کائنات کی رنگینیوں کو دیکھ کر محو حیرت رہ گیا۔ خلاقِ دو عالم جب کسی خاص بندے کو اپنا مقرب بنانا چاہتا ہے تو اس کو عرفان کا ایسا ادراک بخشتا ہے جس کی ضیاء میں جستجوئے حق کی تلاش جھلملانے لگتی ہے اور اس کو ایسا وہم و ذکا حاصل ہوتا ہے۔ جو اس کے قلب میں سیماب کی تڑپ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس طفلِ نادان کو وہ عطیہ خداوندی پیدائشی ودیعت کر دیا گیا۔ جس نے اس کو ایامِ طفولیت ہی میں فہیم و ذکی بنا دیا۔ ہر غور و خوض کرنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہمہ وقت وہ بیقرار رہتا تھا۔ جب وہ غار سے نکلا تو زمین کی وسعت اور آسمان کی لامتناہی کو دیکھ کر وہ متحیر ہوا اور سوچنے لگا یہ زمین و آسمان کس نے پیدا کئے اس وسیع کائنات کو کس نے بنایا یہ سربفلک پہاڑ کس نے بنائے۔ یہ دریا یہ آبشار کس نے بہائے یہ رنگا رنگ گل بوٹے کس نے اگائے۔ ضرور اس کا کوئی خالق ہے اس خیال کے آتے ہی اس نے اس کی جستجو میں جنگل کی راہ لی رات کا اندھیرا سیاہ کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ وہ تفکرات میں ڈوبا جا رہا تھا کہ اتنے میں پردہ سیاہ کو چاک کر کے آسمان پر چاند نمودار ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر فلک کی طرف نظر کی چاند بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنی چاندنی سے کائنات کو چھپا رہا تھا۔ یہ پہلا مشاہدہ تھا جس کو دیکھ کر وہ بے ساختہ پکار اٹھا۔ یہ حسین اور تابدار روشن یقیناً ان سب کا خالق ہے رفتہ رفتہ چاند اور ستارے ماند پڑ گئے۔ چاند غروب ہو گیا۔ اس کے ڈوبتے ہی [illegible]

شراب کا گھونٹ تھے ــ شکیل کی حالت تشویشناک تھی ۔ انھیں معدے کے کینسر کا شبہ تھا! اور وہ سوچ چکے تھے کہ اب اس مرض سے جان بر ہونا دشوار ہے۔ مگر نہیں کیا ہوگی! ناجیہ کو ان پر ترس آ ہی گیا ــ کتنا ستم تھا کہ ایک دور اندیش باپ تیس سال تک بیٹے کو اس لئے بیاہنے سے نہ لگا سکا تھا کہ اس نے مرحوم بھائی سے زبان ہاردی تھی۔ شکیل کا علاج شروع ہوا۔ اور ان کی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے سب نے ضروری سمجھا کہ عدنان کی شادی ان کے سامنے ہوجائے ــ عدنان سے پھر بات چیت ہوئی مگر یہ معلوم کرکے انھیں بڑا دکھ پہنچا کہ عدنان اپنی بے جا ضد پر ابھی تک قائم تھا۔

"تم نہیں دیکھتے کہ میں کتنا بیمار ہوں ــ" شکیل نے کہا۔ "اب بس تمہاری شادی کی تمنا مجھے ایسی ہے کہ شاید تمہاری دلہن کا منہ دیکھ کر کچھ دن اور جی سکوں ورنہ یہ داغ ساتھ لے جانا پڑے گا۔"

انھوں نے بڑی لمبی تقریر سے اسے قائل کرنا چاہا۔

"چچا جان، آخر کس لئے۔ کیا آپ اپنی زندگی اور اس کی موت چاہتے ہیں ــ" عدنان نے کہا۔ وہ چاروں طرف کی یلغار سے بدحواس ہوگیا تھا۔

اسی وقت بند کمرے میں ہونے والی خفیہ مجلس شاورت کی سن گن لینے اور اپنے دھڑکتے دل کو قرار دینے کے لئے ناجیہ بھی آ کھڑی ہوئی تھی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شکیل اسے کچھ بتا رہے ہوں۔ مگر اس نے سنا عدنان کہہ رہا تھا۔

"چچا جان ــ میں اس لئے اپنی شادی سے گریزاں ہوں کہ نکاح نامہ پر دستخط کرتے ہوئے مجھے ولدیت کے خانے میں آپ کا نام لکھنا پڑے گا ــ" اس کی آواز میں دنیا بھر کا درد اکٹھا ہوگیا تھا اور اس کے لہجے سے جیسے آنسو برس رہے تھے ــ "سب سمجھتے ہیں کہ یہ بات مجھے معلوم نہیں ہے۔ مگر میں بہت عرصہ پہلے اس راز سے واقف ہوگیا تھا۔ بیس سال پہلے جب آپ ابا کو زبان دے رہے تھے کہ آپ مجھے ان سے دور نہ کریں گے میں نے باہر کھڑے کھڑے آپ کی باتیں سن لی تھیں۔ چچا جان باپ کی زبان کا پاس بیٹے کو بھی رکھنا چاہئے۔ میں ابا کا آپ کے بعد کہنا رہا ہوں۔ [illegible] نہیں کیا۔ [illegible] نہیں سکتے ــ [illegible]

تم معمولی کو گنہگار بن رہا ہوں کہ [illegible] سوا آپ سب کی نافرمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے ــ"

شکیل بے آواز رونے لگے تھے۔ ناجیہ کے آنسو چہرے پر بہنے لگے تھے۔ بیگم دم بخود مگر محبت سے عدنان کو دیکھ رہی تھیں۔ اپنا ہاتھ بیٹے پر رکھے ہوئے تھیں۔

"کس کو معلوم ہوگا بیٹے۔" شکیل نے گلو گیر لہجے میں کہا ــ "تم سے نکاح نامہ پر بابر دستخط ہوں گے۔ بھائی تک بات نہ پہنچے گی۔ بھائی کا دل دکھانا۔ ان کی محبت کی عمارت کو ڈھانا نہیں چاہتا۔ بس تم شادی پر رضامند ہوجاؤ تاکہ میں اگر مروں تو سکون سے مروں اور وہ مردوں تو مطمئن سا واپس جاؤں ــ"

تبھی دفعتاً دروازہ کھلا اور ناجیہ نے اندر قدم رکھے۔ شکیل اور بیگم دھک سے رہ گئے کہ ناجیہ نے کہیں کچھ سن تو نہیں لیا۔

وہ اندر آئی اور عدنان کو سینے سے لگا لیا۔

"میرے بچے تو فرشتہ ہے ــ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تجھے مجھ سے اتنی محبت ہے۔ شکیل بھیا میں تمہاری بھی کیسی کی گئی ہوں۔ [illegible] غرض نے اپنے بیٹے کو جدا رکھا ــ یہ ضد رہی تھی ــ میری سوئی کو جیسے تم نے آباد کیا تھا پھر سے نہ اجڑ جائے۔ اتنا سمجھی جیسے کہ اب مجھے سکون ہے ــ شکیل بھیا ــ خدا تمہیں زندگی دے ــ تم عدنان کا سہرا دیکھو۔ میں آج ہی بھائی بہن کو لڑکی کی رسم کہلا بھیجتی ہوں ــ"

پھر عجیب بات ہوئی ــ اب کمرے میں بیٹھے [illegible] ساتھ رونے لگے ــ لیکن وہ [illegible] ناصر تھے کہ [illegible] جذبے کے ہاتھوں بہہ رہے تھے ــ جب کہ ان سب کے [illegible] رہی تھی ــ

[illegible]

• اگر آپ بھی آرزو رکھتے ہیں کہ [illegible] دواد کریں کہ یہ پرچہ ہم تک پہنچ جائے۔ [illegible] سلسلے میں ایک [illegible] آیا اور [illegible] کے اپنی سمجھ کر [illegible] شکایت کا موقع [illegible]

• [illegible] اگر آپ بعد میں [illegible]

کر رہا تھا۔ ویسے یار باش بیمار دوستوں کی وجہ سے اس کی شام اچھی گزر جاتی۔ یہ سب دوست ایسے تھے جن سے ان کی بیویاں اکثر [illegible] شوہروں سے نہیں بلکہ دوستوں سے۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے تھے۔ جاتے بھی تو مہینوں بعد جب کوئی بہت اہم کام ہوتا۔ بس یہ کافی ہاؤس واحد جگہ تھی جہاں وہ بے دھڑک سے مل رہے تھے جہاں بیویوں کا خوف نہیں تھا۔ اصل میں ان چاروں کی بیویاں ایک دوسرے کو اپنے میاں کے بگڑنے کا ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔

"یار تم چائے پیو نا۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے" رازی نے ناصر کو ٹہوکا دیا جو سگریٹ کے مرغولے چھوڑ رہا تھا۔ بڑی دگرگوں سی حالت تھی۔ حالانکہ پہلے وہ بہت چہکتا تھا۔ چٹکلے سناتا اور وہ سب اس کی آزادی پر رشک کرتے تھے کیونکہ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اب عشق کر بیٹھا تھا۔

•

ناصر بہت کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ کسی کو بھی ریزرویشن کرانی ہوتی ناصر حاضر ہو جاتا۔ لنچ ٹائم میں اب وہ اسٹیشن کا چکر لگا کر اور [illegible] کی صورت دیکھ کر پیٹ بھرتا اور جس روز اس پری وش کی ڈیوٹی نہ ہوتی وہ بیکار یا چکرایا پھرتا۔

"یار کبھی تم نے اس سے بات بھی کی ہے؟"

"نہیں۔" ناصر بولا۔ "ہمت ہی نہیں پڑتی۔"

"ارے گاؤدی پورے تین ماہ گزر گئے ہیں تمہارے یک طرفہ عشق کو آخر کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔" حامد غصے سے بولا۔

"میں اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا۔" ناصر بولا۔

"اس میں بدنامی کی کیا بات ہے؟"

"تمہیں پتہ نہیں کہ وہ ایک لڑکی ہے۔"

"ہمیں علم ہے تم کسی لڑکے کے عشق میں مبتلا نہیں ہو۔" رازی اس کی بات کاٹ کر بولا تو سب ہنس دیئے اور ناصر جھینپ گیا۔

"یار [illegible] ہو جاؤ۔ اچھا یہ۔ اپنے دل کی کتاب کھول دو اس کے سامنے۔" شوکت نے مشورہ دیا۔

"میں کیا کروں [illegible] وہ نہایت ہی [illegible]"

"[illegible] اس [illegible] ہیں۔"

"[illegible]" وہ [illegible] سے [illegible]

"تو شادی کر لو۔ کسی بڑے کو اس کے ہاں بھیجو۔ تمہیں اس سے براہ راست بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" رازی نے کہا۔

"مجھے تو اس کے گھر کا بھی علم نہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"تم ایک نظر مجھے دکھا دو میں اس کے گھر کا کیا پورے خاندان کا پتہ لگا دوں گا۔" رازی خم ٹھونک کر بولا۔

"پھر تم کل میرے پاس بنک آ جاؤ۔" ناصر نے بیقراری سے کہا۔

"اس کی ڈیوٹی ہوگی؟"

"ہاں ایک ہفتے بعد ڈیوٹی تبدیل ہوتی ہے۔ آج کل اس کی صبح آٹھ سے دو بجے کی ڈیوٹی ہے۔" ناصر نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں لنچ بریک میں آ جاؤں گا۔"

"اگر تم میرا یہ کام کر دو تو ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔" ناصر لجاجت سے بولا۔

"ارے دوستوں کے کام آنا تو میرا فرض ہے۔" رازی بے پروائی سے بولا۔

"تم رشتے کے لئے بھابی کو بھیجنا اس کے گھر۔" ناصر نے مستقبل کی پلاننگ شروع کر دی۔

"تم اپنے والدین کو بھیجنا میری بیوی بھلا کیوں جانے لگی۔" رازی نے کہا۔

"میرے والدین لاہور میں ہیں تم وہ بات تو کر ہی دو، پھر دیکھا جائے گا" ناصر بولا۔

"خیر یار وہ وقت تو آنے دو۔ ہائے ابھی آئی نہیں تم نے برتن پہلا کر ڈالنے شروع کر دیئے۔"

"ابھی تو معلوم کرنا ہے اس کی منگنی یا شادی تو نہیں ہو گئی ہے، بہرحال یہ سب کچھ میں معلوم کر لوں گا۔"

•

دوسرے روز رازی حسب وعدہ ناصر کے آفس پہنچا اور پھر دونوں اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ رازی کا لباس گھسا سا تھا۔ کیونکہ وہ روز [illegible] جتنا خوبصورت [illegible] تھی۔ وہ کپڑے استری [illegible] کی تھی اور رازی وہی کل والا میلا لباس پہن کر آفس چلا گیا تھا۔ حالانکہ کس قدر [illegible] تھی۔

"کم از کم خود ہی کپڑے استری کر لو۔"

"تم نے عادت ہی خراب کر دی ہے" [illegible] تلملاتے ہوئے بولا۔

ایک محبت دو افسانے

ـــــ مسّہ ناز رحمٰن ...

جوڑے میں آخری پن لگاتے ہوئے میں نے ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے یہ بے وقت کی مداخلت بہت بری لگی۔ میں نے ناگواری کے ساتھ ریسیور اٹھایا "ہیلو" دوسری طرف سے اصغر کی آواز آئی۔ اسکی آواز سنکر میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا یقیناً کچھ گڑبڑ ہوگی ورنہ وہ اس وقت فون نہ کرتا۔ فری ہوا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہہ رہا تھا ـــ "جان مجھے افسوس ہے میں نہیں آسکونگا"

"اوہ اصغر۔ میں تقریباً رودی ـ "اب کیا ہوا ـــ؟"

"نداکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور زینت بہت پریشان ہے۔"

"کیا ہوا نداکو ـــ؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا گلا خراب ہے۔"

"اوہ خدایا۔ لیکن یہ کوئی اتنی خوفناک بیماری تو نہیں ـــ"

"میں جانتا ہوں ـــ" اس نے اعتراف کیا ـــ "لیکن میں انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں آسکتا ـــ"

"یہ ناانصافی ہے ـــ" میں رودی ـــ "گذشتہ چندہ دنوں میں تم نے تیسری مرتبہ یہ حرکت کی ہے۔ تمھیں کچھ احساس نہیں کہ ہماری ملاقات کو ایک مہینہ ہو چلا ہے۔ ذرا سوچو میں نے ایک مہینے سے تمھیں نہیں دیکھا ـــ"

"میں جانتا ہوں ـ مجھے احساس ہے" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ـ "خدا کے لئے سمجھنے کی کوشش کرو۔ زینت بہر حال میری بیوی ہے اور ندا میری بیٹی ہے ـــ"

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم صرف میری خواہش ٹھکرا سکتے ہو۔ میری بات ٹھکرا سکتے ہو جو تم سے ملاقات کے لئے گھڑیاں گنتی رہتی ہے۔ تمہارے فون کے انتظار میں رات رات بھر جاگتی رہتی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے تمہارے لئے یہ سب کچھ بے حد تکلیف دہ ہے مجھے تمہارے احساسات کا اندازہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں ـــ"

"نہیں۔ تم نہیں سمجھتے۔" میں چیخی۔ "تم نہیں سمجھ سکتے تمھارا معاملہ مختلف ہے۔ تمھارا گھر ہے۔ بچے ہیں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔ آخر یہ سب کچھ کب تک چلے گا۔ میں اب یہ (عرصہ) برداشت نہیں کر سکتی۔ تم مجھ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے ـــ"

"اوہ میری جان ـ" اس نے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "میری پیاری سی گڑیا ـــ"

"نہیں ـــ" میں چیخی ـــ "مجھے خوبصورت لفظوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ زینت کو طلاق دے دو اور مجھے اپنا لو ـــ"

"تمھیں پتہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ "یہ ندا کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"لیکن کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں ہے۔" میں نے بے صبری سے کہا ـ "تم سمجھتے کیوں نہیں اصغر۔ میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں ـ تمھارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں ـــ"

"جیسے ہی ندا کی طبیعت ٹھیک ہوگی میں تم سے ملنے آؤں گا۔"

"نہیں!" میں چیخ پڑی اور پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی ـــ "ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ میرا مستقبل کیا ہے۔ میرا کیا بنے گا۔"

"یہ صورت حال ہمیشہ نہیں رہے گی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جب ندا بڑی ہو جائے گی تو ـــ"

"یعنی میں اس وقت تک تمھارے انتظار میں بیٹھی رہوں ـ اوہ میرے خدا ـــ"

"اور میں کیا کہہ سکتا ہوں ـــ" اصغر نے بے چارگی سے کہا۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "تمھارے پاس کہنے کے لئے ہے بھی کیا ـ" الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے لیکن میرے وجود کے اندر سے اٹھنے والی غصے کی لہر نے مجھے چیخنے پر مجبور کر دیا ـــ "سب بے کار ہے میں اس صورت حال کو اب برداشت نہیں کر سکتی ـ"

"کیا تم ـــ" دوسری طرف سناٹا چھا گیا اور پھر کچھ دیر بعد وہ بولا "کیا تم ہر تعلق، ہر ناطہ توڑنا چاہتی ہو ـــ؟"

میں نے پسینہ بھرے ہاتھوں سے ریسیور پھینک لیا۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا ـ میرا رُواں رُواں پکار رہا تھا کہ مجھے اپنی محبت کو کھونا نہیں چاہئے۔

"میں ایسا کرنا تو نہیں چاہتی ـ" میں نے اعتراف کیا۔

"تو پھر ـــ؟" اس نے پوچھا۔

"لیکن ایسا کرنا بے حد ضروری ہے ـــ" میں نے ریسیور رکھا لڑکھڑاتی ہوئی مڑی اور ایک کرسی پر گر کر اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا روتے روتے میری آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔

اگلے چند روز تک میری بہت برا حال رہا جب میں اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتی تو ہر چیز پر اداسی بال بکھیرے سوتی نظر آتی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی مجھے اپنا مضحکہ اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی ـــ میں ایک سرکاری ادارے میں بہت بڑے عہدے پر فائز تھی ـ خدا نے عزت، دولت شہرت سب کچھ دے رکھا تھا ـــ بھائی اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ مگن تھے امی، ابو کا انتقال ہو چکا تھا۔ لوگ میرے سماجی رتبے کی وجہ سے مجھ پر رشک کرتے تھے لیکن میں کس قدر تنہا تھی ـ یہ میں ہی جانتی تھی۔

ایک دن میرے باس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دن کی چھٹی لے کر کہیں گھوم پھر آؤں ـ تب مجھے اچانک خالہ جان یاد آئیں بچپن میں میں ہمیشہ ان کے پاس چھٹیاں گزارنے جایا کرتی تھی میرین ڈرائیو کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہتی تھیں ـ میں سمندر کی شیدائی تھی اس لئے وہیں چلی گئی۔

خالہ جان کا بنگلہ بالکل ویسا ہی تھا بس وہ اور خالو جان تھوڑے بوڑھے ہو گئے تھے ان کے گھر میں میرے لئے جو بیڈ روم مخصوص کبھی ہوا تھا وہ آج بھی ویسا ہی تھا ـ اس کی کھڑکی سے سمندر کا نظارہ میرا محبوب مشغلہ تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد سمندر کے کنارے ٹہلنے چلی گئی اور سحر زدہ سی سمندر کو دیکھنے لگی ـــ سمندر کتنا وسیع اور کتنا فراخ تھا ـ میرا دکھ اس کے مقابلے میں کتنا چھوٹا اور حقیر تھا ـ میں دیر تک وہاں ٹہلتی رہی ـ پھر ایک ریسٹورانٹ میں آئس کریم کھانے کے لئے داخل ہو رہی تھی کہ ایک شخص باہر نکل رہا تھا اس نے مجھے دیکھا تو جیسے اسے سکتہ ہو گیا اور حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تم ستارہ ہو نا ـــ؟"

" اوہ ـ اسد ـــ" میں تقریباً خوشی سے چیخ پڑی ـ "کتنے برسوں بعد آج تمہیں دیکھا ہے"۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر پھر ریسٹورانٹ میں چلا گیا تھا ـ امی کی شدید علالت کی خبر ملی تو میں یہاں آ گئی ـــ"

میں نے کہا ـ "چلو اچھا ہوا ورنہ یہ ملاقات نہ ہو سکتی ـــ"

اسد نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا ـــ "کیا تمہیں ہمارا ماضی یاد ہے ـــ"

"میں کیسے بھول سکتی ہوں یہاں تمہارا وقت بہت رومانٹک گزرا ہے ـــ"

"اوہ میری ننھی گڑیا ـ" اور اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں یہی وجہ ان نے ہی تو مجھے بمبئی آنے پر مجبور نہیں کیا تھا ـ اپنی پہلی معصوم محبت کی تلاش میں۔

"کاش کہ سب کچھ اس طرح ختم نہ ہوا ہوتا ـــ"

"اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ سب اب کچھ مضحکہ خیز لگتا ہے نا؟" اسد نے کہا ـــ

"لیکن اس وقت تو ایسا نہیں لگتا تھا" میں نے احتجاج کیا۔

"نہیں مجھی اس وقت تو بہت دکھ ہوا تھا ـ" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"واقعی تمہیں بھی دکھ ہوا تھا ـــ" میں نے پوچھا اس نے اثبات میں سر ہلایا ـــ "سولہ سال کی عمر میں ایسی باتیں بے حد دکھ دیتی ہیں ـ"

میں صرف پندرہ سال کی تھی ـــ

اس نے اپنی کار ایک ہوٹل کے سامنے روکی اور جلدی سے اتر کر میرے لئے دروازہ کھولا ـــ "میں وہ آخری شام کبھی نہیں بھول سکا تم آنکھوں پر پٹی باندھ کر شازیہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ شازیہ شرارتاً بھاگ گئی تھی ـ مجھے شرارت سوجھی میں تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا ـــ اور میں تمہیں شازیہ سمجھ کر تم سے لپٹ گئی تھی ـ اور اسی وقت ڈیڈی وہاں آ نکلے تھے ـ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت گھر میں موجود ہوں گے ـ" اسد نے مجھے یاد دلایا ـ "میں نے اصل بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اتنے غصے میں تھے کہ کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھے"

"ہاں ـ ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے وہ کافی ہے ـــ"

"مجھے تم پر بے حد ترس آیا تھا ـــ"

"اُف، مت پوچھو ـ اس وقت میرا کیا حال ہوا تھا ـ جب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گئے تھے اندر جاتے ہی امی سے کہا تھا کہ ہم فوراً دہلی واپس جا رہے ہیں ـــ میں روتی چیختی رہی مگر کوئی اثر نہیں ہوا ـ یوں ہم جدا ہو گئے ـ"

"ہم نے تمہیں خط بھی لکھے تھے۔"

"واقعی —" میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"ہاں کئی۔ نصف درجن کے قریب — لیکن تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا —"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا — "مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا تھا یقیناً وہ سب خطوط ڈیڈی کے ہاتھ لگ گئے ہوں گے۔"

اسد نے میز پر جھک کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تم میری پہلی محبت ہو — میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی —— کیا تم بھی میرے لئے اسی طرح سوچا کرتی تھیں۔"

"ہوں —" میں نے شرماتے ہوئے اقرار کیا۔

واپسی میں اس نے پوچھا — "ویسے ایک بات تو بتاؤ تم یہاں کس سلسلے میں آئی ہو —؟"

میں نے سر جھکا کر اپنے پیر کے انگوٹھے کو گھورتے ہوئے کہا —

"میں — میں یہاں کسی کو بھلانے آئی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے —" اس نے آہستگی سے کہا اور ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ چند لمحے بعد وہ شگفتہ لہجے میں بولا — "میں تو یہاں ڈیڈی کے کام کی وجہ سے رکا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایک اور کام میرے ذمے لگ جائے گا۔"

"کیسا کام —" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ذہن سے کسی کی یاد مٹانے کا کام —" وہ لاابالی انداز میں بولا۔ یوں ایک خوبصورت سہ پہر کا آغاز ہوا۔ ہم بچوں کی طرح سارے میں گھومتے پھرے۔ جی کھول کر قہقہے لگائے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سات سال کا درمیانی وقفہ کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ زندگی کا وہ معصوم اور رومانٹک زمانہ پھر پلٹ آیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے رات کا کھانا ہم نے سمندر کے نزدیک واقع ایک ہوٹل میں کھایا۔

"کتنا اچھا شہر ہے۔ ایک روز ہم یہاں مستقل طور پر رہنے کے لئے آئیں گے۔ ہمارے بچے یہیں پڑھیں گے —" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں مسکرا دی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسد اب کتنے اعتماد سے بات کرنے لگا تھا — "اب ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے سہا —" اسد نے سرگوشی کی۔

رات گئے جب اسد نے مجھے خالہ کے گھر چھوڑا تو میرے انگ انگ سے خوشی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔

اگلی صبح خالہ کی دستک پر میری آنکھ کھلی تو وہ ناشتے کی ٹرے لئے ہوئے اندر چلی آئیں۔ میں نے بوکھلا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ "اوہ میں اتنی دیر تک سوتی رہی —"

"آخر چھٹیاں ہوتی کس لئے ہیں —" خالہ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو پتہ ہے۔ کل میری کس سے ملاقات ہوئی —" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا جانوں —"

"اسد خاں سے — وہ آپ کو یاد ہیں —؟"

"ہاں کیوں نہیں بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ سنا ہے آج کل امریکہ میں کہیں ملازمت کر رہا ہے پچھلی مرتبہ جب وہ آیا تھا تو مجھ سے بھی ملنے آیا تھا۔ اس کی امریکن بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ بہت پیاری لڑکی ہے"

"بیوی ؟" یہ لفظ بندوق کی گولی کی طرح میری سماعت سے ٹکرایا

"او خدایا" میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی — "اب میرے ساتھ دوبارہ یہ سب کچھ پیش نہ آئے۔"

اللہ میاں اتنی ناانصافی نہیں کر سکتے۔ یقیناً خالہ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ مجھے خالہ کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے رہے تھے لیکن کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے میں نے ان کی بات سننے کی کوشش کی — "بے چاری اسد کی امی اس مرتبہ تو بالکل ہی پلنگ سے لگ گئی تھیں اسی لئے تار دے کر اسد کو بلوایا تھا۔ میرا خیال ہے اب وہ واپس جانے والا ہو گا۔"

میں نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں میرا سر چکرا رہا تھا ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی —

خالہ کو یہ سمجھانا بے حد مشکل تھا کہ میں نے اچانک واپس جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ میرا فوراً واپس جانا بے حد ضروری ہے۔ ٹیکسی میں ایئرپورٹ جاتے ہوئے میں نے آنسو بھری نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا اب میں کبھی یہاں نہیں آؤں گی۔

اس مرتبہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ اب میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا جب میں واپس پہنچی تو میرا فلیٹ پہلے ہی کی طرح سنسان تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔ باہر چمکنے والا سورج مجھے اپنا مضحکہ اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔

اسد اس وقت کیا کر رہا ہوگا ؟ میں نے سوچا۔ — اس کی بیگم نے اس سے پوچھا تو ہوگا کہ کل وہ سارا دن کہاں غائب رہا تھا"

میں نے خود کو کرسی پر گرا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی زندگی کس قدر نامہربان تھی۔ مجھے ہمیشہ غلط لوگوں سے محبت کیوں ہو جاتی ہے کیا میری قسمت میں ساری عمر یونہی تڑپنا اور سسکنا لکھا ہے۔ مجھے بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

دروازے کی گھنٹی سے میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ آخر اس وقت کون آسکتا ہے میں خود کو گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لے گئی۔

سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

• اسد • میں نے حیرت سے کہا۔ تم یہاں کیسے ؟

اس نے پریشانی کے عالم میں کہا — • ظاہر ہے میں تمہارے پاس آیا ہوں کل جب میں تم سے ملنے تمہاری خالہ کے پاس گیا تو انھوں نے بتایا تم جا چکی ہو وہ خود پریشان تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے ان سے تمہارا پتہ لیا اور اگلی فلائٹ سے یہاں پہنچا ہوں ۔•

• بہتر ہوگا کہ تم اسی فلائٹ سے واپس چلے جاؤ۔•

میں نے غصے سے کہا — • میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں پہلے ہی زخم کھا چکی ہوں اب میں دوبارہ اس تجربے سے نہیں گزرنا چاہتی —•

میں نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن اسد نے اپنا پاؤں بیچ میں پھنسا دیا۔

• تم کیسی باتیں کر رہی ہو —• اس نے جھنجلا کر کہا اور پھر اس کی آنکھوں میں نرمی سمٹ آئی — • دیکھو جان۔ میری کچھ سمجھ میں تمہاری باتیں بالکل نہیں آرہی ہیں تم مجھے ایک منٹ کے لئے اندر آنے دو [illegible] بات کاٹتے ہوئے مجھے بہت [illegible] اسد اندر [illegible] ہوئے [illegible] — تم شادی شدہ ہو —•

• کیا ؟• اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا — • تم شادی شدہ ہو —• میں نے اپنی بات دہرائی —•

خالہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے وہ تمہاری اہلیہ سے بھی مل چکی ہیں —•

• اوہ میرے خدا • اس نے گہرا سانس لیا۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

ایک لمحے تک خاموشی رہی پھر میں نے اس کے ہاتھوں کا مضبوط لیکن نرم گرفت اپنے کندھوں پر محسوس کی۔

• سیما • اس نے نرمی سے کہا — • تمہاری شادی مجھ سے ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔ میں نے تمہاری خالہ سے بات کر لی ہے •

میں نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے آنسو بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا — • لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟•

اس نے مجھے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا — • میں شادی شدہ نہیں ہوں — حلف رکھو میرے ہاتھ پر —•

• لیکن خالہ نے تو —•

• ہاں مجھے پتہ ہے خالہ نے کیا کہا ہوگا — ان کا بھی قصور نہیں ہے شبانہ میرے ساتھ ان کے گھر گئی تھی — وہ اسے میری بیوی سمجھ بیٹھیں وہ میری اچھی دوست ہے اور محض تفریح کرنے میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا، نہ ہے — میں نے تمہارے سوا کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں کی [illegible] بارے میں سوچ سکوں —•

اسد نے گرمجوشی کے ساتھ میرے ہاتھ تھام لئے اور کہا — • اپنے ماضی کو بھول جاؤ اور شبانہ کو بھی — صرف ہمارا مستقبل اہم ہے اب صرف ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں سوچنا ہے — [illegible] ہم واپس [illegible] دے دیں —•

سکتا ہوں جیسے آپ . . . اپنی مخروطی انگشت اور زلف تراشیدہ اور چشم ہائے نیم خوابیدہ سے گھائل کر کے اس کا بریف کیس لے بھاگی ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں دس بیس روپوں اور آٹھ دس فضول کاغذات کے علاوہ اسکا میٹرک سرٹیفکیٹ رکھا ہو۔"

لڑکی نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی "یہ بریف کیس ... پتا ہے شاید میں جلدی میں اس کی چابیاں اپنے گھر ہی بھول آئی ہوں۔" عبدل دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئیے ہوئے تھا۔ عبدل کو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ کل کی لڑکی دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھ جیسے لڑکی شناس کو۔ ساری زندگی وہ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیوں سے نمٹتا اور ان کو نمٹاتا آیا تھا۔

لڑکی نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کے پاس کوئی ایسی چابی ہوگی جس سے یہ بریف کیس کھل جائے" عبدل کو لڑکی کی حالت زار پر ترس آ گیا۔ اس نے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرے پاس تو چابی نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کا بریف کیس کھول سکتا ہوں مگر اس سے پہلے آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ بریف کیس میں کتنی رقم ہے"

بسنتی لڑکی اس کے قریب کھسک آئی۔ "اس میں سات لاکھ روپے ہیں میں اسے گھر لے جا کر اس لئے نہیں کھول سکتی کہ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ اسے کھولنے کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ میں صبح سے بھوکی ہوں۔"

عبدل نے دریافت کیا "آپ اپنے گھر سے کیوں فرار ہوئی ہیں؟"

لڑکی نے کہا۔ "میں فلم ایکٹریس بننا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"جی ہاں! میں بچپن سے فلم ایکٹریس بننے کے خواب دیکھتی آئی اب میں نے طے کر لیا ہے کہ چاہے کچھ کیوں نہ ہو جائے بمبئی جا کر اپنی قسمت ضرور آزماؤں گی۔"

عبدل نے پانسہ بدلا۔ اور کہا۔ "خوش ہو جائیے کہ آپ کی مراد پوری ہو گئی آپ کے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے میں نے آپ کو اصل بات نہیں بتائی تھی۔ میں کسی ٹیکسٹائل مل کا مالک نہیں ہوں بلکہ عبدل اینڈ عبدل فلم کمپنی میری اپنی ہے میں یہاں پارک میں یہاں اس لئے نہیں بیٹھا تھا کہ میرا ڈائریکٹر کا بہت ملنے گیا ہوا ہے بلکہ میں یہاں بیٹھا اپنی نئی فلم کے لئے کسی نئی ہیروئن کو تلاش کر رہا تھا آپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ جس کی تلاش رہتا وہ شاہکار آ گیا۔"

لڑکی کا چہرہ خوشی اور مسرت سے گلابی ہو گیا۔ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں اس نے نرمی ادا سے پوچھا کیا "آپ فلم پروڈیوسر ہیں۔؟"

"جی ہاں! لاہور والے مجھے فلمی پروڈیوسر عبدل کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اب تک میں نے گیارہ فلمیں پروڈیوس کی ہیں۔ اور ان میں سے ایک فلم بھی ایسی نہیں جسکی سلور گولڈن، اور ڈائمنڈ جوبلیاں نہ منائی گئی ہوں۔"

لڑکی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اتنی جلدی اور آسانی سے ہیروئن بننا نصیب ہو جائے گا۔

عبدل اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "چلو پہلے کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں اس کے بعد کاروباری باتیں ہوں گی۔"

لڑکی عبدل پروڈیوسر پر ہزار جان سے مرمٹی تھی کم از کم ظاہر وہ یہی کر رہی تھی کہ گویا عبدل ہی اس کا سب کچھ ہے دوسری طرف عبدل نے فلم کا نام بھی تجویز کر لیا تھا "مدہوش حسینہ" اور یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اپنی ہیروئن کا نام روح افزا رکھے گا اس نے تارکے ایک ٹکڑے کی مدد سے روح افزا کا بریف کیس ہو سو کے لوٹوں سے لبالب تھا گویا روح افزا نے سات لاکھ روپلے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ نہیں تھا۔ عبدل کی ساری زندگی اس انتظار میں گزر گئی تھی کہ کہیں سے ملیں کسی جیب سے نکلیں یا کسی پرس سے برآمد ہوں لیکن کم از کم ایک بار اتنے روپے اسے ضرور مل جائیں کہ وہ جیب کاٹنے کا دھندا چھوڑ کر شریف لوگوں کا دھندا اختیار کرے اس کی شرافت کی راہ میں سب سے بڑی دیوار رقم کی تھی مگر بسنتی یعنی روح افزا کے لئے اتنی رقم لے آئی کہ شرافت کے دروازے میں داخل ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔

عبدل عجلت اور جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو وہیں بیٹھے بیٹھے شرافت کا نعرہ لگاتا۔ سات لاکھ روپوں سے بھرا ہوا بریف کیس اٹھاتا اور اتنی تیزی سے بھاگتا کہ ریل سے پہلے اس کے قدم رکتے۔ مگر اس نے بڑی بے نیازی سے بریف کیس اٹھا کر روح افزا کی گود میں رکھ دیا۔

روح افزا نے لا ابالے پن سے کہا "پروڈیوسر صاحب اب تک میں کھانا کھاؤں آپ میرا بریف کیس اپنے پاس رکھیں یا کو ... کھانے میں وقت ہو رہا ہے۔"

"میں تمہارے بریف کیس پر ... کیا کروں گا۔" عبدل نے ... اب دیانت ہے تمہارے بریف کیس ... اس وقت ... یہاں ہوتا۔"

ضمیر جاگ اُٹھا....

پروین۔ بی اے۔ پٹنہ

سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی گندی گلی ہے جس میں دوسرے غریبوں کے ساتھ میں ایک گونگا اپاہج بھی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ اپاہج کام کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے بھیک مانگ کر گزر بسر کرتا ہے۔

اُداسی اور مایوسی ایسے لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے اور وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے یہ دونوں کچھ زیادہ اداس تھے۔ کیونکہ ایک ایک روپیہ جوڑ کر جو کچھ سامان ان لوگوں نے اکٹھا کیا تھا اسے کوئی اٹھا لے گیا تھا چوری کی رپورٹیں تو سیٹھوں اور لکھ پتیوں ہی کی لکھی جاتی ہیں چار پھٹے پرانے کپڑے دو چار المونیم اور مٹی کے برتن یا چند روپے چوری ہونے پر کسی تھانے جایا بھی جائے تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا جاتا ہے۔ پولیس کے لوگ یہ محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ یہ ٹوٹے پھوٹے برتن اور یہ پھٹے پرانے کپڑے امیروں کے ہزاروں روپیوں کی چوری سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سیٹھ ساہوکار اپنا سامان پھر خرید سکتے ہیں لیکن ایسے بھک منگے ایسا مشکل ہی سے کر پاتے ہیں۔

یہ گونگا اپاہج دس سال پہلے زبان کاٹ دیئے جانے کے باعث بولنے کی طاقت کھو چکا تھا۔ پیروں اور ہاتھوں سے پہلے ہی سے معذور تھا۔ شاید پیدائش سے پہلے ہی، اس کا بدن گھنا گیا تھا۔ بہرحال کسی طرح زمین پر رگڑتا چلتا اور بے ہنگم سی آواز نکال کر لوگوں کو مخاطب کرتا۔ کوئی اسے نفرت سے دیکھتا۔ کوئی دو چار باتیں سناتے اور رحم کھا کر دس پانچ پیسے اس کی طرف پھینک دیتا اس طرح دو چار روپئے جو مل جاتے وہ جھونپڑی میں جا کر اپنی بیوی سکھیا کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ جس سے وہ جو کچھ ہو سکتا پکا کر کھلاتی اور خود بھی کھا لیتی۔ سکھیا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بھیک مانگے لیکن اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ بھیک مانگے اس لئے اور بھی کہ اس گندی اور غلیظ جھونپڑی میں رہتے ہوئے تازہ ہوا اور دھوپ سے محروم ہو کر بیمار ہو گئی تھی۔ کھانسی اسے مسلسل آتی تھی۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ جب بھی اسے کچھ زیادہ پیسے مل جاتے تو وہ اس کے لئے دوا لے آتا وہ کبھی اسے لے کر اسپتال نہیں جاتا تھا اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ اسپتال ہوتے تو ہیں غریبوں کے لئے لیکن ان سے فائدہ، سرکاری افسروں، ممبروں اور وزیروں کو ہی پہنچتا ہے۔ انھیں قیمتی سے قیمتی دوائیں دی جاتی ہیں اور غریبوں کو پانی جیسا مکسچر اور معمولی گولیاں جو کبھی کبھی نقلی بھی ہوتی ہیں اور ان کے لئے بھی غریبوں کو گھنٹوں لائن لگا کر کھڑا رہنا پڑتا ہے۔

ایک روز اس گونگے اپاہج بھک منگے کی بیوی کو تیز بخار تھا بول تو سکتا نہ تھا سامنے بیٹھی اپنی سکھیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتا اور کچھ سوچنے لگتا۔ پھر جیسے اس کے دل سے آواز آنے لگی۔

میری بیوی، میری سکھیا رانی ___ تو اتنی بیمار ہے اور میں کچھ کر نہیں سکتا ___ اور تو اور میں تجھ سے کھانا پکواتا ہوں۔ ایسی حالت میں بھی۔ کاش میں، اپاہج نہ ہوتا۔ تو میں ___ تو میں اتنے روپئے کماتا کہ تجھے کوئی دکھ نہ ہونے دیتا اچھے سے اچھے کپڑے پہناتا تجھے اچھے کھانے کھلاتا ___ میرا بھی ایک مکان ہوتا۔ اس وقت میں تجھے ایسی پانی ٹپکتی جھونپڑی میں تھوڑے ہی رکھتا کہ پانی برسنے میں سمٹ کر کونے میں بیٹھنا پڑے ___ میں تیرے لئے اچھے اچھے پھل لاتا ___ میں جانتا ہوں سکھیا تجھے بڑی خراب بیماری ہے تجھ کو اچھی غذا کی ضرورت ہے اگر تجھے میرے خیالات معلوم ہو جائیں تو تو کہے گی میں اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔ ارے پگلی! میں مزدوری کرتا یا کوئی چھوٹا سا کاروبار کرتا۔ پھر میں تجھے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاتا۔ اچھی غذا کھلاتا، قیمتی دوائیں لاتا۔ ایسا ہوتا تو میرا دکھ را ہوتا کہ تھا مُنڈے سے نہ مرتا۔ میری گڑیا جیسا بیٹا کی بھینٹ نہ چڑھتی پھر اس نے سوچا۔ ہماری سرکار کو بھی ہم پر رحم نہیں آتا ہماری یہ جھونپڑی بھی پولیس اجاڑ دیتی ہے جس میں ہم جانوروں کی طرح رہتے ہیں سرکار ہمارے سدھار کے لئے روپیہ دیتی ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ روپیہ کس طرح صرف ہوتا ہے۔

[illegible] تک بھی سب ہی تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہم دیتے ہی کے [illegible] جاتے ہیں۔ پھر اس نے سکھیا کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا [illegible] طرح جل رہا تھا۔ اسے دوا کی ضرورت تھی کچھ پیسوں کا انتظام کرنا ضروری تھا کہ اس کے لئے دوا لا سکے سیٹھ [illegible] اس کی نظر میں بڑے دیالو تھے۔ کسی طرح وہ ان کی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ سامنے ہی کسی دکان پر ایک ریکارڈ بج رہا تھا ——— "ہر جن کی سنو وہ ہماری سنے گا۔"

دربان نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور بھگانے لگا۔ اپاہج گونگے نے کسی طرح اسے کہا کہ اس کی گھر والی بہت بیمار ہے۔ وہ دربان کے قدموں پر گر پڑا۔ رویا گڑگڑایا تب کہیں وہ پسیجا۔ اور اسے لے کر سیٹھ کے پاس پہنچ گیا۔ اور سیٹھ کو کہا۔ سیٹھ نے دس روپیہ کا نوٹ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ یوں ہی بہانے کر کر کے روپیہ مانگتے ہو یہ لے جاؤ مگر رمضان شریف کے علاوہ کبھی یہاں نہ آنا۔"

اپاہج نے نوٹ کی طرف دیکھا۔ سوچا اسے اٹھا لے ... لیکن اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے سوچا اس کی سچی بات کو بھی بہانہ سمجھا جاتا ہے ——— اس نے نوٹ نہیں لیا دعائیں دیتا ہوا باہر نکلنے لگا تو سیٹھ کے کسی مصاحب نے کہا

"دیکھا آپ نے یہ کتنے بوڑھے ہیں۔ بیوی مر رہی ہوتی تو یہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ مکار اور چار سو بیس ہے ——"

اپاہج یہ سب سنتا باہر نکل کر سڑک پر بیٹھ گیا۔ وہ دوا لے کر ہی سکھیا کے پاس جانا چاہتا تھا۔ شام تک اس نے کچھ روپے جمع کر لئے اور دوا لے کر اپنی بانس اور پلاسٹک سے بنی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ سکھیا سو رہی تھی اس نے اسے جگانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی نیند نہ ٹوٹی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مصائب سے چھٹکارہ پا کر اطمینان کی نیند سو چکی تھی۔ دوا کی شیشی اپاہج کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ گولیاں بکھر گئیں

—— [illegible]

یاد نبیؐ چاہتا ہوں

جناب بہزاد لکھنوی

خدایا نئی زندگی چاہتا ہوں
فقط دل میں یادِ نبیؐ چاہتا ہوں

ہے طیبہ کی خاطر تڑپنے کی خاطر
الم کے لئے یہ خوشی چاہتا ہوں

پلا ساقیا جام عشقِ محمدؐ
کہ ہر وقت اک بیخودی چاہتا ہوں

ہے یہ درد یادِ نبیؐ کا سہارا
میں اب درد دل میں کمی چاہتا ہوں

جو بہزاد جاتی ہے سوئے مدینہ
اسی راہ کی رہبری چاہتا ہوں

بہزاد صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مولائے کل ہو ختم پیمبر تمہیں تو ہو
حقا کہ دو جہان کے سرور تمہیں تو ہو

جس نے بتایا حق کو تمہاری ہی ذات ہے
جس نے بتائی راہ وہ رہبر تمہیں تو ہو!

تم سے کروں نہ عرض تو کس سے ہو التجا
میرا نصیب میرا مقدر تمہیں تو ہو

اگر کسی وجہ سے آپ کا [illegible] واپس آ گیا اور آپ [illegible] چھوڑ دی
[illegible] پا کیا جائیگا۔

کے لئے [illegible] ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی آزادی ہے؟ اور یہ کیسی تعلیم و ترقی ہے؟ کہ انسان انسان نہیں رہا بلکہ وہ درندہ بن گیا ہے۔ ہاں وہ درندہ ہی ہے۔ یہ درندگی نہیں تو کیا ہے؟ کوئی بھی انسان ایسا نہیں کرسکتا۔ کیا آج کی تعلیم یہی سکھاتی ہے۔ کیا آج کی ذہنی ترقی کا یہی مقصد ہے کہ وہ اس طرح کے ظلم و ستم کرے۔ وہ بھی کن پر؟ کومل بدن رکھنے والی دوشیزاؤں پھول دلہنوں پر جو شیشے سے زیادہ نازک ہوتی ہیں جو کلیوں اور پھولوں سے بھی حسین نازک اور دلفریب ہوتی ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے اہم، سمجھ میں نہ آنے والی بات تو یہ ہے کہ ایسے مظالم میں بوڑھی ساسیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ کنواری نندیں بھی شریک کار ہوتی ہیں۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں آتا کہ کبھی وہ بھی بہو تھیں ـــــ انھیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ انھیں بھی بہو بنکر کسی کے گھر جانا ہوگا۔

ہندوستان میں ستی کی رسم مسلم حکمرانوں کے باعث ختم ہوگئی جو ایک عظیم ظلم ہوتا تھا، لیکن چتا میں جل کر مرجانے میں ایک مذہبی تصور رہتا ہوگا، اس لئے اکثر اسے ظلم نہ سمجھتی ہوں گی۔ بخوشی اس مذہبی فریضے کو ادا کرتے ہوئے اپنی جانیں نذر آتش کر دیتی ہوں گی ـــــ لیکن آج جس طرح دلہنیں جلائی اور ماری جاتی ہیں۔ اس میں کوئی مذہبی جواز نہیں ہے، اس لئے اس طرح مرنے والی دلہنوں کو تکلیف عظیم ہوتی ہوگی۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے کے قوانین پر جن میں ابھی اور سختی کرنے کی صورات شامل کی گئی ہیں۔ پوری طرح نفاذ کرانے کا بھی اہتمام کرے یعنی ایسا اہتمام جو رشوت یا سفارشات کا اثر نہ ہونے دے ـــــ لیکن شاید ایسا ممکن نہ ہوسکے گا۔

مِعراجِ شوق

شاہر حرم حمید صدیقی

خدا کا حریم جلال آرہا ہے
نگاہوں میں حسن جمال آرہا ہے

تصدق ہیں جس پر دو عالم کے جلوے
وہی کوچۂ بے مثال آرہا ہے

عجب مستیاں ہیں عجب لغزشیں ہیں
کہ پھر حال کے بعد حال آرہا ہے

معراج شوق میں شاعری کی ذرا یہ کیفیت بھی ملاحظہ ہو۔

پیشِ نظر ہے کون سی محفل نہ پوچھئے
اظہار لطفِ دید ہے مشکل نہ پوچھئے

دل جانب مدینہ ہے رخ جانب حرم
کچھ انتہائے کشمکش دل نہ پوچھئے

اک جذبِ محویت میں چلا جارہا ہوں میں
مجھ سے نشانِ جادہ و منزل نہ پوچھئے

گو اٹھ گئے بہت سے حجابات اٹھ گئے
پھر بھی حجابِ زیست ہے حائل نہ پوچھئے

کس کی تجلیاں ہیں تصور میں جلوہ گر
آئینہ بن گیا ہے مرا دل نہ پوچھئے

معراج شوق ہوگئی حاصل مجھے حمید
اب مجھ سے میری زیست کا حاصل نہ پوچھئے

پانے سے پہلے

از محترم وحید الدین خاں صاحب

انگریزی کا مقولہ ہے کہ ہم دیتے ہیں تب ہی ہم پاتے ہیں؛ دنیا کے بنانے والے نے دنیا کا یہ قانون مقرر کیا ہے کہ یہاں جو دیتا ہے وہی پاتا ہے۔ جس کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہو اس کے لئے پانا بھی اس دنیا میں مقدر نہیں۔

ہمارے چاروں طرف کی دنیا میں خدا نے اس اصول کو انتہائی کامل شکل میں قائم کر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز کو اگرچہ اپنے وجود کو قائم کرنے کے لئے دوسروں سے کچھ لینا پڑتا ہے، مگر ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ جتنا لیتی ہے اس سے زیادہ وہ دینے کی کوشش کرتی ہے۔

درخت کو لیجئے۔ درخت زمین سے پانی اور معدنیات لیتا ہے۔ وہ ہوا سے نائٹروجن لیتا ہے۔ وہ سورج سے حرارت لیتا ہے اور اس طرح پوری کائنات سے اپنی غذا لیتے ہوئے اپنے وجود کو کمال کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ مگر اس کے بعد اس کا پورا وجود دوسروں کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو لکڑی دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو پھول اور پھل دیتا ہے۔ وہ ساری عمر اسی طرح اپنے آپ کو دوسروں کے لئے وقف رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال کائنات کی ہر چیز دوسروں کو نفع پہنچانے میں مصروف ہے۔ سورج، دریا، پہاڑ، ہوا، ہر چیز دوسروں کو نفع پہنچانے میں لگی ہوئی ہیں۔ کائنات کا دین نفع بخشی ہے نہ کہ حقوق طلبی۔

اس دنیا میں صرف ایک ہی مخلوق ہے جو دینے کے بجائے لینا چاہتی ہے، اور وہ انسان ہے۔ انسان یک طرفہ طور پر دوسروں کو لوٹتا ہے، وہ دوسروں کو دئے بغیر دوسروں سے لینا چاہتا ہے۔ وہ نفع بخش بنے بغیر نفع خور بننا چاہتا ہے۔ انسان کی یہ روش خدا کی اسکیم کے خلاف ہے، وہ کائنات کے عام مزاج سے ہٹی ہوئی ہے۔ یہ تضاد ثابت کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے وہ دنیا میں کامیابی مقدر نہیں۔ موجودہ دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو وسیع تر کائنات سے اپنے کو ہم آہنگ کریں۔ جو دینے والی دنیا میں خود بھی دینے والے بن کر رہیں، نہ کہ لینے والی دنیا میں مزید لینے والے۔

(بشکریہ ماہنامہ الرسالہ۔ دہلی)

اقوالِ زرّیں

- اکثر اوقات ہمارے بارے میں ہماری نسبت ہمارے دشمنوں کی رائے زیادہ صحیح ہوتی ہے۔

(رضیہ جمال)

- موت اور رزق کا غم نہ کرو ان دونوں کا وقت مقرر ہے اور مقررہ وقت پر یہ آتے ضرور ہیں۔
- اگر تمہارے یہاں تریاق موجود بھی ہو تو اس پر بھروسہ کرتے ہوئے زہر مت کھاؤ۔
- تمہیں جہاں بھی سچائی کی مشعل دکھائی دے اس کی روشنی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاؤ اور یہ مت سوچو کہ اس مشعل کو کس نے روشن کیا ہے۔
- جس سر میں تفکرات نہ ہوں وہ ایسا پارک ہے جس میں پودے نہ ہوں۔
- جس کا سر موم کا بنا ہوا ہو اسے دھوپ میں نہیں نکلنا چاہیئے۔
- سر اس وقت دھڑ پر اچھا لگتا ہے جب اس کے ساتھ عزت بھی ہو۔
- جب تمہارا مخاطب تمہاری ہر بات پر سر ہلانے لگے تو سمجھ لو کہ اس کی خواہش یہ ہے کہ اب تم اپنی زبان بند کر لو۔
- تمہیں خود تم سے بڑھ کر اور کوئی سکون نہیں دے سکتا۔
- میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا رہا اور آخر کار وہ مجھے اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں ملا۔
- سمندر کی غضبناک لہروں نے کتنے بیڑوں کے بیڑوں کو ڈبو دیا ہے۔
- سمندر کبھی نہیں سوتا اس کی بیداری بے قرار اور بے چین روحوں کو تسکین بخشتی ہے۔
- سمندر کا کوئی بادشاہ نہیں ہوتا صرف خدا ہوتا ہے۔
- جب ہم سمندر کے ساحل پر بیٹھ کر لہروں کا نظارہ کرتے ہیں تو ہمارا دکھی دل شگفتہ پھول کی طرح مسکرانے لگتا ہے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایسا شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور پاکیزہ ہو۔ جس ماہ کے پرچے میں شعر چھپنے والا ہو اس سے قبل والے مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانے والے اشعار ہی شامل اشاعت کئے جاتے ہیں دسمبر کے لئے عنوان ہے "آرزو" اور جنوری کے لئے "صبا"

ارادہ باندھتی ہوں ، سوچتی ہوں ، توڑ دیتی ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے ، کہیں ویسا نہ ہو جائے

مرسلہ :۔ طاہرہ تبسم اعظمی
(ماجد پور ۔۔۔ سکروڑ)

ارادہ ہے پھر زندگی کو سنواریں
تمنا ہے پھر لالہ زاروں سے کھیلیں

مرسلہ :۔ ب۔ن آنسہ ابراہیم (بنگلور)

زندگی کیا ابھی کچھ اور ارادہ ہے تیرا
کیا یہ کچھ کم ہے کہ اتنا جو دیا ہے تو نے

مرسلہ :۔ قمر النساء ۔ خان منزل (بیجاپور)

ہے ارادہ گھر سے نکلے جانب منزل مگر
ہمسفر ملتے رہے اور کارواں بنتا گیا

مرسلہ :۔ محمد تنویر شمسی (لکھنؤ)

ارادہ جس کا پختہ ہو، یقین جس کو خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں میں وہ گھبرایا نہیں کرتا

مرسلہ :۔ شمیم شاہین (ملکی محلہ آرہ) مرسلہ :۔ سید اختر حسن (گورکھپور)

سجا لوں زیست کلیوں سے مٹا دوں اپنی ہستی کو
مجھے پہلے بتا دو تم تمہارا کیسا ارادہ ہے

مرسلہ :۔ مس روبی ، دیبا (آگرہ)

کسی کی آرزو نے اس قدر رسوا کیا مجھکو
ارادہ اور کوئی پھر اگر کرتے تو کیا کرتے

مرسلہ :۔ نور جبیں ولد افروز درجت نور ۔۔

جنہیں ہے ان کے لئے عشرت بہار کبھی
جنھیں خود اپنے ارادے پہ اختیار نہیں

مرسلہ :۔ صوفیہ مظفر صاحبہ جمشید پور

کلام تبسم

طاہرہ تبسم اعظمی

چاہے جتنے بھی غم اے خدا دیجئے
حوصلہ بھی مجھے صبر کا دیجئے

کچھ ہماری وفا کا صلہ تو ملے
آپ گر اپنا وعدہ نبھا دیجئے

کچھ نہ دے گا زمانہ سوا طنز کے
اپنے غم کو ہنسی میں چھپا دیجئے

کچھ تو تاریک راہیں منور رہیں
میرے گھر کو خوشی سے جلا دیجئے

اور تلخیٔ دوراں گوارہ نہیں
اب نہ جینے کی مجھ کو دعا دیجئے

درد و حرماں نصیبی الم کرب و غم
زندگی اور کیا ہے ؟ بتا دیجئے

سچ کے حق بات میری کہا سنئے یہ
اب تبسم کو اس کی سزا دیجئے

نئی مطبوعات

اہرام	مظہر الحق علوی	۳۲/-
تزئین	سرور جہاں	۲۱/-
معصوم گناہ	سیم بانو قدوائی	۱۵/-
کچے راستے	ارشاد امروہوی	۲۴/-
زہرِ سے ذات	عفت قریشی	۴/-
اسٹیج ڈرامے	آفاق احمد	۲۵/-

گا۔ وہ رضامند ہو گئیں۔ مجھے فرش و دِرش کچھ لینا نہیں ہے۔ فقط تم سے ملنا تھا۔!

"مجھ سے کچھ کام ہے!" دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھال کر اس نے پوچھا۔

"نانا ابا نے منع نہیں کر دیا کہ تم سے کوئی کام نہ لیا جائے۔؟"

"خادم تو ہوں آپ سب کا!"

"اب تو اتنی خاکساری اور کسر نفسی مت کیا کرو۔" صنوبیہ بولی اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا "آؤ۔ ادھر ہسٹری کے ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ میں نے منزہ بی سے کہا تھا کہ مجھے تاریخ کے ڈیپارٹمنٹ سے لے لیجئے گا۔ ورنہ مجھے یہاں وہاں ڈھونڈتی پھریں گی! آؤ چلیں۔!"

"مگر صنوبیہ بی بی! کیا یہ ٹھیک ہے۔ کہ کہ"

"کہو۔ رک کیوں گئے!؟"

"آپ اور میں وہاں بیٹھ کے باتیں کریں!؟"

"اتنی زیادہ بری بات بھی نہیں ہے۔ کیوں۔ کیا تمھاری نیت صاف نہیں ہے!۔"

"نہیں نہیں۔ خدانخواستہ۔!"

"باتیں تو بزرگوں کی سی کرتے ہو!۔

اچھا چلیے۔ مگر میں کینٹین میں کہہ آؤں کہ آپ کے لیے پیسٹری اور کافی بھجوا دی جائے۔ لیکن آپ کیا یہاں دیر تک ٹھہریں گی۔ یہ چھوٹا سا ناشتہ دان آپ کے ہاتھ میں کیسا ہے؟"

"تم کافی اور پیسٹری کے لیے کہہ آؤ تو بتاؤں گی!۔" (باقی آئندہ)

اگر تقدیر کی خوبی یہی کہلاتی ہو کہ آدمی کی مٹھی گرم ہو جائے تو وہ ایک ایک پائی سید صاحب کے قدموں پر رکھ دیتا۔

"میاں تم خرچ کر لیا کرو۔ مجھے کیوں دے ڈالتے ہو بیٹا!" سید صاحب کو شرمندگی ہوتی۔ وہ زبان خلق کی تیر اندازی سے اس کی شخصیت کو مجروح ہونے سے بچا نہ سکتے تھے۔ اور اس کا ذمہ دار خواہ مخواہ خود کو سمجھتے تھے۔

"بڑے صاحب یہ بہت حقیر چیز ہے۔ آپ کی عنایتوں کا بدل تو میری جان بھی نہیں ہو سکتی۔ آپ میری حقیر خدمتوں کا تذکرہ کر کے مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔" ایاز جواب دیتا۔ سید صاحب نے بارہا کہا تھا کہ وہ انھیں بڑے صاحب نہ کہا کرے لیکن ایاز نے اپنی روش نہیں بدلی وہ اب سمجھدار تھا اور یہ سمجھ اور شعور اس کے لیے نہایت درجہ کی افسردگی، بے چینی اور خلش لے آئی تھی!

بچپن اور لڑکپن کا دور ہوا کی مانند گزر گیا تھا۔ یہ زمانہ جو اسے بہت کچھ مادی سہولتیں دے رہا تھا۔ اس کا روحانی سکون چھین کرنے لگی تھا! بیک وقت کئی قسم کی فکریں اس پر یلغار کر دیتیں۔ اور ہر طرح کی کھوکھلی دلچسپیوں سے اس کا دل اُچاٹ ہو جاتا!۔ وہ فلسفیانہ طرز فکر رکھتا تھا۔ زندگی نے اسے جس طرح ایک شرمناک دھوکے میں رکھ کر دوسروں کی نظروں میں سبک اور خفیف کیا تھا۔ اس کا احساس اسے بہت تھا لیکن ان محسوسات کو ذہن سے دور دھکیلنے کی کوئی طاقت اس میں نہ تھی!

کوئی سی چھٹی تھی! وہ اپنے کمرے میں بیٹھا باغ کی سبز فضا میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ یہاں کی ایک ایک پتی ایک ایک کلی اس کی محنتوں کی

آئینہ دار تھی۔! ایک اجڑے ہوئے باغ کو اس نے ان طویل برسوں میں
ہرا بھرا چمن بنا دیا تھا۔!

دفعتہً اس نے اپنے کمرے کے پیچھے افتادہ کوٹھری میں کچھ آوازیں
سنیں۔ اور اٹھ کر دیوار کی طرف چلا گیا۔! اور بند کھڑکی سے کان لگا دیے
ان آوازوں کو اس نے فوراً پہچان لیا ایک ارقم کی تھی۔ دوسری گھر کی نئی
ملازمہ صنوبر کی۔ جانے ارقم اس سے کیا منوانا چاہتا تھا۔ صنوبر کہہ رہی تھی
"مگر آپ کا کیا۔ آپ تو کوئی بہانہ بنا کر الگ ہو جائیں گے۔ میں سب کو
کیا منہ دکھاؤں گی۔ صاحب جی۔ میرا باپ بڑا جلا ہے۔ وہ مجھے زندہ
گاڑ دے گا! نہیں نہیں۔ پرائے پھڈے میں میں ٹانگ نہ گھسیڑوں گی!"

"اچھا سن! تو تو صنوبیہ بی بی کے کام کاج پر مامور ہے کبھی انھوں نے
میرا ذکر بھی تجھ سے کیا۔ وہ مجھ سے نہیں بولتی کتراتی پھرتی ہے
جانے خود کو سمجھتی کیا ہے۔ صنوبر۔ سنو۔ یہ دانہ اچھا ہے۔ میں تمہیں
پورے ایک ہزار روپے دوں گا۔ تم پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ بس تم
میری بات مان لو!"

"اپنی عزت گنواؤں آپ کے لیے!"

"ہشت: عزت وزت کوئی چیز نہیں۔ اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو
عزت اسے خود بخود مل جاتی ہے۔ کبھی میری بات۔!"

"آپ جانیے۔!"

اری او لڑکی۔ تم نے پوری بات سمجھ لی نا۔ اس طرح کیا ہو گا معلوم
ہے۔ وہ کم بخت جو میری راہ کا ہمالیہ ہے۔ راہ سے ہٹے گا اور پھر صنوبیہ
بھی میری ہو جائے گی۔ مطلب یہ کہ ایک تیر میں دو شکار!!۔" وہ ہنسا

وہ سورج میں غرق بے معنی انداز میں خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ دفعتہً
اس نے ایک بھرائی ہوئی سرگوشی سنی: "سنو۔ ایاز۔؟"

وہ جلدی سے مڑا۔ گرد و پیش سنسان تھا۔ غالباً چپراسی اور چوکیدار بھی
کمرے بند کر کے جا چکے تھے۔ صرف سیناروں سے باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی
دے رہی تھی۔!

"یہاں آپ کا آنا کیسے ہوا؟" ایاز نے پوچھا۔ وہ بہت لیے دیے اور کھنچا کھنچا سا
لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس طویل مدت میں اجنبیت، تکلف اور غیریت کے سارے
اعتبارات ختم ہو چکے تھے۔ لیکن احساس شباب اور کچھ نئے جذبات نے ان
کے درمیان بیگانگی اور حجاب کی ایک دبیز دیوار کھڑی کر دی تھی!۔

"کیا کسی کا یہاں آنا منع ہے؟" صنوبیہ یوں مسکرائی جیسے چپکے سے کوئی کلی
کھول دے!۔ ایاز چپ رہا۔ دل میں طوفان سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ آج
کتنے دنوں بعد اس نے اسے دیکھا تھا۔ کتنی پیاری ہو رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک
سفید ریشم میں لپٹی جوہی کی کلی۔ نہائے دھوئے سیاہ دراز بال جو اس نے فقط
سے گوندھ کر یونہی کھلے چھوڑ دیے تھے۔ پاکیزہ چہرہ۔ آنکھوں کی کاجل کی ریکھا
لبوں کے دلفریب گلابی نے اس کے سفید سفید چہرے کو عجیب سا حسن بخش
دیا تھا۔ کتنی خوشنما آنکھیں تھیں جیسے مسجد کے محراب ابرو کے نیچے دو چراغ
روشن ہوں۔!

"مسز جوشی سے نوٹس لینا ہے شاید۔!" خاموشی سے گھبرا کر ایاز نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ یہ تو مجھے بازار میں شوپنگ کرتی مل گئی تھیں۔" صنوبیہ نے
مسکرا کر سر کو ایک خوب صورت انداز میں جھٹکا: "دراصل میں نے تمہاری [illegible]
یہاں آنے کا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی اپنی [illegible]

لا ہے۔!
"آپا کو بھی ایسے بیغیروں کو سمیٹنے کی بری عادت ہے" شکیب نے کنکھیوں سے ایاز کو دیکھ کر کہا "اب ایسا نہ ہو کہ کہیں کسی کو کھیر کی کھرچن ملا دیں۔!"

"مجھ پر سے۔!" ایاز نے دانت پیسے "میں نہیں نگلوں گا کھرچن۔ پتہ نہیں کیسے کنجوسوں سے ساتھ پڑا ہے۔ آپا بے چاری مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ دیکھا نہیں جا رہا تم سے"

دفعتہ شکیب کا چھوٹا بھائی عمر اچھل پڑا "صنوبیہ آپا آ رہی ہیں مسز جوشی کے ساتھ۔!"

"انگولس کے نوٹس لینے ہوں گے۔!" ایاز نے کہا۔ شکیب مسکرایا اور ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولا "بس میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدل کے سفید سے سرخ سے نیلے کیسے ہو جاتے ہو؟ اچھا اب میں چلا۔ خدا حافظ۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔

اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ظہیر کے ساتھ چلا گیا!۔

[illegible] گزرتے ہوئے صنوبیہ نے ایک سرسری نگاہ ایاز پر ڈالی اور ان کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ ایاز عجیب سا کھڑا رہا۔ کیوں آئی تھی وہ یہاں۔ اس کا یہاں کیا کام تھا؟ کیا اس نے ملنے کا بہانہ نکالا تھا۔؟ ایک وقت گزر چکی تھی دونوں میں بات چیت نہ ہوئی تھی۔ صنوبیہ پر نظر پڑی [illegible] اور ایاز ایک بے بس غلام کی طرح گھر سے دور باغ کے کونے کی کوٹھری میں پڑا رہتا تھا۔

"آپ ان بے چارے سے جلتے کیوں ہیں؟" صنوبر بولی۔

"اگر پاؤں کی جوتی ٹوپی کی برابری کرنے لگے تو اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ تو پیروں میں رہنے کی چیز ہے۔ نہ مانے تو پھر اٹھا کر پھینکنا پڑتا ہے۔!"

ارقم کی آواز سنائی دی۔

دو لمحوں کی خاموشی کے بعد صنوبر نے کہا "اگر کوئی آفت آئی تو۔!"

"نہ تمہارے سر نہ میرے سر۔ صاف تم اسی کا نام لے لینا۔!"

"کس کا نام؟" زیر لب ایاز بڑبڑایا۔ کیا یہ ناپاک سازش جس میں کسی طرح صنوبیہ ملوث دکھائی دے رہی ہے۔ اسی کے لیے کی جا رہی ہے؟ یا یہ اسی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔؟

صنوبر کی تبسم آمیز آواز سے وہ چونکا! "اچھا تو پھر لائیے ایک ہزار!"

اس کے بعد پوری خاموشی چھا گئی۔ ایاز دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ساری بات چیت ابھی اور اسی وقت جا کر سید صاحب کو سنا دی جائے پھر کچھ سوچ کر وہ رک گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ارقم کی کوئی نئی ہوس ہو۔ اور اس میں نہ وہ ملوث ہو نہ صنوبیہ تو پھر سید صاحب کیا سوچیں گے!۔ وہ گو مگو کے عالم میں پھر کرسی پر آ بیٹھا۔

پانچ چھ سال سے وہ باغ میں بنی کوٹھری میں رہنے لگا تھا کبھی کبھار سید صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا! وہ تو جہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے پر مُصر تھا لیکن سید صاحب نے اسے اپنی قسم دے رکھی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی خدمت اگر کوئی کر سکتا ہے تو ایاز ہی ہے۔ سب کو انھوں نے خوب اچھی طرح کسوٹی پر پرکھ لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی سوچ کے بحرِ عمیق میں یوں گم ہوا کہ ارقم و صنوبر کی بات چیت کو بالکل بھول گیا۔

گھر میں ہونے والی چپقلش سے وہ تھوڑا بہت واقف تھا۔ ارقم کی والدہ صنوبیہ کا رشتہ لائی تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ جب ان کی بیٹی سید صاحب کے بیٹے سے بیاہی ہے تو ان کی نواسی ان کے بیٹے سے بیاہی جائے۔ سید صاحب نے صاف جواب دے دیا تھا۔

صنوبیہ کا اختیار اس کی ماں اور ماموؤں کو ہے۔ محترمہ! وہ دوسرے خاندان کی بچی ہے۔ ابھی فیاض میاں کا حق اس پر باقی ہے۔ وہ اگر کبھی آ نکلیں اور اپنے بچوں سے ملنا چاہیں یا ان کی فلاح بہبود کے لیے کچھ سوچیں تو ہم انھیں باز نہیں رکھ سکتے۔ یہ خون کا ناطہ وہ ناطہ ہے جسے ایک بار استوار کرنے کے بعد خدا بھی نہیں توڑ سکتا! آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔ میں فیاض کے سامنے شرمندہ ہونا یا جواب دہ ہونا نہیں چاہتا!"

"وہ نگوڑے ہیں کہاں"؟ آسیہ بیگم جھلائیں "پچیس برس گزر گئے نہ خبر جبر لی نہ دی۔ مر کھپ گئے کہ کہیں چلے گئے، اب بھی پر ان کا حق کیا ہے؟"

"نہ مرے کھپے ہیں۔ نہ کہیں دفان ہوئے ہیں" بیگم نے جل کر کہا "خوب کمائے اسی شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اکثر شکیل جمیل کو ان کے بھائی بند اور کبھی وہ خود بھی دکھائی دیتے ہیں۔! ایسے جلاد جلدی مرتے نہیں۔ مجھے تو مردے نکلوں کی طرف سے دغدغہ لگا ہی رہتا ہے۔ آجائیں کبھی ملنے ملانے تو پھر ارے ہاں۔ اب ہاتھ پکڑ کر نکالا تو نہیں جا سکتا!"

آدمی تھا۔ اکثر اسی نے بڑی فراخدلی سے اس کی مدد کی تھی اور اس نے اچھے خاندانوں میں ٹیوشن تلاش کیے تھے! ایاز کو اس کی دوستی اور خلوص پر پورا بھروسہ تھا! اس کے گھر بھی اس کا آنا جانا تھا۔ اور گھر والوں نے بھی ایاز کو خلوص ہی ملا تھا۔ وہ دونوں آپس میں دوست بھی تھے اور رازدار بھی!

شکیب نے الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور مسکرا کر بولا۔
"اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر۔ تو سلامت رہوی ہا ز آئی!"

"میں بھی اب جا رہا ہوں" ایاز نے شعر کو نظر انداز کر کے کہا "پھر ملوں گا تو کچھ ذاتی باتیں کروں گا۔ تمھارے سوا بھلا کس سے کہہ سکتا ہوں!"

"مولوی ارقم صاحب کے ملفوظات ہیں شاید
اب بھی ان کو شکایت نہیں ہے۔ اپنی الجھن ہے!"
بیان کرو فریاد کی۔ جہاں پناہ گوش برآواز ہیں!

"تمھارے مسخرے پن سے بڑی کوفت ہوتی ہے شکیب۔ کبھی کبھی تو میں اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ تم میری پریشانیوں کو واقعی سنجیدگی سے محسوس بھی کرتے ہو کہ نہیں۔ یونہی اس کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہو!" ایاز تڑپ کر دھیمی آواز میں بولا۔

"حالانکہ تمھارا درد دل میں ہی سنتا ہوں" شکیب نے سنجیدگی سے جواب دیا "وہ مرزا غالب کا شعر بھی ہے نا کہ درد دل کے سوا انسان کو اور کس لیے پیدا کیا ہے"

"چلیے بھیا" اس کے بھائی نے بور ہو کر کہا۔ اور ایاز سے بولا "شام کو آپ گھر آئیے گا! آپا نے کہلوایا ہے کہ کچھ اور شیر ال پر نیاز ہے۔ آپ کو

علامہ اقبال کہہ گئے ہیں"۔ ایاز ہنسنے لگا۔ "تم سے کس نے کہا ہے کہ بیوند لگا لائے یہ شعر سناؤ! مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ شکیب اینڈ سنز۔ تو کہاں ہیں سنز؟۔ بکواس کرتے ہو؟"

"بکواس تم کرتے ہو۔ کالی زبان تم نکالتے ہو" شکیب نے برا سا منہ بنایا "میں ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتا ہوں۔ آج نہیں تو کل۔ جب اللہ رکھے تمہارا ابّا چار آنے کا گڑ لینے آئے گا تو میرا بڑا پوتا۔۔!"

"مذاق مت کرو۔ مجھے واقعی افسوس ہوگا۔ اگر تم یہ سال پورا کر لیتے تو"

"ابے تم نے بھنگ پی لی ہے کیا؟" شکیب بگڑ گیا۔ "بار بار آپ نصیحت فرما رہے ہیں۔ بھئی! اس زبردستی کے نکاح کے معنے یہ تھوڑی ہے کہ میں تعلیم ختم کر بیٹھوں۔ تمہارا ساتھ پھر ملے گا کہاں۔ یہ سمجھو کہ صبح دس بجے نکاح ہوگا اور ساڑھے دس بجے ہم بدولت پھر یہیں قدم رنجہ فرمائیں گے مطلب یہ کہ سہ

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ ایسے بے تکے شعر گفتگو میں ضرور پڑھو" ایاز ہنستے ہوئے کہا۔ "تو تمہارے چھوٹے بھائی صاحب اسکوٹر لے آئے اچھا تو پھر خدا حافظ۔ مگر سنو۔ اپنے نکاح میں مجھے نہ بلاؤ گے کیا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو بھائی۔ ایک خطرناک سودے بازی کے وقت کسی مضبوط گواہ کا رہنا بے حد ضروری ہے۔" شکیب نے کہا۔

ایاز پھر ہنسنے لگا: "گواہ باقی نہیں۔ بسر و چشم چلتے ہیں۔"

شکیب اس کا کالج کا ساتھی تھا۔ بے حد زندہ دل، دلچسپ اور مخلص

تو بھلا تمہاری بھی باتیں آپا زینب!" آسیہ بیگم نے دوسرا مہرہ سرکایا۔ "ان کی بچی اگر ہمارے ہاں آ بھی گئی تو ان کی شکایت کا کیا موقعہ ہے؟ بھلے ہی گھر گئی ہے نا۔ کوئی چوڑھے چمار کا خاندان نہیں ہے۔ نہ لڑکا ہی اوباش آوارہ ہے۔ فیاض میاں کو تو بیٹی کے اچھے خاندان میں بیاہ جانے سے اُلٹی خوش ہوگی۔ میں تو کہتی ہوں۔ یہ سب آپ اور بھیا کی ٹالنے کی باتیں ہیں۔ نہ فیاض میاں ابھی تک اولاد کی خیر خبر لینے آئے اور نہ کبھی آئیں گے کسی وجہ سے آپ لوگ اگر ہم سے لڑکی بیاہنا نہیں چاہتے تو صاف صاف کہہ دیجئے۔ یوں مجھے معلق نہ رکھیے؟"

"آسیہ بہن تم ہاجرہ ہی سے بات کر دیکھو۔۔!" بیگم نے کہا۔ "اگر وہ راضی ہیں تو پھر ہماری مرضی یا رائے کیا؟ لڑکی ان کی۔ لڑکا ان کی بھاوج کا بھائی۔ وہ پسند کرتی ہیں تو پھر سب ٹھیک ہے!"

"آپ لوگ نانا نانی ہیں۔ بزرگ!" آسیہ بیگم بولیں۔

"بزرگوں کو چھوٹوں نے اٹھا کر پرانے طاقوں پر دھر دیا ہے" بیگم نے جواب دیا۔ "جب تک بے غیرتی سے زندہ ہیں۔ بس زندہ ہیں۔ اب بزرگی تعظیم کے قابل نہیں رہی۔ بیزاری کا باعث ہے!"

زینب امکینٹ صاحب نے ناخوشگوار انداز میں بات کاٹ دی۔ "اس طرح کی لایعنی گفتگو مت کرو۔ بس تمہارا یہ مشورہ بہت مناسب ہے کہ یہ محترمہ صرف لڑکی کی ماں اور ماموؤں سے بات چیت کریں!"

لیکن ماں اور ماموؤں سے گفتگو کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ کچھ سن گن صنوبیہ کو مل گئی تھی۔ اس نے ہاجرہ سے کہا۔

"آپ ان گورکھ دھندوں میں مت پڑیے۔ یونہی صحت تباہ ہو چکی ہے

عزیز پریشانیوں کا بوجھ دماغ پر مت لاد یجیے۔ میں نے پختہ ارادہ کر
لیا ہے کہ میں آئندہ سروس کروں گی۔ ! مجھے شادی بیاہ کی فضولیات
میں پڑنا نہیں ہے۔ میرے باپ اور بھائیوں نے آپ کو بہت دکھ دیے
ہیں۔ آپ نے زندگی بھر کسی خوشی کا منہ نہ دیکھا۔ اب میں آپ کو خوشیاں
دوں گی۔ ممی۔ ! کسی کے بہکانے، سبز باغ دکھانے یا مستقبل کے خوف
دلانے سے متاثر مت ہوئیے۔ ورنہ آپ کو زیادہ صدمہ پہونچے گا!"

"کیوں پہونچے گا!" ہاجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے قطعی انکار سے!" دوٹوک انداز میں صنوبیہ نے جواب دیا

"تم میری خوشیاں چاہتی ہو بیٹی!"

"یقیناً"

"اگر میری خوشی اسی میں ہو کہ تم اپنے گھربار سے لگ جاؤ۔!"

"ممی آپ مجھے بھی بہت چاہتی ہیں نا!"

"جی رہی ہوں صرف تمہاری صورت دیکھ کر بیٹا۔!"

"تو پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیے کہ آپ کی خوشی میری
بربادی میں پنہاں ہے۔ ممی! پھر میں لب سی لوں گی۔ جو آپ کا جی
چاہے کیجیے!"

ہاجرہ بیگم نے مٹھی بند کر کے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

صنوبیہ ہنسی! "آپ ڈرتی ہیں ممی۔ سب سے ڈرتی ہیں آپ۔
بھائیوں سے۔ بھاوجوں سے، بیٹیوں سے، ایرے غیروں سے۔ ابھی
تو آپ کی یہ نوبت پہونچی ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں جو چاہے
کر سکتی ہوں۔ کہنے دیجیے۔"

نظر انداز کر کے پوچھا۔

"اماں سنا نہیں کہ چچا صاحب نے لمبی چوڑی کرانے کی دکان میرے نام
ٹرانسفر کر دی ہے۔ تلک ہے!" شکیب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ جتنا دل
چاہے غلہ گھر میں بھر لو کچھ پرواہ نہیں۔ تمہیں کبھی آٹے دال کا بھاؤ
معلوم کرنا ہو تو سیدھے شکیب اینڈ سنز کرانہ مرچنٹ کی دکان پر
چلے آنا۔ معقول کٹوتی پر گیہوں چاول"

"اچھا تو حضور اب بیٹھے بنیں گے!" ایاز بولا "سرمایہ داری کریں گے
ذخیرہ اندوزی فرمائیں گے۔ میں پوچھ رہا ہوں ایم کام کرنے کے بعد شریفانہ
طور پر بینک کی سرکاری ملازمت تمہیں کہاں کاٹ رہی تھی جو یہ کھڑاگ
پھیلا بیٹھے ہو۔ واقعی۔ تم نہ رہو گے تو یہ ماحول مجھے ڈسنے کو دوڑے گا بابا۔ کم
یہ ایک سال آخری امتحان کا تو کسی نہ کسی طرح کھینچ ہی لو!"

"کیا مطلب۔ تم نہ رہو گے! میاں۔ رہوں گا کیوں نہیں!" شکیب
نے برا مانا۔ "ایسی بھری پری جوانی میں مجھے یہاں سے چلتا نہ کرو۔ اور یہ جو
تم بک رہے ہو کہ سرکاری نوکری۔ !۔ تو اس کا یہ ہے کہ مہینے بھر کی گھسی
کے بعد گنی بوٹی نپا شوربہ لیے گھر چلے جا رہے ہیں۔ میاں۔ اب تو یہ ہوگا
کہ آرام سے گدیلے پر بیٹھ کر ایک دن میں سارے مہینے کی تنخواہ ان جناب
آسانی سے بنالیں گے۔ سمجھے سہ

رہا کشکانہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پر رکاب کیا چیز ہے۔ آج تک میں کچھ نہ دے سکا۔ اگر دوڑ سکو
کا ڈر نہ ہوتا تو علامہ اقبال کا ... پہنچ جاتا۔

میں بتاؤں۔ کیوں ہے ؟" وہ خوفناک انداز میں ہنسا۔

مستفسرانہ انداز میں شازیہ نے اسے دیکھا۔

آپ کے گھر میں جو فیقرپل کر جوان ہوا ہے۔ دراصل روٹیاں لے گئی ہیں۔"

چپ رہو۔ بکواس نہیں" شازیہ نے گھڑک دیا "تم صنوبیہ پر ایسا بہتان نہیں رکھ سکتے۔ میں نے صنوبیہ کو اپنی گود میں لٹایا ہے اسے میں نے بڑا کیا ہے۔ اسے خوب سمجھتی ہوں۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ دراصل اسے انکار اس لیے ہے کہ وہ ہاجرہ باجی کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ کہہ چکی ہے!"

لاکھ کہا کرے۔ آپ اسے راضی کیجئے۔ ورنہ پھر میں زیادتی پر مجبور ہو جاؤں گا!"

اس کی نوبت کیا ہو گی ارقم صاحب؟" صنوبیہ دروازے میں کھڑی تھی "دھمکی کی صورت بھی بتا دیجئے۔ تاکہ وہ حسن ظن جو تھوڑا بہت آپ سے ہے وہ بھی فنا ہو جائے۔ پھر آپ کی کتنی قدر و منزلت میرے دل میں پیدا ہو جائے گی۔!"

ارقم کچھ سٹپٹا سا گیا "میں پسند نہیں کرتا کہ لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں یوں بے حیا گفتگو کریں!"

"جو اجازت اسلام نے دی ہے۔ آپ اسے بھی کالعدم قرار دیتے ہیں۔ صنوبیہ نے کہا "بہرحال آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کیا مطلب اور آپ اپنی مرضی مجھ پر مسلط کرنا کیوں چاہتے ہیں؟"

"میں نہیں مان سکتا کہ بزرگوں کے فیصلے سے تم بے خبر ہو۔"

"مجھے سب خبر ہے" صنوبیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ ماں کی طرح جھکے گی یا شکست نہ مانے گی۔ سرد لہجے میں بولی "لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ میں بزرگوں کے الٹے سیدھے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دوں۔ میری اپنی زندگی میرے اختیار میں ہے۔ جیسی چاہوں گزاروں!"

میں سمجھتا ہوں" غصے کی زیادتی میں ارقم یہی کہہ سکا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے آپ کو اتنی سمجھ دی ہے!"

ارقم! خاموش رہو!" شازیہ نے ڈانٹا۔

باجی۔ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے" ارقم نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا! اتنا کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا چل دیا۔

صنوبیہ؟" شازیہ نے پیار سے اسے مخاطب کیا۔

نہیں بھابی" صنوبیہ نے کہا "مجھے کچھ مت سمجھائیے۔ میں بچپن ہی سے ارقم بھائی کا ناقابل برداشت مزاج برداشت کرتی آئی ہوں۔ اب یہ نہ ہو سکے گا! آپ بھی انھیں سمجھا دیجئے! یہ غصہ گرمی اور حکومت مجھ پر نہ چلے گی!۔"

ارے وہ پاگل ہے" شازیہ نے کہا "آپی اسے سمجھ آ جائے گی۔ اور اصل بات یہ ہے کہ ہم نے بچپن سے اس کے دماغ میں یہ خیال بٹھا دیا تھا کہ تم اس کی دلہن بنو گی۔ تمہارے ان خیالات کا کسے خیال تھا۔ وہ تمہارے انکار اور ضد سے بوکھلا اٹھا ہے۔!"

"تو آپ اپنے نا سمجھ بھائی کو انسانی شکل کا کھلونا دے کر بہلانا چاہتی ہیں۔ صنوبیہ بولی "اور وہ بھی بنانے بگاڑنے کو ۔۔۔"

حریم
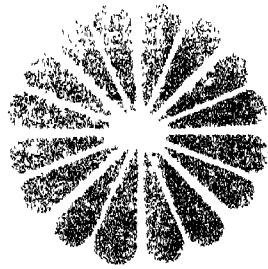
THE HAREEM

Dec. 85

Rs. 1/60
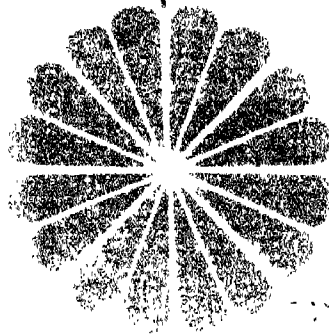
ایڈیٹر

نسیم انہونوی

مستقبل کی آواز
دھڑکتے دل کا ساز
بخشی جنتری سنہ ۱۹۸۶ء
نئی نویلی دُلہن کی طرح سجی بنی
مفید مضامین اور دیدہ زیب طباعت سے آراستہ و پیراستہ
قدردانوں کے لئے حاضر ہے
اندراجات
نعتیں
احادیث پاک
پیش گوئیاں
فالنامہ
تاریخی ناموں اور ساتھ ہی ساتھ بخشی کی شہرۂ آفاق
ادویات اور حسن افزا مصنوعات کا تعارف
نمونہ کی کاپی ایک روپیہ کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں
ایس اے بی بخشی کمپنی پوسٹ بکس نمبر کلکتہ (۷۳)
ہمارے اسٹاکسٹ سے بھی حاصل فرما سکتے ہیں

اکتوبر کے حریم میں، میں نے جناب حیدر عباس صاحب ایڈووکیٹ کا ایک مضمون روزنامہ قومی آواز سے صرف اس لئے نقل کیا تھا کہ اس میں عباس صاحب کی یہ بات میرے خیال میں قابل غور تھی کہ اس وقت سارے ملک میں قانون شریعت کے سلسلے میں بڑے بڑے جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں، جنہیں ہمارے بڑے بڑے علمائے کرام شریک ہوکر اس فیصلہ کے خلاف آوازیں بلند کر رہے ہیں جو سپریم کورٹ کے ایک جج نے اس مطلقہ عورت کے سلسلے میں دیتے ہوئے اس کے شوہر پر مطلقہ کو تمام زندگی نان ونفقہ دینے پر مجبور کیا ہے۔

ہماری سرکار نے بار بار ایسی بات کہی ہے کہ وہ شریعت اسلامی میں کوئی ردوبدل نہ کرتے ہوئے ایک ہی سول کوڈ نہ بنائے گی، لیکن اس کے باوجود سپریم کورٹ نے اس طرح کا فیصلہ دیا جو سراسر شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔

ہوتا ایسا ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے نظیر بن جاتے ہیں اور دوسرے اسی نوعیت کے مقدمات ایسی نظیروں کے تحت، اس طرح فیصل ہوتے ہیں، اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ یہ نظیر قائم نہ رہے۔

حیدر عباس صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بھی وضاحت کی تھی کہ وہ بھی شرعی مسائل ہیں جو غیر شرعی طور پر ایک عرصے سے قائم ہیں۔ میں اس سلسلے میں اور کچھ لکھنے سے پہلے اپنی نااہلی اور کم فہمی کا اعتراف کرلینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اول تو میں علم دین کا کبھی طالب علم نہیں رہا اور دینی کتابوں کا میرا مطالعہ بھی محدود رہا۔ میری ساری توجہ پردے پر رہی اور میں نے اپنے ناولوں اور حریم کے ذریعہ جتنا بھی لکھا اس بحث پر لکھا۔ اور اس وقت تو میری حالت ایسی ہے کہ میں کسی سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ مسلسل علالت اور ضعف کے باعث جہاں دوسری قوتیں کم سے کمتر ہوجاتی ہیں، ذہنی فہم و فراست کو بھی زوال آجاتا ہے۔ ۱۲ماہ کے اندر ½ ۵ کلو وزن کم ہوگیا ہے۔ لکھنا پڑھنا دشوار ہے، اس لئے یہ میری بے بضاعتی اور کم فہمی ہی تھی کہ میں نے حیدر عباس صاحب کا مضمون حریم میں شائع کر دیا اور اس سوال کے ساتھ کہ علمائے کرام سے اس کا جواب چاہتا ہوں جو صرف نان نفقہ ہی کے مسئلہ کو شریعت کے نظریہ سے ایک مسئلہ بنائے ہوتے ہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ اس کا تعلق اس طبقے سے ہے جو ہمیشہ مردوں کے ظلم و ستم برداشت کرتا رہا ہے؟

میری اس تحریر سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو مستحسن سمجھتا ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، لیکن میرے خیال سے یہ مسئلہ فرائض اسلام میں شامل نہیں جنہیں ہم

عورت اور مرد کے وجود کبھی کبھی جنس لطیف کی طاقت اور جنس قوی کی کمزوری کی حیرت انگیز داستان بن جاتے ہیں

داخلی مسئلے سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے مسائل اسلام کے خارجی مسائل ہیں۔ جو ان علماء نے بنائے ہیں جن کی پیروی مسلمانوں کے گروہ علیحدہ علیحدہ کر رہے ہیں۔

جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں کہ فرائض میں بھی اختلافات ہیں۔ وہ انھیں ہر امام کے پیرو، اپنے امام کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کرتے ہیں۔ اسی طرح شرعی مسائل میں بھی اختلافات ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان میں وقت کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ طلاق کے بعد نان نفقہ دینے کے مسئلے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے اور حالات کے پیش نظر شرائط کے ساتھ اس میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

اسلام ہمارے رسول کریم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں جیسا تھا، ویسا اب نہیں ہے۔ کچھ مسلمان شراب بھی پیتے ہیں۔ جوا بھی کھیلتے ہیں۔ زنا کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ سود بھی لیتے ہیں اور بھی دوسری برائیوں میں شریک رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے نبی کریم صلعم کبھی نہ چاہتے تھے کہ طلاق ایسی صورت میں ہو جو [illegible]

حفاظت

فوزیہ صابر

بجو چپ چاپ بیٹھی کھڑکی سے گلی میں سے بکریوں کے ریوڑ کو گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اچانک کسی نے اسے چٹیا سے پکڑ کر زور سے اندر کی طرف کھینچا۔ بجو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ بجو نے جلدی سے سر جھٹک کے اندھیرے کو دور کیا تو سامنے ہی اماں کمر پہ ہاتھ رکھے غیظ و غضب کے عالم میں کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

”کیا دیکھ رہی تھی کلموہی شرم نہیں آتی ذرا بھی۔ تجھ اتنی سی جان کو اس لئے اتنا بڑا کیا تھا کہ جوان ہو کے ماں باپ کی عزت رولتی پھرے“۔ اماں کا ہاتھ گھوما اور بجو کے چہرے پر پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

بجو حیران پریشان کھڑی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھپڑ پڑنے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”اماں میں تو بکریاں۔۔۔۔“

”خاموش!“ اماں نے اسے بالوں سے پکڑ کے دو تھپڑ مارا۔ ”اب ماں کے آگے جھوٹ بھی بولے گی۔۔۔؟ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ سن رہی ہے نا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میری آنکھوں میں دھول جھونک لے گی۔ میں تیری حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔۔۔“ اماں نے اتنی زور سے دھکا دیا کہ بیچاری تیرہ سالہ بجو چارپائی پر گر پڑی اور آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے رواں ہوگئی اتنی معصوم سی جان کو تو یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اماں کیا دیکھنے پر اسے لعن طعن کر رہی ہیں۔ اماں کے ایسے ہی رویئے سے وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ شاید یہ اماں اس کی نہیں ہے اور گڈو اور پپو اس کے اصلی بچے ہیں تب ہی تو ان سے اتنا پیار کرتی ہیں۔ وہ ان کو بنا بنا کے کھلاتی ہے نہلا دھلا کے اچھے کپڑے پہناتی ہے اور اگر کبھی بجو صحیح طرح سے نہا دھو کر سلیقے سے بال بنا لے تو قیامت ہی آجاتی تھی۔

بجو کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جس دن پڑوسن اور عابدہ کے بیٹے کی شادی تھی۔ اماں کہیں باہر گئی تھیں چونکہ وہ بھی اس تقریب میں مدعو تھی۔ اس لئے اس نے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بالوں میں خوب تیل ڈال کے کس کے چوٹی کی ابھی وہ چوٹی کرنے کے بعد سر پہ کنگھی پھیر رہی تھی کہ اِدھر اُدھر سے جو بال نکل گئے تھے وہ بھی جم جائیں کہ اماں برقع سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور جیسے ہی ان کی نظر بجو پر پڑی گویا بھونچال آگیا۔ ”میں ذرا دیر کو گھر سے کیا نکلی اور تجھے موقع مل گیا پر نکالنے کا۔ بتا کس کے لئے اتنا سنگھار کر رہی تھی۔ بتا؟“ اماں نے بجو پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی اور بجو حیران پریشان اماں کی باتیں سنتی رہ گئی۔ کئی بار اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن سسکیوں کے بیچ کچھ نہ کہہ سکی۔

”ابا۔ یہ جو اماں ہیں نا“ بجو نے ڈرتے ڈرتے ابا سے کہا۔

”ہاں کیا ہوا؟“ ابا نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

”یہ میری سگی ماں ہیں؟“ بجو آخر دل کی بات زبان پر لے آئی۔

”ہاں بیٹا تیری سگی ماں ہے۔۔۔“ ابا نے اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

”پھر یہ ہر وقت مجھے ٹوکتی کیوں رہتی ہیں“ بجو نے پر اسرار لہجے میں کہا۔

ابا نے اخبار رکھ دیا اور کہا۔۔۔ ”تمہاری حفاظت کے خیال سے۔۔“

”یہ میری حفاظت کیوں؟“ بجو کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور ابا نے ہنستے ہوئے دوبارہ اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ بجو کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی وہ اکثر اس معاملے پر غور کرتی اور جتنا غور کرتی اتنا الجھتی جاتی اس دن بجو باورچی خانے میں بیٹھی ریت سے برتن مانجھ رہی تھی کہ پڑوسن کی خالہ زینب برقع سنبھالتی ہوئی آگئیں۔ اماں نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ تقریباً محلے کی ہر عورت خالہ زینب کا اسی طرح پر جوش خیر مقدم کیا کرتی تھیں وجہ یہ تھی کہ خالہ کو محلے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات معلوم تھی اور خالہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خوب نمک مرچ لگا کے سنایا کرتی تھیں اور جب تک وہ کے نہ سناتیں انہیں چین نہ آتا تھا۔ آج جس بے چینی سے خالہ آئی تھیں اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا اگر وہ بات تھوڑی دیر اور خالہ کے دل میں رہ گئی تو نہ جانے کیا قیامت آجائے گی۔

خالہ زینب نے جلدی سے پان منہ میں رکھا اور بولیں "اے حمیدہ سن تو۔"

"کیا خالہ ؟" اماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اے وہ جو نکڑ والے گھر میں جمیلہ رہتی تھی نا۔ وہ بھاگ گئی ہے۔" اماں نے دل تھام لیا پھر آگے جھک کر بولیں۔

"کس کے ساتھ خالہ ؟"

"اے وہ جو آوارہ سا ہے نہیں ؟ جاوید جو اکثر نکڑ پر کھڑا رہتا تھا اس کے ساتھ۔" خالہ نے منہ بنا کے کہا۔ "مجھے تو پہلے ہی دھڑکا تھا میں نے کئی بار اس کی ماں کو خبردار کیا مگر اس کو تو اندھا اعتماد تھا اپنی بیٹی پر اس نے ایک حرف بھی سننا گوارا نہ کیا۔"

"ارے مجھے تو پتہ تھا ایک نہ ایک دن تو یہ ہوگا ہی۔" خالہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ اماں تھوڑی دیر اس واقعے پر افسوس کرتی رہیں پھر بولیں۔ "خالہ میں نے تو اپنی بجو کو بڑی حفاظت سے رکھا ہے۔" بجو کے اپنا نام سن کر کان کھڑے ہوگئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی سمجھ بوجھ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ "میں تو اسے دروازے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ آج تک کبھی اس نے سنگھار نہیں کیا۔ خالہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو بجو کا بھروسہ ہی نہیں کچھ عمر ہے نا۔ نجانے کیا کیا گل کھلا بیٹھے اور کیا۔"

خالہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "بچیوں کی خیر خواہ مائیں اسی طرح اپنی بیٹیوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ آج کی اور پیٹ کل کو اس کے کام آئے گی۔"

اور باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی بجو کا دماغ سلگنے لگا اماں کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ اپنی بیٹی پر، بجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جمیلہ کی [illegible] وہ تو مجھے خود آوارہ لگتی تھی یوں گلی میں مٹک مٹک کر چلتی تھی اور ہر ایک کو مسکرا کے دیکھتی تھی۔

اسے سارا دن رہ رہ کے اماں کے الفاظ یاد آتے رہے۔ رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹی تب بھی اسے اماں کی باتیں یاد آ گئیں اگر اماں پہلے سے مجھے زمانے کی اونچ نیچ بتاتیں مجھ پر اعتماد کرتیں تو کیا وہ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ۔ کیا مجھے اپنے رستے پر چلتے ہوئے یہ خیال نہ آتا کہ میری محبت کرنے والی ماں مجھ پر اعتماد کرتی ہے اسے کوئی ایسا کام کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہیئے بجو دل ہی دل میں سوچتے سوچتے سو گئی۔

صبح اٹھ کر وہ گھر کے کاموں میں جٹ گئی۔ اماں کی ڈانٹ پھٹکار جاری تھی۔ بجو بوجھل بوجھل دماغ سے سب کچھ سن رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر کسی رنج کسی ملال کا شائبہ تک نہ تھا وہ خاموشی سے سارا کام کرتی رہی شام کو خبر ملی کہ پچھلی گلی میں عباسی صاحب کی بیگم انتقال کر گئیں۔ محلے کی ساری عورتیں بمعہ بجو کی اماں انکے گھر تعزیت کرنے چلی گئیں بجو گھر میں اکیلی تھی کہ دروازہ کھٹکا۔ بجو نے باہر جھانکا نفیسہ تھی جو سامنے والے گھر میں رہتی تھی اور بجو سے عمر میں چند سال بڑی تھی دونوں باتیں کرنے لگیں کیونکہ آج دونوں کو اکٹھے ماؤں کی ڈانٹ پھٹکار سے چھٹی ملی تھی۔

اچانک نفیسہ اٹھ کر دروازے تک گئی اور چق اٹھا کے باہر جھانکنے لگی پھر جلدی سے اشارے سے بجو کو بلانے لگی۔ سامنے ایک خوبرو سا نوجوان چلا جا رہا تھا۔ چال میں سستی تھی اور کبھی کبھی آوارگی سے مسکرا رہا تھا "یہ کون ہے ؟" بجو نے اشتیاق سے پوچھا جیسے برسوں سے قید کوئی شخص باہر کی فضا کی رنگینی دیکھ کر حیران رہ گیا ہو۔

"یہ نیاز ہے !" نفیسہ نے آہستگی سے کہا۔ "اسی محلے میں رہتا ہے۔"

"اچھا۔ ؟" بجو نے حیرانی سے کہا۔

"اور کیا۔" نفیسہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو تو جیسے اس محلے میں رہتی ہی نہیں۔" بجو کو اچانک اماں کی باتیں یاد آ گئیں نہ جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے ایک کنکر اٹھا کے سامنے سے گزرتے ہوئے نیاز کی طرف پھینک دیا۔ نیاز نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بجو نے بھی مسکرا کے چق واپس ڈال دی۔ "و کر لو اماں حفاظت۔" بجو نے ہنستے ہوئے زیر لب کہا۔

اور پھر جب بھی نیاز سیٹی بجاتا ادھر سے گزرتا۔ بجو کسی نہ کسی بہانے سے اسے دیکھ لیتی۔ ماں بے چاری کہاں تک حفاظت کرتی کبھی سوتی ہوتی۔ کبھی نماز پڑھ رہی ہوتی۔ بجو اپنے مزاج سے فائدہ اٹھانے لگی۔ اسے ماں کا یہ انداز نا پسند تھا کہ اسے قیدی بنا رکھا جا رہا تھا۔

اور پھر ایک دن وہ رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

"آپا، یہ ساری باڑیاں ہیں۔" بشیرن جو آکر پھر جیسے گونگی تھی بولی۔
"شہری [illegible] باتیں ابھی ہو دیں ہیں۔ میں جاؤں یوں۔"

"یہاں [illegible] کنواں نہیں ہے وہ ڈول سے پانی کھینچنے والا" میں نے بشیرن سے کام کی بات پوچھی۔

"ہے کیوں نہیں۔ وہ رکمی کے گھر کے پچھواڑے ہے۔ چلو دکھا لاؤں۔" ہم سب کھڑے ہو گئے میں اور فرح بشیرن کے ساتھ وہاں پہنچے۔ چاروں طرف سناٹا پڑا تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے اس ویرانے سے گھبرا کر کہا۔

"اب یہاں کوئی پانی تھوڑی بھریں ہیں۔" بشیرن بولی۔ "ہتھی کے نل سے پانی بھر لیں ہیں۔"

"یہاں گاؤں کی لڑکیاں نہیں آتیں۔؟" میں نے کریدا۔

"ابھی نا — یہاں کون آوے گا۔" کسی نے کہا اور میں بے دلی سے واپس لوٹ گئی۔ گھر پہنچے تو دیکھا ڈرا بھر مٹر رکھے ہیں اور سب چھیل رہی ہیں۔

"اتنے بہت سے مٹر کیا ہوں گے —؟" میں نے گاڑی بھر مٹر دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"پکاویں گے — سنا تمہیں بہت پسند ہیں۔ ہم تو روز اپنی گائے بکری کو کھلا دیں ہیں۔"

"تو — میں نے اپنی ذات کے ساتھ گائے بکری کی برابری پر غور کیا۔ ویسے میرا جی چاہ رہا تھا کہ سارے مٹر اپنے سوٹ کیس میں بھر لوں" مٹر تو دلی میں بہت ہے لیکن ایسے تازے اور بڑے مٹر اتنی تعداد میں صرف دکانوں ہی میں نظر آتے ہیں۔ اور وہ بھی اتنے شاداب اور بھرے بھرے نہیں ہوتے۔

"آپا تمہارے کے یہاں مٹر نا ہوتے کیا —؟" صاحب خانہ کی مہترانی نے اپنی معلومات میں اضافہ کی خاطر نہیں بلکہ میری للچائی ہوئی نگاہیں دیکھ کر معلوم کیا۔

میں نے خجل سی ہو کر کہا "ہوتے ہیں مگر آٹھ روپے کلو ملتے ہیں۔"

"ہائے میں مر جاؤں —" مہترانی سمیت ساری عورتوں پر ہیبت سی چھا گئی۔ مہترانی کا وہ مٹر سینہ پر ٹھا وہیں جم گیا۔ کرے [illegible] گھر کی بہو نے ہمدردانہ نظریں مجھ پر ڈالیں "آپا پھر تم [illegible] کھاتی ہوں گی —" سب کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں اس وقت [illegible] کے نزدیک کوئی جیسی تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہمارے ہاں جوائنٹ فیملی میرا مطلب ہے پورا خاندان ایک ہی جگہ نہیں رہتا۔ بس میاں بیوی بچے ہی رہتے ہیں۔" مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی ہوں۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ میں کچھ جھلا سی گئی۔

"ارے بھئی پاؤ بھر بھی لاتے ہیں تو کافی ہو جاتے ہیں دو جگہ کر کے بنا لیتے ہیں۔"

"دو جگہاں —؟" ان کی چھوٹی بہو زور سے ہنس کر چیخی۔

"کھائیں نا ہیں دل بہلا دیں۔" دوسری خاتون بولیں۔

"ہاں جی دل ہی بہلا دیں ہیں تو بھلا بتاؤ۔ ان کے حساب تو دس بیس روپے کی روز ہم اپنے ڈنگروں کو ڈکرا دیں ہیں۔"

"آپا تم یہیں رہ جاؤ —" بڑی بہو نے تجویز پیش کی۔ فرح نے گھبرا کر میری طرف دیکھا کہ کہیں یہ سودا میں منظور ہی نہ کر لوں۔ میں مسکرا پڑی — چند سو نفوس پر مشتمل یہ گاؤں خاصا بور ثابت ہو رہا تھا۔ دو تین ہی روز میں ہم اپنے آپ سے بھی بیزار ہونے لگے تھے۔ ساری زندگی رہتا میں نے جھرجھری سی لی۔ میرے خواب بکھر رہے تھے رفتہ رفتہ حقیقت سامنے آ رہی تھی۔ یہاں نہ روشنی تھی نہ زندگی کی ہماہمی نہ تھیٹر نہ اور کوئی مصروفیت۔ عورتوں کی جہالت اور مردوں کا دقیانوسی پن۔ اجاڑ راستے ویران اور خاموش راتیں۔ تفریح کے نام پر بھی کہاں تک ڈھول پیٹا جا سکتی جاتی

میری خاموشی کو رضامندی سمجھ کر صاحب خانہ خاتون نے نہایت فراخ دلی سے کہا "ہاں آپا سچ رہ جاؤ — ہم اپنا پیچھے والا گھیر اور مکان تمہیں دے دیں گے۔"

"اور بھینس کو کہاں باندھو گی —" کسی کی آواز آئی اور میرے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی — یا الٰہی میں یہاں آتے ہی گائے بکری بھینس ڈنگروں کے برابر کیسے ہو گئی۔

"بھینس کا کیا ہے اسے ہم ادھر اپنی طرف لے لیں گے۔ بہترا بڑا مکان ہے۔" میرے دل کو تسلی سی ہوئی اور یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ یہ لوگ خود کو بالفاظ دیگر انسانوں کو جانوروں سے الگ تصور نہیں کرتے۔ دراصل ان کے رہن سہن نے انہیں ایسا ہی بنا دیا ہے۔

"رہنے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ چلو کہیں گھوم آتے ہیں۔" میں نے اس ذکر کو ختم کرنا [illegible]

یہ ظالم مرد

لبنیٰ عروج

"تم بچپن ہی سے بڑے فراڈی، دھوکہ باز اور کمینے تھے اسد" رافعہ نے اپنی لمبی سی چوٹی کو آخری بل دیتے ہوئے سوچا۔ پھر مسکرا اٹھی۔ عادتیں جب پختہ ہو جائیں تو انسان کبھی اُن کے حصار سے نکل نہیں پاتا ان کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے، یہی تمہارے ساتھ بھی ہوا ہے اسد، اس لئے کہ تم سدا دھوکہ دیتے رہے آج قدرت نے تمہارے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کیا ہے تمہیں تمہاری بے انصافیوں اور ظلم و استبداد کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا ہے۔ تم نہ سمجھو تو الگ بات ہے۔ تمہیں یاد ہے نا اسد کہ تم میری چھوٹی خالہ کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے تھے۔ خالو ابا تو تمہیں چار پانچ ماہ کی عمر میں ہی روتا بلکتا چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ تب چھوٹی خالہ تمہیں کتنی چاہتیں، کتنی محبتیں دی تھیں۔ مجھے ہنسی آرہی ہے' ہاں میں ہنسنا چاہتی ہوں۔ بڑے زور سے مگر پتہ نہیں کیوں جب بھی ہنسنا چاہتی ہوں آنکھوں میں ڈھیر ہل آنسو نجانے کہاں سے چلے آتے ہیں۔ میں سمجھ نہیں پاتی ہوں، دراصل مجھے ہنسی تو اس بات پر آرہی ہے کہ تم جسے بے پناہ محبتیں دی گئیں۔ اس کے قابل ہی نہیں تھے ہم لوگ کتنے معصوم کتنے بے وقوف تھے۔ جو تمہیں سمجھ نہ سکے۔ یاد ہے نا بچپن میں بھی تم کھیلتے وقت ہمیشہ بے ایمانی کرجایا کرتے تھے۔ تم نے اپنی زندگی کی بنیاد بے ایمانی اور دھوکہ بازی پہ رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ تم گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ بہت بڑے بازی گر اور دھوکہ باز بن گئے۔

تمہیں وہ دن یاد ہیں اسد جب مجھے تم سے منسوب کردینے کا بھیانک ناٹک رچایا گیا تھا۔ اس وقت میں شعور و آگہی سے بے بہرہ تھی۔ انہی دنوں تمہاری خالہ جان نے مجھے تمہارے لئے مانگ لیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ میں ابھی اس قابل ہی کہاں تھی جو زندگی کی باریکیوں کو سمجھ پاتی۔ میں تو تمہارے سیاہ رنگ سے بھی نفرت نہ کرسکی۔ اس چہرے سے بھی محبت ہی کرتی رہی جو چیچک زدہ تھا۔ تمہاری البتہ تا ہی بھی مجھے بُری لگی۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اسد [illegible] تب مجھے بھانے لگی چاہنے لگتا ہے بغیر خواہ مخواہ بنے۔ دھنک رنگ [illegible] میں لے جاتا ہے کہ ہم لڑکیاں سدا سے بیوقوف بنتی رہی ہیں۔

تھی۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ مجھے تم سے منسوب کردیا گیا۔ میں کوئی احتجاج نہ کرسکی اس لئے کہ مشرقی معاشرے میں لڑکی کا احتجاج بے حیائی بن جایا کرتا ہے۔ میں چپ رہی۔

وقت سرکتا رہا۔ تب اُن دنوں تم ساتویں درجے میں تعلیم پا رہے تھے کہ چھوٹی خالہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ تم بہت دنوں بکھرے بکھرے سے اور غمزدہ رہے۔ ظاہر ہے وہ تمہاری ماں تھیں۔ از حد شفیق اور محبت کرنیوالی وہ چلی گئیں تو تم تنہا ہوگئے۔ خالہ امی کے جانے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ تم اپنی اسٹڈی میں بہت زیادہ سنجیدہ ہوگئے۔ میٹرک کرنے کے بعد تم نے کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ تمہاری خیریت کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ تم کراچی جیسے بڑے شہر میں جاکر مزید تعلیم بھی حاصل کررہے۔ اور ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے۔ تم اپنا بوجھ آپ اٹھا رہے تھے۔ تمہیں سراہا جاتا تھا۔ تم نے کسی سے کوئی مدد لینا گوارہ نہیں کیا۔ اپنا مستقبل خود بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ تم لاگریجویٹ بن گئے تھے۔ پھر تمہیں تمہاری لیاقت و قابلیت کے عوض راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن میں کسی اچھی جاب پوسٹ پر اپائنٹمنٹ بھی مل گیا۔ تم اپنی محنتوں کے بل بوتے ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔

میرے والدین خوش تھے مطمئن تھے کہ میں تم سے منسوب تھی۔ اور تمہارا مستقبل شاندار تھا۔ وقت کچھ اور سرکا۔ تب دنیا کی وہی صدیوں پرانی ریت نبھانے کا وقت آگیا۔ ماں باپ جوان بیٹی کو کب تک اپنی دہلیز پر بٹھائے رکھتے۔ تمہیں بلایا گیا اور ابا جان نے تم سے شادی کے لئے کہا ـــــــ تم راضی ہوگئے۔ دستور کے مطابق تاریخ مقرر ہوگئی اور جس دن تم کو بارات لے کر آنا تھا تم اچانک غائب ہوگئے۔ اس دن ہمارا گھر پھولوں کی خوشبوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ میں اپنے تینوں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ رشتہ داروں کا ایک ہجوم تھا ملنے جلنے والے بھی بھاری تعداد میں جمع تھے۔ میں عروسی ملبوسات میں سمٹی سکڑی بیٹھی تھی۔ میری دوست اور سکھیاں ہنس رہی تھیں۔ مذاق کررہی تھیں بارات کی آمد کا انتظار بڑی شدت سے ہورہا تھا۔ وہ گھڑیاں وہ ساعتیں لمحہ لمحہ کرکے گزر رہی رہیں۔ لیکن تم نہیں آئے۔ تمہیں بہت ڈھونڈا گیا۔ تلاش کیا گیا۔ تمہارے دوست احباب رشتہ دار کچھ بھی بتانے سے قاصر تھے۔ ذرا سوچو تو سہی اسد [illegible] ماں باپ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ اس لڑکی کے احساسات پر کیسا کاری ضرب لگی ہوگی۔ [illegible] تمہارا [illegible] کہاں جا سکتے تھے۔ تم نے دھوکہ دیا [illegible] کیوں کی بکس کرچلا کہاں [illegible]

[illegible] کہہ دیا: مجھے یاد کر کے کیا ملا تمہیں؟ تم کہیں دور چلے گئے۔ [illegible] کی طرح جب چھن گئے تھے۔ تم بہت کم ظرف، بہت گھٹیا انسان تھے۔ بہت شریف اور باعزت باپ کی نیک نامی کو بٹہ لگا کر تمہیں کیا ملا؟ لیکن میں نے کہا تھا کہ ہم لڑکیاں بہت بے وقعت ہوتی ہیں۔ جیسے دھوکہ اور فراڈ ہی ملتا ہے ہمیں کچھ سے لگانے کو۔ تم مردہ ضمیر انسان بزدل اور بے غیرت تھے۔ تمہیں کیا کچھ کہوں اسد کہ یہ دل بہت جلا ہوا ہے۔ بڑی راکھ اڑتی ہے یہاں۔ بڑے شعلے جو جلا کر بھسم کر ڈالنے والے۔ میں نے زندگی میں کوئی شکوہ کوئی خوشی دیکھی ہوتی تو کچھ تم سے گلہ کرتی۔ لیکن قدرت کبھی کبھی بے گناہوں کو بڑی بڑی سزائیں دے کر اپنی کبریائی کا پتہ دیا کرتی ہے اور میں بھی اس کے انہی بندوں کی صف میں شمار ہوتی ہوں۔ جنھیں وہ آزمائش میں ڈالا کرتا ہے۔

تم یہ بات لے کر ہی نہیں آئے۔ بہت دنوں ہم نے سوگ منایا۔ دنیا سے کٹ کر رہے۔ پھر بابا جان نے ایک اور دھوکہ کھایا۔ مجھے ایک اور اسد کے پلے باندھ دیا۔ وہ بھی سراسر دھوکہ تھا۔ اس کا نام مختلف تھا۔ ورنہ تو وہ بھی تمہارا ہی دوسرا روپ تھا۔ اس نے شرافت اور نجابت کے لبادے اوڑھ رکھے تھے۔ چہرے پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ وہ بھی تمہاری ہی برادری کا ایک شخص تھا۔ جو مجھے کچھ بھی نہ دے سکا۔ ہاں ایک بیٹا ضرور دے گیا میرے ساتھ ساتھ وہ ایک معصوم سے وجود کو حالات کی بھٹی میں جلنے، سلگنے اور تپنے کے لئے چھوڑ گیا۔ طلاق کا سیاہ داغ میری پیشانی پہ سجا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری زندگیوں سے نکل گیا۔ میں نے اس بے رحم وقت میں خود کو سنبھالا اور اپنی تعلیمی ڈگری سے فیضیاب ہوئی۔ لیکچرر شپ اختیار کر کے حالات کے منہ زور گھوڑے کو قابو میں کرنے کی کمزور سی سعی کی۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ سکوت کو ثبات نہیں سو میرے ساتھ پھر یہی ہوا کہ بابا نے مجھے ایک اور شخص کے حوالے کر دیا۔ سوچتی ہوں اسد کہ ہم لڑکیاں کیا صرف باپ کے ہاتھوں میں کھلونا ہی ہوتی ہیں۔ وہ جب جی چاہتا ہے اپنی مرضی [illegible] ہمیں بیچ ڈالتے ہیں۔ نافرمانی کرو، حکم عدولی کرو تو اپنی ہی اولاد کو [illegible] دینے لگتے ہیں۔ ان چاہتوں کے حوالے دینے لگتے ہیں۔ ان مائیوں کے [illegible] جنھوں نے ہماری پیدائش اور ہماری تربیت پر صرف کیے [illegible] اپنی ساری شفقتوں کے عوض ہمیں مجبور کر کے رکھ دیتے ہیں۔ [illegible] اس لئے کہ ماں باپ تو ہمیشہ اولاد کی [illegible] اُن کی تقدیر۔

[illegible] کے حوالے کر دیا گیا۔ ہاں اچھا — پھر بیٹی اور کمزور آنکھوں میں میری آبادی اور میرے سکھ کے سپنے سجا کر، بوڑھوں پہ لرزتی دعائیں دے کر مجھے پھر وداع کر دیا۔ جانتے ہو اسد یہ شخص بہت مذہبی عقائد رکھتا ہے۔ اسلامک ہسٹری پر ریسرچ کرنے کی خاطر کئی سالوں سے لندن میں مقیم ہے۔ اسلام اور مذہب کے بارے میں اس کی معلومات اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ شرعی احکامات کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن صرف میرے لئے وہ بظاہر جتنا اجلا نظر آتا ہے۔ درحقیقت اتنا ہی گھٹیا انسان ہے اس لئے کہ وہ بھی تمہاری صنف سے تمہاری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس برادری سے جس کا نظریۂ حیات دھوکہ اور فریب ہے جن کی زبانیں کچھ کہتی ہیں اور عمل کچھ۔ میں سوچتی ہوں اسد تمہاری صنف کی حکمرانی اور جبر و استبداد کی انتہا کب اور کہاں ختم ہو گی؟ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگنے لگتا ہے جیسے خدا بھی تمہارے ساتھ ہو۔ وہ تمہاری درندگیوں پر تم سے نالاں نہیں بلکہ بہت خوش ہے اگر وہ تم سے نالاں و ناراض ہوتا تو کبھی تمہیں یوں ڈھیل نہ دیتا۔ تمہاری رسّی دراز نہ کرتا۔

ہاں تو اسد میں کہہ رہی تھی۔ میرا شوہر جو کہ بہت مذہبی بنتا ہے اس کے سارے فلسفے اور دلائل وہاں آکر دم توڑ جاتے ہیں جہاں میرے پہلے بیٹے کا ذکر آتا ہے وہ انسانیت کے بلند ترین درجے سے گر کر [illegible] وہ سارے لبادے اُتار پھینکتا ہے۔ اپنے اصلی روپ میں چلا آتا ہے وہ میرے پہلے بیٹے کو کسی صورت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں اس کے بیٹے کی بھی ماں ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ بہرحال زندگی گزرتی چلی جا رہی ہے۔ شاید میری کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن کل تمہیں دیکھ کر مجھے ایک بار پھر نئے سرے سے بہت سے دکھوں نے گھیر لیا ہے۔ ہاں اسد اس لئے کہ تم میری ہی صنف کی دو اور عورتوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ حالانکہ اگر تم گہرائی میں جا کے سوچو تو پتہ چلے کہ تمہیں خدائے بزرگ و برتر نے دنیا ہی میں تمہارے سارے اعمال کا بدلہ دے دیا ہے اور یہ اجر یہ بدلے تو ہمیں قدم قدم پہ ملتے ہی رہتے ہیں۔ ہم انسان ناسمجھ ہوتے ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھی بدلہ مل گیا ہے۔ تم نے کسی کو دھوکہ دیا تھا۔ خدا نے تمہارے ساتھ بھی وہی کیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ [illegible] تمہارے ساتھ بھی ہوا ہے [illegible] پاس خالق سے [illegible] رہا تھا۔ وہ ہاں [illegible] کسی [illegible] بیماری کے تحت اس کا آپریشن کر کے [illegible] ماں باپ کیا [illegible]

پچوریاں

اظہر افسر

میاں
بیوی (دکنی زبان بولتی ہے)
پرساد • خسر

اوسط گھرانے کا باہر کا کمرہ، وسط میں تخت بچھا ہے
ایک طرف دو تین کرسیاں بھی رکھی ہیں
تخت کے ایک کونے پر بیٹھا، میاں ٹیک لگائے کوئی کتاب
پڑھ رہا ہے ——

بیوی۔ (جلدی جلدی چلتی آتی ہے) آج اتّی مزے کی بات ہوئی معلوم، آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔

میاں۔ کیا ہوا۔

بیوی۔ اتّی خوش ہوئی میرے کو پوچھو نکو۔

میاں۔ کیا ہوا آخر

بیوی۔ آج وہ ہنڈی والا آیا تھا۔

میاں۔ ہنڈی والا۔

بیوی۔ معلوم ہے کتّے روز سے اپنے کنے سُوپال نہیں تھے۔

میاں۔ سُوپال۔ سُوپال کیا۔؟

بیوی۔ سُوپ، سُوپ۔

میاں۔ سُوپ بنایا ہے۔

بیوی۔ سوپ میں بناتیوں ؟

میاں۔ کیا۔ آخر بات کیا ہے۔

بیوی۔ پہلے اس کتاب پہ مٹّی ڈالو۔ اور چین سے بات سُنو

میاں۔ اچھا اچھا لو۔

بیوی۔ پڑوسیوں سے چھنّی منگا کے کتّے روز سے کام لے رہے تھے۔

میاں۔ کتنے روز سے کام لے رہے تھے۔

بیوی۔ (رونے لگتی ہے)

میاں۔ ارے ارے کیا ہوا۔ ابھی ہنس رہی تھیں، خوشی سے پھولی جا رہی تھیں اور اب رونے لگیں۔

بیوی۔ اجی تین روز سے صبح کو آٹا چھاننے، بازاروں سے چھنّی منگا رہے تھے معلوم۔ ایک کرکری تھی۔

میاں۔ اچھا اچھا۔ بولو

بیوی۔ وہ لوگاں کبھی دیتے تھے، کبھی نہیں دیتے تھے۔

میاں۔ ہاں شاید ——

بیوی۔ آپ کو کیا ہے، پکا پکایا سامنے آجاتا، گھر میں تین مہینے سے آٹا چھاننے کی چھلنی نہیں ہے معلوم ہے ؟

میاں۔ ہاں نہیں ہے معلوم نہیں تھا تو اب ہو گیا؛ اب رونا دھونا چھوڑ و سیدھی طرح بات بتاؤ۔

بیوی۔ (بائیں ہاتھ سے آنسو پونچھتی ہے) آج خوشی پوچھو نکو، آج وہ ہنڈی والا آیا تھا۔

میاں۔ یا اللہ ——

بیوی۔ یہی باتاں میرے کو پسند نہیں۔

میاں۔ کیا اللہ کو یاد کرنا بھی بُرا ہے، سچ مچ بزرگوں نے کہا ہے

بیوی۔ میں جاتیوں یا— (جانے لگتی ہے)

میاں۔ ارے ارے بیگم آؤ آؤ۔

بیوی۔ پہلے میں کتاب پھاڑ دیتیوں۔

میاں۔ اچھا اچھا میں کتاب ایک طرف رکھ رہا ہوں۔ دیکھو ادھر چلی گئی کتاب — اب بتاؤ تم اتنی خوش کیوں ہو۔

بیوی۔ بولوں ؟

میاں۔ اب بولو نا۔

بیوی۔ آج۔

میاں۔ وہ ہنڈی والا آیا تھا۔ ارے ارے رونا نہیں، رونا نہیں، کیا ساری عورتیں ایسی ہوتی ہیں یا ہماری ہی قسمت میں ایسی عورت ہے۔

بیوی۔ اے عورت دورت —— کس کو بول رہیں؟ ذرا تمیز سے بات کرے تو ہوئیں ——

میاں۔ اچھا اچھا فرمائیے۔

بیوی ۔ تو کیا ہوا معلوم ۔
میاں ۔ ہنڈی والا آیا تھا ۔ وہ لال مٹی والا ۔
بیوی ۔ دیوانے ہے جی ۔ آپ سے بات کرنا کیا ہے ایک دیوانے
کو قصہ بولنا ہے ۔
میاں ۔ اچھا اب رونے کی صورت مت بناؤ ، بولو کیا ہوا ۔۔ میں
سُن رہا ہوں ۔
بیوی ۔ خاک سُن رہیں ۔
میاں ۔ (قہقہہ لگاتا ہے)
بیوی ۔ صحیح بولتیں ، ہنستے مرد وے کو روتی عورت کو کبھی نہیں
پتیانا ۔
میاں ۔ واہ بیگم واہ کیا بات کہی ہے تم نے ، بالکل سچ
بیوی ۔ اب سنتیں کہ میں جاؤں ۔
میاں ۔ ہاں ہاں بولو ، آج وہ ہنڈی والا آیا تھا ، کونسا ہنڈی
والا یہ آپ ہی بتائیے ۔ آدھے گھنٹے سے بس ہنڈی والا
آیا تھا ہنڈی والا آیا تھا سن رہا ہوں ۔
بیوی ۔ اب آئے راستے پر
میاں ۔ جی میں تو شادی کے دن سے ہی راستے پر آگیا ہوں ۔ تو
وہ ہنڈی والا آیا تھا ۔ ؟
بیوی ۔ ہتو کیا کیا لایا تھا جی ، چمٹے ، توے ، پھکنیاں ، سوبہ کش ،
وہ بھی لایا تھا جی
میاں ۔ کیا ؟
بیوی ۔ گر وہ بیلن ، اگر اپنے کہتے ہے ابھی ، گر وہ بیلن تو لگاں
سنگ کے لے جائیں ، اِنے لایا تھا چھوٹے توے بڑے توے
مرغی کا مشین ، آلے ۔ چپاتی بنانے کا ، رس نکالنے کا آلہ
میاں ۔ یہ چیزیں تو اپنے پاس ہیں ۔
بیوی ۔ اس کے پاس تھے ۔ بول رہوں ۔ چھریاں ، کانٹے ،
کمان کی چھری ، گول چھری ،
میاں ۔ گول چھری بھی ہوتی ہے کیا ۔
بیوی ۔ ہو ۔ ہوتی ۔ آرے کے چھریاں ، بالکل آرے کے دیسے
رہتے ۔ تیز سوال لے لیں ،
میاں ۔۔۔ نواب ہوگئے تھے واٹ کے چندیاں ہوگئے تھے

میاں ۔ بہت اچھا کیا ۔
بیوی ۔ دیکھو دو روپے کو دیا معلوم ، اونے دو بولے تو بھی نہیں بولا ۔
اچھے لے لیں ، لاکے بتاؤ ؟
میاں ۔ نہیں نہیں رہنے دو ۔
بیوی ۔ اصلی بات تو سنتے نہیں آپ ۔
میاں ۔ وہ کیا ۔
بیوی ۔ چھنی ۔ آٹا چھاننے کی چھنی بھی لی نا
میاں ۔ وہ کتنے کو ملی ۔
بیوی ۔ ڈیڑھ روپے کو ملی ۔ سوا سوا روپیہ ۔۔۔ ایک چالیں بولے
سبھی تو نہیں دیوی بولا ۔
پرساد ۔ (باہر سے) کیا نواب بھائی ہیں ۔ ؟
میاں ۔ ارے آؤ پرساد
پرساد (اندر آتا ہے) آداب عرض ہے بھابی
بیوی ۔ نواب بھائی ۔ آئیے بیٹھئے ۔۔۔
پرساد ۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) کیا ہو رہا ہے ۔
میاں ۔ دیکھو پرساد ہمارا ملک ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے
یہاں طرح طرح کے موسم ہیں طرح طرح کے رہن سہن ، رسمیں ہیں
تہوار ہیں ۔
بیوی ۔ پھر شروع ہوگئی نا آپ کی کتاب ، اجی پرساد بھائی آئے ہیں تو کچھ
کھلاؤں پلاؤ بٹھاؤ ۔
پرساد ۔ بیٹھو تو میں گیا ہوں بھائی ، بس کھلانے پلانے کی دیر ہے ، میں
تیار ہوں ۔
میاں ۔ ہمارے تہواروں میں عرسوں میں سبھی مذہب کے لوگ بلا کسی
تفریق کے شریک ہوتے ہیں ۔
پرساد ۔ جی ہاں
میاں ۔ گنیش اتسو ، دیوالی اور دسہرہ سبھی مناتے ہیں ۔ مسلم بزرگوں
کے عرسوں میں اور عیدوں میں لاکھوں ہندو بھائی خود کھول کر
حصہ لیتے ہیں ۔
پرساد ۔ واہ واہ واہ کیا بات ہے ، (باہر دیکھ کر) آداب عرض ہے چچا جان
خسر (اندر آتا ہے) یہ ہماری کس بات کی تعریف ہو رہی ہے ۔
بیوی ۔ چھری دیدو بابا جان ۔

کے دس بجے خان بابا کھانے کے لئے مجھے بلانے آئے میں نے کہا اکیلے کھانے کیا جاؤں۔ بابا میرا کھانا یہیں لے آؤ۔ میں یہیں کھاؤں گا بابا نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔ بڑی بٹیا کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں ۔۔۔ میں حیرت زدہ سا اٹھا اور کھانے کے کمرے کی جانب چل دیا۔ نہ جانے کیوں میں اس محل کی اس پراسرار ہستی کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ اور جب میں کھانے کے کمرے میں پہنچا تو تم کسی آسمانی حور کی طرح سرتاپا سفید لباس میں ملبوس ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میں نے گھبراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ پیشانی پر لے جاتے ہوئے تمہیں سلام کیا۔ تم نے بھی سر کے اشارے سے گویا جواب سلام دیا اور مجھ سے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا میں نے دل کڑا کرکے پوچھا ۔۔ "آج پہلی بار آپ کو دیکھا ہے۔ آپ کھانا بھی گھر والوں کے ساتھ نہیں کھاتیں لیکن آج ۔"

"نرم مدھار آواز میں تم نے جواب دیا تھا ۔۔ "آج ایک موقع ہاتھ آگیا تھا کہ آپ سے کچھ باتیں کرسکوں"۔

میں نے کہا۔ "لیکن آج ہی کیوں۔ پہلے بھی ایسا ہوسکتا تھا آپ میری ماموں زاد بہن ہیں اور پھر ہم نے ایک دوسرے کی صورت بھی اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی پھر آپ کو باتیں کرنے کا خیال کیوں کر آیا۔"

تم نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا تھا۔ "آپ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں تو روز ہی آپ کو دیکھتی تھی۔"

"یعنی چھپ چھپ کر ۔ سامنا تو کبھی ہوا نہیں ۔"

"ایسا ہی کچھ سمجھئے ۔۔" کہہ کر تم نے نظریں اٹھائی تھیں اور تمہاری وہ نظریں آج تک میرے دل میں پیوست ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم سامنے کیوں نہیں میرے آئیں"؟

"اس لئے کہ میں تنہائی پسند ہوں۔ میری اس عادت سے سارے گھر والے واقف ہیں۔ میری یہ عادت شاید پیدائشی ہے۔ لیکن آپ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ میری یہ عادت بہت بری ہے لیکن میرے دل میں چور تھا۔ سب نہ جانے کیا سوچتے اگر میں آپ کے یہاں آتے ہی اپنی گوشہ نشینی ختم کر دیتی ۔۔"

میں نے کہا ۔۔ "میں سمجھا نہیں کہ دل میں چور کون سا گھس گیا تھا۔"

"کچھ جواب دینے کے بجائے تم نے کہا تھا ۔۔ "سب لوگ ... خان بابا کھانے لا رہے ہیں۔"

"میری بھوک پیاس تو تمہیں دیکھ کر ہی ختم ہوگئی تھی شنا۔ لیکن تمہیں دکھانے یا تمہارا ساتھ دینے کے لئے کچھ ٹونگتا رہا۔ تم مسلسل اصرار کرتی رہیں۔ خود دے ڈشیں اور قابیں اٹھا اٹھا کر گویا سروس کر رہی تھیں جب کھانا ختم ہوا تو تم بغیر کچھ کہے کھانے کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں نہ تم سے کچھ کہہ سکا اور نہ ہی تم کو روک سکا۔ میں ایک بت کی طرح کرسی پر بیٹھا رہا۔ مجھے اس کا بھی خیال نہ رہا کہ خان بابا ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا اور جب مجھے اس کا احساس ہوا تو گھبرا کر میں اٹھ کھڑا ہوا مجھے ہاتھ دھونے کا بھی خیال نہ رہا۔

شنا تمہارے حسن کی جتنی بھی ثنا کی جائے کم ہے۔ میں نے ایسا حسن اس روز سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھ پر تمہیں دیکھ کر جیسے دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ نہ جانے کس طرح میں اپنے کمرے میں پہنچا اور تمہارے تصور میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ لیکن تم پھر کبھی نظر نہ آئیں گھر کے سب لوگ دوسرے دن سویرے ہی آگئے تھے پھر شب و روز گزرتے رہے۔ تصور میں نہ جانے میں کیا کیا سوچتا رہتا۔ تم ہر وقت میری آنکھوں میں بسی رہتیں۔ اکثر میں نے دیکھا کہ تم میری مسہری کے پاس کھڑی ہو ۔۔۔ لیکن یہ میرا واہمہ ہوتا ۔۔ پھر ایک روز میں اپنا سر کرسی کی پشت سے لگائے بیٹھا تھا کہ تم سچ مچ آگئیں۔ تم نے اس وقت شب خوابی کا سفید لباس پہن رکھا تھا لیکن فریب تصور میں ایسا مبتلا تھا کہ حقیقت کو بھی تصور سمجھتا رہا یہاں تک کہ تم میرے قریب آگئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ تم کہہ رہی ہو کہ تصور نہیں حقیقت ہے فراز ۔۔ لیکن میں نے اس آواز کو بھی اپنی سماعت کا واہمہ سمجھا ۔۔۔ پھر تمہارے لباس کی بھینی بھینی جوان خوشبو مجھے محسوس ہوئی۔ لیکن اسے بھی میری قوت شامہ نے دھوکا ہی سمجھا میں ایک سنگی بت کی طرح بیٹھا رہا ۔۔۔ اور پھر تم نے اپنی مرمریں انگلیاں میرے بالوں سے مس کیں اور تب بے اختیار میرا ہاتھ اوپر اٹھا اور تمہارا دست نازک اس کی گرفت میں آگیا۔ لیکن تم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے چھڑا لیا اس لئے کہ میری گرفت سخت نہ تھی پھر میں نے نگاہیں اٹھا کر تمہاری طرف دیکھا۔ "وہ گوہر تابناک تمہارے دونوں رخساروں پر چمک رہے تھے تمہاری آنکھیں ایک شفاف اور ساکت جھیل کی طرح نظر آرہی تھیں ۔۔ میں نے سوچا تھا کاش میں اس میں ڈوب سکوں۔

پھر تمہارے لب ہلے۔ تم نے کہا "کیا تم نے بھی ... کی ..."

جو میں کر بیٹھی ہوں۔"

"ہاں ثنا! میں اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں ہار چکا ہوں۔"

"لیکن کیا کبھی ہم دونوں مل بھی سکیں گے ۔" ثنا نے بڑے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر ہم مل نہ سکے تو مر جائیں گے ثنا! لیکن بچھڑ کے جینا گوارا نہیں کرینگے۔"

آہ! لیکن ہم بچھڑ کے بھی زندہ رہے اور مر مر کے جیتے رہے۔ اس رات کے بعد پھر ہماری زندگی میں ایسی کوئی رات نہیں آئی ـــ تم کسی اور کی ہو گئیں۔ شاید اس لئے کہ میں تمہارے والدین کی نظروں میں تمہارے معیار کا نہ تھا۔

اس شالی رات کا سویرا ہوتے ہی مجھے تار ملا کہ والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں گھر چلا گیا اور والدہ کی علالت کے طول کھینچنے کے باعث تمہارے پاس جلد واپس آنا در کنار تمہاری شادی میں بھی شریک نہ ہو سکا جس کا کارڈ امی کے نام گیا تھا ـــ پھر تم آذر کی ہو گئیں جس کے پاس عالیشان بنگلہ تھا اور جو ڈاکٹریٹ کر کے امریکہ سے واپس آیا تھا ـــ واقعی تم ایسے ہی کسی کی شریک حیات بننے کے قابل تھیں۔ مجھ تہی دست کے پاس محبت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

آج پھر دو برسوں کے بعد تمہارا سامنا ریحان کی شادی پر ہوا میں اندر کسی کام سے آیا تو تم آنگن میں کھڑی تھیں یوں تو مجھے خبر تھی کہ تم بھی آئی ہو لیکن جان بوجھ کر میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی فرق نہ آیا تھا ان دو برسوں میں لیکن تمہارے چہرے پر وہی اداسی کا سایہ اب بھی لہرا رہا تھا جو ہماری آخری ملاقات پر تھا تم تمہارے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے اب تک تمہاری روح کو قرار کیوں نہیں آیا سب کچھ تو ہے تمہاری زندگی میں پھر یہ بے چینی یہ اضطراب کیوں؟

آوارہ روح کی طرح رات کے سناٹے میں چکر کاٹنا تو میرا کام ہے۔ پھر میں باہر چلا آیا۔ جس کام کے لئے گیا تھا وہ دھرا ہی رہ گیا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا شاید اس تلخ دھوئیں میں اپنے آپ کو گم کر دینا چاہ رہا تھا۔

شادی کے ہنگامے دھیرے دھیرے سرد ہوئے لیکن میں تمہارا سامنا نہ کر سکا۔ کل تم بھی جلنے والی تھیں۔ تمہارے شوہر صبح ہی کہیں چلے گئے تھے۔ میں باہر صوفے پر دھنسا سگریٹ پھونک رہا تھا اس کے مرغولوں میں تمہاری شبیہ تلاش کرنے میں سرگرداں تھا کہ تمہارا بچہ باہر نکل گیا۔ اور تم اسے پکڑنے ادھر ہی چلی آئیں۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا ـــ تمہارے جسم پر سرخ ساڑی تھی۔ دونوں کلائیاں سرخ چوڑیوں سے بھری تھیں۔ تمہاری شفاف پیشانی پر سرخ بندیا جگمگا رہی تھی اور سیاہ گھٹاؤں کے سے بالوں کے درمیان مانگ میں افشاں کے ذرے چمک رہے تھے۔ تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا لیکن اچانک ہی ریحان گیٹ میں چیختا ہوا داخل ہوا۔ تمہیں ایک نظر دیکھا اور پھر گھبرایا ہوا اندر کی طرف بھاگا۔ پہلے تم اور پھر میں دونوں ہی اس کے پیچھے لپکے۔ نہ جانے اس نے کیا کہا تھا کہ اندر ایک شور برپا ہو گیا دیوانہ وار سب ہی باہر کی طرف بھاگے۔ تمہارے ساتھ ہی میں بھی ان سب میں شریک تھا۔ سب ہی اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر تمہارے سہاگ کو لٹنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے ـــ آذر آپریشن تھیٹر میں تھے سب ہی باہر کھڑے اور بیٹھے دعائیں مانگ رہے تھے تم اپنے بچے کو سینے سے لگائے اس طرح کھڑی تھیں جیسے واقعی تم آذر کا تراشا ہوا ایک ایسا مجسمہ ہو جسے اس نے ایک مغموم عورت کے روپ میں تراشا ہو۔ نہ تمہاری پلکیں جھپک رہی تھیں نہ غم و الم کے سوا کسی طرح کے جذبات عیاں ہو رہے تھے۔ آپریشن کے بعد حسین و جمیل و باوقار آذر کا جسم پٹیوں میں لپٹا اسٹریچر پر باہر آیا وہ بے ہوش تھا یا مر چکا تھا اس کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ تم اسے دیکھ کر چیخیں اور لوگ سنبھال نہ لیتے تو بچہ تمہارے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر جاتا۔ تم چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تھیں۔ پھر گھنٹوں بعد ایک نرس نے باہر آ کر کہا۔ مریض کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ بار بار ثنا، ثنا کر رہا ہے ـــ یہ کس کا نام ہے۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی ہے کہ اسے مریض کے پاس آنے کی اجازت دے دی جائے۔

تم ہوش میں آ چکی تھیں۔ نرس کی باتیں سنتے ہی تم بے قرار ہو گئیں اور اپنے ننھے لخت جگر کو لئے اندر چلی گئیں ـــ سب ہی بے قرار تھے آذر کو دیکھنے کے لئے مگر مریض کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس بھیڑ کو اندر جانے دیا جاتا ـــ کچھ دیر بعد تمہارے والد کے اصرار پر ایک ایک کو اندر جانے اور خاموشی سے مریض کو دیکھ کر باہر آ جانے کی اجازت دی گئی تو میں بھی گیا آذر کی آنکھیں بند تھیں تم ایک کرسی پر اپنے بچے کو لئے بیٹھی تھیں۔ تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا تھا تمہاری آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی اور تم بالکل خاموش تھیں۔ تم نے کسی کو دیکھا ہی نہیں یہاں تک کہ میرے آنے کا علم بھی نہیں نہ ہو سکا لیکن میں چند منٹ وہاں رہا صرف تمہیں کو دیکھتا رہا ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ

تمہارا سہاگ اجڑنے والا ہے۔ اس وقت میں اصل حادثہ سے واقف نہ تھا۔ میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ حادثہ میری محبت کے لئے فال نیک ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرا دل تمہاری محبت میں سرشار ہونے کے باوجود یہ تمنا رکھتا تھا کہ خدائے پاک تمہارا سہاگ قائم رکھے اور آزر بچ جائے۔

کئی ڈاکٹر پوری توجہ سے آزر کی زندگی بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے — شاید انھیں بھی تمہارا سہاگ پیارا تھا۔ آکسیجن دیا جا رہا تھا — بلڈ پریشر چیک ہو رہا تھا۔ حرکت قلب دیکھی جا رہی تھی — لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا — چند ہی گھنٹوں میں تمہارا سہاگ اجڑ گیا — بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد پوسٹ مارٹم کے آزر کی لاش گھر لائی گئی — اس کے ساتھ ہی ایک زندہ لاش بھی تھی۔

پھر تمہارے ہاتھوں کو چوڑیاں توڑ کر ویران کر دیا گیا — بھڑک دار لباس اتار کر تمہیں اجاڑ دیا گیا — لیکن تمہارا حسن، بیوگی میں اور بھی دلکش ہو گیا تھا — اور تب میں کسی شیخ چلی کی طرح منصوبے بنانے لگا تھا۔

آزر کا جسم سپرد خاک کر دیا گیا۔ تمہاری آہ و بکا سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ سب ہی تمہیں تسلی تشفی دے رہے تھے جی چاہتا تھا کہ میں بھی تمہاری دل جوئی کروں۔ تمہارا غم بٹاؤں لیکن میں تمہارے پاس جا ہی نہ سکتا تھا۔ تمہیں سارے خاندان کی عورتیں گھیرے رہتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ سب رخصت ہونے لگے۔ شادی کا گھر اب ماتم کدہ بن گیا تھا۔ اب وہاں خاموشی اور ویرانی رچ بس گئی تھی۔ پھر ایک روز میں اپنے دل کو سنبھالتا ہوا تمہارے پاس گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا تم کو دیکھتا رہا۔ تازہ گلاب کا سا چہرہ مرجھا کر بے رونق ہو گیا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنی قوت گویائی کو یکجا کر کے کہا — "ثنا! کاش میں تمہارا غم بٹا سکتا۔ میں نے تو یہ بھی دعا مانگی تھی کہ خدایا میری نامراد زندگی کے جتنے دن باقی ہیں وہ آزر کی عمر میں جوڑ کر اسے اچھا کر دے — لیکن دعا قبول نہیں ہوئی اور ایک پر مسرت اور کامیاب زندگی ختم ہو گئی — اور میں جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔"

[illegible] فراز تمہارے الفاظ سے تمہاری بے بسی [illegible] تھی۔ پھر تم نے ایک آہ سرد بھر کر میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ الفاظ میں، میں اس [illegible] کی صورت کی عکاسی نہیں کر سکتا۔ میرے لب جیسے سل گئے تھے — چند لمحات سکوت میں گزرے پھر تم ہی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "فراز تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹروں نے مجھے اور میرے بچے کو اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ آزر کے لبوں پر ثنا، ثنا ہی کی رٹ لگی تھی۔ اسی لئے دریافت کیا گیا کہ ثنا کون ہے — میں اندر گئی — جانتے ہو فراز کہ آزر کے لبوں پر میرا ہی نام کیوں تھا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے — اور سنو کہ آزر نے کیا کہا تھا — انھوں نے کہا تھا — "ثنا میرے بعد تم کسی دوسرے کے بازوؤں میں جا کر اپنا غم غلط نہ کرنا — وعدہ کرو کہ تم صرف میرے بچے کے لئے ہی جیو گی — انسان بچھڑ کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ آہ ثنا بس اب تم سے دور ہو رہا ہوں —"

آزر کی زبان جواب دیئے جا رہی تھی — میں نے انھیں تسلی دینے کے لئے وعدہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گی اور پھر میری دنیا اجڑ گئی — کئی روز بعد پھر میں نے انھیں خواب میں اس طرح دیکھا کہ وہ میرے بچے کو لئے چومتے رہے پھر مجھ کو مخاطب کر کے کہا "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" اور میں ایک مرتے ہوئے شوہر سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کروں گی۔"

— میں نے کہا تھا — "یہ کیا کہہ دیا تم نے ثنا — آزر نے تمہیں کیسی بندشوں میں جکڑ دیا ہے۔ تم زندہ رہتے ہوئے بھی تمام عمر کفن میں لپٹی ایک زندہ لاش بنی رہو گی —"

"آہ! لیکن ہم دونوں ہی مجبور ہیں — آزر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بچھڑ کے بھی زندہ رہ سکتا ہے — میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ واقعی آدمی بچھڑ کے بھی جی ہی لیتا ہے۔" (ختم شد)

حرمی دسترخوان

دل پسند چٹنی

چٹنیاں تو آپ نے بہت سی نوش فرائی ہوں گی، لیکن یہ چٹنی ممکن ہے دکھائی ہو، اس لئے ایک بار اسے بھی بنا کر استعمال فرمائیں۔

سامان: تازہ چکا (جما ہوا) دہی ۵۰۰ گرام گاجر ولایتی ۱۰۰ گرام (گانٹھ گوبھی) ۱۰۰ گرام، مولی موٹی اور ملائم ۱۰۰ گرام، سیم ۱۰۰ گرام۔ شلگی پھلی (گوار کی پھلی) ۱۰۰ گرام۔ ناریل آدھا (تازہ ناریل ہو جس میں اندر پانی رہتا ہے۔ پیاز بڑی دو گٹھی۔ دال ماش (اُڑد) اور دال چنا، چائے کا ڈیڑھ ڈیڑھ چمچہ۔ کرے پاک (تیز پتہ) رائی چائے کا ایک چمچہ۔ نمک حسب ضرورت۔ تیل کڑوا (سرسوں کا) یا جو آپ کو پسند ہو ۱۰۰ گرام۔

ترکیب:۔ تمام سبزیوں کو دھو کر گاجر کو چھیل کر اس کی اندرونی سخت ہڈی نکال دیں۔ سیم کو ہلکا ہلکا کھرچ لیں پھر سب ترکاریوں کو باریک کاٹ لیں۔ ناریل کو باریک پیس لیں ــــ پیاز کے لچھے تراش لیں۔

کسی بڑے بھگونے یا پتیلی میں تیل ڈال کر کڑکڑائیں پھر پیاز کے لچھے اس میں ڈال کر گلابی کر لیں۔ پیاز تلنے کے بعد دہی میں رائی ملا کر ڈالیں اور بھونیں۔ پھر کٹی ہوئی سبزیوں کو دھو کر ان کا پانی اچھی طرح چھان کر ملائیں دالیں بھی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر پکائیں نمک اندازے سے ڈال کر برتن کو اتار لیں اور استعمال فرمائیں نمک کم محسوس ہو تو اور ملا لیں۔

مرسلہ:۔ کے شگفتہ بانو (آمبور)

انڈے کے رول

سامان: انڈے تین عدد۔ میدہ چائے کی ایک پیالی گوشت بلا ہڈی کا ۲۵۰ گرام۔ نمک حسب ضرورت۔ کالی مرچ پسی ہوئی چائے کا ایک چمچہ۔ دودھ چائے کی آدھی پیالی۔

مٹر ہرے ۲۰۰ گرام (چھلنے کے بعد)۔ مکھن ایک ٹیبل اسپون شکر چار چمچہ۔ ہری پیاز ایک چھوٹی آنڈی مع ساگ۔

ترکیب:۔ کسی پتیلی یا بھگونے میں نمک، کالی مرچ اور گوشت ڈال کر تھوڑا پانی ڈالیں اور ابالیں۔ پانی اتنا ہو کہ گوشت گل جائے اور پانی اسی میں ہضم بھی ہو جائے۔ دیکھتی رہیں گوشت گلنے (جلنے) نہ پائے۔

گوشت کو نکال کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں مٹر کے دانوں کو جوش دے کر دانے نکال لیں انڈوں کو پھینٹ کر اس میں شکر، دودھ، میدہ، نمک کالی مرچ ملا کر خوب پھینٹیں اور رکھ لیں۔

تیل، یا گھی یا ڈالڈا میں گوشت کے ٹکڑے۔ تھوڑا نمک اور مٹر ڈال کر بھون لیں۔

اب کسی فرائی پین میں گھی یا ڈالڈا تھوڑا سا ڈال کر پوری سطح پر پھیلا دیں اور اس پر انڈے آمیزے سے ایک بڑا چمچہ لے کر فرائی پین میں ڈال کر، اس کا ہینڈل پکڑ کر اس طرح گھمائیں کہ آمیزہ پوری سطح پر ہلکا ہلکا لگ جائے۔ یاد رہے کہ آنچ ہلکی ہلکی ہونی چاہیئے۔ آمیزہ کا نچلا حصہ گلابی ہو جائے تو اسے رائس اسپون سے اٹھا کر پلٹ دیں جب دوسرا حصہ بھی گلابی ہو جائے تو اسے کسی چپٹے برتن میں رکھ کر تھوڑا سا مٹر اور گوشت کے ٹکڑوں کا آمیزہ پھیلا کر رول کر لیں اور کسی ڈش میں رکھ دیں۔

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ ایک ایسی خبر ہر ماہ چھپ سکتی ہے جو ولادت شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جائے۔ تاخیر سے آنے والی خبریں ایک ماہ بعد شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• ہماری منہ بولی عزیز بہن فاطمہ ملک صاحبہ (برمنگھم انگلینڈ) کی دختر نیک اختر آدان سلمہا مسز خلیق زیا و سلمہٗ کے یہاں ۸ر اگست ۸۵ء کو اللہ پاک نے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام صائمہ قرار پایا۔ میری دعا ہے کہ صائمہ سلمہا جگ جگ جئے اور اپنے والدین و بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ (نسیم انہونوی)

• کے۔ سائرہ بانو (آمبور) میری سہیلی خالہ طاہرہ سعد اللہ کو اللہ پاک نے دوسری بار ۷ر نومبر ۸۵ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نومولود عمر خضر پائے اور فخر خاندان بنے۔

• صبیحہ سلطانہ (بنگلور) میری بیٹی نشاط سلطانہ سلمہا اور داماد سید اسمٰعیل انجینیر K.P.L کو اللہ پاک نے ۳ر نومبر ۸۵ء کو ایک لڑکی عنایت فرمائی نام ندا سلطانہ قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ نومولود کو عمر طویل بخشے اور دین و دنیا دونوں میں سرخرو بنائے۔

• کچیکار عائشہ تسکین و اصفہ تحسین (آمبور) ہماری آنٹی ذکیہ رفیق کو اللہ پاک نے ۱۶ر اکتوبر ۸۵ء بروز چہارشنبہ دوسری بار ایک اور فرزند عطا فرمایا۔ نام توقیر احمد قرار پایا۔ دعا ہے کہ دولت دنیا و عقبیٰ سے مالا مال ہو عمر خضر پائے بلند اقبال بنے۔

• خریداری نمبر 1970 بلا ٹکٹ ملی ـــ دوبارہ خبر اور ٹکٹ روانہ کریں۔

پیغامات نشاط

• عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم (پرشین رگس بھدوہی) کے فرزند دلبند محمد رضا خاں سلمٗہ کی شادی یاسمین خانم سلمہا دختر نیک اختر نثار محمد خاں صاحب کھتولی) کے ہمراہ ۹ر نومبر ۸۵ء بروز ہفتہ ہوٹل کلارکس اودھ لکھنؤ میں بصد شان و شوکت عمل میں آئی۔ بارات بھدوہی سے لکھنؤ ۹ر نومبر کی شام کو پہنچی۔ ۷½ بجے کانفرنس ہال میں نکاح کی تقریب ادا ہوئی ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک بینکوئٹ ہال میں شاندار ڈنر دیا جاتا رہا۔ جس میں معززین اور عمائدین نے شرکت کی۔ میں تہہ دل سے محترمہ بیگم صاحبہ عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم اور محترم نثار احمد خاں صاحب اور بیگم صاحبہ نثار احمد خاں صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• سیفیق احمد ہاشمی صاحب (پھول باغ۔ لکھنؤ) کے فرزند ڈاکٹر سید زبیر احمد سلمہٗ اور دختر نیک اختر رقیہ خاتون سلمہا کی شادیاں بالترتیب یاسمین سلمہا اور محمد جاوید سلمہٗ (دختر و فرزند جناب محمد یونس صاحب (ڈالی گنج لکھنؤ) کے ہمراہ ۹ر نومبر ۸۵ء ½۱۰ بجے دن میں ریلوے انسٹی ٹیوٹ، اسٹیشن روڈ لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• محمد نور میاں کے فرزند محمد شکیل میاں سلمہٗ کے عقد سعید کے سلسلے میں جو توحید فاطمہ سلمہا۔ دختر نیک اختر جناب محمد یونس صوفی بحسن و خوبی عمل میں آئی۔ ایک شاندار دعوت ولیمہ ۱۷ر نومبر ۸۵ء کی شب میں محمد نور میاں صاحب کی قیام گاہ حکیم عبدالعزیز روڈ پر دی گئی جس میں موصوف کے اعزہ اقربا کے ساتھ ہی عمائدین شہر نے بھی شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شمس الحسن صاحب (لکھنؤ) کے فرزند شرف الحسن سلمہ کی شادی عشرت سلمہا (دختر نیک اختر لیاقت علی صدیقی صاحب مرحوم) کے ہمراہ بمقام ممتاز کالج لکھنؤ بتاریخ ۲۴ر نومبر ۸۵ء بحسن و خوبی عمل میں آئی۔ ۲۶ر نومبر کو پرنگٹن ہوٹل لکھنؤ میں دعوت ولیمہ دی گئی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• چودھری سید علی محمد زیدی صاحب (رودولی) کے معتمد منیجر رودولی کولڈ اسٹوریج اینڈ آئس فیکٹری محمد شفیع اللہ خاں، خان عزمی

ردولوی کی دختر نیک اختر شاہدہ تسکین سلمہا کی شادی ، ہمراہ محمد حکیم خاں (خلف محمد صدیق خاں صاحب مرحوم) ۲۸ نومبر ۸۵ء کی شب میں بمقام ارشاد منزل ردولی بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• مرزا مصطفےٰ حسین کے فرزند حسن مصطفےٰ سلمہٗ (لکھنؤ) کی شادی مستقیم فاطمہ عرف روبینہ حیدر سلمہا کے ہمراہ یکم دسمبر ۸۵ء کو بحسن وخوبی انجام پائی ۲ دسمبر کی شب میں سکرہدی ہاؤس کاظمین روڈ لکھنؤ میں دعوت ولیمہ دی گئی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• عبدالعزیز انصاری صاحب کی دختر نیک اختر جبینہ آرا انصاری سلمہا کی شادی، نورالہدیٰ انصاری سلمہٗ (فرزند جناب نور عالم انصاری صاحب کے ہمراہ بمقام دھن کھیٹی کلکتہ یکم دسمبر ۸۵ء کو بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• واسلا تنصیرہ تبسم عطیہ سلطانہ (آمبور) ہماری خالہ زاد بہن سیما ترنم (بنت محمد شفیع اللہ صاحب (آمبور) کا عقد سعید نور اللہ (ابن جناب پٹیل سی احمد باشاہ) کے ہمراہ ، جولائی ۸۵ء کو بحسن وخوبی انجام پائی - دعا ہے کہ ان کی زندگی شاد و خرم گزرے۔

• ایم نفیس شمسی سلمہٗ (فرزند جناب۔ ایس، ایم، ادریس شمسی) ہمراہ ریحانہ شمسی سلمہا (دختر نیک اختر ایچ ایم طیب شمسی صاحب رئیس کوٹ دوارہ) ۱۷ نومبر ۸۵ء کو بمقام کوٹ دوارہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلے میں ادریس شمسی صاحب نے ۲۰ نومبر ۸۵ء کو اپنی قیام گاہ چم گلی آگرہ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پرملال کی خبریں

• دینی تعلیمی کونسل کے عالیہ ناظم مولانا محمود الحسن عثمانی صاحب کا گذشتہ ماہ انتقال ہوگیا۔ مرحوم بے لوث اسلامی خادم تھے انھوں نے بڑے خلوص اور دلچسپی کے ساتھ دینی تعلیمی کونسل کے فرائض انجام دیئے تھے اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

• شاہ عبدالحلیم نقشبندی متوطن موضع خوش گھر (گھسکر) امیٹھی۔ لکھنؤ کا ۲۸ اکتوبر ۸۵ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے صاحب حال پیر طریقت تھے انھوں نے تقریباً پچاس سال تک مختلف مکاتیب ومدارس میں تعلیمی خدمات انجام دی تھیں ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ وہ اپنی بزرگی اور تعلیمی صلاحیتوں کے ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ میری خالہ زاد بہن زینب فاطمہ سلمہا مولانا حلیم صاحب کے فرزند عبدالعلیم صاحب سے منسوب ہیں ۲۸ء سے ۳۰ء تک جب میں شاعری کا ذوق بھی رکھتا تھا اور مشاعرے منعقد کیا کرتا تھا ان میں حلیم صاحب ضرور شرکت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں وہ بڑے ہی خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر بے تکلف دوست کی حیثیت سے پیش آتے تھے۔ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• مہذب اللغات کے مؤلف - اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب مہذب لکھنوی کا ۳ نومبر ۸۵ء کو انتقال ہوگیا وہ ۸۰ برس کے تھے۔

مہذب صاحب لکھنوی تہذیب وتمدن کے آئینہ دار تھے شاعری کا فن انھیں اپنے آباؤ اجداد سے ملا تھا۔ مہذب اللغات ان کا ایسا علمی ادبی کارنامہ ہے جو اردو کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ مہذب صاحب بڑے ملنسار خوش مزاج اور خلیق تھے اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• بڑے افسوس کے ساتھ یہ خبر شائع کر رہا ہوں کہ محترم شیخ محمد قدیر الزماں صاحب خاتون منزل لکھنؤ کے فرزند شیخ محمد محفوظ الرحمٰن کا ایک زیر تعمیر مکان کے نزدیک گر جانے سے ۸ نومبر ۸۵ء کو انتقال ہوگیا مرحوم کی عمر صرف ۳۲ سال تھی وہ قدیر الزماں صاحب کے چھوٹے بیٹے تھے سال گذشتہ ہی ان کی شادی ہوئی تھی ممتاز ڈگری کالج میں بحیثیت لائبریرین فائز تھے۔ حادثہ بڑا جانکاہ ہے۔ مرحوم کے ضعیف والدین، جوان بیوہ اور دوسرے تمام اعزہ کو صبر جمیل عطا فرمائے (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

• اردو کے مشہور ادیب محمود نیازی صاحب کا ۲۳ اکتوبر ۸۵ء کو بوقت فجر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا

جسد خاکی سیدنا عبداللہ لکھنؤی کے مزار کے پاس سپرد خاک کیا گیا مرحوم نے اپنی یادگار ایک بیوی ایک فرزند اور ایک دختر چھوڑی ہیں یہ خبر ہمیں مرحوم کی ہمشیرہ سراج بی حضرت جی نیازی کے خط سے ملی۔ محمود صاحب محکمہ کین سے منسلک رہے لیکن علمی ادبی کام بھی کرتے رہے۔ بچوں کے لئے کئی دلچسپ کہانیاں لکھیں۔ کئی انگریزی ناولوں کے ترجمے کئے۔ مرحوم کا ناول خیام ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ان کتب کے علاوہ تلمیحات ان کا ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جو اردو کی تاریخ میں ہمیشہ لکھا جاتا رہے گا یہ تمام کتب نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی ہیں ان کے علاوہ مرحوم کی ایک کتاب تلمیحات غالب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ محمود نیازی سے میرے دیرینہ تعلقات تھے۔ انتقال سے چند روز پیشتر ہی مجھے ان کا خط ملا تھا جس کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ جب بھی لکھنؤ آتے مجھ سے ضرور ملتے تھے بڑے خوش مزاج اور علم دوست تھے اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(نسیم انہونوی)

● ابھی کل ہی کی بات ہے یعنی ۶ر نومبر کی کہ میرے دیرینہ کرمفرما مخلص دوست اور لکھنؤ کے نامور طبیب شکیل احمد شمسی صاحب میرے آفس تشریف لائے تھے اور دیر تک ان سے قانون شریعت پر جاری گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اچانک ہی ۱۲ر نومبر ۸۵ء کی شام کو ان کے فرزند اقبال شمسی ایڈوکیٹ نے فون پر اطلاع دی کہ ۳ بجے دن میں حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ شمسی صاحب ۱۱ر نومبر کو ۱۲ بجے دن تک بالکل ٹھیک تھے اس کے بعد قلبی تکلیف ہوئی شب میں انھیں داخل اسپتال کیا گیا اور ۱۲ر کو انتقال فرمائے۔

۱۳ر نومبر کو ۲ بجے شمسی صاحب کی کوٹھی شفا محل حکیم عبدالعزیز روڈ لکھنؤ میں نماز جنازہ ہوئی جس میں حکیم صاحب کے اعزہ اقربا کے ساتھ ہی صدہا معاذین اور علماء شریک تھے۔

شمسی صاحب کے تین فرزند مظفر اقبال شمسی ایڈوکیٹ، عقیل احمد شمسی (جو سعودی عرب میں ہیں) اور طارق شکیل شمسی کے علاوہ تین بیٹیاں ہیں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں مرحوم کی زوجہ کا انتقال کئی سال قبل ہو گیا تھا۔

شمسی صاحب کی عمر ۷۰ سال تھی تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے عرصہ تک پرنسپل رہے۔ ہر طبی کانفرنس میں ان کی شرکت ہوا کرتی تھی۔ طبی مصروفیتوں کے ساتھ ہی دینی اور تعلیمی اداروں سے ساتھ بھی ان کی وابستگی رہا کرتی تھی آج کل بھی وہ ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کے صدر تھے۔

علم طب کے ساتھ ہی عام علمی مذاق بھی رکھتے تھے مشاعروں والے شاعر گو نہ تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے بہت عمدہ کہتے تھے حال ہی میں مرحوم کا مجموعہ کلام "بیدحیات بند وقلم" کے نام سے شائع ہو کر کافی مقبول ہوا۔ اس سے پہلے علم الولادت پر حکیم صاحب کی ایک فنی کتاب چھپی تھی۔ زیارت بیت اللہ کے بعد شمسی صاحب نے سفرنامہ حج لکھا تھا جو نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے "ارض حرم تک" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اپنے فن میں انھیں کمال حاصل تھا طب سے عوام کی دلچسپی کم ہونے کے باوجود ان کے مطب میں روزانہ شہری ہی نہیں باہر کے مریضوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا لکھنؤ میں شمسی صاحب کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا ثبوت نماز جنازہ کے شرکاء تھے۔ مردوں کے ساتھ ہی پچاسوں برقع پوش خواتین بھی اپنے ہردلعزیز طبیب کے آخری سفر پر انھیں پرنم رخصت کرنے کے لئے موجود تھیں۔ نماز جنازہ کے بعد حکیم شکیل احمد صاحب کا جسد خاکی عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

● عبداللطیف صاحب وظیفہ دار مدرس کی اہلیہ رشیدہ بیگم صاحبہ قدیمی حریمی بہن ۵ر اکتوبر ۸۵ء کی شب میں ۹ بجے اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں ۶ر اکتوبر بروز اتوار دن میں تدفین ہوئی۔ مرحومہ بڑی ہی نیک دل پابند صوم وصلوٰۃ اور خوش اخلاق بی بی تھیں اپنی نشانی دو لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑی ہیں اللہ پاک انھیں بخشے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کسی بھی حریمی بہن کا انتقال میرے لئے افسوسناک ہوتا ہے میں بھی سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ (یہ خبر امتہ المغیث باقی نے بھی روانہ کی ہے جو مرحومہ کی صاحبزادی ہیں)

(نسیم انہونوی)

● مزنم ناصر کلب۔ ضلع ایٹہ اطلاع دیتی ہیں افسوس کہ میرے میاں خیر الحاج سید حامد حسین خطیب سکریٹری جماعت اسلامی ہند کا ۱۱ر نومبر ۸۵ء

بروز جمعہ بوقت ۵ بجے صبح کلکتہ میں کار کے حادثہ میں انتقال ہوگیا جسد خاکی حضرت بی بی خدیجہ کے قریب میں دفن کیا گیا جو مرحوم کے اعلیٰ مقام کی دلیل ہے اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• نسرین لطیف (بڈولی۔ امراوتی) افسوس میری دادی محترمہ فاطمہ بیگم زوجہ اسمٰعیل خاں صاحب ۲۸ر اکتوبر ۸۵ء بروز پیر بوقت صبح ۱۱ بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ مرحومہ بڑی شفیق، حلیم الطبع، نیز ہمدرد خاتون تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی بھی پابند تھیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سلمیٰ خلیل (لاہور) رقمطراز ہیں کہ ہماری تایا بہ ماں صغرا بی صاحبہ ۱۹ر اکتوبر ۸۵ء بروز ہفتہ بوقت ۶ بجے شام اللہ کو پیاری ہوگئیں مرحومہ پابند صوم وصلوٰۃ، متقی پرہیز گار، خوش اخلاق اور رحم دل تھیں اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• شاہدہ تبسم وصبیحہ تسنیم (دکھی پور۔ بنگلور۔ سادھو) افسوس میرے پھوپھی زاد بھائی عبدالرحمٰن صاحب ۱۸ر اکتوبر ۸۵ء بروز جمعہ بوقت صبح قلبی دورہ پڑنے سے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے ملنسار اور خلیق انسان تھے اپنی نشانی ایک بیوہ اور چھ بچے چھوڑے ہیں۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• افضال فاطمہ رضوی (سیتاپور) افسوس میرے بہنوئی سید محمد تقی صاحب سابق کارکن قومی آواز لکھنؤ ۱۵ر اکتوبر کی شب میں راہی عدم ہوئے۔ مرحوم بڑے نیک، ہر دل عزیز، متقی، پرہیزگار اور محب اہل بیت تھے۔ تجہیز و تکفین میں ہر مکتبہ خیال کے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔

اللہ پاک مرحوم کو جنت میں جگہ دے اور میری بہن افضال فاطمہ اور بھانجی بھانجوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

نسیم انہونوی کا ناول — حسینہ ۱۲/- رومانی پردہ انوکھی کہانی

○ سدا بہار ناول

رومہ	مسرور جہاں	۳۰/-
تاباں	〃 〃	۲۷/-
تزئین	〃 〃	۲۱/-
صاعقہ	رضیہ بٹ	۳۰/-
روپ	〃 〃	۲۴/-
نمو	〃 〃	۱۷/-
اس دیوانگی میں	سلمیٰ کنول	۲۷/-
عروج	〃 〃	۴/-
عندلیب	〃 〃	۱۳/-
بے نام	〃 〃	۳۵/-
نمود سحر	واجدہ نازلی	۲۲/۵۰
انتظار سحر	〃 〃	۲۲/-
شہابی	شہناز کنول	۲۵/-
عالم پناہ	رفیعہ منظور الامین	۳۰/-
سارے جہاں کا درد	〃 〃	۲۱/-
پلکوں تلے	عطیہ پروین	۱۹/-
آنکھوں کے دیئے	〃 〃	۱۷/۵۰
ناظمہ	〃 〃	۲۲/-
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	〃 〃	۱۸/-
ہارجیت	عفت موہانی	۱۸/-
معصوم گناہ	وسیم بانو قدوائی	۱۵/-
انگارے	شبنم سحر	۳۰/-
پھول	عشرت تمیز	۹/-
صباحت	〃 〃	۳۰/-
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۲۸/-
نیلوفر	شاہدہ پوٹھکزئی	۱۲/-
پیار کی خوشبو	مسرور جہاں	۱۲/۵۰
خوشنما	عطیہ پروین	۳۰/-

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا پسندیدہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہوسکتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان پر ہو۔ موزوں اور سنجیدہ ہو ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجا گیا ہو کہ جس ماہ کے پرچے میں چھپنے والا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ر تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ جنوری کے لئے عنوان ہے "صبا" اور فروری کے لئے "یاد"

ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسے چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

مرسلہ:۔ طاہرہ تبسم اعظمی (راجہ پور سادر)

اک انتظار نیا ہے اک اضطراب نیا
بدل رہی ہے مرے دل کو آرزو تیری

مرسلہ:۔ شیریں سحر (سرائے رو ہیلہ)

بشر کو چاند پہ بسنے کی آرزو ہے عبث
جہاں ہے قحط ہوا و غذا و پانی کا

مرسلہ:۔ نجمہ انصار (کھٹکل)

ستم گر میری اتنی بات رکھ لے دل بیتاب کے جذبات رکھ لے
پکار رہے تجھے اپنا سمجھ کر۔ بس اتنی آرزو ہے بات رکھ لے

مرسلہ:۔ سہیلہ بانو (ہاسن)

لالے کو کہاں نصیب وہ داغ
جو دل کو دیئے ہیں آرزو نے

مرسلہ:۔ عزیزہ خاتون (واصع پور)

اگر شامل نہ در پردہ کسی کی آرزو ہوتی
تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (ٹلکو)

لب ان کے روبرو نہ کھلے، ہم کہیں تو کیا
دل میں جو آرزو تھی وہ دل ہی میں رہ گئی

مرسلہ:۔ سید اختر حسن ماجد (گورکھپور)

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نندیال)

تجھ سے ملے نہ تھے تو کوئی آرزو نہ تھی
دیکھا تجھے تو تیرے طلب گار ہو گئے

مرسلہ:۔ ناہید (میسور)

دل کو بیتاب رکھتی ہے اک آرزو
کم ہے یہ وسعت عالم رنگ و بو

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (دنگارا پیٹ)

یوں فریب آرزو دل کو دیا کرتا ہوں میں
حد سے بڑھ جاتا ہے غم تو ہنس لیا کرتا ہوں میں

مرسلہ:۔ رفعت یاسمین (کھمبا)

ہم کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ ضد کہ ہم سے تقاضہ کرے کوئی

مرسلہ:۔ ذکیہ رفیق (آمبور)

نئی و حالیہ ناولیں

عاشی	رضیہ بٹ	۳۲/-
خوبصورت	بشریٰ رحمان	۴۰/-
ذرے ذات	عفت قریشی	۴۰/-
صلیب کے زخم	نوشابہ صدیقی	۲۵/-
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	۵۵/-
پھانس	ریحانہ زیدی	۴۵/-
ابقہ	سعیدیہ بیگم	۳۵/-
نورا	عذرا بیگ	۴۵/-
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	سہیلا فاروقی	۳۵/-
ارمانوں کی سیج	ایف۔ ایم۔ وسیم	۳۵/-
امید بہار	فرزانہ نصیر	۲۵/-
حسینہ	نسیم انہونوی	۱۳/-
پیاسی	بشریٰ رحمٰن	۴۰/-
قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۳۶/-

کلی چھیندنے اپنی طرف سے جوڑ دیے!۔

"واقعی؟"

دیکھ ہی کے جو آرہا ہوں!"

تسلی نہیں کر دیا دونوں کو!۔

"نانا ابا پھانسی پر نہیں لٹکا دیں گے۔ اب صنوبر نہ میری بہن ہے نہ میری ماں جائی۔ وہ بس دونوں بڈھوں کی جاگیر بن کر رہ گئی ہے۔ ان ہی کے پاس رہ بدمعاش بھی گھسا رہتا ہے۔ بہت چاہتے ہیں اسے۔ پڑھوا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ تایا ابا کسی بڑے پوسٹ پر رکھا بھی دیں گے!"

"ناقابل برداشت۔ قطعی ناقابل برداشت" ارقم نے مٹھیاں کس لیں۔

"اس مردود کا پتہ تو میں چپکے چپکے کاٹ ہی رہا ہوں۔ گہری پالیسی ہے۔ پیٹ نہ پڑے گی۔ مگر اب ان بڈھوں کا بھی کوئی علاج کرنا پڑے گا!۔ کیا واقعی تایا ابا اسے کسی پوسٹ پر رکھا دیں گے!۔

سنا تو یہی ہے!"

جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں" ارقم پاگل ہونے لگا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبیث سے ان کم بخت بڈھوں کی محبت کی وجہ کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ گل تایا ابا یا نانا ابا ہی کا کھلایا ہوا ہو۔ تبھی تو۔ ورنہ اتنی توجہ اتنا التفات اتنا خلوص ان نحوسوں نے نہ تو مجھے دیا نہ تم لوگوں کو۔

یہ سارا پیار اس حرامی پلے ہی پر کیوں نچھاور ہو رہا ہے!۔

ہو سکتا ہے کہ تایا ابا یا نانا ابا ہی کا کارنامہ ہو۔ میری خالہ راز دار بنائی گئی ہوں" جیبرنے ہاں میں ہاں ملا دی۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا "آپ نے اپنی اسکیم نہیں بتائی۔ (باقی آئندہ)

اچھی بات ہے۔ میں ابھی آیا۔ آپ تب تک جا کے بیٹھئے!"

"پانچ منٹ بعد جب دونوں پرسکون تنہائی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے تب ایاز گھبرا رہا تھا اور صنوبر کے عارضوں پر رہ رہ کر سرخی بکھر جاتی تھی۔ اس نے اپنی کسی کیفیت پر قابو پانے کے لیے سنتے ہوئے توشہ دان ایاز کے سامنے رکھ دیا۔

"کل دوپہر گاجر کا حلوہ بنا تھا۔ منوں گھی، کھویا اور خشک میوہ، ممی نے اس میں جھونکے ہیں۔ اتنا لذیذ ہو گیا ہے کہ جی چاہتا ہے کھاتے چلے جائیں۔! میں نے تو خوب سا کھایا ہے۔ اماں نے کہا تھا کہ ایاز کو حلوہ نہیں ملا لہٰذا آپ کے لیے میں ڈبے بھر کے لے آئی ہوں۔ اب ختم کرو انھیں جلدی سے۔ پھر بیرہ مطلوبہ چیزیں لے آئے گا!"

"آپ نے اپنی بچپن کی عادت ابھی تک چھوڑی نہیں ہے" ایاز ہنسنے لگا!

"ہمیشہ آپ نے اپنے حصے سے میرا حصہ نکالا ہے۔ سچ مچ اتنا خیال آپ میرا کرتی ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں بے نوا اور بے بضاعت آپ کے اتنے گرانقدر احسانوں کا بدلہ کیسے اتار سکوں گا!"

کیا سچ مچ یہی سوچتے بھی ہو جو کہہ رہے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا: ایاز کیا کسی کے خلوص اور گہرے محسوسات کا کوئی بدلہ یا معاوضہ بھی ہو سکتا ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ کہ کیا ہے کیونکہ میرا خیال ابھی تک یہی تھا کہ بعض چیزوں کا کوئی معاوضہ کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں!۔

"ہاں۔ ہمیشہ غلطی میری ہی نکلتی ہے۔ نجانے اتنی ناسمجھ کیوں ہوں۔!"

"صنوبر بی بی۔ آپ۔!

"تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے ایاز۔ مجھے صنوبر بی بی کہہ کے اتنی تعظیم اور احترام سے مت مخاطب کیا کرو۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے تم تو اتنے ہی دس گیارہ برس

کے بچے ہو مگر میں یکبار گی پچاس سال کی ہو گئی ہوں ۔!"

"یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے" ایاز پھر ہنس دیا "آپ نے نہیں سنا۔ ایاز قدر خویش را بشناس" اس کی ہنسی تیز ہو گئی "معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات میرے لیے کہی گئی ہے ۔ واہ۔ تقدیر نے اس زبان سے کیسی سچی پیشین گوئی نکلوائی اسم بامسمٰی بن کر رہ گیا ہوں!"

"دیکھو اب اگر تم نے اچھی اچھی باتیں نہ کیں تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی" صنوبیہ نے بگڑ کر کہا "میں یہاں نہ بنا کر تم سے ملنے اس لیے نہیں آئی کہ تمہاری جلی جھلسی سنوں ۔

معاف کیجئے!" وہ شرمندہ سا ہو گیا "ہاں تو آپ شروع کیجئے ۔ اچھی اچھی باتیں ۔ میں صرف سنوں گا! میں تو کچھ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ میرے پاس اچھی بات ایک بھی نہیں ہے!"

بیرہ ایک ٹرے لیے ہوئے آ گیا! ۔ دونوں چپ ہو گئے! ۔ اس کے جانے کے بعد ایاز نے کہا "اب یہ بچا ہوا حلوہ میں گھر لے جاؤں گا ۔ زندگی میں پہلی بار کھایا ہے ۔ کتنا مزیدار ہے ۔ آپ لے تو اس میں سے چکھا بھی نہیں!

یہ تمہارا حصہ تھا! کاٹی بناؤں!

لائیے ۔ میں بناتا ہوں!

نہیں!

اچھا تو آپ ہی بتائیے!" اس نے کیتلی کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا صنوبیہ یک لخت بھپر گئی ۔

اتنی جلدی سپر انداز کیوں ہو جاتے ہو ۔ نہ احتجاج نہ اصرار ۔ چھین جھپٹ کر اپنا حق منوانا تمہیں کیوں نہیں آتا؟ تمہاری کمزوری خاموشی اور صبر کے انداز نے

سے کیسی نبھ رہی ہے ۔ کس سلسلے میں تشریف آوری ہوئی حضور کی؟"

"سوالوں کی بوچھار کر دی آپ نے" جبیر مسکرایا "میرا بس ایک جواب ہے کہ اب تو آرام سے گزر رہی ہے ۔ اور ——

ہاں عاقبت کی فکر نہیں کیوں ہو" ارقم بولا "آؤ ادھر بیٹھ کے باتیں کریں ۔ میں بھی اب جا ہی رہا تھا!

ہائیں ۔ تو کیا آپ اندر ہی تھے؟

ہاں ۔ باجی کے پاس!

دونوں آگے بڑھ کر ہار سنگھار کے پیڑ سے لگی سنگی بنچ پر بیٹھ گئے ۔ ارقم نے سگریٹ سلگائے ایک خود لبوں میں دابا اور دوسرا جبیر کی طرف بڑھا دیا ۔

"آپ کہیئے ۔ آپ کی دال کچھ گلی؟" جبیر ہنس کر بولا ۔

"زبردستی گلانی پڑے گی" ارقم کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی ۔ اب وہ خوفناک لگ رہا تھا "یار! تمہاری بہن ۔ برا مت ماننا ۔ مجھے تو کچھ بہکی ہوئی لگتی ہے ۔ اور ارقم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے درمیان شیطان کا کردار کون ادا کر رہا ہے! تعجب ہے کہ تم لوگ بھی آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہو ۔! نہ تو تمہارے نانا کی غیرت کو جنبش ہوتی ہے نا پھوپھی جان ہی کچھ اعتراض کرتی ہیں ۔ ہمارے گھر میں تو واقعی بڑی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ امی اور ڈیڈی حیران ہیں کہ آخر ایک ناجائز، شرمناک ناپاک ہستی کو نانا جان محترم اور نانی اماں محترمہ نے سینے سے کیوں لگا رکھا ہے!"

سمجھ میں نہیں آتا ۔ ارقم بھائی" جبیر نے دو گہرے کشوں میں سگریٹ کا مردہ نکال کر دور پھینک دیا اور بولا "ابھی میں نے ڈرامہ دیکھا کہ وہ اوپر کھڑی ہے اور نیچے وہ لفنگا بیٹھا ہے ۔ اشارے بازیاں ہو رہی ہیں" جبیر

تھا کہ اس گستاخ زبان دراز لڑکی کی بوٹیاں اڑا دینا!۔

"بیٹا آپ کی کافی اور میکرونی!" دفعتہً وہاں صنوبر آ گئی!۔ اس کے ہاتھوں پر چھوٹی سی چمکدار ٹرے تھی جس میں میکرونی کی طشتری اور کافی سے لبریز پیالی تھی! جبیر کی نظر بس اس پر پڑیں اور اس نے دانت چمکا دیے!۔ صنوبر کوئی چھ ماہ قبل (دیر کے کام کاج اور شازیہ کی بچی کے کھلانے پر نوکر رہی تھی۔ بیس اکیس سال کی خوب صحت مند گٹھیلے جسم کی سانولی رنگت کی قبول صورت لڑکی تھی۔ نہایت شوخ دیدہ، بڑی طرار اور چرب زبان تھی۔ جتنی چالاک اتنی ہی حریص، چور الگ، فتنہ فساد برپا کرانے میں ماہر۔ اس نے جبیر کی قابل اعتراض نظریں بارہا دیکھیں مگر برا نہ مانا بلکہ اٹھلا اٹھلا کر یوں شرمائی کہ جبیر کے نفس کی چنگاریوں کو ہوا دے دی۔!

"کون ہو تم؟" اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا بھول گیا کہ ابھی ابھی صنوبیہ کو سرزنش کر رہا تھا!

"ٹرے منڈیر پر رکھ دو۔ اور تم فوراً بھاگو یہاں سے" صنوبیہ نے لڑکی کو بری طرح جھڑک دیا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر منڈیر پر ٹک گئی۔ میکرونی کا ننھا سا ٹکڑا منھ میں رکھا اور کافی کی پیالی لبوں سے لگا لی۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ جبیر بے کہ چلا گیا۔ وہ البتہ قہرناک نظروں سے صنوبیہ کو گھور رہا تھا!۔ پھر اس نے ایک نظر باغ پر ڈالی۔ وہاں بھی ایاز نہ دکھائی دیا۔ "ڈائن پلیس" کہ جبیر نے زیر لب کہا۔

"معلوم نہیں تھا گھر میں یہ تماشے ہوا کرتے ہیں۔ خیر۔ میں بھی دیکھ لوں گا! وہ باہر نکلا اور اس کی مڈبھیڑ ارتم سے ہو گئی۔ رسمی سی علیک سلیک کے بعد ارتم نے مسکرا کر پوچھا: "فرمائیے جناب۔ بی سارہ کے کیا حال ہیں۔ آپ

یہ دن دکھایا ہے کہ کونے میں پڑے ہوئے ہو، عضو معطل کی طرح!" اس نے کافی پیالی اور چار پلیٹیں اس کی طرف سرکا دیں: "خبردار کیے دیتی ہوں۔ یہ سب تمھیں کھانی پڑیں گی۔ مجھے پتہ ہے کہ صبح تم نے ناشتہ نہیں کیا تھا!"

ایاز کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی: "اب یہ آپ کو بھانے کی ضرورت نہیں کہ میں کسی کی زیادتی پر احتجاج کیوں نہیں کرتا؟ صنوبیہ بی بی۔ مجھے حق حاصل نہیں ہے کہ میں چھین جھپٹ کر کسی سے کچھ حاصل کروں۔ کیا میرا ماضی آپ پر عیاں نہیں ہے؟۔

"ماضی؟" برا سا منھ بنا کر صنوبیہ نے بات کاٹ دی: "اکثر لوگوں کے ماضی قابل اعتراض ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی فرشتہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیا ان کے ماضی کوئی کرید کر حشرات الارض برآمد کرتا ہے پھر تم اپنے ماضی کو کیوں نہیں بھول جاتے۔ اس طرح تو تمھاری ساری جبلتیں مردہ ہو جائیں گی۔!"

"تو پھر کیا ہو جائے گا؟"

تم ہنس رہے ہو ایاز؟۔

جی ہاں۔ آپ کی معصومیت پر۔!

کیوں میں نے کوئی ایسی ہی مضحکہ خیز بات کی ہے!؟

آپ نے مجھ سے بہت سی غلط اور پوری نہ ہونے والی توقعات وابستہ کر لی ہیں!۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے ایاز۔ میں تمھیں ایک شائی انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم پچھلی باتیں فراموش کر دو۔ انسان کو ہمیشہ آگے کی راہ پر نظر رکھنی چاہیئے۔ جو ہوا وہ ہو چکا اب تمھاری پریشانیاں، فکریں، برہمی اور غصہ تمھارا اچھا یہ برا ماضی تمھارے لیے تبدیل نہیں ہو سکتا!۔ پھر تم اپنے

حال اور مستقبل کو سنہرا بنانے کی کوشش کیوں نہ کرو۔ "تم ہمیشہ اچھی پوزیشن لاتے ہو۔ ابھی اس دن تایا ابا نے کہا تھا کہ وہ نیشنل بینک کی اسپیشل اسسٹنٹ شپ سے عنقریب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ اور ان کی جگہ تمھیں رکھا جا سکتا ہے بس پھر ساری تمھاری قسمت پلٹ جائے گی!"۔ ایاز! "سمجھو میری بات!"

"سمجھ گیا آپ کی بات!" وہ اب بھی یوں زیر لب مسکرا رہا تھا جیسے صنوبیہ کی نادانی کا لطف لے رہا ہو۔ "صنوبیہ بی بی۔ قسمت کیا صرف دولت ہی سے پلٹتی ہے۔ انسان کو صرف روپیہ پیسہ ہی چاہیے اور کچھ بھی نہیں!"

"آج کل کی دنیا میں سکھ سے جینے کے لیے روپیہ ہی بڑی چیز ہے!" وہ اس طرح بولی جیسے اسے خود اپنی بات کی بے وزنی کا احساس ہو گیا ہو!۔ ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ ابھی کچھ نہیں سمجھتیں! دولت سے انسان صرف مادی مسرتیں خرید سکتا ہے۔ روحانی خوشیاں روپے پیسے سے نہیں خریدی جا سکتیں۔ اگر مجھے کوئی بڑا عہدہ مل گیا مجھے دولت نصیب ہو گئی۔ مجھے خدا نے کچھ بنا دیا۔ تب بھی صنوبیہ بی بی۔ تب بھی مجھے دلی سکون اور روحانی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی!"

"کیوں؟"۔

"کیونکہ تب بھی میں جو کچھ چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں مل سکے گا!"

"تم میں ہاتھ بڑھا کر وہ چیز اٹھانے کا بوتا بھی نہیں؟"۔

"نہیں صنوبیہ بی بی!"۔

"عجیب آدمی ہو!" صنوبیہ نے حیرت سے کہا۔ "تو پھر جی کیوں رہے ہو؟"۔

"یقیناً غلطی کر رہا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "اگر بڑے صاحب کی بات کا پاس و لحاظ نہ ہوتا اگر آپ کی توجہ کا سہارا نہ ہوتا تو پھر میں نہیں جانتا کہ میں کہاں

ہے۔ اسے نکال ہی کے دم لیں گے!۔ یہ کیا تماشہ ہے۔ وہ سامنے مرا ہوا ہے اور تم یہاں کھڑی ہو۔"

صنوبیہ میں بھی وہی خون تھا جو جبیر کی رگوں میں تھا۔ وہ بہت حقارت سے ہنسے لگی۔ "تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جس طرح تم لوگوں نے ماں کو دکھ دے کر اس کے کلیجے میں ناسور ڈال کر بھنگن اور چماریوں کو پسند کر لیا ہے اسی طرح میں بھی کوئی ناپاک کھیل کھیلوں گی مگر نہیں۔ جب ممی نے کہا تھا کہ شبیر اور جبیر مر چکے ہیں۔ ممی نے ان کا چالیسواں کر دیا ہے تو میں نے سوچا کہ ممی کی رہی سہی دکھ بھری زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے اب مجھی کو لڑکا بننا پڑے گا۔ سر جبیر بھیا۔ تم جا کر کسی چمارن کے ساتھ جوتے سیو۔ اگر ان کی آنکھیں چمگادڑ کی سی ہیں۔ یا میں ان کا تماشہ دیکھ رہی ہوں تو تمھاری بلا سے۔ آئندہ مجھ سے اس طرح ذلیل انداز میں گفتگو نہ کرنا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھی اپنے لیے لحاظ کی امید مت رکھنا!"

"جا رو سر چڑھ کر بول رہا ہے" جبیر کا لہجہ۔ جیسے زبان سے زہر ٹپک رہا تھا۔ "اس کا تدارک بہت ضروری ہے۔ خیر بھیا اور اتم بھائی کو آنے دو!"

"تمھیں شرم آنی چاہیے" صنوبیہ نے بھی شعلہ بار لہجے میں جواب دیا۔ "اپنی چھوٹی بہن اور ایک غیر مرد کی نسبت تمھارے خیالات اتنے گندے ہیں اگر کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو تم اس کا خون پی جاتے نہ کہ تم خود اپنے منہ سے گندگی ٹپکا رہے ہو۔ میں تمھیں اپنا بھائی کہتے شرم محسوس کرتی ہوں تم کان کھول کر سن لو۔ چیاس بھیا اور ریکنڈرن ارقم مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جو کچھ تم ناپاک شلیٹ کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔!"

"اچھا اچھا!" جبیر خوابیدہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ بس نہ چلتا

مجھے کھنڈر میں تو پے نہ آئے۔ بلکہ مجھ پر دو سچے آنسو بھی گرا سکے۔!"

اے نوج۔ چپ رہیے" بیگم نے تنک کر کہا "بات کا پہاڑ بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔ یہ کل کے بچے جو اپنے سامنے ننگے کھلے پھرا کرتے تھے۔ ان کی باتوں کا بھی کوئی معیار ہے۔ یوں چیخ چلا کر اپنی طبیعت مت خراب کیجئے"

اب ہم بچے نہیں رہے نانی اماں" جبیر جارحانہ انداز میں بولا۔

بزرگوں سے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو" عمرانہ نے غصے سے کہا "اور اب تم بہت بک بک کر چکے جاؤ یہاں سے۔ مار کے آدھا منڈوہ غارت کر کے رکھ دیا۔ ایسے شوق سے صنوبر کو ندھتی ہے۔! امی۔ منڈوہ گیا ہو تو دے دیجئے ادھر لٹا دوں۔ آپ کا زانو سُن ہو جائے گا"

رہنے دو۔ بی" امی نے مسکرا کر کہا "جب تک کوئی بچہ میری گود میں نہ رہے مجھے چین نہیں آتا!"

کچھ دیر جبیر خاموش بیٹھا گھٹنا ہلاتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ برآمدے میں صنوبیہ کھڑی چاندنی کا نظارہ کر رہی تھی۔ آہٹ سن کر اس کے لب مسکرا گئے!

یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟" جبیر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

آپ کی آنکھیں تو کمزور نہیں معلوم ہوتیں۔؟!" صنوبیہ بولی۔

دفعتہ جبیر کی نگاہیں باغ کی آخری حد تک پھیل گئیں۔ ٹوٹے ہوئے حوض کی منڈیر پر ایاز بیٹھا تھا۔ اس کی پشت تھی برآمدے کی جانب۔ مگر جبیر کے دل میں شعلہ سا اٹھ گیا۔ زہر خند کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"البتہ انکی آنکھیں چمگادڑ کی طرح تیز معلوم ہوتی ہیں چاندنی میں مطالعہ فرما رہے ہیں! صنوبیہ! میں جانتا ہوں کہ وہ حرامی بچہ تمہیں اپنے پھندے میں الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جب تک میرے اور بھیا کے دم میں دم ہے یہ اندھیر نہیں ہو گا!" دیانے بھی کہا تھا کہ بس ابھی پھانک نے جھکی کمر

ہوتا۔ کیا کرتا؟ اور اب کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ ایک نہ ایک دن اپنے گھر چلی جائیں گی۔ بڑے صاحب کو مجبور کر کے مجھے در بدر کر دیا جائے گا تو پھر کیا ہو گا کیا کروں گا میں!"

نہیں!" صنوبیہ نے مستحکم انداز میں سر ہلایا "مجھے پرائے گھر جانا نہیں ہے۔ ممی سے میں نے کہہ دیا ہے۔ اگر وہ کسی کے سلسلے میں مجھے مجبور کریں گی تو پھر انجام بہت برا ہو گا۔ اس طرف سے تم اطمینان رکھو... اور تمہیں کوئی در بدر بھی نہ کرے گا کیا تم گھر کے ایک فرد نہیں ہو!"

شاید آپ کے نزدیک ہوں گھر کا ایک فرد۔ کسی اور کے لیے نہیں!"

ایاز؟ برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

ضرور پوچھئے۔ آپ کی بات کا برا ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!"

کیوں؟" وہ پھر اپنے خاص انداز میں مسکرائی۔

کیونکہ آپ اتنی اچھی ہیں۔ ہمدرد ہیں۔ مہربان ہیں۔ میں اگر آپ کی بات کا برا مانوں گا تو کیا آپ برا نہ مانیں گی؟ تو پھر پوچھیے۔ کیا بات ہے؟"

"تم نے کبھی مہرن خالہ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ آخر تم ان کے پاس کیسے آ گئے؟" انھوں نے تمھیں کسی گھر سے چرا تو نہیں لیا تھا۔ اتنے دن تک پالا پوسا اور پھر کسی وجہ سے پیچھا چھڑا کر گاؤں جا کر لاپتہ ہو گئیں!

صنوبیہ بی بی۔ میں بچپن میں بڑا احمق تھا" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "سچ مانیے کہ مجھے خالہ سے یہ ضروری بات پوچھنے کا مطلق دھیان ہی نہیں آیا۔ اور نہ انھوں نے کبھی تذکرہ کیا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کسی نے اپنی پیشانی کا کلنک گھورے پر پھینک دیا تھا۔ خدا ترسی کے مارے خالہ اٹھا لائیں۔ یہ ہے میری کہانی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس ہستی کا ماضی اس قدر تاریک اور شرمناک

ہو۔ وہ زندگی کی دوڑ میں کیونکر حصہ لے سکے کیونکر کسی سے من چاہی چیز طلب کر سکے۔ کیونکر کسی پر اپنا حق مسلط کر سکے۔ نہیں ہو سکتا نا ایسا؟۔ اس لیے میں نے دنیا دار درویش کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس ہوں مگر جی رہا ہوں!"

"تمھیں جینا ہی ہے ایاز۔ تم میرے دوست ہو۔ اور تم نے ہمیشہ وعدہ کیا ہے۔ میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑو گے، بس یہ یاد رکھنا!" صنوبیہ نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔

"آخری سانسوں تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا!" وہ اپنی آنکھوں میں چھپے محبت کے لبریز ساغر اسی پر انڈیلتا ہوا مخمور لہجے میں بولا "مگر آپ نے اپنا وعدہ یاد نہ رکھا۔ تب؟!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں جینے کا حوصلہ سکھاؤں اور خود زندہ رہنے کا طریقہ بھول جاؤں؟"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا صنوبیہ بی بی!"

"ایک آدھ بات کا مطلب تم خود سمجھ لیا کرو۔ مگر ایاز تم مجھے اس طرح بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ تم کتنے اپنے اپنے سے لگنے لگتے ہو؟"

"اچھا؟" وہ گلابی ہو کر جھینپے انداز میں ہنسنے لگا!۔

اس خرابۂ کائنات میں زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی امید اور آس

لگ بھگ ہو رہا ہے۔ اب اسے آپ لوگ گھر سے کیوں نہیں نکال دیتے!"

"ایک بات بتاؤ گے!" سید صاحب نے باوجود مشتعل ہونے کے سرد لہجے میں بولے اور کپکپا دینے والی ٹھنڈی نظروں سے جبیر کو دیکھنے لگے!۔

"جی۔!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"تمھیں اس سے دشمنی کیوں ہے؟" بتاؤ مجھے!"

"نانا ابا۔ ہم بدنام ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے!" جبیر نے کہا "میرے دوست اکثر کہتے ہیں کہ کبھی غلاظت کا انبار گھر میں کیوں لگا رکھا ہے؟"

"تمھارے دوست؟" سید صاحب تمسخرانہ انداز میں ہنس کر بولے "مطلب یہ کہ گندگی اور غلاظت کے منقد انبار۔ جنھوں نے اپنا تعفن اس طرح تم پر انڈیلا ہے کہ تم بھی غلاظت ہی کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئے ہو تمھیں بزرگوں کا ادب نہیں رہا ہے۔ تمھیں ماں سے محبت نہیں ہے۔ تم کو بہن کی فکر نہیں ہے تم نے تعلیم بھی پوری نہیں کی۔ تمھاری ماں اپنے کندھے توڑ محنت کی مزدوری تم کو بھجواتی رہی اور تم عیش کرتے رہے۔ تم ایک دوغلی نسل کی کرسچین چھوکری کے شوہر بن گئے۔ اپنی اقدار برباد کرتے رہے۔ تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم خود کیا ہو۔ تمھیں کسی کو برا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ تم خود انتہا سے زیادہ برے ہو!"

"نانا ابا یہ صرف ایاز کی حمایت میں ہے؟" جبیر نے پوچھا۔

"ہاں! تم یاد رکھو کہ اسے میں نے رکھا ہے۔ تم نے نہیں!" سید صاحب کا ضبط رخصت ہو گیا۔ اب وہ گرج رہے تھے "جب تک میں زندہ ہوں، وہ میرے پاس رہے گا کیونکہ مجھے بھی کوئی ایسا ہمدرد چاہیے جو دم آخر میرے منھ میں پانی چوا سکے! میرے مرنے کے بعد ایک ناگوار بوجھ کی طرح

کر گیا ہوگا۔ بے حیا کی بلا دور۔ تعجب ہے کہ روٹی توڑنے کے لیے مسٹنڈا ابھی تک نہیں مرا ہوا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے رہتے تک ملعون کو نکال باہر کروں گا!۔ کہاں ہے؟ باہر کے کمرے میں!؟

جیسے آئے ہو ویسے ہی دفعان بھی ہو جاؤ:" ہاجرہ نے کہا: "تمھیں گھر کے کسی معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے!۔

اچھا تو یہ کہیے کہ اب وہی سب کچھ ہو گیا ہے"۔ جبیر نے جواب دیا: ہمارے گھر سے دور ہونے کا فائدہ سب سے زیادہ اسی کو پہونچا ہے۔ ممی جی۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ جیسے آپ نے حسب نسب جانے بغیر ایک واہیات آدمی کو اپنا شوہر بنا لیا تھا۔ اسی طرح اس غلیظ کو آپ نے اپنے داماد کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے؟!؟

تمھارے منھ میں گھی شکر!" صوفیہ نے دل ہی دل میں کہا۔ البتہ بیگم صاحبہ اور ہاجرہ اس پر اُلٹ پڑیں۔ بیگم نے بے نقط سنائیں۔ ہاجرہ نے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر کے غصے کے مارے کانپتے ہوئے کہا۔

"جبیر۔ خیریت اسی میں ہے کہ چلا جا۔ ابھی اور اسی وقت دفع ہو جا میرے سامنے سے۔ سچ ہے بری زمین کی فصل بھی بری ہوتی ہے۔ نجانے کیا سوچ کر ان سپولوں کو ساتھ لگا لائی تھی کہ مجھے اس عمر میں ڈستے رہا کریں۔ یا تو خدا ان صورت حراموں کی مٹی عزیز کر لے یا پھر میرے وجود سے زمین کا بوجھ ہلکا کرے۔

"سچی بات پر برا مان لیا۔ ممی۔ مجھے وجہ بتائیے کہ آپ نے ابھی تک اس حرامی کو کیوں پناہ دے رکھی ہے"۔ جبیر ہار نہ ماننے والا کب تھا: "پہلے تو یہ جواز تھا کہ وہ بے سہارا بچہ تھا۔ حالانکہ یہ جواز بھی معقول نہ تھا کیونکہ دس گیارہ سال کے بچے بھی کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر ہی لیتے ہیں... مگر اب تو وہ پچیس سال کے

کی بیساکھیاں بہت ضروری ہیں۔ کوئی موہوم سی توقع جو پوری نہ ہو سکتی ہو۔ انسان کو تگ و دو کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ امید نہ ہو تو زندگی اس کے گلے کا شکنجہ بن کر رہ جائے!۔ آدمی کی خیاںت بے ثبات کے لمحات گنے گئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آغاز کے ساتھ ہی اپنا انجام بھی لے آتا ہے اور اس حقیقت کو سمجھنا بھی اچھی طرح ہے وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کے چل دیتا ہے۔ زندگی کا یہ پاگلوں کا سا گورکھ دھندہ بس چند روزہ بہار ہے۔ متاع قلیل مدت کے پروگرام کتنے لمبے چوڑے کتنے پائیدار اور وسیع و عریض ہوتے ہیں! جیسے اسے ابد کے کنارے چھونے ہیں۔ آدمی ایک آدمی کو کندھوں پر لاد کر لاتا ہے اور بستر خموشاں کے سناٹوں میں گم کر کے خود چہل پہل کی دنیا میں کھو جاتا ہے اور نہیں سوچتا کہ ایک دن دوسرے لوگ اسے اپنے کندھوں پر لائیں گے اور مٹی کے ڈھیر تلے چھپا کر چل دیں گے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو خدا کی ساری مخلوق گوتم ہی گوتم بن کے ویرانے بسا لیتی اور آبادیاں ویران ہو جاتیں۔ انسان کو ایک پاگل سی عقل اور دیوانی سی سمجھ دی گئی ہے۔ اور بس وہ خوب مزے سے جی رہا ہے۔!

ایاز ابھی تک ایک تاریک غار میں جیتا رہا تھا۔ صوفیہ کی نصیحت اور حوصلہ افزائی نے اسے اس غار سے باہر نکال لیا۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا۔ دنیا کی دوڑ میں اندھا دھند حصہ لینے والوں کے ساتھ خود بھی بھاگ پڑے!۔ اور اس نے اپنی تگ و دو تیز کر دی۔ یہ سوچے بغیر کہ اب جانا کہاں تھا۔؟

ایک خواب پرست آدمی یوں حقیقت کی سنگلاخ سے ٹکرایا کہ اس کے سارے ہی خواب بے تعبیر رہ گئے۔ اب وہ سطحی مسرتوں کا متلاشی تھا!۔

پہلے پہل اسے بڑی شرم لگتی تھی۔ اپنے مخالفین کے بقول وہ خود رو تھا اب اس نے اثر لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ناسمجھ سا تھی بھی جانے کدھر کدھر کے ہو رہے تھے مگر ایک مستحکم چٹان تھی جو اس کی راہ میں بدستور مرجود تھی۔ اقم کی ہستی کی چٹان۔

گرمی کے موسم کا وسط تھا۔ دن بھر گرم ہوا چلا کرتی۔ اور باغ میں بگولے چکراتے۔ درختوں پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔ ہر چیز پر سناٹا سا برس رہا تھا۔ امتحانات شروع ہو چکے تھے! صنوبیہ جو پرائیوٹ کوشش کر رہی تھی اب بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ کوئی سند لے کر ملازمت کرے اور اپنی ماں کے دکھوں کا مداوا کر سکے! ۔ ان دنوں پہاڑ سے جبیر آیا ہوا تھا۔ اور ماں بہن کے حق میں ایک نئے دکھ کا باعث بن گیا تھا!۔

رات بڑی حسین تھی۔ شفاف آسمان پر پورا چاند روشن تھا۔ پلکیں جھپکاتے ننھے منے تارے یہاں وہاں بکھرے تھے۔ صحن میں ایک طرف موگرے کا جھنڈ تھا۔ جس پر کثرت سے پھول کھلے تھے۔ سارا صحن تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کھانے سے قبل سب صحن میں آ بیٹھے، سید صاحب ان دنوں کچھ بیمار تھے صنوبیہ انھیں پکڑ کر باہر لائی۔ وہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ اور اپنی کسی تکلیف سے آہستہ آہستہ کراہنے لگے!۔

ابی جی کہاں تکلیف ہے؟" صنوبیہ نے بے چین ہو کر پوچھا، اور ان کا کندھا دبانے لگی" آپ نے ڈاکٹر صاحب کی دوائی چھوڑ دی۔ اب ایک مرتبہ حکیم صاحب ہی کو دکھا دیجئے۔ ان کی دوا میں تو شراب یا برانڈی کی ملاوٹ نہیں ہوتی!"

۔ یہ تو بڑھاپا ہے بیٹی۔ اور بڑھاپا کسی حکیم یا ڈاکٹر کے علاج سے نہیں جاتا" وہ ہنسنے لگے" تم فکر نہ کرو۔ یہ جوانی دور سے چل کر آیا ہوں۔ تو سانس

پھولنے لگی ہے!۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا!۔

جبیر بڑی دیر سے ایک مونڈھے پر بیٹھا موتیے کے پھول نوچ نوچ کر پنکھڑیاں زمین پر بکھیر رہا تھا۔ اور اس کی یہ حرکت دیکھ دیکھ کر صنوبیہ کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن وہ چپ چاپ پیچ و تاب کھاتی رہی۔!

تم جاکے پڑھو بیٹی۔ چوبیس تاریخ سے تمھارا امتحان ہے۔ میری فکر ناحق کرتی ہو" سید صاحب نے کہا۔ بیگم وہیں بیٹھی عامرہ کے چھوٹے بچے کو سلا رہی تھیں۔ انھوں نے کہا" اور تو آپ کا بھلا چاہنے والا کون رہا ہے ہی کون۔ باپ مرے کے جیئے ماں جہنم جلی جائے جہنم میں کسی کو کوئی فکر ہے۔ اولاد پیدا کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں کام آئے۔ ہم نے اولاد پیدا کی ہے۔ دوسری عورتوں کے لیے جوان جہان مرد وہ سسرال کے غلام ہو کر رہ گئے۔ عدیل نے دوسری شادی کیا کی ہے کہ گھر ہی کو بھول کے رہ گئے۔ اب وہاں ارمانوں بھری اولادیں پیدا ہوں گی۔ نگوڑی شہلا کے کرم بھی پورے ہو گئے۔ اللہ نے بچہ نہ دیا۔ تو اس کا کیا تصور۔ نہ اسے طلاق دیتے ہیں نہ گزارہ۔ بڑی جھینک رہی ہے میکے میں۔ عدیل کو پڑھائی سے فرصت نہیں کہ باپ کو پوچھ لیں۔ اجی آپ سنتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ایاز سے کہیے کہ ڈاکٹر جبین صاحب کو پھر بلا لائے۔ ان کے انجکشن سے آپ کو فائدہ ہوا تھا"

نفسی نفسی کا دور ہے بی بی" سید صاحب کچھ سوچ کر مغموم ہو گئے" کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ تم ناحق رنج کرتی ہو۔ میں نے تو فرض کر لیا کہ میں بے اولاد ہوں۔ مجھے اب رنج نہیں ہوتا۔!"

) اور اولاد آپ کی اگر کوئی ہے تو وہ غلام ہے" دفعتہً جبیر بولا" وہ آپ کا خیر خواہ ہے۔ دکھ درد کا ساتھی ہے۔ ارے! میں تو سمجھا تھا کہ وہ کہیں منہ کالا

[Q]areem, Lucknow, December, 1985 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP-32